ماہنامہ
کرن
مارچ 2012
سالگرہ اسپیشل
سالگرہ نمبر

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

مارچ 2012
جلد 34 شمارہ 12
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مارچ کا سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

انسان خواب دیکھتا ہے۔ انسانوں کے درمیان باہمی محبت، چاروں سو پھیلی روشنیوں اور زندگی کی اعلا اقدار کے فروغ کا خواب۔ یہ خواب ہی ہوتے ہیں جو انسان کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں اور باعمل انسان اپنے خوابوں کو سنہری تعبیر دینے کے لیے کوشش بھی کرتا ہے۔ محمود بابر فیصل نے ایسا ہی ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر "کرن" کے روپ میں آپ کے سامنے ہے۔

محمود بابر فیصل کا لگایا ہوا یہ پودا یقیناً اپنے آپ پر فخر کر رہا ہوگا کہ اس کی بنیادوں میں ایسے شخص کی محبتیں، شفقتیں اور ریاضتیں شامل حال رہی ہیں۔ محبت اور خلوص جس کی زندگی کا واحد مشن تھا۔ زندگی کے سارے رنگ محبت و خلوص سے ہی تو عبارت ہیں۔ اور محمود بابر فیصل نے ان ہی رنگوں سے کرن کی آبیاری کی۔ اور ماشاء اللہ کرن نے آج کامیابی کا ایک اور سال مکمل کر لیا ہے۔ اس سفر میں آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی نے ہمیں آگے اور آگے قدم بڑھانے میں مدد دی۔ ہم اپنی مصنفین کے بھی شکرگزار ہیں جن کی تحاریر نے کرن کو جگمگایا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ لوگوں کی محبتیں یونہی ہمارے ساتھ رہیں (آمین)

کرن کا سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے۔

اس شمارے میں،

- اداکارہ "سوہائی ابرو" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "قصے، کہانیاں اور بھول" سالگرہ کے موقع پر مشہور شخصیات اور قارئین سے سروے،
- اداکارہ "نزما بچہ"، دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- اداکارہ "ثمینہ پیرزادہ" قارئین کی عدالت میں،
- "مجھ سے ملیے" میں "سعدیہ عزیز آفریدی" اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں،
- آر جے "اسما توحید" آواز کی دنیا سے،
- "دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "او رے پیا" نایاب جیلانی کا طویل مکمل ناول اختتامی مراحل میں،
- "مقید خاک" ضوباریہ ساحر کا طویل مکمل دلچسپ ناول،
- "میرے بے خبر" مہوش افتخار کا مکمل ناول،
- "تم سنگ نیناں لاگے" فرحانہ ناز ملک کا دلچسپ ناول،
- "عشق ہوتا نہیں" نفیسہ سعید کا دلچسپ ناولٹ،
- عنبرین اعجاز، صدف آصف، صباحت یاسمین اور صائمہ احمد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "سالگرہ اسپیشل" ہر شمارے کے ساتھ مفت پیش خدمت ہے۔ استفادہ کریں
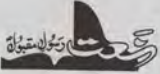
لکھتا ہوں میں ثنا کی سطر تیرے واسطے
ہوتی ہے یونہی زیست بسر تیرے واسطے

ہر دم تیرے جمال سے ہوتا ہوں فیض یاب
اٹھتی ہے جس طرف بھی نظر، تیرے واسطے

ملتا ہے پھر سرور عجب رنگ کا مجھے
جھکتا ہوں جب میں وقتِ سحر تیرے واسطے

چندا یہ چاندنی، یہ ستارے، یہ کہکشاں
سارے ہیں تیرے زیرِ اثر، تیرے واسطے

سہراب تیرے نام پہ قربان ہوتا جائے
اس کا قلم رواں ہو اگر، تیرے واسطے

سہراب حنیف اللہ میانوی

دل جس کا آئینہ ہے وہ صورت تمہیں تو ہو
عنوان کائنات مشیت تمہیں تو ہو

سر تا قدم نگاہ کی دولت تمہیں تو ہو
خود جس سے روشنی ہے عبارت تمہیں تو ہو

محکم تمہارے ذکر سے ہے اعتبارِ عشق
سرمایۂ فروغِ محبت تمہیں تو ہو

دستِ سوال دامن کونین کی قسم
حاجت روا بقدر ضرورت تمہیں تو ہو

تم سے ہے یا رسولؐ! چراغاں حیات میں
آنکھوں کا نور دل کی بصیرت تمہیں تو ہو

اقبال صفی پوری

غزل

گلی گلی میرے زخموں کی گواہ
میرا درد عام ہے میرے خدا

کون بھرتا ہے غیر کے زخم
اب یہاں کون میرا تیرے سوا

اس شہر میں تھا اک شناسا جو
وہ بھی گیا ماتھے پہ سہرا سجا

جب اس کا تھا تصور میرے قریب
سوچوں پہ گیا وہ پہرے لگا

سناؤں تو کس کو سناؤں کہانی
تو ہی سن لے فیصل کی میرے خدا

ذوالقرنین

نظم

وہ تم کو کیسی لگتی ہے؟

جب ہلکی ہلکی بارش ہو
مٹی کی سوندھی خوشبو ہو
وہ ہنستی ہو، وہ گاتی ہو
اور پریت کے گیت سناتی ہو
وہ تم کو کیسی لگتی ہے؛

وہ اتراتی اٹھلاتی ہو
وہ آنکھیں موندے آتی ہو
اور ماتھے کو سہلاتی ہو
خود روتی اور رلاتی ہو
اور پھر درد اپنا بتلاتی ہو
وہ تم کو کیسی لگتی ہے،

جب گھپ اندھیرا چھاتا ہو
کوئی پیار سے پاس بلاتا ہو
اور دل کی بات بتاتا ہو
پھر خوابوں میں کھوجاتا ہو
وہ تم کو کیسی لگتی ہے؟

ذوالقرنین

سوہائی ابرو سے ملاقات

شاہین رشید

ڈرامہ سیریل سنجھا تو آپ سب دیکھ ہی رہے ہوں گے۔ اس سیریل میں نامور فنکاروں کے علاوہ کچھ نئے چہرے بھی نظر آرہے ہیں۔ ان نئے چہروں میں جس چہرے نے سب سے زیادہ ناظرین کی توجہ حاصل کی اپنی پرفارمنس سے وہ "سنجھا" کا رول کرنے والی اداکارہ سوہائی ہیں۔ یہ ان کا پہلا ڈرامہ سیریل ہے اس سے قبل وہ ٹیلی فلمز میں کام کر چکی ہیں۔ سوہائی سے کی باتیں نذرِ قارئین ہیں۔

★ "کیسی ہیں سوہائی اور سنجھا میں بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں اور آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

* "جی میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور میری پرفارمنس پسند کرنے کا شکریہ۔ مصروفیات تو میری ڈانس پرفارمنگ کی ہی ہوتی ہیں۔ لیکن میں سنجھا میں بھی بہت مصروف رہی۔ عموماً" سیریل کو مکمل ہونے میں اتنا ٹائم نہیں لگتا۔ زیادہ سے زیادہ دو یا تین مہینے لگتے ہیں لیکن "سنجھا" ایک سال میں مکمل ہوا۔ دسمبر 2011ء میں اس کی شوٹ مکمل ہوئی ہے کسی نہ کسی وجہ سے لیٹ ہوتا رہا۔ اس کی لوکیشنز بھی بہت زیادہ تھیں اور کاسٹ بھی بہت بڑی تھی۔۔۔۔ نا صرف میں اس سیریل میں بہت مصروف رہی بلکہ اپنی ڈانس

پرفارمنس میں بھی بہت مصروف رہی مسلسل کام کی وجہ سے تھکاوٹ بہت ہو گئی تھی۔"

★ "ڈانس پرفارمنس۔۔۔ کچھ بتائیں اس کے بارے میں؟ شیما کرمانی کے ساتھ ہیں؟"

❋ "میرا اپنا گروپ ہے "نرت تال" اور عنقریب ایک پرفارمنس مجھے دینی ہے کراچی "لٹریچر فیسٹیول" میں اور میرا اپنا گروپ ہے اس میں لائیو میوزیشن ہوتے ہیں اور ہم لائیو پرفارمنس دیتے ہیں۔۔۔ شیما کرمانی کے ساتھ میں الگ پرفارمنس دیتی ہوں۔ وہ تو میری گرو ہیں انہی سے سیکھا ہے۔۔۔ لیکن میرا کام ان سے تھوڑا مختلف ہے ہمارے گروپ میں سب ینگ لوگ ہیں اور ابھی "تلیا" نے مجھے ایک تھیٹر میں چھوٹا سا رول کرنے کے لیے کہا ہے جو کہ کافی اچھا اور دلچسپ ہے اور یہ تھیٹر ڈرامہ مارچ میں ہو گا۔ تو بس میں زیادہ توجہ ڈانس کی طرف ہی دیتی ہوں۔"

★ "سنجھا کے حوالے سے یہ بتائیں کہ جب ایک سیریل کو ایک سال لگ گیا تو اب مزید تو دل نہیں چاہے گا کام کرنے کو؟"

❋ "دل تو چاہتا ہے۔ مگر اتنا لمبا کام ہو جائے تو پھر تھکن بہت ہو جاتی ہے۔ پھر پڑھائی بھی کرنی ہوتی ہے اور ڈانس کو بھی ٹائم دینا ہوتا ہے۔ مجھے آفرز آتی ہیں مگر مجھے رول پسند نہیں آتے اور میں ابھی خود بھی کام نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ میں "اے لیول" کر رہی ہوں اور سیکنڈ ایئر کا لاسٹ ٹرم ہے تو یہ مشکل چار مہینے ہیں امتحان کے پھر میں گریجویشن کر لوں گی تو امتحانات کی ٹینشن پھر یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کرنا۔ تو میں خود بھی دوسرے کاموں میں انوالو نہیں ہونا چاہتی اور ڈانس پر توجہ اس لیے زیادہ دے رہی ہوں کہ میں گریجویشن ڈانس میں ہی کرنا چاہ رہی ہوں اور میں اپنے آپ کو ریلیکس رکھنا چاہتی ہوں۔ اداکاری میں مشکل یہ ہے کہ کبھی آپ رات کو دیر سے فارغ ہوتے ہیں۔ کبھی مسلسل کئی کئی گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔"

★ "آپ کا نام سوہائی ہے۔ بڑا یونیک ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

❋ "سنجھا کا مطلب ہے غروب آفتاب کا منظر اور سوہائی کا مطلب طلوع آفتاب ہے اور میں سندھی ہوں، سندھ سے میرا تعلق ہے اور میرے والدین آرٹسٹک ذہن رکھتے ہیں اور انہیں شاعری سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ تو میرے والد نے میرا نام "سنجھا" ہی سوچا تھا۔ کیونکہ یہ بات کنفرم ہو گئی تھی کہ ان کی بیٹی ہی ہو گی "تو "سنجھا" تھوڑا ڈیپریسنگ تھا تو جب میں صبح کے وقت پیدا ہوئی تو میرے ابا نے میری اماں کو کہا کہ اب ہم اپنی بیٹی کا نام سوہائی رکھیں گے۔"

★ "نام کا اثر انسان کی زندگی پہ ہوتا ہے؟"

❋ "مجھے معلوم نہیں ہے اور نہ ہی میں ان چیزوں پر یقین رکھنا چاہتی ہوں لیکن شاید اثر ہوتا ہو گا۔۔۔ اور میں اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں آپ کو بتا رہی تھی کہ میرے والد کا تعلق حیدر آباد سے ہے اور میری والدہ کا نوشہرو فیروز کے پاس ایک گاؤں ہے۔ جس کا نام گدڑی گوٹھ ہے۔ میرے والد نے نیشنل کالج آف آرٹ لاہور سے گریجویشن کیا ہے اور گرافک ڈیزائنر ہیں اور کافی عرصے سے ڈان گروپ آف نیوز پیپر سے وابستہ ہیں ان کا نام "خدا بخش ابڑو" ہے اور میری والدہ رائٹر ہیں، شاعرہ ہیں، خواتین کے مسائل پہ ہی زیادہ لکھتی ہیں ان کا نام عطیہ داؤد ہے میرے والد نے بھی جتنی پینٹنگز بنائی ہیں وہ خواتین کے ہی ایشوز پہ ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے خالد اور فیض کی نظموں پہ بھی کام کیا ہے۔ میری والدہ کی بھی کافی کتابیں شائع ہو چکی ہیں شاعری کی اب کافی عرصے سے وہ ڈرامہ رائٹر بھی ہیں اور ایک ٹیلی فلم آئی تھی "کون حسن آرا" وہ میری والدہ کی ہی تحریر تھی میں اپنے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ میں 23 ستمبر 1993ء میں کراچی میں پیدا ہوئی میری ایک ہی بہن ہے۔ جو مجھ سے تین سال بڑی ہے اور وہ انگلینڈ میں انگریزی ادب میں بیچلر کر رہی ہے اور اس کا نام سوہا ہے اور اس کا مطلب خوب صورتی ہے۔"

★ "آپ ڈانس پرفارمر ہیں "سنجھا" کے لیے آپ کا انتخاب اس وجہ سے ہوا؟"

❋ "مجھے ڈرامے کی پروڈیوسر نے فون کیا اور کہا کہ میں تم سے ایک میٹنگ کرنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے پاس گئی انہوں نے مجھے سنجھا کی پوری کہانی بتائی اور مجھے میرا رول بتایا۔۔۔ کہ سنجھا کو ڈانس کرنے کا بہت شوق ہے اور وہ اپنی فیلنگز کو ڈانس کے ذریعے ایکسپریس کرتی ہے اور ڈانس کے ذریعے ہی اپنے آپ کو discover کرتی ہے اور چونکہ میرا رنگ سانولا ہے اور فیچرز بھی ایسے ہیں کہ کردار سے میچ کر رہی تھی۔ تو مومنہ نے کہا کہ اس کردار کے لیے مجھے تمہارا ہی خیال آیا تھا، اس لیے میں یہ کردار تم سے کروانا چاہتی ہوں اور تمہارا نام ذہن میں رکھ کر میں نے یہ رول [illegible] کہ یہ کردار میرے دل کے بہت [illegible] کی کہانی اچھی لگی۔ اپنا رول اچھا لگا اور میں اس رول کو کرنے کے لیے بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ مجھے پرفارم کر کے بھی مزا آیا۔ بس لمبا ہو گیا تو تھکن ہو گئی تھی۔"

★ "بور ہو گئیں کیا؟"

❋ "نہیں بور نہیں ہوئی بس کردار میں اتنی انوالو ہو گئی کہ دماغ پہ سوار ہو گیا اور تھوڑی سی بیمار بھی ہو گئی تھی۔ کیونکہ میں زیادہ ڈرامے کرتی نہیں ہوں۔ جیسے ہماری کافی فنکارائیں ایک شوٹ سے دوسرے اور دوسرے شوٹ سے تیسرے میں آسانی سے چلی جاتی ہیں۔ جبکہ میں ایسا نہیں کرتی بلکہ ایک ہی کردار کی گہرائی میں چلی جاتی ہوں اور مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ میں سچ مچ کی سنجھا ہوں۔ گھر آ کر عجیب سا لگتا تھا کہ اماں ابا سے کیا بات کروں۔ کیسے بات کروں۔"

★ "اس کردار کے لیے والدین نے اجازت دے دی تھی؟"

❋ "جی بالکل دے دی تھی کیونکہ میرے والدین بہت براڈ مائینڈڈ ہیں اور انہوں نے مجھے اور میری بہن کو اتنا اسٹرونگ بنایا ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ یہ اس قابل ہیں کہ اپنے لیے خود صحیح فیصلہ کر سکتی ہیں اور کچھ غلط کام نہیں کریں گی۔ سنجھا میں بھی مجھے جو ٹھیک لگا میں نے اسی طریقے سے کیا۔"

★ "اچھا رسپانس مل رہا ہے؟"

❋ "مجھے تو ابھی تک بہت اچھا رسپانس ملا اور جب میں پبلک میں کہیں جاتی ہوں تو لوگ بہت خوشی خوشی مجھ سے ملتے ہیں۔ حالانکہ ابھی میرا ایک ہی سیریل چلا ہے۔۔۔ لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں "ارے آپ سنجھا ہیں نا، آپ بہت اچھی ہیں" اور آپ کو ممتاز نے کتنا

مارا ہے۔"

★ "سچ مچ مارا تھا؟"

* "جی بالکل سچ مچ مارا تھا۔ ریشم باجی نے کہا کہ میں تمہیں تھوڑا سا ماروں گی تاکہ حقیقت کا رنگ آئے تو میں نے کہا کہ آپ مجھے ٹھیک طرح سے ماریں ورنہ پھر میں حقیقت کا رنگ نہیں دے پاؤں گی۔ تو وہ بھی مجھے ٹھیک ٹھاک مارتی تھیں اور جب وہ مجھے گھسیٹتی تھیں تو میں بھی اپنا پورا زور لگاتی تھی کہ سین حقیقی لگے اور چونکہ میرے نام سے لوگ واقف نہیں اس لیے مجھے نجھا کہہ کر ہی سب بلاتے ہیں۔ ویسے بھی میرا نام کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

★ "کسی نے تنقید کی؟"

* "نہیں کسی نے نہیں کی۔ البتہ فیس بک پہ کچھ لوگ کمنٹس دیتے ہیں جو کہ عجیب عجیب سے ہوتے ہیں کیونکہ لوگ تھوڑے Materialistic ہوتے ہیں تو کچھ نے لکھا کہ "یہ لڑکی تو بالکل بھی خوب صورت نہیں ہے اور کالی بھی ہے" تو مجھے ایسے لوگوں کی بالکل بھی پروا نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں لوگوں کی اکثریت کو "بیوٹی کی نالج" نہیں۔ ان کے لیے تو گوری اور گرین آنکھوں والی ہی لڑکی حسین ہوتی ہے نہ تعلیم کی اور نہ ہی ہنر کی ان کے نزدیک کوئی ویلیو ہے۔"

★ "اپنا سیریل دیکھتی ہیں؟"

* "ہاں جی ضرور دیکھتی ہوں۔ صرف پہلی قسط نہیں دیکھ پائی تھی اور اس لیے بھی شوق سے دیکھتی ہوں کہ مجھے خود نہیں معلوم ہوتا کہ اگلی قسط میں کیا ہونا ہے۔"

★ "پرفارمنگ آرٹ کا شعبہ بہت وسیع ہے اور لوگ اداکاری کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں اور ڈانسنگ کو ہمارے یہاں پرموٹ نہیں کیا جاتا اور زیادہ اچھا بھی نہیں سمجھا جاتا..... تو آپ کو اس طرف آنے کا خیال کیسے آیا؟"

* "میرا رجحان ہمیشہ ڈانسنگ کی طرف ہی رہا ہے اور اس کی وجہ میرے والدین ہیں اور مجھے ہمیشہ یہ بتایا گیا کہ لوگ ڈانس کو اچھا سمجھتے ہیں اور عزت دیتے ہیں۔ جب میں سات سال کی تھی تو میں شیما جی کے پاس گئی ڈانس سیکھنے اور میرے لیے یہ ایک بالکل مختلف تجربہ تھا میں نے اس کو کبھی بھی غلط نظریے سے نہیں سوچا جب لوگ کوئی بات کرتے ہیں تو میں ان کی باتوں کو بالکل بھی اہمیت نہیں دیتی..... بچپن میں جب فرینڈز کہتے تھے کہ غلط بات ہے اور تمہاری جب شادی ہوگی تو تمہارا شوہر کیا کہے گا کہ میری بیوی ڈانس کرتی ہے..... یہ باتیں مجھے بری لگتی تھیں اس لیے دوستوں کی برتھ ڈے پارٹیز میں نہیں جاتی تھی تو سب ناراض ہو جاتے تھے۔ تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے ہرٹ کرتی تھیں تو میں نے سوچا کہ ہرٹ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور آہستہ آہستہ میں ڈانس کی اہمیت کو سمجھتی گئی۔ پاکستان میں ضیاء الحق سے پہلے ڈانس کی اہمیت تھی لیکن ان کی وجہ سے تو سب کچھ ختم ہو گیا اور شیما جی کی عزت میں اس لیے بھی زیادہ کرتی ہوں کہ وہ اپنے رولز پہ ڈٹی رہیں۔"

★ "ٹی وی پروگراموں میں ڈانس پرفارم کرنے کی آفرز آئیں؟"

* "کمرشل ایوارڈ کی تقریب میں مجھے بلایا گیا لیکن میں نے منع کر دیا۔ حالانکہ اس میں کافی پیسہ بھی ملتا ہے۔ ایوارڈ کی تقریب بہت کمرشل ہوتی ہے اور جس طرح پورٹریٹ کیا جاتا ہے اس کے میں خلاف ہوں۔ کیونکہ اس کو غلط طریقے سے دکھایا جاتا ہے۔ جو لوگ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ سب کی اپنی سوچ ہے۔ لیکن میں نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ میرا جو اسٹائل ہے وہ ان کو پسند نہیں آئے گا۔"

★ "فارغ وقت میں کیا کرتی ہیں؟"

* "فارغ اوقات میں یا تو ڈانس کی پریکٹس کرتی ہوں یا پھر ڈانس کے بارے میں سوچتی ہوں یا پھر میوزک سنتی ہوں اور میوزک بھی کچھ الگ ہی قسم کا ہوتا ہے بچپن میں ابا نے خالصتاً "کلاسیکل میوزک سنایا" پھر نیم کلاسیکل میں جب کلاث میں تھی تب ہی سے میرے

کانوں میں میوزک ڈال دی گئی تھی۔ تو اب مجھے میوزک سننے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ مجھے میوزک سننا اچھا لگتا ہے۔ مجھے فوک میوزک بہت پسند ہے۔ فلمی میوزک بھی سنتی ہوں۔ مگر ڈیسنٹ والی۔ یہ "چھمک چھلو" اور "شیلا کی جوانی" والی میوزک مجھے پسند نہیں....."

★ "پڑھائی، ڈانس، ایکٹنگ ان سب سے فرصت کے بعد کچن کو وقت دیتی ہیں؟"

* "کچن سے لگاؤ بچپن میں ہوتا تھا اب نہیں ہے۔ جب چھوٹی تھی تو برتن بھی دھونے کو دل چاہتا تھا کھانا پکانے کا بھی دل چاہتا تھا..... اور میرے خیال میں ایک عمر ایسی آتی ہے کہ جب اماں ابا کہتے ہیں کہ فلاں کام تمہاری ذمہ داری ہے، تب ہم اس کام کی طرف بھاگتے [illegible] ذمہ داری میں ہے۔ ویسے میں [illegible] ہوں [illegible] کے کاموں میں۔ اماں ورکنگ وومن ہیں اس کے باوجود سارے گھر کی ذمہ داری انہوں نے اٹھائی ہوئی ہے۔"

★ "شادی اپنی پسند سے کریں گی یا اماں ابا کی پسند سے؟"

* "اپنی پسند سے کروں گی اور والدین کی پسند بھی اس میں شامل ہو گی۔ ان کی رضامندی بھی شامل ہو گی۔"

★ "ویلنٹائن ڈے مناتی ہیں؟"

* "بالکل مناتی ہوں اور اس کو کسی کے ساتھ منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دن سب کے ساتھ منانا چاہیے۔ اپنے والدین کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ اپنے نانا نانی، دادی دادا کے ساتھ..... اپنے دوستوں کے ساتھ صرف رومانٹک ڈے کے طور پر اسے نہ لیا جائے۔"

★ "آپ نے کہا کہ شادی اپنی پسند سے کریں گی، اگر آپ کی پسند والدین کو پسند نہ آئی تو؟"

* "تو نہیں کروں گی۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی پسند کی خاطر گھر سے بھاگ جاتی ہیں، مجھے میرے ماں باپ نے اجازت دی ہوئی ہے کہ میں اپنی پسند سے شادی کروں۔ لیکن میں اس بات کو ضروری سمجھتی ہوں کہ ان کی پسند بھی شامل ہو۔"

★ "غصے کی تیز ہیں یا نرم؟"

* "میں تھوڑی جذباتی لڑکی ہوں۔ سنجیدہ بھی ہوں غصہ آتا ہے تو بہت آتا ہے۔ جب خوش ہوتی ہوں تو چھلانگیں مارتی ہوں۔ اس لیے مجھے لگتا ہے کہ میں ایک جذباتی لڑکی ہوں..... حساس بھی بہت ہوں۔

میرے والد کی فیملی میں غصہ ہے تو مجھ میں بھی غصہ ہے..... اماں بتاتی ہیں کہ میں جب چھوٹی تھی تب ہی سے مجھ میں غصہ ہے..... غصے میں پاؤں پٹختی تھی۔ خیر اب ایسا نہیں ہے۔ اب کچھ کم ہو گیا ہے۔"

★ "کھانے پینے میں کیا پسند ہے؟"

✻ "کھانے پینے کے معاملے میں کافی موڈی ہوں۔ بھوک کے وقت تو جو مل جائے میں کھا لیتی ہوں۔ جب اماں ابا پوچھتے ہیں کہ آج کیا کھانا ہے تو میں بالکل بھی نہیں بتا پاتی کہ مجھے کیا کھانا ہے..... ویسے بھی میں کم ہی کھاتی ہوں۔"

★ "کھانے میں تو کنجوس ہیں..... پیسہ خرچ کرنے میں کیسی ہیں؟"

✻ "اپنے معاملے میں پیسہ خرچ کرنے میں کنجوس ہوں۔ لیکن والدین کے لیے یا دوسروں کے معاملے میں کنجوس نہیں ہوں۔"

★ "فیشن سے لگاؤ ہے؟"

✻ "فیشن کے معاملے میں میرا اپنا ایک اسٹائل ہے..... انڈیا میرا جانا ہوتا رہتا ہے تو وہیں سے میں اپنے ڈریسز لے آتی ہوں۔ یہاں کا جو فیشن ہے بڑے پاجاموں کا اور لمبی قمیصوں کا وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ مجھے ڈانس کرنا ہوتا ہے تو میرے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔ بڑے پائنچوں والے پاجامے پہننا مشکل ہے۔ چوڑی دار پاجامہ اور لمبی قمیص مجھے بہت پسند ہے اور ساڑھی بہت پسند ہے۔"

★ "یعنی اپنی مرضی سے سب کچھ کرتی ہیں؟"

✻ "میرے والدین نے مجھے بہت آزادی دی ہے میرا اپنا ذہن ہے میں اس سے سوچ سکتی ہوں۔ ہم اپنی فیملی میں دوستوں کی طرح ہیں..... میں بہت جذباتی ہوں اور غلطیاں بھی کرتی ہوں..... تو پھر سب مجھے سمجھاتے ہیں کہ کیا غلط ہے کیا صحیح ہے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ سب کام اپنی مرضی سے ہی کرتی ہوں۔"

★ "آپ نے کچھ ٹیلی فلمز بھی کی ہیں؟"

✻ "جی ہاں ٹیلی فلمز میں بھی کام کیا ہے۔ جب میں بارہ یا چودہ سال کی تھی ——— "شالی" میں کام کیا جو چائلڈ میرج پہ تھا۔ "گڈی" جو چائلڈ ریپ پہ تھا۔ ہمیشہ بولڈ ایشو کے ڈراموں میں ہی مجھے بک کیا جاتا ہے۔ "بھوپال والی بیٹی" وہ بھی ریپ پہ تھا' آٹھ سال کی تھی تو شیما جی نے ایک میوزک ویڈیو پروڈیوس کیا تھا اور ڈائریکٹ بھی کیا تھا اس کا نام "شہزادی" تھا۔ تو اس طرح ٹیلی فلمز تو چلتی ہی رہتی ہیں۔"

★ "اور آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی؟"

✻ "بالکل کہنا چاہوں گی۔ ریشم اور نعمان اعجاز سینئر فنکار ہیں ان کے ساتھ کام کرنا مجھے بہت اچھا لگا اور ان کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ شوٹ سے پہلے ریہرسل کرتے تھے جیسا کہ گزرے زمانے میں ہوتا تھا۔ اب تو سب کو اتنی جلدی ہوتی ہے کہ کوئی کہتا ہے تم اپنی لائن یاد کرو میں اپنی کرتا ہوں۔ اس طرح کیمسٹری نہیں آتی..... تو ان دونوں کے ساتھ کام کر کے مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

اس کے علاوہ میں ڈائریکٹر فاروق رند کی شکر گزار ہوں کہ جن کی وجہ سے مجھے "ننجھا" کا مشکل رول نبھانے میں بہت آسانی ہوئی ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سوہائی سے اجازت چاہی۔

دو کا پہاڑہ

[illegible]

شاہین رشید

1 "آپ کے دو پسندیدہ نام؟"

☆ "مانک اور ایک اور نام جو آج کل مجھے بہت پسند آرہا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ جب میری بیٹی ہو تو میں اس کا نام رکھوں اور وہ نام "تارہ" ہے۔ میرا ایک بیٹا ہے جس کا نام "جانن" ہے۔"

2 "آپ کے دو لکی نمبر؟"

☆ "تین اور نو۔"

3 "دو تاریخی ادوار جن میں آپ جانا چاہتی ہیں؟"

☆ "بالکل جانا چاہوں گی ایک تو میں 60's کے دور میں جانا چاہوں گی اس زمانے کی جو فلمیں' میوزک' جو کپڑے ہیں وہ مجھے بہت پسند ہیں اور پرانی امریکن فلموں میں جو ہاؤس وائف دکھائی جاتی تھیں جو بڑا سا

اپرین پہن کر کچن میں مصروف ہیں اس دور کی جو ویلیوز ہیں مجھے بہت پسند ہیں اور میں ان ادوار میں صرف دو دن کے لیے ہی جانا چاہوں گی ہمیشہ کے لیے نہیں۔"

4 "کن دو افراد کے SMS کے جواب آپ فوراً دیتی ہیں؟"

☆ "اپنے میاں کے اور بیٹے کے۔"

5 "کوئی دو بری عادتیں جو آپ چھوڑنا چاہتی ہیں؟"

☆ "اگر میرے پاس کچھ کرنے کو نہ ہو تو بہت جلدی ڈیپریسڈ ہو جاتی ہوں اور کوئی کام پلان کر کے نہیں کرتی اور میں کھانا پکانے سے ڈرتی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کھانا اچھا نہ بنے۔"

6 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتی ہیں؟"

☆ "ایک تو یہ کہ جب کوئی شادی پہ بلاتا ہے تو میں کہہ دیتی ہوں کہ میں تو شوٹ پہ ہوں گی اور یہ کہ میں تمہیں ابھی کال کرتی ہوں۔"

7 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر آپ کو غصہ آجاتا ہے؟"

☆ "میرے میاں جب مجھے کہتے ہیں کہ تمہارا فوراً جذباتی ہونا مجھے اچھا نہیں لگتا اور کوئی کہے کہ آپ کچھ زیادہ ہی حساس ہیں۔"

8 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو سفارش سے آئے ہیں آپ کے خیال میں؟"

☆ "ارے ایسے سوال نہ پوچھیں کوئی بھی سفارش سے نہیں آیا بلکہ سب اپنے ٹیلنٹ سے آئے ہیں۔ اپنے شوق سے آئے ہیں لیکن کاش اس شوق کے ساتھ ان کی تعلیم بھی زیادہ ہوتی اور تھوڑے مخلص ہوتے۔"

9 "مارننگ شو کے دو بہترین اینکر آپ کی نظر میں؟"

☆ "سویرا ندیم اور فیصل قریشی اور ان کی ساتھی عائشہ بھی بہت اچھی ہیں۔"

10 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتی ہیں؟"

☆ "اپنے میاں صاحب پر کچھ معاملات میں آنکھ بند کر کے بھروسہ کر سکتی ہوں اور ایک بچپن کی دوست ہے جو اب سری لنکا میں رہتی ہے امبر اس کا نام ہے۔ ہر بات میں اس سے مشورہ لینا میں بہت ضروری سمجھتی ہوں۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتی ہیں؟"

☆ "خاتون رائٹر لاری مور Lorrie moore اور ایک ایسی شخصیت کے ساتھ گھومنا چاہتی ہوں جو کھانے کے شوقین ہوں تاکہ میں بھی انجوائے کر سکوں۔ تو ایسی شخصیت سرد کھوسٹ ہیں جو نا صرف کھانے کے شوقین ہیں بلکہ انہیں بہت اچھا کھانا پکانا بھی آتا ہے۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر رشک آتا ہے؟"

☆ "میں چونکہ ایک فنکارہ ہوں تو مجھے ان لوگوں پر زیادہ رشک آئے گا جو اداکاری میں بہت آگے ہیں۔ ایک تو شاہ رخ خان ہیں اگر اداکاری سے ہٹ کر دیکھیں تو آصف علی زرداری ہیں۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتی ہیں؟"

☆ "عیدالفطر اور کرسمس بھی اہتمام سے مناتے ہیں۔ کیونکہ جب ہم لندن میں تھے تو آس پاس کے سارے لوگ کرسمس مناتے تھے اور یہاں کے کرسچن لوگوں سے اچھے تعلقات ہیں تو اس لیے بھی ــــ اور وہ بھی ہمارے تہوار پر ہمیں مبارک باد دیتے ہیں۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "صبح صبح کا وقت اور سہ پہر جس کو ہم عصر کا وقت بھی کہتے ہیں، بہت اچھے لگتے ہیں۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتی ہیں؟"

☆ "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر اور پڑھائی کے بارے میں پوچھوں گی مطلب جس عمر کا بندہ یا بندی سامنے ہوگی اسی حساب سے کچھ بولوں گی۔"

16 "دو کھانے جن کو کھا کر آپ کبھی بور نہیں

ہوتیں؟"

☆ "پائے، نہاری، چائنیز۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتیں؟"

☆ "اپنی امی سے اور اگر گھر میں کسی ملازم کو ڈانٹ دوں تو پھر اس سے سوری ضرور کرتی ہوں۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ دیکھتی ہیں؟"

☆ "میں بالکل بھی کرکٹ نہیں دیکھتی ــــ مجھے بہت مشکل لگتی ہے۔"

19 "دو خواہشات جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں؟"

☆ "بہت سے ایسے کردار ہیں جن کو میں کرنا چاہتی ہوں۔ جیسے "صاحب بی بی غلام" میں مینا کماری کا جو رول ہے وہ کرنا چاہوں گی اور سائیکل چلانا چاہتی ہوں۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتیں؟"

☆ "میرے ساتھ تو بڑے سین ہوتے رہتے ہیں ــــ کیونکہ میں گھر سے اتنی عجلت میں نکلتی ہوں کہ ضروری چیزیں گھر بھول جاتی ہوں اور اکثر لوگ میرے پیچھے آرہے ہوتے ہیں کہ جی آپ بیگ لے جانا بھول گئی ہیں۔ آپ گلاسز لے جانا بھول گئی ہیں۔ تو میں تو ضروری چیزیں لے جانا ہی بھول جاتی ہوں۔"

21 "دو الفاظ جو آپ بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"

☆ "اوکے ــــ Realy اور ایک مزے کا لفظ اور بھی ہے اوئیم یہ بھی بہت بولتی ہوں۔"

22 "سات دنوں میں کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "پیر کا دن اور جمعرات کا دن کیونکہ آدھا ویک گزر چکا ہوتا ہے۔"

23 "بارہ مہینوں میں سے کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "اپریل اس لیے کہ بہار کا مہینہ ہوتا ہے اور سردی کا مہینہ جیسے فروری اور فروری میں میرا بیٹا پیدا ہوا تھا اس لیے بھی پسند ہے۔"

24 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"

☆ "ہمارا ایک صوفہ ہے جس پہ ہم تینوں اکثر ایک ساتھ پائے جاتے ہیں اور باغ میں کرسی ڈال کر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔"

25 "گھر کے دو کام جو آپ کو پسند نہیں؟"

☆ "ڈسٹنگ کرنا تو مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے اور الماری صاف کرنا بھی پسند نہیں ہے۔"

26 "دو ایسی شخصیات جن پر آپ کسی قسم کا بھی شک نہیں کر سکتیں؟"

☆ "میں بہت شکی مزاج ہوں تو ہر بندے پر میں کسی نہ کسی ٹائم شک کرتی ہوں۔ تو یہ سوال مجھ پر سوٹ نہیں کرتا۔"

27 "دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"

☆ "میں تو سیاست کو بالکل بھی نہیں سمجھتی۔ مگر پھر بھی یہ کہوں گی کہ ہمارے سیاست دانوں کو جو کرنا چاہیے وہ کر نہیں رہے۔"

28 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"

☆ "ایران۔"

29 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"

☆ "میرون اور پیلا اور میں ہمیشہ اس تلاش میں رہتی ہوں کہ مجھے صحیح والا بلیو مل جائے مگر ملتا نہیں ہے۔"

30 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"

☆ "ساہیوال' کراچی۔"

31 "اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو آپ کیا دو چیزیں لینا پسند کریں گی؟"

☆ "نتھیا گلی کا موسم اور سری لنکا کا سمندر۔"

32 "لڑکوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟"

☆ "اپنی ماؤں سے بہت کلوز ہونا چاہیے۔ ان کا خیال رکھا کریں اور لڑکیاں کوئی بات آپ سے کر رہی ہوں تو ان کی باتوں کو غور سے سنا کریں کیونکہ اس میں آپ کے لیے کوئی نہ کوئی نصیحت ضرور ہوتی ہے۔"

33 "سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟"

☆ "گرمی پسند ہے بشرطیکہ ہوا میں بہت زیادہ نمی نہ ہو اور سردی کا موسم بھی بہت پسند ہے کیونکہ اس موسم میں دن کافی چھوٹے ہوتے ہیں اور مجھے چھوٹے دن اچھے لگتے ہیں۔"

34 "لڑکوں کی دو ناپسندیدہ عادتیں؟"

☆ "ایک تو یہ کہ ٹوتھ پیسٹ کا ڈھکن بند نہیں کرتے اور ان کو تکلف کرنا نہیں آتا۔ تھوڑی ڈپلومیسی سے کام لینا چاہیے ان کو۔"

35 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتی ہیں؟"

☆ "جب تک ایک کپ چائے اور ایک آدھ بسکٹ نہ ہو میں اٹھ نہیں سکتی اور میرے دو چھوٹے چھوٹے کتے ہیں جو میرے انتظار میں ہوتے ہیں ان سے اٹھ کر بات کرتی ہوں۔"

36 "دو مرد جنھوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"

☆ "میرے والد صاحب اور میرے میاں صاحب۔"

37 "آپ کے نزدیک دنیا کے دو خوب صورت ترین مرد؟"

☆ "میرے میاں صاحب اور میرا بیٹا۔"

38 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"

☆ "فارمنگ کاشتکاری کا پروفیشن اور میڈیکل میں جو جانوروں کے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔"

39 "دو چیزیں جن پر آپ بہت خرچ کرتی ہیں؟"

☆ "کھانے پینے کی چیزوں پر' مجھے کھانے پکانے کی کتابیں پڑھنے اور چیزیں خریدنے کا بہت شوق ہے۔ برتن خریدنے کا بھی شوق ہے۔"

40 "والدین کی دو نصیحتیں جو آپ نے گرہ سے باندھ لی ہوں؟"

☆ "نصیحتوں سے زیادہ میں نے ان سے جو سیکھا ہے اور جس کو میں فالو کرنے کی کوشش کرتی ہوں اس میں ایک تو ان کی انکساری ہے اور دوسری چیزوں کی ویلیو ہے یعنی کوئی چیز ضائع نہیں کرنی جیسے لوگ کھانا ضائع کرتے ہیں یا کچھ چیزوں کو فالتو سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ تو میں ایسا نہیں کرتی۔"

41 "اپنے دو ڈرامے جو آپ کو بہت پسند ہیں؟"

☆ "دام اور ایک نظر میری طرف۔"

42 "دو قیمتی چیزیں جو آپ خریدنا چاہتی ہیں؟"

☆ "مجھے قیمتی چیزوں کا کریز نہیں ہے۔ مجھے تو کوئی چیز پسند بھی آجائے تو میں اسے بھی خریدنے میں بہت سوچ بچار کرتی ہوں۔"

43 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

☆ "نہیں میرا نہیں خیال کہ میں نے کوئی ایسا فیصلہ کیا ہے۔"

44 "کن دو باتوں سے آپ پرہیز کرتی ہیں؟"

☆ "کسی کا دل دکھانے سے اور کسی کے بارے میں غلط سوچنے سے۔ کیونکہ چاہے دوسرے کو پتا ہو یا نہ ہو خود کو بھی اچھا نہیں لگتا کہ دوسروں کے بارے میں برا سوچیں۔"

45 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سے دو وقت کی نمازیں پڑھتی ہیں؟"

☆ "میں کوشش کرتی ہوں کہ دو' تین نمازیں تو لازمی پڑھوں تو عصر اور مغرب کی ضرور پڑھتی ہوں اور رمضان المبارک میں تو پوری پڑھتی ہوں۔"

46 "بیرون ملک شاپنگ میں کیا دو چیزیں لازمی خریدتی ہیں؟"

☆ "کھانے کی چیزیں جو پاکستان میں اچھی کوالٹی کی نہیں ملتیں اور میرے سیکنڈ ہینڈ چیزیں بھی ضرور لیتی ہوں۔"

47 "کن دو افراد کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "امی کے غصے سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے اور بیٹے کے غصے سے بھی ڈر لگتا ہے۔"

48 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتیں؟"

☆ "کسی کی بھی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیتی۔"

49 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔"

☆ "انار کا جوس اور چائے۔"

50 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

☆ "عابدہ پروین اور نور جہاں۔"

51 "شادی کی دو رسمیں جو آپ انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "نکاح کیونکہ نکاح کے وقت جو ایک سادگی اور خاموشی ہوتی ہے وہ بہت پسند ہے اور ابٹن کی رسم۔"

52 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کردیتی ہیں؟"

☆ "اگر میاں صاحب دیر سے آئیں تو اور جب شوٹنگ کے وقت لوگ دیر سے آئیں یا لاپروائی دکھائیں تب۔"

53 "افسردگی کے وقت کن دو لوگوں کے ساتھ آنسو بہانے کو دل چاہتا ہے؟"

☆ "میری بہن بسمہ اور ثنا۔"

54 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟"

☆ "کہ میں کہیں موٹی تو نہیں لگ رہی اور دوسرے یہ کہ میں لمبی لگوں۔"

55 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "کوئی فرق نہیں پڑتا کوئی بھی ہو جائے۔ ویسے اب اتنا انجوائے نہیں کرتی جتنا کبھی کیا کرتی تھی۔"

56 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں کوئی خاص نہیں۔"

57 "کن دو ریسٹورنٹ میں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟"

☆ "بیچ لگژری اور برنس روڈ پہ۔"

58 "ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتی ہیں؟"

☆ "گلف اور پارک ٹاور۔"

59 "دو چینل جو شوق سے دیکھتی ہیں؟"

☆ "مووی چینل HBO اور باقی سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں ویسے کارٹون نیٹ ورک۔"

60 "دو تبدیلیاں جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتی ہیں؟"

☆ "بہت پتلی ہونا چاہتی ہوں اور بہت پریکٹیکل ہونا چاہتی ہوں۔"

61 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

☆ "دہی اور اچار۔"

62 "کوئی دو شخصیات جن کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

☆ قہقہہ "کسی فلم میکر کو اور جب تک ان سے اچھے رول کے لیے سائن نہیں کروالوں چھوڑوں گی نہیں۔ پیٹر والمو دودار' یہ بھی فلم میکر ہیں۔"

☆ ☆

ثمینہ پیرزادہ

نازیہ کنول نازی

قارئین! آپ کی فرمائش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس ماہ ہم آپ کی ملاقات ٹیلی وژن کی ورسٹائل کہنہ مشق فنکارہ، ثمینہ پیرزادہ سے کروا رہے ہیں، اسی سلسلے میں ہمارے اگلے مہمان، پاکستان ٹیلی وژن کے خوب صورت فنکار "احسن خان" ہوں گے آپ اپنے سوالات بروقت ارسال فرما کر اس خوب صورت سلسلہ کا حصہ بن سکتی ہیں۔

ثمینہ پیرزادہ ...نا صرف بہت اچھی کامیاب فنکارہ ہیں۔ بلکہ ... محب وطن پاکستانی بھی ہیں۔ ثمینہ سے اس سلسلے کے لیے ہماری نشست بہت طویل رہی اور اس گفتگو میں ہم نے ان کے بارے میں بہت کچھ جانا۔ جو قارئین کی نذر ہے۔ (کچھ مرد حضرات کے سوالات بھی موصول ہوئے مگر بوجہ مجبوری وہ سلسلہ کا حصہ نہیں بن سکے۔ معذرت۔)

○ "السلام علیکم ثمینہ، کیسی ہیں آپ؟"

☆ "جی وعلیکم السلام... میں ٹھیک ہوں۔"

○ ہمارا سلسلہ ہے "قارئین کی عدالت" اور اس سلسلے میں آپ کے لیے ہمیں بہت زیادہ سوال موصول ہوئے ہیں۔ شروع کریں؟"

☆ "جی جی ضرور..."

ثمینہ آپ کے لیے یہ سب سے پہلا سوال ہمارے پاس آیا ہے ننکانہ صاحب سے صدف آرزو کا اور یہی سوال ڈیرہ غازی خان سے رانیہ خان نے ہمیں بھجوایا ہے۔ پوچھتی ہیں۔

○ "آپ ٹیلی وژن اسکرین پر ہر ڈرامہ میں ہمیشہ سے خوب صورت دکھتی ہیں۔ کیا عام زندگی میں بھی اتنی ہی خوب صورت ہیں؟"

☆ کھلکھلاتے ہوئے "دیکھیں عام زندگی میں ہوں تو نظر آتی ہوں نا، اصل میں اسکرین جو ہے وہ آپ کا آئینہ ہے اگر آپ حقیقی زندگی میں ویسے نہیں ہیں جیسے اسکرین پر نظر آتے ہیں تو بہت زیادہ دیر تک تو آپ جھوٹ نہیں بول سکتے۔"

ہمارے پاس یہ سوال ہے فرح احمد کا میر پور آزاد کشمیر سے پوچھتی ہیں۔

○ "آپ ساڑھی زیادہ زیب تن کرتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟"

☆ "اصل میں ضیاء الحق کے دور میں ہمیں ساڑھی باندھنے کی اجازت نہیں تھی۔ آپ دیکھیں ہر انسان کا بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارے، کسے کیسے کپڑے پہننے ہیں؟ کیسے جینا ہے، یہ اس پر ڈی پینڈ کرتا ہے۔ آپ یہاں اس ملک میں عورت کی آزادی کی بات کرتے ہیں مگر یہ کیسی آزادی ہے جس میں عورت کو اپنی مرضی کا لباس پہننے کی اجازت نہ ہو۔ جب تک کسی عورت کو اس کے جسم کی اونرشپ نہیں ملے گی، آپ عورت کی آزادی کی بات کر ہی نہیں سکتے۔

تو وہ لباس جو مجھے پہننا پسند ہیں اس کا بیک گراؤنڈ ہی یہی ہے کہ میں اپنا ڈیفائن کروں، آپ کو دکھاؤں کہ ساڑھی کتنا گریس فل لباس ہے تو اس وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ میں سر پر ڈوپٹہ نہیں اوڑھوں گی اور ساڑھی پہنوں گی۔ مجھ پر کسی شاہی نظام کی طرف سے پریشر نہیں ہونا چاہیے کہ میں فلاں لباس پہنوں یا اتنے بچے پیدا کروں۔ یہ عورت کا حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے شخص سے شادی کرے، اپنی مرضی کا لباس پہنے اور اپنی مرضی کے بچے پیدا کرے۔ اس سے یہ حق کوئی چھین نہیں سکتا جب تک یہ نہیں ہو گا آپ ڈیموکریسی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔"

اوکاڑہ سے بشریٰ نوید باجوہ اور واہ چک سے صائمہ یوسف راجہ کا مشترکہ سوال ہے۔

○ "آپ ایک مخصوص چینل کے لیے زیادہ کام کرتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟"

☆ "ایسا نہیں ہے، اصل میں وہ اسکرپٹ بہت اچھے بھیجتے ہیں۔ تو سارا دارومدار تو اس بات پر ہے کہ آپ کو کردار کون زیادہ اچھا دے رہا ہے۔ "جنت سے نکالی ہوئی عورت" ہمایوں کی پروڈکشن ہے ایک میرا پلے اے آر وائی پر بھی چل رہا ہے۔ بلکہ دو پلے ہیں ایک "کچھ خواب تھے میرے" اور "کافر" "درشہوار" اس کا اسکرپٹ بھی بہت اچھا ہے۔ ان کی ایک اور پروڈکشن کر رہی ہوں "سمجھوتہ ایکسپریس" اور سلطانہ صدیقی صاحبہ بھی مستقبل میں ایک سیریل ڈائریکٹ کرنے والی ہیں اس میں بھی میں ہوں تو بات ساری یہ ہے کہ ان کے پاس اسکرپٹ بہت عمدہ ہیں۔

نعمان مسعود نے میرے لیے ایک بہت اچھا اسکرپٹ لکھوایا ہے "آران لائن" کمپنی کے تحت تو یہ سارے وہ لوگ ہیں یہ میرے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ پھر میں خود بھی ان کے ساتھ بہت کمفو ٹیبل محسوس کرتی ہوں۔ بابر جاوید کے ساتھ میں نے "میری ذات ذرہ بے نشاں" سیون اسٹار کے تحت ہی کیا ہے۔ مستقبل میں بھی میں بابر کے ساتھ مزید کام کروں گی ان شاء اللہ تو زیادہ اہم بات میرے لیے یہ ہے کہ اسکرپٹ کیسا ہے اور کام کون اچھا دے رہا ہے۔"

شہزادی عباس لاہور سے اور عائشہ ملک وہاڑی سے پوچھتی ہیں۔

○ "نور پور کی رانی" میں آپ کا کردار ہمیں بہت اچھا لگا۔ کیا آپ نے خود اس کردار کو انجوائے کیا؟"

☆ "بہت انجوائے کیا، لیکن بہت مشکل کردار تھا، سارا دن سیدھی کمر کے ساتھ میں کھڑی رہتی تھی، کہیں نہیں جاتی تھی، لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں میتھڈ ایکٹر ہوں۔ اور شاید میں ہوں بھی کیونکہ جب میں کوئی کردار کر رہی ہوتی ہوں تو اس کو خود پر طاری کر لیتی ہوں چاہے وہ جتنی دیر بھی چلے میں اس موڈ سے نکلتی نہیں ہوں، جیسے کہ دوسرے اسٹارز کرتے ہیں۔ تو وہ

ایک بہت تھکا دینے والا کردار تھا۔ مگر یہ ہے کہ "مٹھی بھر مٹی"

——"نور پور کی رانی" اور اب "داستان" اور "در شہوار" کر کے آ رہی ہوں تو بہت مزا آتا ہے مجھے کام کر کے یا سرنواز کے ساتھ مجھے "جنت سے نکالی ہوئی عورت" کر کے بھی بہت مزا آیا۔"

ثمینہ ہمارے پاس یہ سوال ہے حمیرا عرفان کا کوٹ رادھا کشن سے "یہی سوال حاصل پور سے شازیہ الطاف تغلق نے ہمیں ارسال کیا اور یہی سوال بہاول پور سے اریبہ شاہ کا ہے پوچھتی ہیں۔

○ "آپ کے شوہر عثمان پیرزادہ نے ایک پلے میں آپ کو طلاق دی تھی جس پر علماء نے فتویٰ دیا کہ طلاق ہو چکی ہے کیا احساسات تھے۔ اس وقت آپ کے؟"

☆ "مجھے اس وقت بہت افسوس ہوا تھا کہ ہم نے اپنے مذہب کو کتنا معمولی لیا ہوا ہے ہمیں پہلے اپنے مذہب کو سمجھنا چاہیے یوں ایک دم سے تین بار طلاق کہہ دینے سے طلاق نہیں ہو جاتی اگر 90 دن کے اندر آپ نے ایک دوسرے سے رجوع نہیں کیا تو طلاق ہو گی۔ میں سمجھتی ہوں جیسے نکاح کے وقت ایک وکیل مقرر ہوتا ہے۔ گواہ بھی ہوتے ہیں تو طلاق کے وقت بھی ایسا کچھ ہونا چاہیے۔ لوگوں میں شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن شریف میں ہے کہ جب تم عورت کو طلاق دے دو تو اسے خالی ہاتھ اپنے گھر سے مت نکالو تو اسلام لوگوں کی زندگی میں بہتری لانے کے لیے آیا ہے' مشکلات پیدا کرنے کے لیے نہیں آیا! میں سمجھتی ہوں مفکرین کو' علما کو بیٹھ کر سوچنے کی ضرورت ہے۔"

گجرات سے حفصہ سعید' سمندری سے ابابیل اور میرپور آزاد کشمیر سے اریبہ ماروی کا سوال ہے۔

○ "عثمان پیرزادہ سے آپ کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟"

☆ "عثمان سے میری پہلی ملاقات بہت پہلے ہوئی تھی۔ سن 73ء تھا' جب میں چکوال میں اپنی ایک کزن کو چھوڑنے گئی تھی۔"

انہی بہنوں کا آپ سے دوسرا سوال ہے۔

○ "آپ نرم مزاج' محبت کرنے والی خاتون ہیں جبکہ عثمان صاحب کافی سخت مزاج ہیں' دونوں میں اگر جھگڑا ہو جائے تو صلح میں پہل کون کرتا ہے؟"

☆ کھلکھلاتے ہوئے "میں ہی کرتی ہوں' کیونکہ کوئی بات اگر مجھے ڈسٹرب بھی کرے تو میں اسے بھول جاتی ہوں۔ عثمان کی عادت ہے کہ وہ اکثر ناراض ہو جاتے ہیں' مجھے ویسے رویے بہت متاثر کرتے ہیں اور بہت تکلیف بھی دیتے ہیں' عثمان کو اب یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ انہیں تھوڑا جینٹل ہونا ہے اب تو وہ بہت نرمی سے بات کرتے ہیں' اہم چیز جو ہمارے تعلق میں ہے وہ ہماری دوستی ہے۔ ہم دونوں نے بہت لمبا سفر کیا ہے ایک دوسرے کے ساتھ تو اب ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے ہیں اسی لیے ہماری زندگی بہت مزے کی ہے۔"

چشتیاں شریف سے آپ کی بہت بڑی فین ہیں ساجدہ جاوید ان کا سوال ہے۔

○ "آپ نے عثمان پیرزادہ کے ساتھ ایک کامیاب' خوشگوار زندگی بسر کی' اس کامیابی میں کس کی کوشش کا زیادہ ہاتھ رہا؟"

☆ "ہم دونوں ایک ہی فیلڈ سے وابستہ ہیں اور ہم دونوں کے خواب ایک جیسے ہیں' جنہیں ہم دونوں ہی پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں' ہم دونوں کی یہ خواہش ہے کہ یہ ملک بہتر ہو جائے یہاں لوگوں کو ان کے حقوق ملیں' جب آپ کے خواب ایک ہوں اور آپ انہیں پورا کرنے میں جتے ہوئے ہوں تو پھر زندگی بہت خوب صورت ہو جاتی ہے۔ میاں بیوی کا جو تعلق ہے اس میں ایک بندے کی قربانی سے کچھ نہیں ہو سکتا' دونوں ایک دوسرے کی عزت کریں' ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلیں' مل کر محنت کریں' گھر بنائیں' تبھی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے۔"

سیالکوٹ سے ام امید کو آپ بہت اچھی لگتی ہیں

خاص طور آپ کی آنکھیں انہیں بہت پسند ہیں۔ چنیوٹ سے اقصیٰ شاہد کو آپ کی آواز بہت پسند ہے، اٹک سے ثروت رشید گل اور ساہیوال سے نرجس رانی نے آپ کی ایکٹنگ کو بہت سراہا ہے انہی کا آپ سے سوال ہے۔

○ "پانی جیسا پیار" میں آپ نے مثالی ساس کا کردار ادا کیا کیا حقیقت میں بھی ایسی ہی ساس ثابت ہوں گی؟"

☆ مسکراتے ہوئے "میری دو بیٹیاں ہیں تو میں دو داماد گھر لاؤں گی ان شاء اللہ اگر بیٹے ہوتے اور میں بہو لے کر آتی تو پھر یقیناً" اسے بیٹی بنا کر ہی رکھتی، میرے نزدیک سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو بچی آگے آپ کی نسل چلائے گی، آپ اس کے ساتھ کچھ بھی برا کرنے کا کیسے سوچ سکتے ہیں۔ ساس اور بہو کا تعلق میرے نزدیک ماں اور بیٹی سے بھی بڑا ہوتا ہے تو اس کو چھوٹا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ رشتے ہمیشہ پیار سے چلتے ہیں نفرت سے نہیں۔"

چک جھیتو بہاول سے نسیم ارشد، بہاول نگر سے ہی ہماری قاری بہن پروین افضل شاہین، دونوں نے آپ کی اداکاری کو سراہا ہے، بھلوال سے ہماری بہن شگفتہ خان کا سوال ہے۔

○ "آپ طویل عرصہ سے شوبز سے وابستہ ہیں، آپ نے بے شمار کردار کیے، پھر بھی کوئی ایسا کردار جو ادا کرنے کی خواہش ہو؟"

☆ "ایک بار میں ایدھی سینٹر گئی تھی۔ وہاں میں ایک بچی سے ملی جو کہ گونگی تھی، آپ حیران ہوں گی کہ اس کے ساتھ میں نے اتنی باتیں کیں اور مجھے اس کی ہر بات سمجھ آ رہی تھی۔ اسے اشاروں کی زبان نہیں آتی تھی۔ صرف اس کے تاثرات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے جب اس بچی کو دیکھا تو مجھے لگا یہ طاقت ہوتی ہے ایکسپریس کرنے کی، ہم نے اتنی دیر باتیں کیں، سب کچھ ڈسکس کیا، صرف تاثرات سے اس نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ کہاں سے آئی ہے، تو میری یہ خواہش ہے کہ ایک ایسی عورت کا کردار کروں جس کے پاس سوائے experation کے اور کچھ نہ ہو اپنی بات بیان کرنے کے لیے۔ ویسے گونگی کا کردار میں نے کیا ہے "زرد دوپہر" میں مگر اس بچی کا جو ایکسپریشن تھا وہ کرنے کا میرا دل کرتا ہے۔"

ہری پوری سے عالیہ راجہ، آکسفورڈ سے صائمہ قریشی اور سیالکوٹ سے طیبہ سعدیہ بہن نے آپ کی شخصیت اور اداکاری کو سراہا ہے، جام پور سے مشیع مسکان اور ہارون آباد سے مشحون علی، رحیم یار خان سے ساس گل نے سوال کیا۔

○ "آپ کی فلم اور ڈرامے کے کردار بہت بولڈ ہوتے ہیں ایسا کیوں ہے؟"

☆ "وہ بولڈ اس لیے ہوتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں جو بھی مشکلات ہیں، مسائل ہیں ان کی عکاسی کرنی ضروری ہے، اب ڈھکی چھپی چیزوں میں حقائق کو بیان کرنے کا وقت نہیں ہے۔ کہ ہر چیز اٹھائی اور کارپٹ کے نیچے پھینک دی۔ اب بات کرنی پڑے گی اگر آپ کھل کر بات نہیں کریں گے تو تہہ جمتی جائے گی۔ اگر ہمیں انسانی رویوں سے تکلیف ہو رہی ہے تو اسے کیوں نہ بیان کیا جائے۔ جیسے "انتہا" میں کام ہوا، یا پھر "خدا کے لیے" میں ہوا "بول" میں ہوا تو یہ سب بہت ضروری ہے کرنا۔"

جلال پور پیروالا سے طاہرہ ملک اور راولپنڈی سے سمیرا اسلام آپ کا ہر ڈرامہ بہت شوق سے دیکھتی ہیں ان کا آپ سے سوال ہے

○ "آپ نے طویل عرصہ اداکاری کی ہے بے شمار کردار بھی کیے کسی فلم یا ڈرامہ کا کوئی ایسا کردار جسے شوٹ کرتے ہوئے کہیں کسی اور ہی دنیا میں چلی گئی ہوں؟"

☆ "سارے ہی کرداروں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ میں انہیں شوٹ کرتے ہوئے کہیں اور ہی چلی جاتی ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جب میں "میری ذات

ذرہ بے نشاں" کا وہ سین کر رہی تھی جس میں وہ کہتی ہے کہ "میں دوزخ میں جل رہی ہوں مجھے دوزخ کی آگ نظر آ رہی ہے" اسے شوٹ کرتے ہوئے میں کہیں اور ہی چلی گئی تھی۔ پھر "زرد دوپہر" میرا ایک سیریل تھا اس کے بھی کچھ سین ایسے تھے جو مجھے کہیں اور ہی لے جاتے تھے۔ اسی طرح "کرب" میں میرا جو کردار تھا، میرے سارے ہی کردار مجھے کہیں لے جاتے ہیں۔"

باغ آزاد کشمیر سے ارم گل مہو کاؤن بدر مرجان سے نوشین اقبال نوشی اور اسلام آباد سے سمیرا مشتاق کا آپ سے مشترکہ سوال ہے۔

○ "بازار حسن میں" آپ کا کردار بہت خوب صورت تھا، کبھی دوبارہ ایسی ہی کسی فلم میں کام کرنے کا خیال آیا؟"

☆ "بازار حسن میں" میں ابھی نئی نئی آئی تھی اس لیے بہت سی باتوں کی سمجھ نہیں تھی اس وقت مگر میرا دل کرتا ہے کہ میں ایک اور فلم بناؤں اور اسے خود ڈائریکٹ کروں۔"

گنگا پور سے مہوش ملک نے دو سوال کیے ہیں، پہلا سوال یہ ہے۔

○ "اداکاری کے ساتھ ساتھ ڈائریکشن کا تجربہ کیسا رہا؟"

☆ "تجربہ تھوڑا مشکل تھا کیونکہ میں ہمیشہ بہت خاص طریقے سے کام کرنا چاہتی ہوں۔ بہت ڈسپلن کے ساتھ لوگوں کو سمجھا کے، ٹرینڈ کر کے، ایک مخصوص ماحول بنا کے، مگر یہاں ایسا نہیں ہے، میرے لیے خاصا مشکل تجربہ تھا کیونکہ آپ جو ایک مخصوص گروپ بناتے ہیں اسے اگر توڑ دیا جائے تو پھر مشکل ہو جاتی ہے جیسے "انتہا" کے بعد میں امجد بوبی کے ساتھ مزید کام نہیں کر سکی۔ اسی طرح برقی صاحب کے ساتھ میرا زیادہ کام نہیں ہو سکا، میری ٹیم کو توڑ دیا گیا تو ایک بہت مشکل وقت تھا جو میں نے دیکھا مگر ان شاء اللہ اچھا وقت آئے گا اور نوجوان ڈائریکٹر بہتر کام کریں گے، یاسر نواز، سرمد کھوسٹ، مرزا خالد، یا پھر یہ سب جب فلم بنائیں گے تو آپ خود دیکھیے گا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے بہت امید ہے۔"

مہوش ملک کا آپ سے دوسرا سوال ہے، یہی سوال زاہدہ ملک کا دیپال پور سے ہے۔

○ "آپ کا سب سے پہلا سیریل کون سا تھا؟"

☆ "میرا سب سے پہلا سیریل "جانے دو" تھا۔ اس سے پہلے میں نے چار انڈی ویجول ڈرامے کیے تھے۔ جن میں دو بہت شارٹ تھے اور دو بہت طویل مگر پہلا سیریل "جانے دو" تھا جس میں بہروز سبزواری اور زیدی صاحب میرے ساتھ تھے۔"

ناروے سے بہن نوشین ابرار نوشی کا سوال ہے۔

○ "ٹیلی وژن کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں؟"

☆ "ٹیلی وژن کے علاوہ مجھے پڑھنے اور کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ اگر آپ مجھے زیور یا کپڑوں کی شاپنگ کے لیے کہیں تو یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ پہلے کے لوگ کتاب دوست تھے پتا نہیں اب وہ لوگ کہاں چلے گئے۔"

کوٹ رادھا کشن سے فرح نذیر چوہدری اور کہروڑ پکا سے سدرہ اسلم آپ کی بہت بڑی فین ہیں۔ سیالکوٹ سے ام امید کا بہت خوب صورت سوال آپ کے لیے۔

○ "کسی سیٹ پر سین شوٹ کرواتے ہوئے کوئی دلچسپ واقعہ جو آپ کو ہمیشہ یاد رہتا ہو؟"

☆ مسکراتے ہوئے "عثمان جب پہلی فلم شوٹ کر رہے تھے "نزدیکیاں" تو اس میں ایک سین تھا جس میں، میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے آتی ہوں اور میرے والد میرا انتظار کر رہے ہیں اس سین میں، میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے زبردست شارٹ دے رہی تھی مگر جس پوائنٹ پر میں نے گھوڑے کو روکنا تھا وہ وہاں پر رکا ہی نہیں اور سرپٹ بھاگتا چلا گیا۔ سب تالیاں بجا رہے تھے کہ واہ کیا شارٹ دیا ہے میں نے اب جہاں گھوڑا رکا وہاں سڑک ٹوٹی ہوئی تھی اور نیچے گہری کھائی تھی۔ یہ دریائے راوی کے کنارے پر شوٹ کر رہے تھے ہم، خدا کا شکر ہے کہ وہاں ملتان روڈ پر آکر گھوڑا رک گیا، میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی اگر کرتی تو ضرور وہ مجھے نیچے گرا دیتا۔ تو یہ بہت مزے کا سین تھا۔ اللہ جنت نصیب کرے آغا طالش صاحب کو، وہ وہاں تھے انہوں نے عثمان کو کہا کہ گھوڑا نکل گیا ہے بھاگو بیوی کے پیچھے تو پھر وہ سارے میرے پیچھے بھاگے۔ یہ شارٹ میں نے بہت زبردست دے دیا تھا مگر شکر ہے کہ بچ گئی۔"

کراچی سے کرن وفا اور زینب فاروق آپ کی فین ہیں "میری ذات ذرہ بے نشاں" کو بہت پسند کیا ہے انہوں نے، گجرات سے فوزیہ ثمروٹ کا سوال ہے۔

○ "بچپن کیسا گزرا؟"

☆ "بہت خوب صورت! سب سے اہم چیز جو میری یادداشت میں ہے وہ یہ کہ ہمارے والد صاحب ہمیں پکنک پر ضرور لے کر جاتے تھے۔ ہم تین بہنیں ہیں اور ہمارا ایک بھائی ہے۔ میں دوسرے نمبر پر ہوں ہمارے گھر میں ہم سارے بچے مل کر ڈرامہ کھیلتے تھے۔ ہمارے گیراج میں پیچھے ایک جگہ تھی وہاں پر ہم سب بیٹھ کر کہانیاں سوچتے تھے اور ڈرامے کرتے تھے۔ میرے بعد والی جو بہن ہیں وہ ڈائریکٹر بنتی تھی اور سب کو ڈائریکٹ کرتی تھی۔ سب گاتے بھی تھے اور ہمارے والدین ہمیں شاباش دیتے تھے۔ بہت خوب صورت تھا بچپن۔"

قصور سے چندہ مثال کا سوال ہے۔

○ "آپ کامیاب اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب بیوی اور کامیاب ماں بھی ہیں کیا راز ہے اس کے پیچھے؟"

☆ ہنستے ہوئے "بہت مشکل ہوتا ہے آپ کے لیے کہ آپ اتنا کام کرتے ہوئے گھر بھی چلائیں، بچوں کو بھی سنبھالیں، میری دونوں بیٹیاں ماشاء اللہ سے باہر پڑھ رہی ہیں اور بہت کامیاب ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ دونوں بہت Humble ہیں میری بڑی بیٹی انعم میجر اسٹڈی کر رہی ہے اور چھوٹی اہل میڈیا میں انٹرسٹڈ ہے تو میں بہت خوش ہوں کہ میری بیٹیاں بہت کامیاب ہیں۔

ان میں علم کی جستجو ہے اور سب سے پیاری بات کہ ہم چاروں ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔

میری بیٹیوں نے بہت سی چیزیں مجھ سے لی ہیں تو بہت کچھ عثمان سے بھی لیا ہے۔ اور ہم دونوں ہی اپنے بچوں سے بہت خوش ہیں۔ دونوں کتاب دوست ہیں اور میں ہمیشہ ان کے لیے بہت اچھی کتابیں خریدتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں بچوں کو کتابیں ضرور خرید کر دینی چاہئیں۔ بجائے اس کے کہ ڈھیروں کھلونے خرید دیے، کمپیوٹر لے دیا، کتابیں لے کر دیں اور کہانی ضرور پڑھ کر سنائیں تاکہ ان کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو، جو بات کتاب میں ہے وہ کھلونے میں نہیں ہے کتاب سے ان کے ذہن کو تقویت ملتی ہے اور ہمارا دنیا میں آنے کا مقصد ہی غور و فکر ہے۔"

بہاولپور سے مبین شفیع اور جوہر آباد سے ذکیہ براہیم کا مشترکہ سوال ہے۔

○ "ٹیلی وژن پر کن ساتھی فنکاروں کے ساتھ کام کر کے بہت مزا آتا ہے؟"

☆ "میں کبھی کوئی پیکج لے کر نہیں آتی سیٹ پر، بہت سکون و اطمینان سے آتی ہوں اپنا کام کرتی ہوں اور گھر چلی جاتی ہوں میرا کسی کے ساتھ کوئی پرابلم نہیں ہے، پھر بھی مجھے ساجد حسن، قوی صاحب، فیصل قریشی ——— ہمایوں سعید، مرینہ خان، صنم بلوچ، عائشہ کے ساتھ کام کر کے بہت مزا آیا" اور ثروت گیلانی کے ساتھ کام کر کے بھی بہت مزا آتا ہے۔"

فیصل آباد سے رابعہ اکرم، شمائلہ اکرم اور بہاول پور سے سدرہ رحمن کا آپ سے سوال ہے۔

○ "کھانے میں کیا پسند کرتی ہیں؟"

☆ "کھانے میں میری پسند بدلتی رہتی ہے۔ کبھی مجھے دال چاول بہت پسند ہوتے ہیں کبھی شامی کباب، ایک زمانے میں پلاؤ بہت پسند تھا۔ آج کل سیلڈ کھانے کا بہت شوق ہے اور میں جگہ جگہ پر سیلڈ [illegible] کرتی ہوں۔ میری ایک پٹھان دوست تھی اسے [illegible] سے چھین لیا وہ "مشعل" بہت اچھا بناتی تھی یہ ایک خاص کھچڑی ہوتی ہے جو ذرا پتلی سی ہوتی ہے پیاز ڈالا ہوتا ہے اور وہ گرم گرم میز پر آتی ہے تو وہ مجھے بہت یاد آتی ہے اپنی دوست۔ میں جیسا کھانا کھانا چاہتی ہوں اگر ویسا نہ ملے تو پھر میں چپ کر کے آگے بڑھ جاتی ہوں۔"

حافظ آباد سے سعدیہ ساجد اعوان کا سوال ہے اور یہی آج کا آخری سوال ہے۔

○ "اداکارہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

☆ "اداکارہ نہ ہوتی تو ڈانسر ہوتی یا سنگر ہوتی، جو بھی ہوتی اسی فیلڈ سے وابستہ ہوتی، کیونکہ جو کردار پردے پر نظر آتے ہیں اس میں آپ ہمیشہ کے لیے زندہ رہ جاتے ہیں۔ دوسری چوائس آرکیٹکچر ہوتی کیونکہ دنیا بھر کی عمارات مجھے بہت متاثر کرتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں یہ بہت کامیاب فیلڈ ہے۔"

○ "شکریہ ثمینہ اتنے قیمتی ٹائم اور دلچسپ گفتگو کے لیے آپ کا پیغام ہم قارئین تک پہنچا رہے ہیں؟"

☆ "مجھے بھی بہت مزا آیا اس انٹرویو میں اپنے چاہنے والوں کے سوالوں کے جواب دے کر۔ واقعی بہت مزے کے سوال تھے، بہت وزن تھا ان میں۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے اور میں بہت شکر گزار ہوں ان محبتوں کے لیے جو مجھے اتنی توجہ سے دیکھتے اور پسند کرتے ہیں۔ یہ ہمارا ملک ہے اور یہ واحد ملک ہے جہاں ہم اول درجے کے شہری ہیں۔ اگر ہم اسے سجائیں گے نہیں، سنواریں گے نہیں تو رل جائیں گے۔ آپ جس کام سے بھی منسلک ہیں اسے پوری ایمانداری سے کریں۔ بزرگوں کی عزت کریں، بچوں سے پیار کریں اور صفائی کا خاص خیال رکھیں۔

باقی آپ جیتی رہیں خوش رہیں۔ پاکستان زندہ باد۔"

قصّے کہانیاں اور پھول

ریحانہ امجد بخاری

کھلی کتاب کے صفحے الٹتے رہتے ہیں
ہوا چلے نہ چلے دن پلٹتے رہتے ہیں
بس ایک وحشت منزل ہے اور کچھ بھی نہیں
کہ چند سیڑھیاں چڑھتے اترتے رہتے ہیں

وقت کے میزان میں ایک سال اور کم ہو گیا ماضی کے تالاب میں پانی کی کنکریاں پھینکنے سے دائروں کا جال سا پانی کی سطح پر بچھ جاتا ہے اور پھر ان دائروں کے بیچ چہرے نظر آتے ہیں' ہنستے مسکراتے' روتے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے لاتعداد سیاہ و سفید چہرے جنہوں نے اپنا اپنا کردار ادا کیا اپنی بساط کے مطابق اچھا اور برا.....

یہ روٹیاں ہیں' یہ سکے ہیں اور دائرے ہیں
یہ ایک دوجے کو دن بھر پکڑتے رہتے ہیں

اگرچہ ان دائروں کے بھنور میں سوچیں الجھ کر رہ جاتی ہیں مگر ایک سوچ زندہ رہنے کا حوصلہ بڑھاتی ہے کہ ابھی ابن آدم میں احساس زندہ ہے' جو سچائی اور اچھائی کی علامت ہے۔ بے شک انسان خطا کا پتلا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ خطا ان ہی لوگوں سے ہوتی ہے جو کچھ کرتے ہیں اور امتحان بھی ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے جو کارزار میں اترتے ہیں اور امتحان میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ہر لمحہ اپنا احتساب کرتے رہتے ہیں۔

کرن کی سالگرہ کے موقع پر لفظوں سے منظروں میں رنگ بھرنے والے اہل قلم اور قارئین سے ہم نے کچھ سوالات کیے ہیں آیئے دیکھتے ہیں وہ لوگ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں

سوالات

1۔ زندگی کا ایک اور سال گزر جانے پر آپ کے کیا احساسات ہوتے ہیں؟
2۔ شیکسپیئر نے کہا تھا دنیا ایک اسٹیج ہے اس اسٹیج پر آپ نے کون سا اہم کردار ادا کیا ہے؟
3۔ شاعر نے کہا ہے۔

ہر داغ ہے۔ دل میں بجز داغ ندامت

آپ کی کوئی ایسی غلطی یا پچھتاوا جس پر آپ نادم ہیں اور اس کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں؟
4۔ سال گزشتہ میں کرن کی کس مصنفہ کی کون سی تحریر نے آپ کو متاثر کیا اور کیوں؟

مرتضیٰ برلاس (شاعر)

چلتا رہا تو دشت نوردی کا طنز تھا
ٹھہرا ذرا تو آپ نے پابستہ کہہ دیا

(۱) دراصل وقت گزرنے پر بچپن میں تو یہ ہوتا ہے کہ انسان مستقبل کے خواب دیکھتا ہے اور بڑا پر عزم ہوتا ہے۔ جوانی کے وقت زندگی آ کر ٹھہر جاتی ہے اور وہ اردگرد کی رنگینیوں میں کھویا رہتا ہے' دن و رات گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا لیکن انسان جب بڑھاپے کو پہنچتا ہے تو سوچتا ہے کہ یہ سال گزر گیا۔ معلوم نہیں آئندہ سال تک وہ

زندہ بھی ہو گا یا نہیں اور اس وقت اس کو ماضی کی صرف تلخیاں ہی یاد رہ جاتی ہیں چنانچہ جب یہ سال گزرا تو میرے تاثرات کچھ یوں تھے۔

سال یہ بیت گیا رنج کا آلام کا سال
عالمی امن کی اک خواہش ناکام کا سال
جس میں اک لمحہ سکوں ہم کو میسر نہ ہوا
آج گزرا ہے وہی کرب کا کہرام کا سال

سیاسی ناکامیاں' بے روزگاری' بجلی گیس کی نایابی اور دہشت گردوں کے ہاتھوں انسانی خون کی ہولیاں جیسے حشر انگیز واقعات ہوتے رہے ہر دن اک قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا اب نئے سال کے لیے یہ امیدیں ہیں کہ اللہ بہتر کرے۔

(۲) اس سلسلے میں میری ایک نظم "اداکار" میں نے کئی سال پہلے کہی تھی اور اس میں اسی احساس کا اظہار تھا کہ ہم میں سے ہر شخص اس دنیا میں اداکاری کر رہا ہے۔

غم کے چہرے پہ خوشیوں کا غازہ ملے' ساری دنیا کو اب تک ہنساتا رہا
ساری دنیا کی خوشیوں میں شامل رہا' اپنے غم کو میں سب سے چھپاتا رہا
جب بھی اظہار غم کی ضرورت ہوئی' زیر لب میر کے شعر گاتا رہا
یوں تو تعزیر اخفائے غم کے لیے' میں نے مانا سزاوار ہوں دوستو
میں بھی کیسا اداکار ہوں دوستو' میں بھی کیسا اداکار ہوں دوستو

(۳) انسان کی زندگی اگر وہ غور کرے تو بہت سی کوتاہیوں' لغزشوں اور گناہوں سے عبارت ہوتی ہے اور یہ ہی اسلام بھی بتاتا اور سکھاتا ہے کہ انسان اپنے کیے پر ہر وقت نظر رکھے اور اللہ تعالیٰ سے بہتر کرنے کی توفیق اور گناہوں کے ازالے کی امید کے لیے ہمیشہ توبہ کرتا رہے بحیثیت مسلمان من آنم کہ من دانم' پر ہی میرا ایمان ہے اور اس باری تعالیٰ کے آگے سربسجود ہوں کہ وہ میری کوتاہیوں کو معاف فرمائے (آمین)

(۴) دراصل مصروفیات کی وجہ سے مجھے ڈائجسٹ ٹائپ کے رسالے دیکھنے کا موقع کبھی کبھار ہی ملتا ہے کیونکہ میں اپنے فراغت کے اوقات تخلیقی سرگرمیوں اور سنجیدہ ادب کو پڑھنے میں گزارتا ہوں لیکن کرن ڈائجسٹ کے ایک دو شمارے میری نظر سے گزرے ہیں اور میرے ذہن میں ان کا ایک اچھا تاثر ہے میں نے کرن ڈائجسٹ کے "روداد قفس" کی ایک تحریر "پیربابا" پڑھی تھی جسے مصنفہ نے بہت ہی خوب صورت انداز میں تحریر کیا تھا۔ پسند اس لیے آئی اور یاد بھی اس لیے رہ گئی کہ اس میں ہمارے معاشرے کے تاریک پہلو کی طرف اشارہ تھا اور ایسی تحریریں ہر مصنفہ نہیں لکھ سکتی۔

امجد اسلام امجد (شاعر)

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

(۱) آدمی تھوڑا سا غور کرے تو یہ جو زمان ہے وقت جس کو کہتے ہیں یہ اتنی بڑی مسٹری ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نام سے موسوم کیا ہے اور کہا ہے کہ وقت میرا ہی ایک نام ہے وقت کو برا نہیں کہو۔ زمانے کو برا نہ کہو کیونکہ زمانہ میں خود ہوں تو زمان جو ہے یہ اصل میں ایک مسلسل عمل ہے۔ اس میں کسی جگہ پر ہماری اپیرنس ہوتی ہے اور پھر ہم ڈس اپیر۔۔۔ ہو جاتے ہیں۔ یہ جو باقی گھنٹے' دن' مہینے' سال وغیرہ ہیں یہ ہم نے اپنی آسانی کے لیے ایجاد کیے۔

کیونکہ اس زمانے میں اس طرح کی کوئی چیز ہوتی نہیں ہے۔ اگر ہم Destiny کو مانتے ہیں کہ ہم ایک عمل میں پیدا کیے گئے ہیں اور ایک خاص وقت پر اٹھائے جائیں گے تو اس حوالے سے دیکھا جائے تو سال کا آنا یا جانا کوئی معنی نہیں رکھتا البتہ اس بات پر آدمی ہمیشہ شکر ضرور ادا کرتا ہے کہ اس کو کچھ اور وقت ملا اور وہ وقت عزت کے ساتھ ملا رزق کی کشادگی کے ساتھ ملا اور اپنے وطن کی ترقی میں حصہ لینے کے لیے ملا۔

(۲) دیکھیں جی یہ تو بنیادی طور پر تماشائی فیصلہ کرتے ہیں جو ایکٹر آتے ہیں وہ کبھی یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ جنہوں نے اس کا سین دیکھا اس کی اپیرنس دیکھی اس کی پرفارمنس دیکھی۔ جو آنے والا ہے اس کا بنیادی کام تو یہ ہے کہ اس کو جو اسکرپٹ دیا گیا ہے، جو رول دیا گیا ہے یا جو کام دیا گیا ہے اس کو وہ بہترین طریقے سے کرے..... تو وہ میں کوشش کر رہا ہوں۔

(۳) یہ جو چھوٹے موٹے فرض ہوتے ہیں چھوٹے چھوٹے پچھتاوے یا پشیمانیاں ہوتی ہیں یہ سب تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے فیض صاحب کے اس شعر کی وضاحت یوں کروں گا کہ میری نظر میں ندامت تب ہوتی ہے جب آپ کوئی میجر ڈسیژن غلط لیتے ہیں جہاں آپ کو کھڑا ہونا چاہیے وہاں آپ کھڑے نہیں ہوتے پیچھے ہٹ جاتے ہیں یا بھاگ جاتے ہیں تو وہ اصل میں ندامت کا داغ ہوتا ہے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کبھی کوئی فیصلہ غلط نہیں کیا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے کیریئر میں اس طرح کے پچھتاوے سے اللہ نے محفوظ رکھا۔

(۴) تہذیب نسواں وغیرہ سے لے کر اب تک جو پرچے خواتین کے حوالے سے شائع ہوتے آرہے ہیں۔ ان میں ابن انشاء کے خاندان کے ان پرچوں کا نمایاں مقام ہے لیکن چونکہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے ان پرچوں کا مطالعہ نہیں کرپاتا اس لیے کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

فاخرہ بتول..... (شاعرہ)

میں نے سمجھا تھا سمندر تم کو
تھا کا مطلب تمہیں آتا ہو گا

(۱) چلو کچھ تو بوجھ ہلکا ہوا (ویسے یہ تو مذاق تھا) حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا ہر پل، ہر لمحہ، ہر ساعت، ہر گھڑی سمندر کی لہروں کی طرح ہے۔ جو اپنا آپ منوانے اور گزر جانے کا اچھوتا اور انمول عمل ہے ایک اور سال گزرنے کا احساس پانے اور کھونے کے حسین سنگم جیسا دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے کام ادھورے رہ گئے بہت سے لوگ اس سفر میں اب ساتھ نہیں ہیں۔ شاید تھک کر انہوں نے کہیں بہت پیچھے پڑاؤ کر لیا۔

(۲) جی بالکل ابھی میں نے ایک وقت میں کئی کردار ادا کیے ہیں بیٹی کا، بہن کا، بیوی کا، ماں کا اور لکھاری کا، ہر کردار نے مجھے نیا احساس، نیا ذائقہ، اور نیا تجربہ عطا کیا، لیکن میرے خیال میں سب سے خوب صورت کردار ماں کا ہے۔

(۳) آدمی خطا کا پتلا ہے جناب شاعر نے جانے کس رو میں کہہ دیا ہو گا۔

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

میں تو اکثر سوچتی ہوں کہ مجھ میں بہت سی خامیاں اور کمیاں ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ میں بہت جذباتی ہوں اور بہت جلد باز بھی عدم نے شاید میرے لیے ہی کہا تھا۔

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

بقیہ صفحہ 260 پر

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گری

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی، جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔۔۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔۔۔ وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے۔۔۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، وکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے، اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے۔

تیئسویں قسط
۲۳

بظاہر خرم جتنے اعتماد سے مڑا تھا اندر سے وہ اس کا دس فیصد بھی پرامید نہیں تھا۔

اول تو اس نے اس قسم کی حرکتیں کبھی کی نہیں تھیں، دوئم اگر وہ فلرٹ کرنے میں ماہر بھی ہوتا تب بھی آدھے یا ایک گھنٹے میں کسی لڑکی سے اتنی پہچان بڑھا لینا کہ وہ اپنا موبائل نمبر دے دے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے برابر تھا۔

مگر نمل کا انداز ایسا تھا کہ پیچھے ہٹنا تو در کنار وہ ذرا سی ٹال مٹول بھی نہیں کر سکا۔ پھر وہاں اتنے لوگ موجود تھے کہ ان کے سامنے منگیتر ہونے کی حیثیت سے نمل کا رویہ ہی اچھا خاصا نامناسب تھا اس پر اس کا خرم کو چیلنج کرنا، خرم کی عزت نفس کو للکارنے کے برابر تھا۔

لہٰذا وہ کوئی بھی لائحہ عمل ترتیب دیے بغیر ڈائننگ ہال کی طرف بڑھنے لگا۔

گلاس وال کے آرپار وہ اس لڑکی کی میز کی سمت کا اندازہ لگا چکا تھا چنانچہ وہ اب دروازے کی طرف بڑھا جس کے لیے اسے اچھا خاصا چکر کاٹنا پڑا تھا مگر اتنا وقت خرچ کرنے کے باوجود وہ ایسا کوئی پلان ترتیب نہیں دے سکا جس پر عمل کر کے وہ اس لڑکی سے اس کا نمبر حاصل کر لیتا۔

اسے یہ بھی یقین تھا کہ نمل اتنی آسانی سے اس کی جان بھی نہیں چھوڑے گی جو وہ کوئی کہانی ہی گھڑ دیتا۔

وہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر خالی الذہنی کے عالم میں اس لڑکی کی میز کی طرف بڑھتا رہا اور جب ان دونوں کے بیچ فاصلہ محض پندرہ قدم کا رہ گیا تب خرم اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔

ٹیبل پر موجود وہ گلابی کپڑوں میں ملبوس لڑکی بلاشبہ بہت زیادہ حسین تھی اس کے سامنے کھانے پینے کی مختلف چیزیں رکھی تھیں مگر جس طرح وہ ان سے انجان بنی بار بار ہاتھ پر بندھی گھڑی کو دیکھ رہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا وہ کسی کی منتظر ہے مگر خرم کے ٹھٹکنے کی وجہ یہ سب باتیں نہیں تھیں یہ سب تو اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا وہ تو اب اسے پہچاننے کے بعد رکا تھا۔

اس کا چہرہ گلاس ـ وال کے پار واضح طور پر نظر آ رہا تھا مگر خرم نے اسے بس ایک ہی بار دیکھا تھا اس لیے ایک نظر میں وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ لیکن اب وہ نا صرف اسے یاد آ گئی تھی بلکہ وہ اسے اپنے روبرو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

یہ تو بلال اختر کی بیٹی تھی خرم کے والد نے انہی سے تو اپنا موجودہ گھر خریدا تھا اور بلال اختر نے یہ گھر بیچا بھی اپنی اسی بیٹی کی وجہ سے تھا۔

گھر خریدنے سے پہلے فرقان حسن نے خرم کو بلا کر اسے اس گھر اور ان کی بیٹی سے وابستہ کہانیوں کا ذکر کر کے خرم سے مشورہ کیا تھا کہ انہیں یہ گھر خریدنا چاہیے یا نہیں۔

فرقان حسن کے ایک دوست پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ڈی ایس پی کے عہدے پر فائز تھے۔ فرقان حسن نے گھر خریدنے سے پہلے ان سے معلوم کرایا تھا کہ اس گھر پر کوئی قانونی مقدمہ وغیرہ تو نہیں چل رہا یا ٹیکس کے حوالے سے اس پراپرٹی پر کوئی قرضہ وغیرہ تو نہیں ہے نا۔

ڈی ایس پی صاحب، بلال اختر کے بھی دوست تھے انہیں جب گھر کی تفصیل اور مالک کے نام سے فرقان حسن نے آگاہ کیا تو انہوں نے وہ سب بھی بتا دیا جو ان کے علم میں تھا۔

ان کا کہنا تھا اس گھر میں کسی آسیب کا سایہ ہے یعنی کسی لڑکی کی روح رہتی ہے مگر وہ صرف ان کی بیٹی کو ہی نظر آتی ہے۔

ان کی بیٹی ایک نفسیاتی مریضہ ہے جس کا بچپن سے علاج چل رہا ہے۔

ڈی ایس پی نے اپنے اندازے کے مطابق یہ تک کہا تھا کہ بلال اختر اپنی اسی بیٹی کی وجہ سے یہ مکان بیچنا چاہ رہے ہوں گے کیونکہ ان کی بیٹی نے اسی گھر میں اپنی دوست پر حملہ کر کے اس کا سر پھاڑ دیا تھا اور پھر یہ کہا تھا کہ یہ کام اس نے نہیں بلکہ اسی روح نے کیا ہے۔

جب فرقان حسن نے اسے یہ سب بتایا تھا تو اسے خاصی حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ جب وہ گھر دیکھنے گیا تھا تب اس نے بلال اختر کی بیٹی کو دیکھا تھا اور وہ اسے شکل سے بالکل سادہ اور کسی حد تک تھوڑی ڈرپوک لگی تھی اس کا اپنی ہی دوست پر قاتلانہ حملہ کرنا بڑے اچنبھے کی بات تھی مگر فرقان حسن نے یہ کہہ کر اس کی حیرت دور کر دی تھی کہ ذہنی طور پر بیمار لوگ شکل سے بھولے بھالے ہی لگتے ہیں۔

اسی لیے خرم نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور انہیں گھر خرید لینے کا مشورہ دے دیا بلکہ اس نے تو کمرہ بھی وہی لیا تھا جس میں بلال اختر کی بیٹی بیٹھی تھی عین ممکن تھا کہ وہ کمرہ اسی کا ہو مگر خرم کو تو ایسی باتوں پر یقین ہی نہیں تھا تو بھلا اسے کیوں خوف آتا اور اب اس گھر میں شفٹ ہوئے اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اسے آج تک ایسا نہیں لگا تھا کہ اس گھر میں یا اس کے کمرے میں کوئی روح رہتی ہے البتہ گھر میں منتقل ہوتے وقت اس کمرے سے کچھ کاغذات نکلے تھے جس میں عجیب و غریب مناظر اور وحشیانہ شکلیں تھیں۔

ان کے متعلق بھی خرم کو یقین تھا کہ وہ اس لڑکی نے ہی بنائی ہوں گی اپنا پاگل پن وہ اس طرح کاغذوں پر بکھیرتی ہو گی۔

ایک کوندا سا خرم کے ذہن میں لپکا اور ایک کے بعد ایک ساری باتیں اسے یاد آتی چلی گئیں حالانکہ گھر میں شفٹ ہوتے ہی یہ سب اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا کتنا لمبا سفر طے کر کے آ گیا تھا کہ اچانک اسے یاد آیا نمل وغیرہ گلاس وال سے اسے بے حس و حرکت کھڑا دیکھ رہی ہوں گی اور اسے پریشان سمجھ کر خوش ہو رہی ہوں گی۔

اس نے گردن گھما کر ان کی جانب دیکھا تو سب کو اپنی جگہ ہنوز کھڑے اور اپنی طرف پوری طرح سے متوجہ پا کر فوراً ہی گردن واپس موڑ لی۔

زوبیہ کی توجہ ٹیبل پر رکھے اپنے ہاتھوں پر تھی وہ کچھ بھی نہیں کھا رہی تھی۔

خرم نے گلے میں بندھی ٹائی ٹھیک کی انگلیوں سے بالوں کو سنوارا اور گلے کو ہلکا سا کھنکار کر زوبیہ کی ٹیبل کے نزدیک آ گیا اور بڑے شائستہ لہجے میں بولا۔

"ایکسکیوز می! آپ بلال اختر کی بیٹی ہیں نا۔" زوبیہ اپنی ہی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ خرم کی آواز پر بری طرح چونک اٹھی۔

اس نے سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا تو اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھتی چلی گئی۔

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔" خرم نے اس کے چہرے پر پھیلی اجنبیت دیکھ کر سابقہ لہجے میں کہا تو زوبیہ آنکھوں کو ہلکا سا چندھیا کر ایسے اسے دیکھنے لگی جیسے ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہی ہو مگر یاد نہ آ رہا ہو۔

"آپ مجھے جانتی نہیں ہیں مگر ایک بار دیکھا ضرور ہے میرے والد فرقان حسن نے آپ کے فادر بلال اختر سے ان کا گھر خریدا تھا۔ میں آپ کے گھر بھی آیا تھا اگر آپ کو یاد ہو تو۔۔۔" خرم رک کر ایک بار پھر اس کے تاثرات کی جانچ پڑتال کرنے لگا مگر وہاں اب بھی اس کے چہرے پر اجنبیت اور آنکھوں میں الجھن پھیلی ہوئی تھی۔

زوبیہ کو یہ تو یاد آ گیا تھا کہ وہ اس کے گھر آیا تھا بلکہ خرم کے یاد دلانے پر اس کے ذہن میں وہ پورا منظر گھوم گیا تھا جب خرم نے اس کے کمرے کو بڑی ستائش و شوق سے دیکھتے ہوئے اپنے ماں باپ سے کہا تھا "یہ میرا کمرہ ہو گا۔"

مگر تو پہلی بار دیکھنے پر بھی اسے دیکھا بھالا لگا تھا پھر دوسری بار پر تو اسے فوراً ہی پہچانا تھا۔

مگر اسے تو اس لیے الجھن ہو رہی تھی کہ وہ اس سے کیوں مخاطب ہے وہ تو بچپن سے ہی بے تحاشا کم گو اور

تنہائی پسند تھی اس کی تو لڑکیوں سے بات کرنے میں جان نکلتی تھی تو بھلا ایک لڑکے کے مخاطب ہونے پر اس کی حالت غیر کیوں نہ ہوتی جبکہ اس وقت تو صورت حال بھی بڑی عجیب تھی۔

یہاں ہوٹل میں وہ عائشہ اختر کے اصرار پر تصویروں کی کوئی نمائش دیکھنے آئی تھی جس میں اسے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر عائشہ اختر کا خیال تھا کہ اسے ایسی جگہوں پر جانا چاہیے جہاں چار لوگ اسے دیکھیں تو اس کے رشتے کی بات چل سکے۔

یہ اور بات تھی کہ اپنی یہ سوچ انہوں نے زوبیہ پر ظاہر نہیں کی تھی مگر جس طرح انہوں نے اسے تیار ہو کر چلنے کے لیے کہا تھا اسے مد نظر رکھتے ہوئے زوبیہ خود ہی سب سمجھ گئی تھی۔

اپنے طور پر تو وہ انہیں ٹالنے کی بھرپور کوشش کر چکی تھی مگر عائشہ اختر بھی اپنے نام کی ایک تھیں وہ اسے لانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔

مگر یہاں آنے کے بعد زوبیہ کو سخت پچھتاوا ہو رہا تھا پینٹنگز کے نام پر عائشہ اختر نے بمشکل چار پانچ تصویریں ہی دیکھی ہوں گی ان کا سارا وقت تو وہاں موجود اپنی جیسی امیر بیگمات سے گپیں لڑانے میں صرف ہو گیا تھا اور زوبیہ بری طرح بور ہو گئی تھی۔

خدا خدا کر کے عائشہ اختر وہاں سے نکلیں تو گھر جانے کی بجائے اسی ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے پر بضد ہو گئیں۔

زوبیہ مجبوراً یہاں آکر بیٹھی تو وہ سارا آرڈر دے کر خود اپنا میک اپ وغیرہ ٹھیک کرنے واش روم چلی گئیں۔

تب سے زوبیہ اکیلی بیٹھی سوکھ رہی تھی کہ پتا نہیں کہاں سے یہ خرم چلا آیا۔

زوبیہ اس پر سے نظریں ہٹا کر اپنے آس پاس ایسے دیکھنے لگی جیسے عائشہ اختر کی واپسی کی شدت سے منتظر ہو۔

خرم اس کا نظر انداز کرنا بخوبی محسوس کر گیا تھا پھر بھی ڈھیٹ بنا عین اس کے سامنے والی کرسی کی بیک پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے مودب انداز میں بولا۔

"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا مگر مجھے آپ سے ایک بڑے اہم مسئلے پر بات کرنی ہے پتا نہیں آپ میری پرابلم کو سمجھیں گی بھی یا نہیں۔" خرم اپنے لہجے میں تجسس پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

مگر زوبیہ کو بدستور خاموشی سے ادھر ادھر دیکھتا پا کر اسے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا اسی لیے اب کی بار وہ رک رک کر اپنے لہجے کو سنسنی خیز بناتے ہوئے بولا۔

"آپ پلیز میری بات سن کر ہنسیے گا نہیں۔ ابھی تک میں نے یہ سب کسی کو بتایا نہیں، صرف اپنے گھر والوں سے ذکر کیا تھا مگر انہوں نے میری ایک بات پر یقین ہی نہیں کیا بلکہ ان لوگوں نے تو بڑی بے دردی سے کہہ دیا کہ یہ سب میرا وہم ہے۔"

خرم نے واضح طور سے چونکتے دیکھا تو وہیں رک گیا جبکہ زوبیہ ایسے سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی جیسے اس کی بات کی وضاحت چاہ رہی ہو مگر خرم چاہتا تھا کہ وہ اس سے پوچھے اور اسے بولنے پر اکسانے کے لیے خرم جان بوجھ کر ایسے چپ چاپ کھڑا ہو گیا جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اپنی بات کیسے کہے۔

اس کی یہ خاموشی طویل ہوتی دیکھ کر زوبیہ کے چہرے پر تجسس کے ساتھ ساتھ بے زاری پھیلنے لگی مگر تب بھی وہ زبان سے کچھ کہنے پر آمادہ نہ ہوئی آخر خرم کو ہی ہار مانتے ہوئے دوبارہ بات شروع کرنی پڑی۔

"میں جب سے اس گھر میں شفٹ ہوا ہوں میرے ساتھ بڑے عجیب و غریب واقعات ہو رہے ہیں۔"

"کیسے واقعات؟" زوبیہ بے ساختہ بولی تھی خرم کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ابھرنے کو مچل اٹھی مگر وہ کمال مہارت سے ضبط کر گیا البتہ اپنے چہرے کو حتی الامکان سنجیدہ بناتے ہوئے پراسرار لہجے میں بولا۔

"کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اس کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی اور موجود ہے۔" زوبیہ کی آنکھیں حیرت و خوف کی زیادتی سے پھٹ گئیں وہ ششدر سی خرم کو دیکھے گئی جو تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر مزید بولا۔

"میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو بعض اوقات پیچھے کسی اور کا بھی عکس ابھرتا ہے سوتے میں کبھی آنکھ کھلتی ہے تو لگتا ہے بیڈ کے سرہانے کوئی کھڑا ہو۔

لیکن یہ سب کچھ بہت اچانک ہوتا ہے بالکل پلک جھپکنے کی طرح میں اس عکس کو دیکھ پاتا ہوں نہ ہی وہ منظر سمجھ پاتا ہوں بس ایسا لگتا ہے جیسے وہ جھلک کسی لڑکی کی ہوتی ہے۔" خرم کی بات ختم ہونے تک زوبیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ہکا بکا خرم کو دیکھے جا رہی تھی۔

خرم ایسے کھوئے کھوئے انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اس کی کیفیت سے بالکل بے خبر ہو کر صرف اپنی کہنے میں مگن ہو بالکل ایک ایسے شخص کی طرح جو اپنے مسئلے میں اتنا الجھا ہوا ہوتا ہے کہ اسے اپنے اردگرد کا ہوش ہی نہیں رہتا۔

حالانکہ حقیقت میں تو خرم کا سارا دھیان زوبیہ کی جانب تھا وہ کس طرح اس کی باتوں پر چونکی ہوئی تھی کیسے اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ ایک ایک بات خرم کی نظر میں تھی اس کے باوجود خرم نے انجان بننے کی حد کر دی اور بڑے سادہ سے انداز میں ٹھٹک کر پوچھنے لگا۔

"آپ میری باتوں کو مذاق تو نہیں سمجھ رہیں نا۔ بخدا میرے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا بلکہ میں تو ایسی باتوں کو مانتا بھی نہیں تھا لیکن جو کچھ مجھے نظر آ رہا ہے میں اسے دیکھ کر ان دیکھا بھی نہیں کر سکتا۔

اگر آپ میرا مذاق نہ اڑائیں تو مجھے پوچھنا تھا کیا آپ کے گھر میں کوئی روح رہتی ہے۔" زوبیہ کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا اس کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں جیسی ہو گئی تھی۔ اسے کچھ بھی بولنے کے قابل نہ پا کر خرم تیزی سے کہنے لگا۔

"میں... میں جانتا ہوں آپ کو میری ساری باتیں بکواس لگ رہی ہوں گی بھلا روح وغیرہ پر کون یقین کرتا ہے لیکن جس کے ساتھ کوئی انہونی ہو جائے وہ جھٹلا بھی تو نہیں سکتا ایک حقیقت جب سامنے کھڑی ہو تو پھر اس کی طرف سے لاکھ آنکھیں بند کر لو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لو مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی اس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

میری بدقسمتی یہ ہے کہ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ صرف میں ہی دیکھ رہا ہوں گھر کے دوسرے افراد اسے میرا وہم کہہ کر مجھے جھڑک دیتے ہیں اب تو انہیں کچھ بتانا بھی بے کار لگتا ہے ان کی تان تو ایک ہی بات پر آکر ٹوٹتی ہے کہ۔

اتنے سالوں سے بلال اختر کی فیملی اس گھر میں رہ رہی تھی اگر کوئی روح یا آسیب اس گھر میں ہوتا تو وہ چار دن میں ہی یہ گھر بیچ کر چلے جاتے۔ اس لیے آج آپ کو یہاں دیکھ کر میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں کیا اتنے سالوں میں کبھی آپ کو محسوس نہیں ہوا کہ کوئی ان دیکھی مخلوق آپ کے گھر میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔" خرم دھیمے مگر اثر انگیز لہجے میں کہتا چلا گیا۔

زوبیہ تو دم بخود سی اسے دیکھے اور سنے جا رہی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک اسے یہ سب سن کر یہ تمہارا وہم ہے کہہ کر جھڑک دیا جاتا تھا۔

بچپن سے لے کر آج تک کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ بچپن سے لے کر آج تک وہ یہ سوچتی آئی تھی کہ کاش کوئی ایک تو ایسا ہوتا جو اس کے احساسات کو سمجھ سکتا۔

اور بچپن سے لے کر آج تک پہلی بار کسی نے آکر ٹھیک وہی سب کہا تھا جو وہ محسوس کرتی تھی۔

اسے تو جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اور بھی ہے اس کے علاوہ جو یہ سب دیکھ سکتا ہے۔

اور اس صورت حال سے گزر رہا ہے جس سے وہ گزرتی آئی ہے۔

گویا یہ سب محض اس کا وہم نہیں ہے کچھ تو حقیقت ہے تبھی تو کوئی دوسرا بھی اس گھر میں کسی کی موجودگی کو محسوس کر رہا ہے اور صرف موجودگی کو ہی محسوس نہیں کر رہا بلکہ یہ تک جان چکا ہے کہ یہ سایہ کسی لڑکی کا ہے۔

ایک طرف اگر اسے خوشی ہو رہی تھی یہ سوچ کر کہ کوئی اور بھی اس کی سچائیوں کا گواہ بن گیا ہے تو دوسری طرف اسے ہول اٹھنے لگے تھے۔

شائستہ خالہ اگر وہم کی بجائے حقیقت تھیں تو عائشہ اختران کے وجود سے انکاری کیوں تھیں اور ان کے ساتھ ہوئے سانحہ سے اس قدر خائف کیوں تھیں آخر وہ زوبیہ کو کچھ بھی کھل کر بتانے کے لیے تیار کیوں نہیں ہوتی تھیں۔

زوبیہ سوچوں کے ایک سمندر میں ڈوب گئی تھی اور خرم اس کی خاموشی کو کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا اسے بت بنا دیکھ کر آخر خرم کو مزید کہنا پڑا۔

"مجھے لگتا ہے اس گھر میں کسی لڑکی کی روح ہے جو مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن یا تو وہ کہہ نہیں پا رہی یا میں سمجھ نہیں پا رہا کیا اس معاملے میں آپ میری کوئی مدد کر سکتی ہیں۔" خرم نے اپنے چہرے پر سارے جہاں کی بے بسی سجاتے ہوئے مدد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ خود سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

جو آج تک اپنی مدد نہیں کر سکی تھی وہ اس کی مدد کیسے کرتی' ابھی اس نے کچھ سوچا بھی نہیں تھا کہ گلاس وال کی دوسری جانب سے عائشہ اختر کو آتا دیکھ کر وہ ایک دم ہراساں ہو گئی۔

"آ... آپ' آپ۔ آپ کو جانا ہو گا... میری مما آ رہی ہیں پلیز آپ فوراً" چلے جائیں۔" زوبیہ کو یقین تھا عائشہ اختر' خرم کی بات سن کر اسے یہیں کھڑے کھڑے کھری کھری سنا دیں گی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اتنے لوگوں کے بیچ ذلیل ہو تبھی سارے اخلاق بالائے طاق رکھ کر دو ٹوک لہجے میں بولی۔

خرم نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو ایک نہایت باوقار سی خاتون کو اپنی عمر کے مطابق بہترین فیشن کیے بڑے سبھاؤ کے ساتھ آتا دیکھ کر تڑپ کا آخری پتا پھینکتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں لیکن پلیز میری مدد ضروری کیجیے گا آپ کو اندازہ نہیں میں کتنا پریشان ہوں کیا آپ مجھے اپنا نمبر دے سکتی ہیں۔" خرم بڑی آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا زوبیہ ایک پل کو جیسے ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی ذہن کے کسی کونے میں کچھ کھٹکا تھا اپنا نمبر اسے دینے کے خیال سے لیکن اگلے ہی پل ایک دوسرا خیال اس کی سوچ پر حاوی آ گیا۔

زندگی میں پہلی بار تو کوئی اس کے حسب خواہش بات کر رہا تھا وہ اس موقع کو گنوا نہیں سکتی تھی مگر اس کی قوت ارادی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ وہ فوری طور پر فیصلہ کر سکے تبھی کشمکش کے عالم میں بولی۔

"میرا نمبر۔"

"جی ہاں' آپ کا سیل فون نمبر ہو تو میں آپ سے بعد میں تفصیلی بات کر سکتا ہوں اصل میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اور آپ مل کر ضرور اس معمہ کو حل کر سکتے ہیں۔ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ روح مجھ سے جو کچھ بھی کہنا چاہ رہی ہے وہ مجھے آپ ہی کے ذریعے پتا چل سکتا ہے۔" خرم نے اسے کشمکش میں گھرا دیکھ کر ایک اور تیر اچھینکا۔

دراصل اسے یقین تھا اگر ایک بار عائشہ اختران کی ٹیبل تک پہنچ گئیں تو پھر زوبیہ نمبر نہیں دے سکے گی ویسے بھی اسے زوبیہ کے پاس آئے پندرہ منٹ تو ہو ہی چکے تھے اور وہ اس کا نمبر ایک گھنٹے کی بجائے آدھے گھنٹے کے اندر ہی حاصل کرنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے بالکل بے رخی اڑائی تھی۔

اصل میں اسے اتنا علم تو تھا ہی کہ اس کا نفسیاتی علاج چل رہا ہے عموماً" جو لوگ ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں

انہیں اپنے آس پاس کے لوگوں سے شکایت ہوتی ہے کہ وہ ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتے خاص طور پر ایسے کیسز میں جہاں مریض کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جو عقل و شعور سے بالکل ہی ماورا ہو۔

ایسے میں خرم کی یہ پیشکش کہ آپ کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا زوبیہ کو فوراً ہی اپنا نمبر اسے دینے پر آمادہ کردے گی۔

اور واقعی یہی ہوا زوبیہ نے گلاس وال کی دوسری جانب سے نظر آتی عائشہ اختر پر ایک نظر ڈالی اور ٹیبل پر سے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں شرمندگی کے ساتھ بولی۔

"مجھے تو اپنا نمبر زبانی یاد بھی نہیں ہے ایک طرح سے میں تو موبائل یوز ہی نہیں کرتی یہ تو بس مما نے بغیر پوچھے دے دیا ہے کہ میں اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں ورنہ مجھے تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" زوبیہ نے پرس میں سے چھوٹا سا موبائل نکال کر ایسے اس کی جانب دیکھا جیسے وہ کسی چیز کا خالی ڈبا ہو۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ اپنا موبائل مجھے دیجیے نمبر میں خود لے لوں گا۔" خرم عجلت میں بولا۔

زوبیہ نے ایک پل کو اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی جانب دیکھا پھر دوسری نظر لحہ بہ لحہ اپنے اور اس کے بیچ فاصلہ کم کرتیں عائشہ اختر کو تو جیسے فیصلہ خود بخود ہو گیا اور اس نے بے اختیار موبائل خرم کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

خرم نے فوراً" سے پیشتر اس کے موبائل سے اپنے موبائل پر کال کی تو اس کا نمبر گھنٹی بجنے سے بھی پہلے خرم کے موبائل اسکرین پر جگمگانے لگا۔

اتنا سکون ' اتنی تسکین ' اتنی خوشی اسے مہنگی سے مہنگی گاڑی خریدنے پر بھی کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی اس پل زوبیہ کا نمبر ملنے پر اسے میسر آئی تھی اس نے بڑی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ نمبر کو دیکھتے ہوئے لائن منقطع کردی اور اس کا موبائل واپس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے مزید کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا یہاں تک کہ ایک چھوٹا سا تھینکس بھی نہیں۔

اسے جو چاہیے تھا وہ مل گیا تھا اب اس لڑکی کے پاس وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ وہ فوراً" ہی دروازے کی طرف پلٹ گیا یہ اور بات تھی کہ اس کی یہ اجنبیت زوبیہ کو ہزار ہا سکون عطا کر گئی تھی۔

وہ چاہتی تھی عائشہ اختر کے آنے سے پہلے پہلے خرم یہاں سے چلا جائے اس کی ساری توجہ عائشہ اختر پر تھی جنہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ جانے کن سوچوں میں گم کسی غیر مرئی نقطہ کو دیکھتی چلی آرہی تھیں۔

ورنہ ایک بار بھی اگر انہوں نے زوبیہ کو دیکھا ہوتا تو اس کی میز کے پاس ایک لڑکے کو اس سے ہم کلام دیکھ کر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتیں۔

نگران کے متوجہ ہونے سے پہلے ہی خرم واپسی کے لیے پلٹ گیا زوبیہ کا سارا دھیان عائشہ اختر کی جانب تھا لہٰذا وہ خرم کے انداز میں اتر آنے والی سرشاری کو محسوس ہی نہ کر سکی ورنہ اس کی غرور سے تنی گردن اور قدم بڑھانے کا فاتحانہ انداز' اس کے کسی بہت بڑے معرکہ کو سر کر لینے کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ دور کھڑے اس کی طرف پوری طرح سے متوجہ وہ سب لوگ سانس روکے اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔

حالانکہ جب وہ زوبیہ کے پاس پہنچا تھا تب تک نمل ان دونوں کو سرسری انداز میں ہی دیکھ رہی تھی کیونکہ اسے یقین تھا زوبیہ 'خرم کے پہنچتے ہی اٹھ کر ویسے ہی چل پڑے گی جیسے اسکول کے زمانے میں کسی کے بات کرنے کی کوشش کرنے پر واک آؤٹ کر جایا کرتی تھی۔

مگر اسے اپنی جگہ پر ہنوز جما دیکھ کر نمل کو حیرت ہوئی لیکن اسے زیادہ فکر نہیں ہوئی اس نے یہی سوچا تھا کہ شاید وقت کے ساتھ زوبیہ کے مزاج میں تھوڑی تبدیلی آگئی ہوگی۔

کسی انجان شخص کی کوئی ذرا سی بات سن لینے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے اپنا نمبر بھی اٹھا کر دے دے گی مگر اس وقت نمل کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب زوبیہ نے اپنا موبائل ہی اٹھا کر خرم کو دے دیا۔

یہ تو اسے پتا تھا کہ خرم کوئی بھی الٹی سیدھی کہانی زوبیہ کو سنا رہا ہو گا اسے شیشے میں اتارنے کے لیے۔

مگر کہانی چاہے کتنی بھی اثر انگیز ہو ایک انجان شخص کو اپنا نمبر دے دینے کے لیے رضامند ہو جائے اپنے آپ میں ایک حیران کن بات تھی کجا کہ اپنا موبائل ہی اسے اٹھا کر دے دینا۔

اس کے قریب آکر کچھ کہنے سے پہلے ہی ان سب کو نمل کے ہار جانے کا علم ہو چکا تھا۔

سنبل تو منہ اور آنکھیں پھاڑے کبھی نمل کو تو کبھی دور سے آتے خرم کو دیکھ رہی تھی حیرت کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر نمل کے لیے شدید غصے کا تاثر بھی نمایاں تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

"دیکھا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔"

مگر نمل کو اس وقت سنبل کے غصے کی پروا نہیں تھی وہ تو صرف خرم سے ہار جانے کے خیال سے سکتہ میں چلی گئی تھی۔

خرم شاہانہ چال چلتا ان سب کے نزدیک چلا آیا ہارون نے بغیر کوئی سوال کیے اسے مبارک باد دینے کے انداز میں اس کی پیٹھ ٹھونکی اور نادر نے کندھا تھپتھپایا جبکہ حمید اور روکی بظاہر خوشی خوشی آگے بڑھے جیسے اس کی کامیابی کی داستان سننا چاہتے ہوں جبکہ حقیقتاً" انہیں صرف اب اس کا اگلا قدم کیا ہو گا یہ دیکھنا تھا البتہ آسیہ وغیرہ نے اپنے قیاس پر یقین کرنے کی بجائے تصدیق کر لینا بہتر سمجھتے ہوئے بڑے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

"کیا ہوا خرم؟ کیا اس نے نمبر دے دیا؟" آسیہ کے سوال پر خرم اس کی بجائے نمل کو دیکھنے لگا جو خود استفہامیہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی جیسے ابھی بھی اس نے آس کا دامن چھوڑا نہ ہو اور یہ امید لگا رکھی ہو کہ خرم کا چہرہ اور آنکھوں و دیکھا وہ سارا منظر سب ایک غلط فہمی ہو اور خرم ابھی اپنی شکست کا اعتراف کرنے والا ہو۔

"تم لوگوں کو کیا لگتا ہے؟" خرم نے الٹا انہیں سے پوچھا۔

"بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ اس نے اپنا نمبر دے دیا ہے تبھی تو اپنا موبائل دیا تھا۔" ایک اور لڑکی خوشی خوشی بولی جیسے خرم کی بجائے وہ خود شرط جیت گئی ہو۔

"تم لوگ صرف بظاہر دیکھے منظر پر یہ سارے اندازے لگا رہے ہو جبکہ میں تو وہاں جانے سے پہلے ہی اس یقین کے ساتھ گیا تھا کہ مجھے اس کا نمبر مل جائے گا۔" خرم نے بڑے شاہانہ انداز میں کہا تو آسیہ سمیت وہ ساری لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو گئیں اور سوالات کرنے لگیں۔

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟"

"تم نے ایسا کیا کہہ دیا جو اس نے اتنی آسانی سے نمبر دے دیا؟"

"کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے؟"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے ورنہ کوئی لڑکی ایک اجنبی کو اس طرح اپنا نمبر کیوں دے دے گی۔"

ان سب کے سوالوں پر خرم نے ان کی جانب دیکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا بلکہ بدستور نمل کو ہی دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص خود اعتماد لہجے میں بولا۔

"کوئی لڑکی ایک اجنبی کو اس طرح اپنا نمبر نہیں دے سکتی لیکن یہاں اس کے مدمقابل "کوئی" یا "کسی" نہیں بلکہ خرم حسن تھا اور خرم جس کام کو کرنے کا ٹھان لے پھر وہ چاہے کتنا بھی ناممکن نظر آئے خرم حسن اسے ممکن بنا ہی لیتا ہے۔" نمل ساکت نظروں سے اس کا مغرور رویہ دیکھ رہی تھی اب بھلا اس کے پاس کہنے اور سننے کے لیے بچا ہی کیا تھا مگر خرم اتنی آسانی سے پیچھا کیسے چھوڑ سکتا تھا وہ ایک ایک قدم اٹھاتا اس کے مقابل آکھڑا ہوا

اور اپنا موبائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"وہ لڑکی ابھی بھی وہیں بیٹھی ہے۔ یہ اس کا نمبر ہے کال ملا کر دیکھ لو تاکہ اسے فون ریسیو کرتا دیکھ کر تمہیں اپنی ہار کو قبول نہ کرنے کا کوئی بہانہ نہ مل جائے۔" نمل اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں وہ خاموشی سے اس کی آنکھوں میں فتح کے نشے کو ہلکورے لیتا دیکھتی رہی جس میں ہر گزرتے پل کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا کیونکہ ہر گزرتا پل خرم کو بتا رہا تھا کہ اس نے نمل کو کس بری طرح سے لاجواب کیا ہے کہ وہ بت بن کر رہ گئی ہے۔

"کیا ہوا کچھ بولو گی نہیں۔" خرم نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔

"شاید تمہیں یاد ہو تم نے کہا تھا شرط ہارنے کی صورت میں میں جو کہوں گا تم وہ کرو گی تو اس سے پہلے ذرا کنفرم تو کر لو کہ آیا تم واقعی ہار گئی ہو یا یہ میری کوئی چال ہے۔" خرم کے کہنے پر نمل نے تو کوئی حرکت نہیں کی البتہ سنبل نے ایک جھٹکے سے موبائل خرم کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ جو لاسٹ ریسیوڈ کال ہے یہی اس کا نمبر ہے نا۔" سنبل کے لہجے سے اس کا بری طرح تپا ہونا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

"ہاں۔" خرم نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا تو سنبل نے کال کا بٹن پش کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔

نمل کا دل چاہا وہ اسے یہ سب کرنے سے روک دے خرم جیت چکا تھا اور انہیں اس حقیقت کو چار و ناچار تسلیم کرنا تھا اس سے انکاری ہو کر وہ اپنا مزید تماشا ہی بنا سکتے تھے۔

مگر وہ یہ سب کہہ نہ سکی سنبل کو اسی پر غصہ آ رہا تھا کہ نمل نے خرم سے شرط لگائی ہی کیوں تھی اب اسے اس وقت ٹوکنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ سب کے بیچ میں نمل پر چڑھائی کر دے کیونکہ موبائل کان سے لگائے وہ بڑی بے چینی سے زوبیہ کو فون اٹھاتا دیکھنے کی منتظر تھی۔

گلاس وال کے پار جب زوبیہ نے گھنٹی بجنے پر موبائل اٹھا کر اس کے اسکرین کی جانب دیکھا اور کال ریسیو کر کے ہیلو کہا تو سنبل کا سارا غصہ نمل پر نکلنے کے لیے ابال ہو گیا اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ نمل کو کچا چبا جائے۔

زوبیہ نے دو تین بار ہیلو ہیلو کیا تو خرم نے موبائل سنبل کے ہاتھ سے لے کر اپنے کان سے لگا لیا اور اسی مہذب لہجے میں بولا جس میں زوبیہ سے مخاطب تھا۔

"ہیلو میں خرم حسن بات کر رہا ہوں۔ میں آپ کا نمبر سیو کر رہا تھا تو مجھے خیال آیا میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

زوبیہ نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی عائشہ اختر پر ڈالی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں ان کا دھیان جانے کہاں تھا وہ ٹیبل پر دونوں کہنیاں رکھے اپنی انگوٹھی گھمائے جا رہی تھیں۔

زوبیہ کو ان کے رویے پر قدرے حیرت ہوئی انہیں تو اس کا موبائل بجنے پر ہی زوبیہ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے تھا اور اپنی عادت کے مطابق فوراً "انکوائری کرنی چاہیے تھی۔

"کس کا فون ہے؟ کس سے بات کر رہی ہو؟ کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔" مگر وہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھیں۔

زوبیہ نے بہت آہستہ سے اپنا نام بتا دیا تو دوسری طرف خرم نے مزید کچھ کہے بغیر صرف اس کا نام دہراتے ہوئے موبائل آف کر دیا۔

"زوبیہ۔" موبائل بند کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر نمل کو دیکھنے لگا۔

"تم نے تو صرف نمبر پوچھنے کو کہا تھا میں نے تو نام بھی پوچھ لیا ہے۔" پھر سنبل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا نام بھی کنفرم کرنا ہے۔" سنبل صرف خرم کو دیکھ کر رہ گئی اب بھلا اس سے کیا کہتی نام تو اسے معلوم تھا لیکن شاید زوبیہ اسکول کے زمانے میں جیسی ہوا کرتی تھی اب ویسے مزاج کی نہیں رہی تھی ورنہ یہ شرط نمل کبھی

نہ ہارتی۔

سنبل، خرم پر سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر خاموش کھڑی نمل کو دیکھنے لگی تو خرم بھی نمل سے ہی مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو اپنی شرط یاد ہے تمہیں یا مجھے یاد دلانی ہوگی۔" خرم کے سوال نے جیسے نمل کی مشکل آسان کر دی اس نے ایسے پلک جھپکا کر خرم کو دیکھا جیسے نیند سے بے دار ہوئی ہو۔

"شرط!"

"اب تمہیں وہ کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔" خرم اس کی خاموشی ٹوٹنے پر شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

نمل نے ایک نظر اپنی اور خرم کے دوستوں پر ڈالی جو بڑی انہماک سے ان کی گفتگو سن رہے تھے پھر خرم کو دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کہنے لگی۔

"کون سی شرط؟ مجھے تو کوئی شرط یاد نہیں۔" آسیہ وغیرہ اپنی جگہ اچھل پڑیں۔

آخر کو خرم نے اتنا بڑا تیر مارا تھا اسے کچھ تو کامپلیمنٹ ملنا چاہیے تھا حیرت تو خرم اور اس کے دوستوں کو بھی ہوئی تھی نمل سے اس درجہ وعدہ خلافی کی انہیں قطعاً "امید نہیں تھی مگر اس سے پہلے کہ خرم کچھ کہتا آسیہ غصے سے اس کے نزدیک آ کر اس ناانصافی پر تنک کر بولی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو نمل This is not fair تمہیں اگر شرط پوری نہیں کرنی تھی تو وعدہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ہاں اور کیا آخر اتنا مشکل کام کیا ہے خرم نے اب تمہیں بھی اس کی بات ماننی ہوگی۔" ایک اور لڑکی نے بھی آسیہ کی طرح خرم کے سامنے اپنے نمبر بڑھانے چاہے تو جیسے ان سب کے درمیان ریس لگنی شروع ہو گئی جو تیسری لڑکی کو بھی بڑے جذباتی انداز میں کہنا پڑا۔

"بالکل یار! ویسے بھی خرم مانگے گا ہی کیا۔ کوئی جان تو نہیں لے لے گا نا۔" نمل نے بمشکل خود کو کہنے سے روکا کہ جان لے لے تو زیادہ اچھا ہے وہ تو کچھ ایسا کہے گا جو اسے سب کے بیچ تماشا بنائے یا اسے سخت ناگوار گزرے۔

پھر بھلا وہ جانتے بوجھتے خرم کو خود پر ہنسنے کا ایک اور موقع کیوں دیتی اسے اس بات کی قطعاً "پروا نہیں تھی کہ اس کی اس حرکت کی وجہ سے سب اسے طعنے ماریں گے یا اس کی اصول پسندی پر حرف آئے گا۔ ایک ایسے شخص کے سامنے اپنی زبان سے پھر جانا اس کے نزدیک کوئی عیب کی بات نہیں تھی جو اس کے صاف انکار کے باوجود زبردستی اس کے ساتھ شادی کرنے پر تلا ہوا تھا۔

جس نے شادی جیسے مقدس رشتے کو ایک مذاق سمجھ لیا تھا اور اپنے والدین اور اس کے والدین تک کو اس گھٹیا مذاق کا حصہ بنا لیا تھا اس بات سے قطع نظر کہ کل کو اس کے اس فیصلے کا کیا انجام ہوگا اور اس انجام پر ان سب کے کیا تاثرات ہوں گے۔

اسے اگر فکر تھی تو صرف اور صرف اپنی انا کی، تو بھلا نمل کو اس کے ساتھ وعدہ خلافی کر کے شرمندگی کیوں ہوتی چنانچہ اپنے وعدہ سے دست بردار ہونے کو وہ اپنے لیے بالکل جائز سمجھتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ خود اعتماد لہجے میں بولی۔

"میں اتنی بے وقوف ہوں بھی نہیں کہ اس کے جان مانگنے پر اپنی جان دے دوں۔ ایک فضول سی شرط اگر یہ جیت گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس کی غلام ہو گئی ہوں اور یہ جو کہے گا میں کر گزروں گی۔" نمل نے بدتمیزی کی حد کر دی تھی۔

خرم کا چہرہ اپنی سبکی کے خیال سے سرخ ہو گیا تھا اتنے لوگوں کے بیچ نمل کا یہ لہجہ اور گفتگو اسے اپنی توہین لگی تھی۔

سب جانتے تھے وہ اس کی منگیتر ہے ایسے میں ان کے درمیان دوستی یا محبت ہونا تو دور کی بات تھی وہ تو خرم سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کر رہی تھی۔

خرم کے دوست تو پہلے ہی سب کچھ جانتے تھے مگر ان لڑکیوں کے لیے نمل کا رویہ واقعی ناقابل فہم تھا وہ کچھ کھوجتی نظروں سے ان دونوں کے چہرے پڑھنے کی کوشش کرنے لگیں اور جب کچھ اخذ نہ کر سکیں یا جو جان پائی تھیں اس کی تصدیق کرنے کے لیے آسیہ نے تو پوچھ بھی لیا۔

"کیا بات ہے نمل؟ کیا تم دونوں کا کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا ہے بڑی اکھڑی اکھڑی ہو تم خرم کے ساتھ۔" اگر خرم کے برا مان جانے کی فکر نہ ہوتی تو یقیناً" یہ سوال آسیہ اس سے بہت برے اور مختلف انداز میں کرتی۔

مگر اب بھی اس کا سوال خرم کو سخت ناگوار لگا تھا لیکن اس وقت کچھ بھی کہنا فضول تھا جو بھی جواب دینا تھا وہ نمل کو دینا تھا اور اس سے کسی مروت اور لحاظ کا پاس رکھ کر جواب دینے کی خرم کو کوئی امید نہیں تھی مگر خرم کی توقع کے برعکس نمل نے فوراً" اپنے اور اس کے بیچ زبردستی کی منگنی کا اعتراف کرنے کی بجائے کچھ لمحے خاموش رہنے میں مصرف کر دیے۔

اور یہ کچھ لمحے سنبل کے لیے بہت تھے اسے بھی خرم کی طرح نمل سے ہر بات کی امید تھی چنانچہ وہ نمل سے پہلے بول پڑی۔

"بھئی اگر جھگڑا بھی ہوا ہے تو وہ دونوں خود آپس میں Solve کر لیں گے تمہیں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔" سنبل کو کہتے ہی اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہو گیا تو وہ فوراً" ہی خوش مزاجی سے کہنے لگی۔

"کتنی دیر ہو گئی تم لوگوں کو آئے ہوئے اور تم سب یہیں سے کھڑے ہو چلو اندر چل کر بیٹھو تم سب نے تو دولہا کو بھی نہیں دیکھا ہو گا۔" اس کی بات پر ایک لڑکی جیسے چونکتے ہوئے بولی۔

"ہاں 'دیکھو نا رومیلہ بھی کیسی پاگل ہے اس کے پاس اپنے منگیتر کی موبائل میں کوئی پکس ہی نہیں ہیں۔"

"وہ اصل میں کینیڈا میں رہتا ہے نا اس لیے رومیلہ نے اسے خود بھی نہیں دیکھا ہے۔" آسیہ نے صرف اپنی معلومات جھاڑنے کے لیے کہا ورنہ اس کی سوچ بھی وہی تھی جو اس کے پاس کھڑی شہناز کی تھی۔

"آج کل ایسی شادیاں کہاں ہوتی ہیں اور کینیڈا کون سا دور ہے کہ ایک تصویر نہ آ سکے۔ رومیلہ جھوٹ بولتی ہے ورنہ تو آدھی آدھی رات تک نیٹ پر بیٹھ کر باتیں بھی کرتی ہو گی۔" نمل اور سنبل بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

سنبل نے جس مقصد کے تحت یہ ذکر نکالا تھا وہ پورا ہو گیا تھا آسیہ 'خرم اور نمل کی بجائے رومیلہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی لہٰذا اب رومیلہ کی طرف داری کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہیں وہ ایک بار پھر اسی موضوع پر نہ آ جائے جس سے اسے ہٹایا تھا۔

خرم بھی اس موضوع کو بدلتا دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا البتہ حمید اور روکی اسے آنکھوں سے اشارہ کر رہے تھے۔ آخر وہ اتنی بڑی شرط جیتا تھا اور جیتنے کے باوجود خاموش کھڑا تھا اسے نمل سے کچھ تو منوانا چاہیے تھا۔

مگر خرم جان بوجھ کر ان کے اشاروں کو ان دیکھا کر رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نمل کو کسی کام پر مجبور کرنا آسان نہیں وہ اگر زیادہ ضد پر آ گئی تو خرم کو سب کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دے گی اور وہ اس مقولے پر پوری طرح یقین رکھتا تھا کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

اس وقت نمل کو چھیڑنا خود اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا کیونکہ اس وقت اس سے کچھ منوانا ناممکن

اور اپنی بے عزتی کرنا عین ممکن تھا۔

چنانچہ وہ اتنی بہترین شرط جیت کر بھی فی الحال بالکل انجان بنا کھڑا تھا یہ اور بات تھی کہ اس نے تہیہ کر رکھا تھا نمل کو مزا ضرور چکھائے گا جو اتنی ڈھٹائی سے اپنی بات سے مکر گئی۔

آسیہ وغیرہ نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو خرم کا دل چاہا یہیں سے واپس پلٹ جائے مگر یہاں آنے سے پہلے وہ حمید وغیرہ کے سامنے خاصے جوش و خروش کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

اس لیے اب بغیر کھانا کھائے الٹے قدموں لوٹ جانے پر سب یہی سوچتے کہ وہ دلبرداشتہ ہو کر جا رہا ہے اور کوئی اس سے ہمدردی کرے یا اس پر ترس کھانے کی آڑ میں اس کا مذاق اڑائے یہ خرم کو ہر گز گوارا نہیں تھا لہٰذا وہ بھی ہارے بندھے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

مگر نمل کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"مجھے پتا تھا تم ہارنے کے بعد اپنے وعدے سے ایسے ہی مکر جاؤ گی مجھے تم سے کچھ منوانا تھا بھی نہیں۔ تم نے چیلنج کیا میں نے عادت کے مطابق قبول کر لیا اور عادت کے ہی مطابق جیت بھی گیا اب تم اپنی جھینپ مٹانے کے لیے اتنے مشکل کام کو بھلے ہی "ایک فضول چیلنج کہو" یا سب کے سامنے اپنی بات سے پھر جاؤ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ویسے بھی مجھے تم سے منوانا ہی کیا تھا تمہیں تو ویسے بھی مستقبل میں میری ساری باتیں ماننی ہیں پھر اگر اپنی انا کی تسکین کے لیے تم ابھی ایک دو چھوٹے موٹے مذاق پر سیریس ہو کر انہیں رد کر بھی دیتی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے تمہیں معلوم تو ہے میری عادت 'میں کہتا ہوں تا who cares۔" خرم نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور اس کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گیا تو نمل اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے صرف سر جھٹک کر رہ گئی جس پر سنبل نے ان سب کے ہٹ جانے کے بعد بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں آئندہ کے لیے مسائل کھڑے کر رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟" نمل واقعی نہیں سمجھی۔

"خرم ٹھیک ہی کہہ رہا تھا آئندہ تمہیں اس کی ہر بات ماننی ہے پھر کیوں اسے اپنے اتنے خلاف کر رہی ہو کہ باقی کی زندگی اپنے رویوں کا حساب دیتے ہوئے گزر جائے۔"

"ایسا تب ہو گا جب خرم مجھ سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گا۔" نمل نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"تو کیا تمہیں نہیں لگتا کہ وہ کامیاب ہو جائے گا۔" سنبل نے الٹا اسی سے پوچھا اور اس سے پہلے کہ نمل کچھ کہتی وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ بولی۔

"ابھی تک تو خرم جو کہہ رہا ہے وہ کر رہا ہے کہیں کسی بھی مقام پر اسے ناکامی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا۔" اس کی بات پر نمل نے چاہا کہ وہ کچھ کہے مگر جیسے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر سنبل کو دیکھتے رہنے کے بعد اندر کی طرف بڑھ گئی تو سنبل بھی گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

رومیلہ عجیب پریشان سے انداز میں چلتی اسٹیج کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی کی جانب بڑھ رہی تھی جو کچھ بھی اب تک اس کے اردگرد ہو رہا تھا وہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

جب اس کا نکاح پڑھایا جا رہا تھا تو اپنے حق مہر پر وہ چونک پڑی تھی۔

اس کا مہر ایک کروڑ روپے رائج الوقت تھا جسے سن کر وہ ہونق ہی تو بن گئی تھی پھر یہ سوچ کر اس نے خود کو تسلی دے دی کہ لڑکے والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا تبھی اتنا مہر مقرر کیا گیا ہے ورنہ اگر وہ لوگ انکار کرتے تو بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

البتہ اسے حیرت ضرور تھی کہ ایک تو وہ ابرار بھائی کا دوست تھا دوسرے وہ جن حالات میں شادی کر رہا تھا اس کا شادی پر رضامند ہو جانا ہی بہت بڑا احسان تھا پھر ابرار بھائی کو اتنا مہر مقرر کر کے ان کے احسان کو شرمندہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مگر شاید یہ سب ابرار بھائی نے اس کے تحفظ کے لیے کیا تھا جو بھی تھا رومیلہ کے لیے بڑا عجیب تجربہ تھا پھر نکاح ہونے کے بعد اسے لا کر اسٹیج پر دولہا کے ساتھ بٹھا دیا گیا تو تھوڑی دیر بت بنے رہنے کے بعد رومیلہ کو احساس ہوا کہ اس کے برابر میں براجمان شخص بھی ایک بت کی طرح بیٹھا ہے۔

وہ اس کی طرف تو کیا کسی کی بھی طرف متوجہ نہیں تھا اس کی دوستیں نمل اور سنبل کے ساتھ اسٹیج پر آئیں اور اس کے ساتھ اتنی باتیں کرنے کی کوشش کیں مگر وہ مختصر ترین الفاظ میں صرف "ہوں، ہاں" اور "جی" کہہ کر رہ گیا اور یہ الفاظ بھی اس نے جس طرح ادا کیے تھے اس سے لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے سر پر ڈنڈا لیے کھڑا ہے اور اس نے سخت مجبوری کے عالم میں یہ اتنی تھوڑی بہت بات چیت کی ہے۔

نمل اور سنبل تو یہ رویہ دیکھ کر فوراً ہٹ گئیں آسیہ وغیرہ بھی کچھ لحاظ کر گئیں مگر اس کی کزنز نے تو جیسے تہیہ کر رکھا تھا دولہا کو زچ کرنے کا۔

ان کی اوٹ پٹانگ چھیڑ چھاڑ پر رومیلہ کو بھی کوفت ہونے لگی تھی مگر وہ تھیں کہ الیان کا اتنا سنجیدہ رویہ دیکھ کر بھی ذرا شرمندہ نہیں ہو رہی تھیں۔

ایسے میں اسے نمل اور سنبل پر بڑا غصہ آیا تھا جنہوں نے پہلے ہی آنے میں اتنی دیر لگائی تھی کہ اس کا نکاح بھی ہو گیا اور وہ موجود ہی نہیں تھیں اور اب بھی وہ جانے کہاں غائب تھیں کہ ایک بار اسٹیج سے اتر کر دوبارہ نظر ہی نہیں آئیں یہاں تک کہ کھانا بھی کھل گیا۔

ابرار بھائی بھی سب کچھ فاسٹ فاسٹ کر رہے تھے پہلے نکاح ہوتے ہی اسے لایا گیا اور اس کے آتے ہی کھانا کھول دیا اور ابھی کھانا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ رخصتی کا شور مچ گیا۔

رومیلہ شرم بالائے طاق رکھ کر الجھن بھری نظروں سے اپنے اردگرد دیکھنے لگی۔

اسٹیج سے سامنے کا منظر بڑا واضح تھا لوگ گول میزوں کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھے کھانا تناول فرما رہے تھے جن میں سے کچھ لوگوں کو وہ جانتی تھی اور کچھ کو نہیں جانتی تھی۔

پتا نہیں ان میں سے دولہا والے کون تھے ابھی تک تو کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا یہاں تک کہ دولہا کے والدین تک کا کوئی اتا پتا نہیں تھا اگر اس نے اپنی کزنز کو الیان سے یہ کہتے سنا ہوتا تو وہ سوچتی کہ شاید لڑکے والوں میں کوئی آیا ہی نہیں ہے لیکن اس کی کزن نے بڑے تپاک سے کہا تھا۔

"بھئی آپ کے تو پیرنٹس اتنے ینگ اور اسمارٹ ہیں کہ آپ کو تو گڈ لکنگ ہونا ہی تھا۔" اس کے اتنے کھل کر تعریف کرنے پر بھی الیان نے جواب میں کچھ نہیں کہا تو اس پل رومیلہ کا شدت سے دل چاہا وہ گردن گھما کر الیان کو دیکھے مگر وہ ایسا کر نہ سکی اور جلد ہی اپنی حیرت میں بھول بھی گئی رومیلہ کے حیران ہونے میں اضافے کا سبب اس کے اپنے بابا جانی اور ابرار بھائی بھی تھے۔

ابرار بھائی نے ایک بار بھی اسٹیج پر آ کر الیان سے کوئی بات نہیں کی تھی بابا جانی صرف ایک بار آئے تھے جنہیں الیان نے اٹھ کر سلام کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا بابا جانی نے خود ہی اس کی خیریت پوچھی جس پر اس نے

بڑے روکھے سے انداز میں۔

"ٹھیک ہوں۔" کہہ کر جواب دیا تھا تو بابا جانی نے بھی زیادہ بات نہیں کی بلکہ بیرے کو ان کے لیے کھانا لانے کے لیے بلانے لگے۔

"کھانا لانے کی کوئی ضرورت نہیں مجھے بالکل بھوک نہیں ہے بلکہ اس ڈرامے کو جلدی ختم کر کے آپ رخصتی کرا دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔" الیان کی بات اور لہجہ دونوں ہی رومیلہ کے لیے حیران کن تھے۔

وہ بے اختیار گردن گھما کر الیان کو دیکھنے والی تھی کہ بابا جانی کے جملے نے اسے اتنا ششدر کر دیا کہ وہ ان کے تاثرات دیکھنے میں الیان کو ایک بار پھر بھول گئی۔

"ٹھیک ہے بیٹے چلو رومیلہ کھڑی ہو جاؤ۔" بابا جانی ایسے کہہ رہے تھے جیسے اسے اسکول بھیجنے کے لیے سوتے میں سے جگا رہے ہوں۔

رومیلہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

بھلا یہ کیسی شادی اور کیسی بارات تھی کہ دولہا کے والدین تک اٹھ کر اس کے پاس نہیں آئے اور دولہا نے ایک بار کھانے کے لیے منع کیا تو اسے اصرار کر کے کھلانے کی بجائے رومیلہ تک کا کھانا گول کر دیا۔

ہر چند کہ اس وقت کسی بھی لڑکی کو کھانے کی خواہش نہیں ہوتی مگر لڑکی کے گھر والے اپنے طور پر کوشش تو کرتے ہی ہیں۔

بے اختیار اس نے نمل اور سنبل کی تلاش میں نظریں گھمائیں تو لوگوں کے رش میں وہ انہیں دیکھ ہی نہ سکی یا شاید اس کا ذہن اتنا منتشر تھا کہ وہ اگر سامنے بھی کھڑی ہوتیں تو اسے دکھائی نہ دیتیں۔

ایک بار پھر اسے ان دونوں پر شدید غصہ آنے لگا جب اس کا نکاح ہو رہا تھا تب بھی وہ دونوں موجود نہیں تھیں جب اسٹیج پر وہ دونوں آئیں تو الیان کی موجودگی کی وجہ سے وہ انہیں کچھ کہہ نہ سکی البتہ سنبل نے خود ہی اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجے میں کہہ دیا تھا۔

"سوری یار ہم لوگ نکاح کے وقت ایک فضول شرط میں پھنس کر آ نہیں سکے۔ اصل میں مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ بارات کے آتے ہی نکاح بھی ہو جائے گا۔ خیر بہت بہت مبارک ہو۔" رومیلہ شرط کا لفظ سن کر الجھی تو تھی مگر کوئی سوال نہ کر سکی وہ خود اس جلد بازی پر حیران تھی چنانچہ سنبل کے منہ سے بھی یہی بات سن کر اس کا دھیان ایک بار پھر اس افراتفری کے متعلق سوچنے لگا تھا۔

لیکن اب جبکہ الیان، بابا جانی کے کہتے ہی کھڑا ہو گیا تھا رومیلہ کو اپنا بیٹھنا بڑا عجیب لگ رہا تھا مگر کسی کے کہے بغیر خود سے کھڑا ہو جانا اس سے بھی زیادہ عجیب لگ رہا تھا جیسے اسے رخصتی کی بڑی جلدی ہو۔

"اب اٹھ بھی جاؤ۔" اس کے سر پر کھڑے الیان نے یقیناً اسے ہی مخاطب کیا تھا مگر اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی ملازم سے ہم کلام ہو۔

رومیلہ نے بالکل غیر ارادی طور پر سر اٹھا کر الیان کی جانب دیکھا۔

جو اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی جانب ایک تحکمانہ جملہ اچھال کر اب مجمع میں کسی کو چلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

سوٹ بوٹ میں ملبوس اس کے سامنے کھڑا شخص جواب اس کا شوہر تھا یقیناً بہت وجیہہ اور خوبرو تھا مگر چہرے پر پھیلی ناگواری اور پیشانی پر پڑے بل، اس کی ظاہری شخصیت سے زیادہ اس کی باطنی حالت کی طرف رومیلہ کو متوجہ کر گئے تھے۔

رومیلہ نے چند سیکنڈز اسے دیکھنے کے بعد اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو ایک میز کے پاس کھڑا جوڑا اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

شکل اور حلیے سے ہی وہ دونوں میاں بیوی بہت مہذب اور اونچے گھرانے کے لگ رہے تھے مگران دونوں کے چہروں پر بھی الیان کی طرح سنجیدگی پھیلی تھی جو بغیر بتائے رومیلہ کو بتا گئے تھے کہ وہی الیان کے والدین ہیں۔

رومیلہ کو یہ اندازہ تو پہلے سے تھا کہ ابرار بھائی کا جو دوست اس کے ساتھ شادی کے لیے تیار ہوا ہے اس کے لیے یہ فیصلہ بڑا مشکل رہا ہوگا اور اس سے بھی زیادہ کٹھن اس کے والدین اور گھر والوں کے لیے ہوگا۔

اسی لیے اسے امید تھی کہ وہ کسی روایتی انداز میں بارات نہیں لائے ہوں گے اور نہ ہی ان کے ساتھ باراتیوں کا اتنا بڑا مجمع ہوگا جتنا کہ عموماً ہوتا ہے۔

لیکن یہاں تو ان تینوں کے سوا شاید کوئی تھا ہی نہیں اور ان تینوں کے چہروں اور رویوں سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے بڑی مجبوری کے عالم میں آگئے ہوں۔

ابھی رومیلہ اس کے والدین کو دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک بھابھی اس کے قریب آکر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں۔

"چلو رومیلہ اٹھو۔" رومیلہ نے ایک گہرا سانس کھینچتے ہوئے نظریں جھکائیں اور کھڑی ہو گئی۔

اسے اٹھتا دیکھ کر عمبل اور سنبل بھی تیزی سے اس کے نزدیک چلی آئیں انہیں حیرت ہوئی تھی کہ اسے کھانا تک نہیں کھلایا گیا اور رخصتی شروع کردی گئی۔

اصل میں الیان کا رویہ اتنا سنجیدہ تھا کہ وہ دونوں ایک بار کے بعد دوبارہ اسٹیج پر آئی ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہو رہا تھا کہ ابھی رومیلہ کے تمام رشتے دار بھی رومیلہ کے پاس جاکر اسے مبارک باد نہیں دے سکے تھے پھر بھلا وہ دونوں کیسے قبضہ جما کر بیٹھ جاتیں۔

اب بھی رخصتی شروع ہوتی دیکھ کر اس کی کزنز اس کے اردگرد جمع ہو گئیں تو وہ دونوں ایک بار پھر ریڈ کارپٹ کے کنارے پر آکر کھڑی ہو گئیں اور اسے الیان کے ساتھ جاتا دیکھنے لگیں۔

رومیلہ کو باہر نکلنے سے پہلے ایک بڑی سی چادر اوڑھا دی گئی تھی لہٰذا اسے بالکل اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ابرار بھائی کہاں ہیں لیکن اس کا وجدان کہہ رہا تھا ابرار بھائی اس کے آس پاس کہیں نہیں ہے وہ منظر سے بالکل غائب ہیں اور ایسا کیوں ہے اس سوال کا جواب اس کے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اس پر ایک عجیب سی گھبراہٹ سوار ہونے لگی اسے بالکل بھی رونا نہیں آیا تھا جیسا کہ عموماً لڑکیوں کی اس موقع پر آنکھیں بہنے لگتی ہیں۔

شاید اس کے ساتھ سب کچھ ہی روایتی انداز سے ہٹ کر ہو رہا تھا البتہ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے بابا جانی نے اسے گلے لگا کر بڑے گلوگیر لہجے میں دعائیں دیں تو اس کا دل بری طرح بھر آیا۔

اس پل اس کے اندر شدید خواہش ابھری کہ اس سینے کے اندر منہ چھپا کر ساری زندگی گزار دے اور ان لوگوں کے ساتھ جانے سے [illegible] انکار کردے۔

مگر ایسا کہاں ممکن تھا تھوڑی دیر بعد بابا جانی نے خود ہی اسے الگ کردیا تو وہ بھابھی کی رہنمائی میں گاڑی میں بیٹھ گئی اب اسے چادر کے باعث کچھ نظر تو آنہیں رہا تھا مگر اتنا اندازہ ضرور ہوا تھا کہ اس کے بعد گاڑی میں کوئی بیٹھا نہیں۔ یعنی سب لوگ اس سے پہلے ہی گاڑی میں سوار ہو چکے تھے۔

اپنے برابر میں اسے کسی عورت کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جبکہ دوسری طرف جہاں الیان کو ہونا چاہیے تھا وہاں کوئی نہیں تھا اور جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی شگفتہ ریاض ایسے بولیں جیسے بڑی دیر سے بولنے کے لیے بے چین ہوں۔

"الیان تمہارے پاس کوئی فون آیا۔ وہ کب گھر آئے گی۔ انہیں کہو اب اسے فوراً بھیج دیں۔" ان کے لہجے

میں جتنی بے قراری تھی الیان نے اس لحاظ سے جواب دینے میں بڑی سستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے مرے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں۔" کہا تب رومیلہ کو اندازہ ہوا کہ الیان ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہے اور اس کے والد بھی وہیں ساتھ بیٹھے ہیں کیونکہ شگفتہ غفار کے دوسرے جملے کا جواب انہوں نے دیا تھا۔

"کیوں ابھی تک کوئی فون کیوں نہیں آیا اب تو ہم نے ان کی بات مان لی ہے۔" شگفتہ غفار بالکل روہانسی ہو گئیں تو ریاض غفار چڑ کر بولے۔

"آجائے گا فون تھوڑا صبر کرلو۔ وہاں بھی تم نے بڑی بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا ہے اور الیان تمہیں کیا ہو گیا تھا تم تو گھر سے چلتے وقت بہت بڑی بڑی باتیں کر رہے تھے ہمارا غلط رویہ خود ہمارے لیے نقصان دہ ہے ہمیں۔"

"ہم اس موضوع پر گھر جاکر بات کریں گے آپ دونوں پلیز ابھی خاموش رہیں۔" الیان نے ریاض غفار کی بات کاٹ دی رومیلہ جو بغور انہیں سن رہی تھی سب کے اچانک خاموش ہو جانے پر بری طرح الجھ گئی ویسے ہی ان کی گفتگو اس کی سمجھ سے بالاتر تھی اس پر الیان کا پراسرار سا لہجہ جسے سن کر اس کے والدین بالکل چپ ہو گئے تھے خود رومیلہ کی پریشانی بڑھا گیا تھا بلکہ اس نے تو ریاض غفار کو بھی سرگوشیانہ انداز میں کچھ کہتے سنا مگر الفاظ سمجھ میں نہ آسکے جس کے جواب میں الیان نے اس سے بھی زیادہ دھیمی آواز میں جانے کیا کہا کہ ریاض غفار اس کے بعد کچھ نہ بولے اور بالآخر گاڑی ایک جگہ آکر رک گئی۔

سب سے پہلے الیان گاڑی سے اترا پھر وہ دونوں بھی اتر گئے اور رومیلہ انتظار کرنے لگی کہ شاید اسے بھی کوئی اترنے کو کہے گا مگر اس کا انتظار طویل ہوتا گیا اور کوئی اسے اتارنے نہیں آیا۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

☆ ☆

عنبرین اعجاز

راستہ بھٹکنے سے تو بہتر ہے کہ راستہ پوچھ لیا جائے۔ لیکن یہ بات ماہی جھمیلی کو سمجھائے کون؟ ماہی جھمیلی' جن کا اصل نام جمیلہ تھا' کی شخصیت ہی کچھ ایسی لش پش قسم کی تھی کہ جہاں بھی جلوہ گر ہوتیں' اپنے گرد ایک جھمیلا اور میلہ سا لگا لیتیں۔ بچپن میں ہی ان کا نام جمیلہ سے جھمیلا اور پھر جھمیلی پڑ گیا۔

ماہی جھمیلی بچپن سے ہی اپنی دھن کی پکی اور مزاجا" ایسی سخت واقع ہوئی تھیں کہ گماں ہوتا تھا گویا عہد طفولیت میں مٹی کی بجائے سیمنٹ کھاتی رہی ہوں۔ ہمہ وقت ان کے منہ میں پیٹرول بم کے ذخائر کٹھی میٹھی ہاجمولا کی طرح دائیں بائیں ڈولتے پھرتے۔ کبھی بھی' کہیں بھی' کسی بھی وقت غیر متوقع حملہ سامنے والے کو "محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی" کی عملی تفسیر بنانے کو کافی تھا۔ بقول ماہی جھمیلی کے نانا میاں کہ "ان کی جھمیلی قسمت کی دھنی ہے دھنی! اور اپنی خوش قسمتی کے اسٹامپ پیپر پر اللہ سے پکے ٹھپے (مہریں) لگوا کے پھر اس دنیا میں اتری ہے۔"

درست فرماتے تھے بزرگوار' تب ہی تو ان کی شادی دو بہنوں کے اکلوتے لاڈلے چہیتے انجینئر بھائی سے ہو گئی۔ بہنیں شادی شدہ' اپنے گھروں میں شاد آباد' ماہی جھمیلی اکلوتی بہو' اکلوتی بھابھی اور اکلوتی مامی کے تمام ٹائٹلز کی اکلوتی وارث۔ ماہی جھمیلی اکنامکس میں ماسٹرز تھیں اور حساب کتاب میں حد درجہ ماہر۔ ادھار تو وہ کسی کی بات کا بھی نہ رکھتیں' بلکہ ہر اک کو سود سمیت جواب لوٹاتیں۔ کس بہن کے کس بچے کو کس موقع پر کتنا لیا اور اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کے مصداق انہوں نے کب' کیا اور کتنا دیا' ان کی یادداشت میں ذخیرہ رہتا۔ چونکہ وہ اپنی ذات میں ماہر اقتصادیات تھیں' اس لیے وقت کی قدر کا بھی انہیں بھرپور احساس تھا اور وقت کی قدر و قیمت کے درست استعمال سے بخوبی واقف تھیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی بڑی نند کو تو خاص طور پر سختی سے آرڈر جاری کر رکھے تھے کہ آنے سے کم از کم ایک دن پہلے انہیں ضرور مطلع کر دیا جائے' دراصل بڑی نند اسی شہر میں مقیم تھیں' اس لیے ان کے لیے احکامات قدرے سخت تھے۔

ماہی جھمیلی بڑی نند کی آمد سے پہلے پہلے کوکنگ بیکنگ کے کئی بڑے بڑے پر مشقت پروجیکٹس کا افتتاح کر رکھتیں' عموما" ایسی ڈشز ہوتیں جنہیں تادیر فریز کیا جا سکتا ہو۔ چنانچہ بڑی نند اپنی والدہ محترمہ سے ملاقات کرنے اپنی پھولی ہوئی بے قاعدہ سانسوں اور جوڑوں کا درد سنبھالتی' اپنی لاڈو بھابھی کے سیکنڈ فلور پر پہنچتیں تو سامنے ہی لاؤنج میں سینٹر ٹیبل پہ منتظر بڑے بڑے تھال اور پراتیں ان کے پرتپاک استقبال کو موجود ہوتے۔ بھابھو جانی کے اس "ہوم ورک" کے ختم ہوتے ہی ماہی جھمیلی کی بے انتہا سرگمیں نگاہوں کی سوئیاں وال کلاک کی سوئیوں سے چپک جاتیں۔

بڑی نند بمشکل تمام اپنی دکھتی کمر کو سنبھالتی' چٹاخے بجاتے گھٹنوں پہ رکھ کے کھڑی ہوتیں اور ماں سے گلے ملنے کے بعد آہستہ آہستہ زینے اترنے لگتیں۔ جب آدھی سیڑھیاں اتر لی جاتیں تو ماہی جھمیلی اوپر سے ہی ریلنگ پہ جھوم لہرا کے' باچھیں کھول کے ہنستے ہوئے ازراہ تکلف یا رسما" چائے کی پیش کش اس انداز سے کرتیں کہ ازراہ تکلف سے زیادہ ازراہ مذاق معلوم ہوتا۔ بڑی نند صاحبہ سوکھے منہ' خشک زبان اور پیاسا حلق لیے صحرائی لہجے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے بقیہ ماندہ سیڑھیاں بھی اتر جاتیں۔ اب تو بوڑھی ماں سے ملنا بھی دن بہ دن دشوار ہوتا جا رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ مذکورہ "ہیومن ریسورس مینجمنٹ" کے علاوہ بھی ماہی جھمیلی بچت کا بھی پورا پورا خیال رکھتی تھیں۔ اگر عید کے موقع پر نند کے گھر کریم کیک یا چکن پیٹیز لے جانے پڑ ہی جاتے تو سیدھا میزبان کے کچن میں جا گھستیں۔ چائے کی تیاری میں مدد کے بہانے خوب اداکاری و صداکاری کرتیں۔ صداکاری کافی بلند ہوتی' تاکہ ڈرائنگ روم یا لاؤنج میں

موجود میاں جانی کے کانوں کے راستے سے دل ودماغ تک یہ احساس مضبوطی سے جڑ پکڑ سکے کہ میری چہیتی بیگم میری بوڑھی بہن اور نکمی سست جوان بھانجی کے ساتھ کچن میں چائے تیار کروا رہی ہے' بلکہ امپریشن ہی یہ دیا جاتا کہ سارا خاندان ہی کاہل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ واقعی یہ سارا خاندان کاہل الوجود ثابت ہوا تھا' مامی جھمیلی کی منافقانہ پھرتیوں کے سامنے۔

مامی جھمیلی اپنے اصل ٹارگٹ کو چائے کی ٹرالی کے عین وسط میں سب سے اوپر سجا کے لاتیں' سینٹر ٹیبل پہ وہ کیک یا پیٹیز رکھے جاتے جو ان کے شوہر نامدار کی حق حلال کی کمائی کے ہوتے۔ بعدازاں مامی' ماموں کے بچے ان پر ہلہ بول دیتے' جبکہ باقی ادھوری ٹرالی وہ نندوئی صاحب کی سمت دھکیل دیتیں۔ اگر کوئی بچہ شدید قسم کے پیٹ درد کی شکایت کرتا اور کھانے سے انکار کرتا تو مامی اسے یوں خون آشام نظروں سے گھورتیں گویا کہہ رہی ہوں۔

"اگر تو نے یہ نہ کھایا تو میں تجھے کھا جاؤں گی۔" اور اگر ماموں جان ساتھ میں کوکا کولا یا اسپرائیٹ کی لیٹر بوتل بھی ساتھ لے آتے تو اور شامت آتی۔

"پی کم بخت' پی' ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" مامی ڈریکولا کی طرح دانت اور آنکھیں نکال کے یوں وارننگ دیتیں گویا ابھی بار بی کیو بنا ڈالیں گی۔ بچہ بے چارہ غٹاغٹ گلاس چڑھانے لگتا۔ ادھر ننھے کزن کو قے شروع ہوتی۔ ادھر بڑی بھانجی جھٹ سے فرسٹ ایڈ کا ڈبا تھامے ڈرائنگ روم میں آموجود ہوتی۔ اس فرسٹ ایڈ باکس کم ٹرے میں اسفنج مگ' کارپٹ کلینز سلوشن' ٹشو' تولیہ اور دو' چار مزید کلینزنگ آئٹمز ہوتے' مریض بچے کو فی الفور بڑی پھوپھو کے حوالے کر دیا جاتا' تاکہ وہ اب اسے واش روم لے جا کر نہلا دھلا کر کپڑے بدلوا کر' بہلا پھسلا کر چپ کروائیں اور مطمئن کریں' خواہ کیسے بھی' کسی طریقے سے بھی' ہماری جانے بلا۔

ویسے بھی یہ فقرہ مامی جھمیلی کا پسندیدہ ترین تھا کہ "آخر میرے شوہر کی کمائی ہے۔" تو کیوں نہ وہ اپنے شوہر کی کمائی کا پورا پورا خیال رکھتیں اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کا ہر ممکن اقدام کرتیں' لیکن ایک بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ جب نندیں اپنی لاڈو بھابھو کے ہاں کیک یا ایسے ہی مہنگے بیکری آئٹمز لے کر جاتیں تو مامی جھمیلی جھٹ سے ڈبا چھین کے فریج میں چھپا دیتیں۔ ان کے کچن میں آنے کی تو بڑی نند یا بھانجی کو قطعی اجازت نہ تھی۔ مامی جھمیلی دونوں ماں' بیٹی کی کلائیاں اور ہاتھ بڑے دلار سے تھامتیں' زبردستی کھینچتے ہوئے انہیں ڈرائنگ روم میں لے جا بٹھاتیں۔

"منیبہ! آپی کا خیال رکھیے گا' انہیں کچن میں نہ آنے دیجیے گا' مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میرے ہوتے ہوئے یہ کام کریں۔"

مامی جھمیلی اپنے کاجل میں بجھے کارے کارے نیناں سے تیر چلاتی' لاڈ سے کہتے ہوئے کچن کی جانب پلٹ جاتیں اور ماموں میاں خوشی سے پھولے' داد طلب نظروں سے نتھنے پھلا پھلا کے' فخریہ سینہ پھلائے بڑی بہن کو دیکھتے۔ بلاشبہ انہیں اپنی بیوی پہ فخر تھا۔ اب جو ٹرالی آتی تو وہی ریڈی میڈ ڈبا بند تیز مرچیلے کباب' جس کا ایک لقمہ ہی نند کا بلڈ پریشر ہائی اور نندوئی کا معدہ مائیکرو ویو اوون بنانے کو کافی تھا۔

☼ ☼ ☼

ماموں جی بھی مامی جھمیلی کے شریک سفر بنتے ہی "جو حکم سرکار کا" کی عملی تفسیر بن چکے تھے۔ اور بنتے بھی کیوں نہ؟ مامی جھمیلی نے بھی اپنے راوی کنارے والے بابے المعروف بابا مکڑیاں والا (جس کی میلی چیکٹ دراز زلفوں میں مکڑیوں نے جالے ڈال رکھے تھے اور مچھر' مکھی اور دیگر حشرات الارض ان نرم ونازک جالوں پر باقاعدہ سرکس کے کرتب دکھاتے تھے۔) سے "حب شوہر" کی غرض سے سرمے پر کوئی بہت ہی تیز عمل کروایا تھا۔ اسی لیے مامی جھمیلی سرمے کا اتنا وافر ذخیرہ اپنی آنکھوں میں سموئے رکھتی تھیں۔ تب ہی تو یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ سرمہ' سرمے دانی سے نہیں بلکہ ٹرک کا ٹرک ہی لوڈ کر لیتی تھیں۔ سچ تو یہ تھا کہ پورا کوہ طور ان کی آنکھوں میں ایسی خیرہ کن تجلیاں مار رہا تھا کہ مامی جھمیلی جس پہ اپنی قہر آلود نگاہ ڈالتیں' اگلا وہیں جل بھن کے خاکستر اپنے انجام بد کو جا پہنچتا۔ مامی جھمیلی کا ڈسا پانی بھی نہ مانگتا تھا۔

اب تو ایک نئی مشکل آن پڑی تھی' ماموں جان کے بچوں کو ایک خاص بیکری کی نان خطائیاں بھا گئی تھیں اور وہ نان اسٹاپ' نان خطائیاں کھانے کا اچھا خاصا اسکور بنا لیتے تھے۔ اب مامی جھمیلی جب بھی اپنی نند کے ہاں جاتیں' نان خطائیوں سے بھرا ڈبا بصد اصرار لے کر جاتیں بقول ان کے "تبدیلی اچھی لگتی ہے۔"

اب پھپھو کے پورے گھر میں "نان خطائی پاؤڈر" جابجا بکھرا ہوا ملتا جو بچوں کے جو گرز تلے آنے کا نتیجہ ہوتا۔ گزشتہ دس سالوں سے اس گھر میں ڈرائنگ روم سے واش روم تک جو "قے کا سفر" جاری تھا' اس کو دیکھتے ہوئے سارے گھر سے قالین اب اٹھا لیے گئے تھے اور ٹائیلز لگا دی گئی تھیں جس سے بھانجی کو "روحانی" مسرت حاصل ہوئی تھی لیکن گزشتہ عیدین سے لے کر اب تک یہ نئی سوغات' جو متعارف کرائی گئی تھی' اپنی مثال آپ تھی۔ نند صاحبہ تاحال یہ جاننے سے قاصر تھیں کہ آخر ان سے ایسی کیا خطا سرزد ہو گئی جو بھائی بھابھی نے یکدم خطائیاں لانا شروع کر دی ہیں۔ سارا گھر کالے چیونٹوں' کیڑے مکوڑوں اور مکھیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بڑی نند کے سب سے چھوٹے لاڈلے کی آج سالگرہ تھی بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سالگرہ کی تقریب آج منائی جا رہی تھی' صرف افراد خانہ ہی تھے۔ آج ویک اینڈ تھا ورنہ سالگرہ تو دو روز پہلے گزر چکی تھی۔ ماموں جان اپنی فیملی سمیت اچانک آ گئے تھے۔ بہن نے بیٹے کی پسند کی اشیاء گلاب جامن' زردہ' کیک' چوکلیٹ موس اور تیرامیسو بڑے پیار اور اہتمام سے بنایا تھا۔ بھانجے کی طرح ماموں جی بھی میٹھے کے ازحد شوقین تھے' یہ دیسی بدیسی "میٹھی" ڈشز دیکھتے ہی دل میں گویا لڈو پھوٹنے لگے اور چکھتے ہی جھومنے لگے اور جب کھا پی کے فارغ ہوئے تو گویا بہک ہی گئے اور ایسے بہکے کہ بیوی کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بہن کا ہاتھ بلا اختیار چومتے جاتے اور تعریفوں کے پل باندھتے جاتے۔

مامی جھمیلی کے کالی رین سے نیناں اس منظر کی تاب نہ لا سکے۔ یہ احساس کمتری شدت کے ساتھ ہمیشہ سے ان کے اندر جڑ پکڑے بیٹھا تھا کہ شادی سے قبل کھانا پکانا تو در کنار انہیں تو چائے تک بنانا نہیں آتی تھی' ابا چونکہ دبئی میں ملازمت کرتے تھے تو کھانا ہمیشہ باہر سے آتا یا سب گھر والے اپنے اپنے حسب حال باہر سے کھا کر ہی گھر آتے۔ گھر میں پکانے کا رواج ہی نہ تھا' اپنا کمانا اپنا کھانا' اللہ اللہ خیر صلا۔ بس یہی لمحہ تھا چیلنج کو قبول کرنے کا' کچھ کر دکھانے کا' خود کو منوانے کا اور دنیا والوں پر یہ ثابت کرنے کا کہ

جھمیلی کین کک JhameliCanCook

حالانکہ مامی جھمیلی بہت شور شرابا کر چکی تھیں کہ آج کل تو صرف "پینڈو" لوگ ہی گھر پہ کباب' پراٹھے' کوفتے' سموسے' کیک وغیرہ بناتے ہیں' سب کچھ پکا پکایا' تیار شدہ' ڈبوں میں بند' محفوظ غذا' حفظان صحت کے اصولوں کے عین مطابق مارکیٹ میں جابجا دستیاب ہے۔ آخر اس سے استفادہ کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ لیکن یہاں ماموں جان کی وہمی طبیعت نے مامی جھمیلی کے پہاڑی مزاج کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا۔ ماموں جان کو نہ جانے کہاں سے اس وہم نے آلیا تھا کہ خدا جانے پیکٹوں میں محفوظ اشیاء میں پایا جانے والا گوشت کس جانور کا ہو اور کیسا ہو؟ ویسے بھی لاڈلے بھائی کو اپنی دونوں بہنوں کے ہاتھوں کے پکے نت نئے پکوان کا مزا لگ چکا تھا۔ اب تو یہ حال تھا کہ جس گھر میں بھی جاؤ' وہی مخصوص ذائقہ' زبان' دل اور طبیعت اوب سے گئے تھے۔ اور آج کل تو وہ کچھ زیادہ ہی مامی جھمیلی کا جملہ چرائے' وقتاً فوقتاً ان کے

گوش گزار کرتے رہتے کہ "تبدیلی اچھی لگتی ہے" اور مامی جھمیلی کڑاہی کے دانے کی طرح جل جل کر کڑھتی پھڑکتی اچھلتی رہتیں۔

ٹھیک ایک ماہ بعد مامی جھمیلی کے لاڈلے سپوت کی سالگرہ آرہی تھی۔ مامی جھمیلی دل ہی دل میں یہ چیلنج قبول کرچکی تھیں۔ (خود ساختہ چیلنج) کہ اب وہ امور خانہ داری میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرکے اپنے شوہر کی نظروں میں نمبرون کی پوزیشن' اپنی نند سے چھین کے ہی دم لیں گی۔ اس ضمن میں جو پہلا قدم انہوں نے اٹھایا وہ یہ کہ فوری طور پر وہ بک شاپ سے تین عدد کوکنگ میگزین خرید لائیں۔ اب آئے دن باورچی خانے میں نت نئی ترکیبیں آزمائی جانے لگیں اور اہل خانہ پر "تجربات" کیے جانے لگے۔

ساس امی پہ تو گویا کڑی آزمائش اتری ہوئی تھی۔ وہ بارہا اپنی نحیف آواز میں منمنا کے کہہ چکی تھیں کہ "کسی سے پوچھ لینے یا مشورہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا' ایک بار اپنی غلطی کا پتا چل جائے تو انسان آئندہ محتاط رہتا ہے۔" لیکن مامی جھمیلی کی ذاتی لغت میں "غلط" یا "غلطی" کا لفظ سرے سے موجود ہی نہ تھا اپنی دانست میں وہ ہر جگہ درست ہی درست تھیں اور ان کا تو تکیہ کلام ہی یہ تھا۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔" وہ اکثر و بیشتر ماموں میاں کو یہ شعر سناتی تھیں۔

وہ تو کچھ ہو ہی گئی تم سے محبت ورنہ
ہم تو وہ خود سر ہیں کہ اپنی بھی تمنا نہ کریں

بہرحال ان حالات میں مامی جھمیلی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا لیکن ساس امی منہ ہی منہ میں چھالیہ کترتی بڑبڑاتی رہتیں۔

"جس عورت کی نیت ہی ٹھیک نہ ہو' اس سے کھانا کبھی ٹھیک نہیں بن سکتا۔"

یہ ان کا عمر بھر کا تجربہ بھی تھا اور مشاہدہ بھی۔

مامی جھمیلی نے باورچی خانے کو کوکنگ لیبارٹری میں بدل دیا تھا جہاں چولہے کے آگے قومی و بین الاقوامی "پکوانی تجربے" کرتے تیسرا ہفتہ گزرنے کو تھا لیکن تاحال گوہر مراد ہاتھ نہ آسکا تھا۔ مامی جھمیلی نے تنگ آکر کوکنگ میگزینز کو ردی کی نذر کردیا اور اب باقاعدگی سے ٹی وی پہ کوکنگ چینلز دیکھنے لگیں۔ اب بچوں پر کارٹونز اور اسپورٹس چینل دیکھنے پر کڑی پابندی عائد کردی گئی۔ ماموں میاں بھی نیوز چینلز پہ سیاسی تبصرے دیکھنے سے محروم ہوگئے۔ لیکن بچے تو پھر بچے ہی ٹھہرے' شرارت اور بے صبری جن کی شریانوں میں خون بن کے دوڑتی تھی۔ ذرا سی دیر کو ماں کوئی فون سننے میں مگن ہوئی یا باہر دروازے تک کسی کام سے گئی' یہ تینوں آفت کے پر کالے اپنا ہوم ورک چھوڑ چھاڑ بجلی کی سی سرعت سے اٹھتے اور چینل تبدیل کرکے اپنے من پسند کارٹونز بنا پلکیں جھپکائے یوں دیکھنے لگتے گویا پہلی بار کسی عجوبے کو دیکھ رہے ہوں۔ جونہی ماں کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی' جھٹ سے چینل بدل کے بھولی مسکین صورتیں بنائے اپنی اپنی کاپی پہ گردنیں جھکائے جھک مارنے لگتے۔

شب و روز کی اس تلاش و بسیار کے بعد "ذائقے کا سفر" اپنی منزل مقصود کو جا پہنچا اور مامی جھمیلی کے ہاتھ چوکلیٹ موز کیک کی ایک شاندار ترکیب آہی گئی۔ "پالیا! پالیا!" مامی جھمیلی ارشمیدس کے الفاظ دہرا رہی تھیں اور عالم وارفتگی میں لڈی ڈال رہی تھیں۔ ماں کو اس حد تک شاداں و فرحاں دیکھ کے بڑے بیٹے نے بھی بھنگڑے ڈالنے شروع کردیے' بیٹی حسب سابق ماں کی کمر سے جا چپکی' ننھے نے کھلونوں والی ٹوکری سے جھٹ باجا نکالا اور زور زور سے بجانے لگا۔ آج پورے ایک ماہ بعد اس گھر میں زندگی ناچ رہی تھی' کامیابی کی امیدیں محو رقص تھیں۔ یہ منظر دیکھ کے ساس امی بھی خوشی سے تالیاں بجانے لگیں انہیں عہد رفتہ کا ایک مشہور زمانہ "رقص میں ہے سارا جہاں" یاد آگیا۔

☆ ☆ ☆

سالگرہ کا دن آن پہنچا تھا۔ مامی جھمیلی کا حد درجہ اعتماد دیکھ کے گماں ہوتا تھا کہ شاید اب بیکری گھر میں ہی کھل جائے گی۔ کیک اوون میں بھیجا جاچکا تھا۔ تمام اہل خانہ عالم اضطراب میں مبتلا تھے۔ ساس امی صندل کی تسبیح کے دانے بڑی تیزی سے گھما رہی تھیں ان کے ہونٹوں سے جاری ورد اور تسبیح کے دانے گویا آپس میں ریس لگا رہے تھے۔ ماموں میاں بھی موبائل پہ تیز تیز بٹن دبا کے نہ جانے کس کو نیک پیغامات کے انبار بھیج رہے تھے۔ ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ بچوں میں دھینگا مشتی شروع ہوگئی۔ مکوں اور گھونسوں کا یہ "فیملی میچ" اس وقت روک دیا گیا جب اوون میں سے اچانک ہی غیر مانوس سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں فضا سیٹیوں سے گونج اٹھی۔ چند ساعتوں کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے کسی گوریلا نے شدید بدہضمی کے بعد بڑا سا ڈکار لیا ہو۔ بعد ازاں ایک مانوس آواز سے سماعتیں آشنا ہوئیں اور وہ آواز خالی نل سے برآمد شدہ ہوا کی آواز کے مشابہہ تھی۔ اور پھر آخر میں مامی جھمیلی کی آہیں اور سسکیاں بھی مذکورہ ماحول کا حصہ بن گئیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اس سارے جھمیلے میں مامی جھمیلی مکمل طور پر بے قصور تھیں۔ سارا کیا دھرا نٹ کھٹ ببلی کا تھا۔ اسی کی وجہ سے ساری ترکیب کا ستیاناس ہوا تھا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ ابھی مامی جھمیلی نے ایک ٹی وی چینل سے آدھی ترکیب اتاری تھی کہ بریک آگیا' انہوں نے پین اور پیپر وہیں تپائی پہ رکھا اور کچن میں چولہے پہ گرا دودھ صاف کرنے چلی گئیں۔ اسی دوران ببلی نے کارٹونز لگا دیے۔ تھوڑی دیر بعد جب ماں نے کچن سے گھر کا تو جھٹ سے چینل بدل کے پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا مامی جھمیلی بھی آگئیں۔ بریک کے بعد پروگرام والوں نے پھر ریسپی کارڈ لگا دیا' اب مامی جھمیلی نے بقیہ ترکیب بھی اتارلی۔ سوئے اتفاق ہی کہیے کہ دونوں کوکنگ چینلز پر ایک ہی کیک بن رہا تھا لیکن طریقہ اور مقداریں جدا تھے۔ ببلی نے جب دوبارہ چینل بدلا تو پہلے والا چینل نہیں بلکہ دوسرا چینل لگا دیا تھا۔ مامی جھمیلی نے آدھی ترکیب پہلے چینل سے اور بقیہ آدھی دوسرے چینل کے ریسپی کارڈ سے اتارلی تھی اور ترکیب اتارتے ہی ٹی وی آف کردیا ورنہ شاید کوکنگ ایکسپرٹ یا شیف اور میزبان کو دیکھ کے ہی انہیں اندازہ ہوجاتا کہ ان سے نادانستگی میں کتنی بڑی بھول ہونے جارہی تھی' بس "نسخہ کیمیا" ہاتھ لگتے ہی خوشی سے ایسی پھولی سمائیں کہ ہوش و خرد سے ہی بیگانہ ہوگئیں۔

کچن میں ماربل شیلف سے ٹیک لگائے مامی جھمیلی اپنے دودھیا سفید دوپٹے کے پلو سے سرمگیں آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ماموں جان ان کے کندھے پہ ہاتھ دھرے دھیمے دھیمے لہجے میں دلاسے دے رہے تھے۔ پس منظر سے ایک بزرگ خاتون (ساس امی) کی لڑکھڑاتی سی بڑبڑاہٹ بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔

"راستہ بھولنے سے بہتر ہوتا ہے کہ راستہ پوچھ لیا جائے۔" لیکن یہ بات مامی جھمیلی کو سمجھائے کون؟

فراز ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

☆ ☆

مکمل ناول

مہوش افتخار

میرے بے خبر

موبائل کی بیل پہ اس نے سوئی جاگی کیفیت میں لیٹے لیٹے' قدرے ترچھا ہو کر' سائیڈ ٹیبل پہ رکھا فون اٹھا کر اسکرین پہ جگمگاتے نمبر پر نظر ڈالی اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے ٹیبل لیمپ جلاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

"ہاں بختیار' خیر تو ہے؟" کال ریسیو کرتے ہی اس نے پریشانی سے پوچھا۔ بے اختیار اس کی نظریں سامنے لگے وال کلاک کی جانب اٹھی تھیں۔ جہاں گھڑی رات کے ڈیڑھ بجا رہی تھی۔

"خیر ہے یار بس تجھے ایک ضروری خبر دینی تھی۔" دوسری طرف سے بختیار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو ذکا نے قدرے ریلیکس ہوتے ہوئے بیڈ کی پشت سے کمر ٹکالی۔

"ہاں بول۔"

"داور پاکستان پہنچ گیا ہے۔" بختیار نے اسے مطلع کیا۔

"کب؟" ذکا کی کشادہ پیشانی پہ بے اختیار بل نمودار ہو گئے۔

"پرسوں۔"

"اور تو مجھے اب اطلاع دے رہا ہے؟" اس کے چہرے اور لہجے سے یک لخت غصہ جھلکنے لگا۔

"یار مجھے تو خود ابھی کچھ دیر پہلے گاؤں پہنچنے پر پتا چلا ہے۔ یہاں اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

"کیا؟" دوسری خبر تو پہلے سے بھی بڑھ کر شاکنگ ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔ شہری آنکھوں سے یک لخت شعلے برسنے لگے تھے۔

"اور تجھ سے یہ خبر بی بی خرد کے کہنے پہ خاص طور پر چھپائی گئی تھی۔" بختیار نے اس کی لاعلمی کا اصل محرک بیان کیا تو ذکا کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ مگر وقت ابھی بھی اس کے ہاتھ سے نکلا نہیں تھا اور یہی سوچ اس کے لاوے کی طرح کھولتے خون کو قدرے ٹھنڈا کر گئی۔

"کب اور کس سے ہو رہی ہے اس کی شادی؟" اس نے انتہائی سرد لہجے میں استفسار کیا۔

"تین دن بعد بی بی کلاں کے بڑے بھائی کی پوتی سے نکاح ہے اس کا۔" چونکہ ان کے خاندان کا بی بی کلاں کے خاندان سے ملنا جلنا تھا۔ اس لیے نئی نسل تو ان لوگوں کے ناموں سے بھی ٹھیک طرح سے واقف نہ تھی۔

"ہوں.... "اس نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"اب تو میری بات غور سے سن...." اور وہ دھیرے دھیرے اپنا پلان بختیار کے گوش گزار کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج کا دروازہ کھلنے پر فون پر مصروف گفتگو نجیب جلال نے ایک پل کا توقف کرتے ہوئے دروازے کی جانب دیکھا اور اندر آنے والی ہستی کو دیکھ کر سلسلہ کلام ایک بار پھر وہیں سے جوڑا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

"بس تو پھر تم شہر سے اس طرح نکلنا کہ نکاح سے کچھ دیر پہلے پہنچ سکو اور یہاں حویلی آنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھا آغا ماما کی طرف چلے آنا۔" اور صوفے پہ ان سے قدرے فاصلے پہ نشست سنبھالتی بلقیس نجیب کو پتا چل گیا تھا کہ فون کے دوسری جانب کون ہے۔ بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے اپنے دل پہ چھائے بوجھ کو کم کرنے کی لاشعوری سی کوشش کی تھی۔ جبکہ دوسری طرف نجیب صاحب اپنے بیٹے کو اب چند احتیاطی تدابیر دے رہے تھے۔

"حفیظ سے کہہ کر سب بندوں کی تیاری رات کو ہی مکمل کروا لینا اور کل نکلنے سے پہلے ہر چیز کا خود جائزہ ضرور لینا..... راستے میں کہیں رکنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ چھوٹی سی بھی بے احتیاطی کسی بڑی مشکل کا پیش خیمہ بنے۔" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے انہوں نے ایک نظر ساتھ بیٹھی بیوی کی جانب دیکھا۔ اور ان کے چہرے سے چھلکتی پریشانی پہ وہ قصداً "اختصار سے کام لیتے ہوئے بولے۔
"چلو پھر تم اپنے دوستوں کے پاس بیٹھو میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔" کال ڈسکنیکٹ کرتے ہوئے وہ بلقیس بیگم کی طرف متوجہ ہوئے۔
"پہنچا آئے تم لوگ سامان؟"

"جی۔" وہ بوجھل لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔ وہ اور حویلی کی باقی سب خواتین' دلہن کے نکاح کا جوڑا زیورات اور دیگر سامان لے کر دوسرے گاؤں' آغا ماما کی حویلی پہنچا کر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی لوٹی تھیں۔
"تم اتنی خاموش کیوں ہو؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" نجیب جلال نے بغور ان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ہم یہ نکاح کچھ عرصے بعد نہیں کر سکتے؟" وہ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد گویا ہوئیں تو نجیب صاحب کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔
"کیوں ابھی کیا مسئلہ ہے؟"
"آپ کو نہیں پتا کہ کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے جتاتی نظروں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے جواباً "سوال کیا۔
"اگر تمہاری مراد چھوٹی حویلی والوں سے ہے تو بے فکر رہو۔ ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں ..... اور ویسے بھی یہ سب ان کی ضد کا نتیجہ ہے۔ اس لیے وہ ہمیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔" وہ اپنے ازلی پر غرور لہجے میں گویا ہوئے تو بلقیس بیگم کا دل چاہا کہ وہ ان کی تصحیح کر دیں۔ مگر وہ خواہش کے باوجود اپنی سوچ کو زباں نہ دے سکیں اور یوں بھی انہیں اس وقت صرف اپنے بیٹے کی فکر تھی۔

"مجھے صرف داؤد کی فکر ہے۔ آپ نے اسے خوامخواہ پاکستان بلوایا نکاح کا کیا ہے فون پر بھی ہو سکتا تھا۔" وہ پریشانی سے بولیں تو نجیب جلال کھول اٹھے۔
"کیوں ہو سکتا تھا؟ میں نے اپنے بیٹے کے سر پہ اسی گاؤں میں سہرا سجانے کا اعلان کیا ہے..... ہم کیا چور ہیں یا ڈرتے ہیں ان سے۔ جو اپنی خوشیاں یوں بزدلوں کی طرح چھپ کر مناتے پھریں۔ جلال بخت کے خاندان میں نہ کبھی کوئی کام چھپ کر ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ ہم جو بھی کرتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔"
"پھر چھوٹی حویلی میں بھی جلال بخت کا ہی خون بستا ہے..... ذکا بھی یہاں ڈنکے کی چوٹ پہ دھمکی دے کر گیا تھا۔" وہ دوبدو بولیں تو نجیب جلال کے لبوں پہ اک تمسخرانہ مسکراہٹ در آئی۔
"ہونہہ! اس کل کے لڑکے کی دھمکی پہ پریشان ہو؟ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔" اور بلقیس اپنے گھر کے مردوں کے غرور اور ہٹ دھرمی پہ کھول کر رہ گئیں۔ جن کے انہی رویوں کے باعث آج سارا خاندان ان سے نالاں ہوا بیٹھا تھا۔
"اور میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ دشمن کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔" اپنی بات مکمل کرتیں وہ اٹھ کر لاؤنج سے باہر نکل گئیں تو نجیب جلال کان پہ سے مکھی اڑاتے ایک بار پھر اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم بی بی خرد۔"
"وعلیکم السلام کیسی ہے پروین؟" بی بی خرد کے ساتھ ساتھ ان کی دونوں بہوئیں بھی آنے والی کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔ جو اپنے سر پہ رکھی گٹھڑی نیچے اتارتے ہوئے خود بھی دبیز قالین پہ بیٹھ گئی۔
"میں ٹھیک ہوں بی بی۔ آپ سناؤ؟ بڑے خان اور چھوٹے خان جی دونوں ٹھیک تو ہیں؟" اس نے سر اٹھاتے ہوئے سامنے صوفوں پر براجمان تینوں خواتین

کی جانب دیکھا۔
"اللہ کا شکر ہے تو سنا کیا لائی ہے؟" بی بی خرد نے مسکرا کر اپنے مخصوص نرم لہجے میں پوچھا جو کہ ہمیشہ سے ان کی باوقار شخصیت کا خاصہ رہا تھا۔
"گلے لائی تھی بی بی..... لیکن سب کے سب وہاں بڑی حویلی میں بک گئے۔ خیر سے شادی والا گھر جو ہوا۔" وہ دانت نکالتے ہوئے بولی تو تینوں خواتین بے مروتی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔
"ویسے ایک بات کہوں بی بی..... ہوا بہت برا ہے۔" ان کے اترے چہروں کو دزدیدہ نگاہوں سے تکتے ہوئے اس نے آن واحد میں لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے کہا تو بی بی جان سبھاؤ سے خود کو سنبھالتے ہوئے رحمت کو آواز دینے لگیں اور تبھی ان کی نظریں داخلی دروازے میں لب بھینچے کھڑے جمال بخت سے جا ٹکرائیں۔ جو نہ جانے کب سے وہاں کھڑے تھے۔
اسی اثنا میں رحمت دوسری جانب سے اندر چلی آئی تو بی بی جان نے اسے پروین کو صدقے کا گوشت دینے کی ہدایت دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کہا۔ ان دونوں کے ہال سے نکلتے ہی جمال بخت لمبے لمبے ڈگ بھرتے' ماں کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔
"دیکھا آپ نے اپنی قسم کا نتیجہ۔ آج کیسے کیسے لوگ ہمیں باتیں سنا رہے ہیں۔ جبکہ وہ ذلیل ہمیں بزدل گردانتے ہوئے کیسے زور و شور سے اپنی خوشیوں کے شادیانے پیٹ رہے ہیں۔" وہ غصے سے کھولتے ہوئے بولے۔ تو بی بی خرد ایک نظر بیٹے کے سرخ چہرے پر ڈالتے ہوئے رسان سے بولیں۔
"یہ باتیں اس خون خرابے سے بہت بہتر ہیں جو ہمارا ایک جذباتی قدم شروع کروا سکتا ہے اور میں اپنی آنے والی نسلوں کو یہ تباہی و بربادی ورثے میں نہیں دینا چاہتی۔ رہی بات بزدلی اور بہادری کی تو پورا خاندان جانتا ہے کہ بزدل ہم ہیں یا وہ' جنہوں نے رشتوں کو بھی کاروبار بنانے میں عار محسوس نہ کی۔"
"یہی تو رونا ہے بی بی جان کہ وہ ہماری مصلحت پسندی کو ہماری کمزوری سمجھ رہے ہیں اور ان کی یہ خوش فہمی میرا خون جلا رہی ہے۔" وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولے تو بی بی خرد اک بوجھل سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے بولیں۔
"حوصلے سے کام لو جمال۔ اگر ہم بڑے ہوش کے بجائے یوں جوش سے کام لیں گے تو بچوں کو کون صحیح غلط کا فرق سمجھائے گا۔"
"بہت مشکل ہے بی بی جان! بہت مشکل میں گل مینا کو دیکھتا ہوں تو میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔" وہ شکستہ سے انداز میں قریب پڑے صوفے پر گر سے گئے تو کمرے میں زمرد بیگم کی ہلکی ہلکی سی سسکیاں گونجنے لگیں۔ جبکہ بی بی خرد اور سلطانہ بیگم

کی آنکھیں بھی بے اختیار بھر آئیں۔

"کاش! کاش کہ ہم اپنی بچی کو اس بربادی سے بچا سکتے۔ جس کی بھینٹ اب اس کی ساری زندگی چڑھ گئی ہے۔ کاش۔" دھیرے دھیرے بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے کرب سے آنکھیں موندلی تھیں۔ ان کی ذات برادری کے بنائے ہوئے ظالم اور خودساختہ اصول کبھی یوں ان کے گلے کا پھندا بن جائیں گے انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

بی بی کلاں یعنی بڑی بی بی اور بی بی خرد یعنی چھوٹی بی بی، دونوں خان جلال بخت کی بیگمات اور ایک دوسرے کی سوتن تھیں۔ بی بی کلاں، جن کا اصل نام مرادبی بی تھا، تین بھائیوں کی اکلوتی نہایت سرچڑھی بہن تھیں۔ ان کا مزاج ان کے حسن کی طرح خاصا تیز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کے بیاہ کا معاملہ اٹھا تو ان کے والد کو اپنے دوست کے بیٹے جلال بخت سے بڑھ کر اور کوئی نہ لگا جو نہایت حلیم اور ٹھنڈی طبیعت کا مالک تھا گو کہ وہ ان کی بیٹی سے تین سال چھوٹا تھا۔ مگر پھر بھی جب انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے دوست کے سامنے کیا تو خان عبدل بخت نے اپنے دوست کا مان رکھتے ہوئے لمحے کی تاخیر کیے بنا رشتہ قبول کرلیا اور یوں مرادبی بی دلہن بن کے جلال بخت کی زندگی میں چلی آئیں۔ مگر محض ڈیڑھ ہی سال میں جلال بخت جیسے تحمل مزاج بندے کا صبر بھی مرادبی بی کی تنک مزاجی کے آگے جواب دے گیا۔ جنہوں نے نا صرف ان کی زندگی بلکہ حویلی کے سکون کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔

اپنے غلط فیصلے کا احساس خان عبدل بخت کو اب ہر لمحہ ستانے لگا۔ ایسے میں جب جلال بخت نے اپنے چچا کی نہایت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار بیٹی مرجان بی بی، سے عقد ثانی کی خواہش ظاہر کی، تو وہ چاہ کر بھی انہیں منع نہ کرسکے۔ مگر مرادبی بی نے تو گویا طوفان اٹھا دیا۔ لیکن اس بار ان کے والد اور بھائیوں نے بھی ان حالات کا تمام تر ذمہ دار انہیں ٹھہراتے ہوئے کنارہ کشی اختیار کرلی اور یوں وہ ہوا جس کے بارے میں مرادبی بی نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

مرجان بی بی نے سسرال آتے ہی اپنی خوش اخلاقی اور فہم و فراست سے نا صرف اپنے شوہر بلکہ تمام گھر والوں کا اس خوش اسلوبی سے دل جیتا کہ سبھی ان کے گرویدہ ہو گئے اور یہاں آکر مرادبی بی کا ضبط جواب دے گیا انہوں نے جلال بخت سمیت سب گھر والوں کی ناک میں وہ دم کیا کہ بالآخر جلال بخت کو انہیں دوسری حویلی میں منتقل کرنا پڑا۔ جہاں انہوں نے اپنی ساری سسرال سے قطع تعلق کرتے ہوئے ایک ایسی راج دھانی قائم کی جہاں صرف ان کی حکومت تھی۔

ان کے تینوں بیٹے نجیب، نعیم اور زبیر عادتوں اور مزاج میں ہو بہو اپنی ماں کا پرتو تھے۔ جنہیں اپنے باپ اور ان کے خاندان سے ہزاروں گلے شکوے تھے اور جن کے لیے سب کچھ ماں اور ان کا خاندان تھا۔

ایسے میں ناچاہتے ہوئے بھی جلال بخت کا جھکاؤ اپنے دیگر چار بچوں، سکندر، جمال، زینب اور کلثوم کی جانب ہو گیا جنہوں نے اپنے دادا، دادی کی شفقت، چچاؤں اور پھپھیوں کے پیار اور نیک ماں کی تربیت کا بھرپور مان رکھا تھا۔ ان کے اس جھکاؤ کو مرادبی بی نے اپنی اولاد کے سامنے "ان کے باپ کی کم ظرفی کا ایک اور ثبوت بنا کے پیش کیا۔ جس کا نتیجہ ان کے بچوں کا اپنے سوتیلے بہن بھائیوں اور ان کی ماں سے شدید نفرت کی صورت نکلا تھا۔ جو گزرتے وقت کے ساتھ اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ جب جلال بخت کی موت کے بعد ان کی وصیت نکالی گئی تو نوبت ہاتھاپائی تک پہنچ گئی۔ ایسے میں جلال بخت کے چھوٹے بھائی، فیض بخت، جو اپنے بڑے بھائی کی فوتگی کے بعد، اب اپنے گاؤں کے سردار بن چکے تھے، نے مرجان بی بی کے مشورے سے وصیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے ساری جائیداد کو دو برابر حصوں میں تقسیم کردیا اور تب کہیں جاکر بڑی حویلی کے مکینوں نے خاموشی اختیار کی تھی۔

لیکن کچھ سالوں بعد بی بی کلاں نے اپنے سب سے بڑے پوتے، داؤد نجیب جو کہ تعلیم کی غرض سے امریکہ گیا تھا کے لیے سکندر بخت کی بیٹی گل مینا کا رشتہ مانگ کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ہر کوئی بڑی حویلی والوں کی اس کایا پلٹ پہ نا صرف حیران بلکہ پریشان بھی تھا۔ مگر فیض بخت نے اپنی بڑی بھابھی کی جانب سے ہونے والی اس پیش رفت کو سراہنے کے ساتھ ساتھ دونوں گھرانوں کے لیے بہترین فیصلہ قرار دیا تھا۔ جو ان بہن بھائیوں کو ہمیشہ کے لیے ایک کرسکتا تھا۔

ان کے سمجھانے بجھانے پر ہی بالآخر بی بی خرد نے رشتہ قبول کرلیا اور یوں جلال بخت کی اپنی ساری اولاد کو اکٹھا دیکھنے کی دیرینہ آرزو ان کے مرنے کے بعد ہی سہی لیکن پوری ہو گئی تھی۔ مگر جب منگنی کے چند سال بعد شادی کی بات اٹھی تو نجیب جلال کے مطالبے نے ان سب کو حق دق کردیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" نجیب جلال کی بات پہ سکندر بخت کی پیشانی پہ بے اختیار شکنیں در آئیں۔

"کیوں کیا بیٹی کو جہیز نہیں دو گے؟" نجیب جلال نے لہجے میں مصنوعی حیرت پیدا کرتے ہوئے استفسار کیا۔ تو سکندر صاحب کی نظریں بے اختیار اپنے چچا، فیض بخت کی جانب اٹھ گئیں جو خود بھی حیران پریشان سے اپنے بھتیجے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"بیٹیوں کو جہیز ماں باپ اپنی خوشی اور رضا کے مطابق دیا کرتے ہیں نجیب! یوں منہ بھر کے مطالبہ کرنا ہماری روایت نہیں۔" فیض بخت نے اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے انہیں رسان سے ٹوکا تو وہ بنا کسی شرمندگی کے آرام سے گویا ہوئے۔

"تو میں کسی غیر سے تو نہیں اپنے بھائی سے مطالبہ کررہا ہوں۔۔۔ بھائیوں میں بھلا کیسی شرم؟"

"بات شرم کی نہیں غیرت کی ہے۔ ہم نے تو کبھی بیٹیوں سے مطالبے نہیں کیے کجا کہ اپنے بہن بھائیوں سے فرمائشیں کر کے جہیز وصول کرنا۔" انہوں نے

فہمائشی نظروں سے نجیب جلال کی جانب دیکھا۔

"گل مینا تمہارے چھوٹے بھائی کی بیٹی ہے۔ تمہیں تو اسے اپنی بیٹی بنا کے اس گھر سے رخصت کروانا چاہیے۔"

"ہاں تو بیٹی بنا کے ہی تو لے جا رہا ہوں اور یہی توقع میں سکندر سے بھی رکھتا ہوں کہ وہ داؤد کو اپنا بیٹا مانتے ہوئے اپنے حصے کی کچھ جائیداد اس کے نام کر دے اور بس۔"

"تو پھر تم بھی اپنے حصے کی کچھ جائیداد اپنی بیٹی گل مینا کے نام کر دو۔" فیض بخت روبدو گویا ہوئے تو نجیب صاحب ایک پل کے لیے گڑبڑا سے گئے۔ مگر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

"بالکل کر دوں گا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"لیکن مجھے ہے۔" سکندر بخت کی سرد آواز کمرے میں گونجی تو بھی حاضرین محفل ان کی جانب دیکھنے لگے۔ جن میں وہ پانچوں بھائی اور ان کی چچا شامل تھے۔

"کیونکہ اس طرح کی سودے بازی سے کاروبار ہوا کرتے ہیں۔ رشتے نہیں۔"

"تو تم میری نیت پہ شک کر رہے ہو؟" نجیب جلال نے انہیں سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے ایسا کرنے پہ مجبور کر رہے ہو۔" وہ بے تاثر لہجے میں گویا ہوئے تو نجیب صاحب چند لمحے انہیں گھورنے کے بعد ہوشیاری سے بولے۔

"اگر تمہیں مجھ پہ اعتبار ہی نہیں تو پھر اس بات کو آگے بڑھانے کا کیا فائدہ؟"

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" سکندر بخت کی رگیں مارے ضبط کے تن سی گئیں۔

"تم مجھے ایسا کرنے پہ مجبور کر رہے ہو۔" انہوں نے اک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ سکندر صاحب کی بات ان ہی کو لوٹائی تو سکندر بخت کا ضبط جواب دے گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے فیض بخت اونچی آواز میں بولے۔

"یہ کیا بچپنا ہے نجیب! کیا تمہیں نہیں پتا کہ ہمارے ہاں کسی کی منگیتر یا بیوہ کا پھر دوبارہ کبھی رشتہ یا شادی نہیں ہو سکتی۔۔۔ تم نے اتنی بڑی بات کہی تو کیوں؟"

"یہ بات آپ مجھے نہیں بلکہ اپنے اس بھتیجے کو سمجھائیں۔ جو محض تھوڑی سی جائیداد کے لیے اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کرنے پہ تلا بیٹھا ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولے تو سکندر بخت کھول اٹھے۔

"داد دینی پڑے گی تمہاری چالاکی کی۔ کس ہوشیاری سے تم ہمارے قبیلے کے اس اصول کو ہماری کمزوری بنا کے ہمیں بلیک میل کرنے پہ تلے بیٹھے ہو۔ رہی بات میری بیٹی کی تو تباہ وہ دونوں صورتوں میں ہو گی۔ کیونکہ تم جیسے لالچی لوگ تو اس کی ذات کو محض شرائط منوانے کا ذریعہ بنا کے رکھ دو گے۔ پتا نہیں کیا سوچ کر میں نے تمہارا اعتبار کر لیا۔ یہ مان لیا کہ تم لوگ بھی خیر کا کوئی کام کر سکتے ہو۔"

"زبان سنبھال کے بات کرو سکندر۔" نجیب جلال شرافت کا چولا اتارتے ہوئے اپنے اصل پہ اتر آئے۔

"اور تم نیت سنبھال کر بات کرو۔ دولت کی ہوس تھی تو مردوں کی طرح دو ٹوک بات کی ہوتی۔ یہ بزدلانہ چالیں چلنے کی کیا ضرورت تھی۔" سکندر بخت نے بنا کسی لگی لپٹی کے ان کی سچائی ان کے منہ پہ دے ماری تو نجیب جلال کے ساتھ ساتھ نصیر اور زبیر بھی بھڑک اٹھے۔

"چالیں چلنا ہمارا نہیں بلکہ ساری زندگی تمہارا اور تمہاری ماں کا وتیرہ رہا ہے۔۔۔ ہم نے تو خاندان کو ایک کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا۔ لیکن لگتا ہے تمہیں ہماری نیکی راس نہیں آئی۔ اس لیے ہم ابھی اور اسی وقت یہ رشتہ توڑتے ہیں۔" نصیر جلال چمک کر بولے تو فیض بخت کھول اٹھے۔

"نصیر منہ بند کرو! میرے ہوتے ہوئے تم کون ہوتے ہو یہ فیصلہ کرنے والے؟"

"آپ تو خاموش ہی رہیں فیض چچا۔ ساری زندگی مرجان بی بی اور اس کے بچوں کی طرفداری کرنے کے سوا آپ نے کیا ہی کیا ہے اپنے فیصلے ہم خود کر سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔" وہ سارے

لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے فیض بخت سے انتہائی گستاخانہ لہجے میں مخاطب ہوئے تو سکندر کے ساتھ ساتھ جمال بخت کا ضبط بھی جیسے جواب دے گیا۔

"اپنی زبان کو لگام دو نصیر۔" اگلے ہی لمحے جمال بخت نے چیل کی طرح جھپٹ کر ان کا گریبان پکڑتے ہوئے انہیں ایک جھٹکا دیا تو زبیر جلال نے جیب میں رکھی پسٹل نکال لی۔

"ہاتھ ہٹاؤ جمال! ورنہ مجھے ایک لمحہ لگے گا تمہیں ختم کرنے میں۔" پسٹل جمال بخت پہ تانے وہ زور سے چلائے تو فیض بخت نے تیزی سے آگے بڑھ کر جمال کے ہاتھوں کو نصیر کے گریبان سے جھٹک ڈالا۔

"اور مجھے ایک لمحہ لگے گا تمہیں اور تمہاری پوری نسل کو اس گاؤں سے نکالنے میں۔" فیض صاحب نے زبیر کو کسی انتہائی قدم سے باز رکھنے کے لیے قصداً انتہائی سرد لہجے میں دھمکی دی تو وہ تینوں بھائی انہیں کھا جانے والی نظروں سے تکتے ہوئے تھم سے گئے۔

"ٹھیک ہے تمہیں جائیداد چاہیے مل جائے گی لیکن تم۔"

"مجھے اب یہ رشتہ کرنا ہی نہیں۔" نجیب چچا کی بات کاٹتے قطعی لہجے میں بولے تو فیض بخت انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

"دیکھو نجیب! اتنا بڑا فیصلہ مت کرو۔ یہ گل مینا کی زندگی کا سوال ہے۔۔۔ تمہیں اگر کوئی بات بری لگی ہے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ مگر تم اتنی بڑی بات منہ سے مت نکالو۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولے۔ مگر نجیب جلال کے چہرے پہ چھائی رعونت میں کمی واقع نہ ہوئی۔

"ہم مکار لوگوں نے اپنی نیت سنبھال لی ہے۔ لہٰذا اب یہ اپنی بیٹی سنبھالیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولے تو فیض بخت کے چہرے پر ملال بکھر گیا۔

"آج پہلی بار، پہلی بار زندگی میں مجھے اپنی پرکھ۔ اپنے فیصلے پہ افسوس ہو رہا ہے۔ میں نے تمہیں پہچاننے میں بہت بڑی غلطی کی نجیب۔ بہت بڑی۔"

شدت جذبات سے ان کی آواز بے اختیار بھرا گئی تو نجیب جلال انہیں کینہ توز نگاہوں سے تکتے انتہائی سرد لہجے میں بولے۔

"تعریف کا شکریہ۔۔۔ چلو نصیر۔" وہ ایک شعلے برساتی نگاہ سکندر اور جمال پہ ڈالتے، لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے نکلتے چلے گئے تو فیض بخت بے اختیار سسک اٹھے۔

"مجھے معاف کر دو سکندر۔" انہوں نے یک لخت اپنے دونوں ہاتھ سکندر بخت کے سامنے جوڑ دیے تو وہ جیسے تڑپ اٹھے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں فیض چچا؟" انہوں نے تیزی سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"میری وجہ سے ہماری گل مینا کی زندگی برباد ہو گئی۔ بچے۔" آنسو ان کے بوڑھے چہرے پر ڈھلک آئے تو سکندر بخت کی اپنی آنکھیں بھی تیزی سے بھیگنے لگیں۔ بنا کسی خطا کے اپنی بچی کے زندہ در گور ہو جانے کا احساس ان کے دل کو اندر تک کاٹ رہا تھا۔

"یہ تباہی شاید اس کے مقدر میں رقم تھی۔" وہ بھرائے لہجے اور چھلکتی آنکھوں کے ساتھ بمشکل تمام بولے تو جمال بخت کا لرزتا ہاتھ بے اختیار اپنے بھائی کے شانے پر آ ٹھہرا۔

"دعا کیجیے گا فیض چچا اللہ مجھے اپنی بچی کا سامنا کرنے کی ہمت دے۔" وہ زخم خوردہ لہجے میں کہتے باہر کی جانب بڑھ گئے تو نڈھال سے جمال بخت بھی بھائی کے پیچھے چل دیے۔

☼ ☼ ☼

فیض بخت کے گھر سے چھوٹی حویلی تک کا راستہ گہری خاموشی میں کٹا تھا۔ ڈرائیور کے گاڑی پورچ میں روکنے پہ سکندر بخت اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکلے تو نظر سیدھی ذکا اور بختیار کی گاڑیوں سے جا ٹکرائی جو ان کی گاڑی سے آگے کھڑی تھیں۔

"نصیب اللہ!" چند لمحے پریشانی سے سامنے کھڑی

گاڑیوں کو تکنے کے بعد انہوں نے پلٹ کر گیٹ کے قریب کھڑے چوکیدار کو پکارا۔

"جی خان جی۔" وہ بھاگتا ہوا ان کے نزدیک چلا آیا۔

"یہ لوگ شہر سے کب آئے؟" انہوں نے گاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ جمال بخت بھی اس دوران گاڑی سے نکل کر سکندر صاحب کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی پریشانی بھی لڑکوں کی موجودگی کے احساس سے دوچند ہو گئی تھی۔

"گھنٹہ ہو گیا ہے خان۔" وہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا تو سکندر بخت کی متفکر نگاہیں جمال صاحب کی نظروں سے جا ٹکرائیں۔

"کون کون آیا ہے؟" جمال بخت نے بھائی کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے نصیب اللہ کی طرف دیکھا تو اس کی حیرت الجھن میں بدل گئی۔ مگر وہ اپنے تاثرات چھپائے عام سے لہجے میں بولا۔

"آج تو سبھی بچہ آیا ہے چھوٹے خان۔" اور وہ دونوں بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ ہاتھ کے اشارے سے چوکیدار کو واپس جانے کا کہہ کر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ماربل کی سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے، لکڑی کے بھاری داخلی دروازے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"اب کیا ہو گا لالہ؟" جمال بخت کے چہرے پر آنے والی گھڑیوں کے اندیشے صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

"اللہ مالک ہے۔" وہ لب کاٹتے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئے تو بڑے سے ہال میں تقریباً" سبھی افراد خانہ کو بیٹھا دیکھ کر وہیں دروازے کے قریب ہی رک گئے۔

"لو آ گئے.... وہ دونوں اتنی دیر کیوں لگا دی سکندر۔" بی بی خرد چونکہ سامنے صوفے پہ بیٹھی تھیں اس لیے سکندر صاحب پہ سب سے پہلی نظر ان ہی کی پڑی تھی۔ ان کے کہنے پہ باقی سب نے بھی دروازے کی جانب دیکھا تھا۔

"السلام علیکم بابا! السلام علیکم ابی۔" چاروں لڑکے اٹھ کر سکندر صاحب اور جمال صاحب سے بغلگیر ہوئے تو سکندر بخت قصداً" لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے بولے۔

"وعلیکم السلام! لیکن یہ خرم کدھر ہے بھئی؟" انہوں نے سامنے کھڑے بیٹے اور تینوں بھتیجوں کو ایک نظر دیکھتے ہوئے بھانجے کے متعلق پوچھا۔

"وہ ڈائریکٹ اپنی طرف چلا گیا ہے۔" ذکا نے بغور باپ کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا، جہاں عجیب ناقابل فہم سے تاثرات رقم تھے۔

"بابا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" کھوجتی نظروں سے ان کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے تشویش سے استفسار کیا تو سبھی کے درمیان پریشانی کی لہر دوڑ گئی۔ جبکہ سکندر صاحب کے لیے مزید خود کو بشاش ظاہر کرنا دشوار ہو گیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ وہ بس ذرا...." وہ ایک پل کو گڑبڑائے تو ذکا نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"بابا! خیر تو ہے؟ وہاں کوئی بات تو نہیں ہوئی؟" اور جواباً" ان کی متغیر ہوتی رنگت اسے لب بھینچنے پہ مجبور کر گئی۔

"مجھے پتا تھا۔ پتا تھا کہ یہ بڑی حویلی والے کوئی گل ضرور کھلائیں گے۔ اسی لیے منع کرتا تھا کہ یہ رشتہ مت کریں۔ یہ لوگ قابل اعتبار نہیں۔ مگر کسی نے میری ایک نہیں سنی۔" وہ ان کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے یک لخت غصے سے بولا تو سب کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا ہوا سکندر، سب ٹھیک تو ہے نا بچے؟" بی بی خرد سمیت سبھی اٹھ کر ان کے قریب چلے آئے۔ سکندر بخت ایک بے بس سی نظر اپنے سامنے موجود چہروں پر ڈال کر رہ گئے۔ جو کتنی خوشی سے شادی کی طے کردہ تاریخ سننے کے منتظر تھے۔ مگر یہاں.... بے اختیار ان کا چہرہ سرخ اور آنکھیں نم ہونے لگیں۔ تو چہرہ جھکا گئے۔

"سکندر!" بی بی خرد کا رنگ لٹھے کی طرح سفید پڑتا دیکھ کر جمال بخت نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں شانوں سے تھام لیا۔

"خدا کے واسطے کچھ تو بولو جمال۔"

"حوصلہ بی بی جان! انہوں نے انہوں نے یہ رشتہ توڑ دیا ہے۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے تو مرجان بی بی سینے پہ ہاتھ رکھے انہیں پھٹی پھٹی بے یقین نظروں سے دیکھتی چلی گئیں۔ جبکہ زمرد بیگم کی تو کاٹو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت تھی۔

سب پر گویا سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ صرف ایک جمال بخت تھے جن کی لرزتی آواز ماحول پہ چھائے مہیب سناٹے کو توڑتی ہوئی تمام روداد بیان کر رہی تھی۔

"نہیں چھوڑوں گا! ان لالچی، دھوکے باز کتوں کو نہیں چھوڑوں گا۔" ذکا کف اڑاتا باہر کی جانب لپکا تو سبھی خواتین کی چیخیں نکل گئیں۔ جبکہ سکندر بخت نے تیزی سے پلٹ کر اس کا بازو سختی سے تھام لیا۔

"خبردار ذکا! جو تم نے وہاں جانے کے بارے میں سوچا بھی۔"

"آپ نے کیا مجھے بے غیرت سمجھ رکھا ہے جو میں ان ذلیل لوگوں کو چھوڑ دوں گا ان کے.... پورے خاندان کو میں نے زندہ نہ گاڑا تو ذکا سکندر نام نہیں۔" وہ ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتا دروازے کی طرف بڑھا تو بختیار جیب میں پڑی پسٹل نکالتا تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

"ان کے دھوکے اور کمینگی کی سزا تو آج انہیں مل کر رہے گی۔" بختیار کے پیچھے بہروز اور بلال بھی باہر کی جانب بڑھے تو ہال میں کہرام مچ گیا۔

"روکو خدا کے لیے انہیں روکو جمال۔" بی بی جان نے تڑپتے ہوئے استدعا کی تو سکندر بخت کے پیچھے جمال بھی تیزی سے باہر کو دوڑے۔ مگر تب تک ذکا ڈرائیور سے سکندر بخت کی گاڑی کی چابیاں جھپٹتا انتہائی تیزی سے گاڑی نکال لے گیا تھا۔ اس کے پیچھے دھول اڑاتی بختیار کی گاڑی بھی انتہائی تیز رفتار سے نکلی تھی۔

"حبیب! گاڑی نکالو۔" جمال بخت نے ڈرائیور کو اپنی گاڑی نکالنے کا حکم دیا تو وہ دوڑتا ہوا پورچ میں کھڑی گاڑی کی جانب لپکا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دونوں گاڑی میں سوار ہوتے، اندر سے اٹھتی چیخوں نے انہیں دیوانہ وار واپس بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

"امی! بابا! دیکھیں گل مینا کو کیا ہو گیا؟" دروازے میں ہی انہیں زارو قطار روتی گل رخ نے جا لیا تو وہ حواس باختہ سے آگے کو لپکے جہاں ہال کے وسط میں بے سدھ پڑی گل مینا کے گرد بی بی جان، زمرد اور سلطانہ بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

بیل کی آواز پہ چوکیدار نے اپنی دھن میں جونہی گیٹ کھولا بختیار نے سرعت سے آگے بڑھ کے اپنی پسٹل اس کی کنپٹی سے لگا دی۔

"خبردار! جو ہلنے کی کوشش کی۔" اس کے چوکیدار کو قابو میں کرتے ہی وہ تینوں اپنی اپنی پستول لیے تیزی سے اندر کی جانب بڑھے تھے۔ شہر سے گاؤں آتے ہوئے وہ سفر کے دوران، سکندر بخت کی ہدایت کے پیش نظر، اپنی پستول ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے سو اب وہی پستولیں تھامے وہ بے خوف و خطر بڑی حویلی میں گھس آئے تھے۔

"نجیب جلال! باہر آؤ۔" ایک جھٹکے سے لاؤنج کا دروازہ کھولتے ذکا اور بہروز اندر داخل ہوئے تھے۔ جبکہ بلال اپنی ٹی ٹی لیے باہر ہی رک گیا تھا۔ لیکن اندر لاؤنج میں خواتین کو بیٹھا دیکھ کر اس نے با آواز بلند نجیب جلال کو پکارا تھا۔

انہیں یوں اسلحے کے ساتھ اندر آتا دیکھ کر وہاں موجود تینوں عورتوں کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ مگر وہ ان پر اک نگاہ غلط ڈالے بنا دھاڑا تھا۔

"رشتوں کی آڑ لے کر زنانہ چالیں چلنے والے لالچی انسان! میں کہتا ہوں باہر آؤ۔" اور اس کی للکار پہ نجیب جلال کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے چہرے لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔

"زبان کو لگام دو ذکا سکندر۔" نجیب جلال کا چھوٹا بیٹا فاروق سرخ انگارہ چہرہ لیے اس کی جانب لپکا۔ مگر ذکا نے ہاتھ میں تھامی پسٹل کا رخ اس کی طرف کرتے

ہوئے اس کے بڑھتے قدموں کو رکنے پہ مجبور کر دیا۔
"میرے منہ لگنے کی غلطی مت کرنا فاروق! ورنہ مجھ سے برا آج کوئی نہ ہو گا۔" اپنی انگارے برساتی سرخ نگاہیں وہ فاروق نجیب کے چہرے پر گاڑے انتہائی سرد لہجے میں غرایا تو عورتوں کی چیخ و پکار یک لخت بلند ہو گئی۔
"ہٹو فاروق! اس سے میں خود نبٹتا ہوں۔" نجیب جلال نے تیزی سے بیٹے کو شانے سے پکڑ کر پیچھے کیا۔
"کیا بات ہے لڑکے؟ کیوں تماشا لگا رکھا ہے؟" انہوں نے سخت نظروں سے سامنے کھڑے ذکا کو گھورا۔ جس کی آنکھوں میں انہیں سامنے پا کے خون اتر آیا تھا۔
"تماشا لگانا ہمارا نہیں، تمہارا خاندانی وصف ہے۔ اگر اتنے ہی سورما تھے تو اپنی ہوس کو مردوں کی طرح سینہ ٹھوک کے بیان کرنا تھا۔ یوں بے غیرتوں کی طرح رشتوں کا سہارا لے کر انہیں پامال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" اور نجیب جلال کا چہرہ مارے غضب کے سرخ پڑ گیا تھا۔
"مرد ہی ہوں بچے جو تم اب تک زندہ کھڑے ہو۔ میری چھت کے نیچے نہ ہوتے تو تمہارا وہ حشر کرتا کہ تمہاری سات نسلیں یاد رکھتیں۔" اسے سرد نظروں سے تکتے وہ انتہائی ٹھنڈے لہجے میں بولے تو ذکا نے اپنی کٹیلی نگاہیں بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔
"بھول جاؤ اپنی چھت کو اور میرا جو بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو۔" نجیب جلال سمیت وہاں موجود سبھی افراد ایک لحظے کو اسے دیکھ کر رہ گئے۔
"لگتا ہے بہن کی بربادی نے خاصا اثر ڈالا ہے تمہارے ذہن پہ، ورنہ اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے دو مرتبہ ضرور سوچتے۔" اگلے ہی پل وہ طنزیہ انداز میں مسکرائے تو ذکا کے لب بھی زہرخند سے مسکرا دیے۔
"بھول ہے تمہاری کہ صرف میری بہن برباد ہوئی ہے۔ تم بھی اب کم از کم داؤد کو تو کبھی آباد نہیں کر سکو گے۔"
"اچھا!" انہوں نے بھنویں اچکاتے ہوئے تمسخر سے پوچھا۔
"بالکل۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چیلنجنگ انداز میں بولا تو نجیب جلال کھول اٹھے۔
"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"
"نہیں سب کے سامنے سینہ ٹھوک کر زبان دے رہا ہوں۔ جس دن داؤد نجیب نے اس گاؤں میں شادی کی نیت سے قدم رکھا وہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔" وہ واشگاف الفاظ اور بلند آواز میں بولا تو سب حاضرین محفل کے چہروں پہ خوف در آیا۔ جبکہ بلقیس نے بے اختیار اپنا کلیجہ تھام لیا۔
"اچھا! تو پھر تم بھی یاد رکھنا۔ میں اپنے بیٹے کے سر پہ اسی گاؤں میں سہرا سجاؤں گا۔" نجیب جلال دوبدو گویا ہوئے تو ذکا سکندر کے چہرے پر عجیب سرد سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔
"تو پھر طے ہوا۔ تمہارے بیٹے کی بارات والے دن اس کا جنازہ اٹھے گا۔" اپنی بات مکمل کرتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑی حویلی سے نکلتا چلا گیا تو پیچھے کھڑے نجیب جلال کی آنکھیں مارے غضب کے سرخ پڑ گئیں۔

☼ ☼ ☼

بے سدھ پڑی گل مینا کو اٹھا کر فوراً" سے پیشتر شہر لایا گیا تھا۔ جہاں ڈاکٹرز نے نروس بریک ڈاؤن کی اطلاع دیتے ہوئے 'اسے آنا" فانا" داخل کر لیا تھا۔ اس کی اس حالت نے سبھی کے غم اور احساس ندامت میں ڈھیروں اضافہ کر دیا تھا۔
فیض بخت نے بڑی حویلی میں جا کے مراد بی بی اور ان کی اولاد سے قطع تعلقی کا اعلان کیا تھا۔ جبکہ سکندر اور جمال بخت تو ان لوگوں کی جان کے درپے ہو گئے تھے۔ مگر یہاں بی بی خرد ان کے آگے ڈٹ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنی ساری اولاد کو اپنی جان کی قسم دے کر اس خون خرابے سے روکا تھا جو ان کی آنے والی نہ جانے کتنی نسلوں کو برباد کر سکتا تھا۔

ان کا یہ تحمل اور صبر دیکھ کے فیض بخت بھی دل سے ان کی عظمت کے قائل ہو گئے تھے۔ مگر ذکا کو سمجھانا کسی کے بس میں نہ تھا۔ جو اپنے کہے سے ایک انچ بھی ہلنے کو تیار نہ تھا۔ اسے اپنی دونوں بہنیں بے حد عزیز تھیں۔ جن کی آنکھ میں وہ آنسو تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کجا کہ زندگی بھر کی بربادی! وہ بھی بنا کسی جرم کے۔
گل مینا کے ہوش میں آنے تک کا ہر لمحہ چھوٹی حویلی والوں کے لیے کسی پل صراط سے کم نہ تھا اور جس پل ڈاکٹرز نے انہیں اس کے ہوش میں آنے کی نوید سنائی، اس لمحے تو گویا اللہ نے ان کے مردہ تنوں میں نئی روح پھونک دی تھی.... مگر ہوش میں آنے والے وجود کو پھوٹ پھوٹ کر اپنی قسمت کا ماتم کرتا دیکھ کے ہر آنکھ سے آنسو بہہ نکلے تھے۔
ایسے میں ڈاکٹرز نے گل مینا کو تو سکون آور انجکشن دے کے اس اذیت سے وقتی نجات دلا دی تھی۔ مگر ذکا نے اپنی بے سدھ پڑی بہن کے سر پہ ہاتھ رکھ کر سب گھر والوں کے سامنے اس زیادتی کا حساب برابر کرنے کی قسم کھائی تھی۔
اس کی اس حرکت پہ بی بی خرد بھی جلال میں آ گئی تھیں اور انہوں نے ذکا کو اسی وقت یا تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرنے یا پھر ان سب کو چھوڑ دینے کا حکم دیا تھا اور ذکا سکندر اسی پل نہایت خاموشی سے اسپتال کی عمارت سے نکل گیا تھا۔
اس دن سے لے کر آج تک وہ دوبارہ گاؤں نہیں گیا تھا۔ اس دوران بی بی خرد کے علاوہ گھر کے سبھی لوگ اسے سمجھانے کے لیے آ چکے تھے، مگر وہ اپنی بات پہ چٹانوں کی طرح قائم تھا۔ بختیار، بہروز اور بلال تینوں بھائی البتہ روز اول کی طرح اس کے ساتھ تھے اور یہ ان کی مدد کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ آج اپنے دشمنوں سے اپنا بدلہ لینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ بس صرف صحیح وقت اور صحیح لمحے کا انتظار تھا!

☼ ☼ ☼

داؤد نجیب کی پاکستان آمد اور اس کے نکاح کی خبر کو بی بی خرد کے حکم سے خاص طور پر ذکا اور حتی المقدور گل مینا سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کی ہدایت کے پیش نظر زینب اور کلثوم بمع اپنی فیملیز کے دونوں بھتیجیوں کو، نکاح سے چند دن قبل ہی لے کر، گھومنے پھرنے کی غرض سے کراچی چلی گئی تھیں۔ لیکن ذکا سے وہ چاہ کر بھی اس خبر کو چھپا نہ سکی تھیں اور اس بات نے ان سب کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔
ان ہی اذیت ناک لمحوں میں نکاح والا دن بھی آ پہنچا اور ادھر علی الصبح سکندر بخت، ذکا اور باقی لڑکوں کے سر پہ آ پہنچے تھے۔ یہ جانے بنا کہ ذکا نے جو کچھ ٹھان رکھا تھا۔ وہ تو وہ کب کا کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

بڑی حویلی سے بارات بڑی شان سے نکلی تھی۔ ڈھول اور فائرنگ کی آواز ماحول میں مسلسل ارتعاش برپا کر رہی تھی۔ چھوٹی حویلی کے مکین آج اپنے ضبط کی انتہاؤں پر تھے۔ وہ چاہتے تو محض لمحوں میں نجیب جلال سے اس کی دغابازی کا بدلہ لے کر اس کی ہر خوش فہمی کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ مگر صرف اپنی آنے والی نسلوں کو ناجائز خون خرابے سے بچانے کے لیے انہوں نے آج صبر کا یہ تلخ ترین گھونٹ بھرا تھا۔ جو ان کی غیرت کا کڑا امتحان تھا۔ مگر انسانیت اور عظمت کے اعتبار سے بے مثال تھا۔
سکندر بخت کے بروقت شہر پہنچ جانے سے، بی بی خرد سمیت باقی سب خواتین کو تھوڑا حوصلہ ہوا تھا۔ مگر پھر بھی ان کا دھیان مسلسل ذکا میں اٹکا ہوا تھا۔ جو اپنا قول نبھانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ اس کی خاموشی بھی ان سب کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ جو اندر ہی اندر انہیں ہولائے دے رہی تھی۔ مگر وہ اس کے متعلق ذکا سے کسی بھی قسم کا استفسار کر کے، اسے اپنی کمزوری اور اس کی برتری کا احساس نہیں دلانا چاہتے تھے.... جبھی خاموشی سے اس دن کے بخیر و عافیت گزر جانے کے لیے دعاگو تھے۔
دوسری جانب بی بی کلاں اور بڑی حویلی کے مردوں

کے سوا وہاں موجود ہر شخص سخت پریشان تھا۔ حتیٰ کہ دلہن والے جو دوسرے گاؤں میں رہتے تھے ان کی عورتیں بھی بے حد پریشان تھیں۔ مگر بی بی کلاں کے بھائیوں اور بھتیجوں کا زعم بھی بڑی حویلی کے مردوں سے کچھ کم نہ تھا۔ مصلحت پسندی سے کام لینا ان کے نزدیک بزدلی میں شمار ہوتا تھا۔

داؤد کو نجیب جلال نے پاکستان آنے کے بعد شہر ہی میں رکنے کی ہدایت کی تھی اور آج وہ ان کے کہنے کے مطابق اپنے بندوں کے ساتھ سید حالی بی کلاں کے بھائی جنہیں سب آغا ماما کہتے تھے کی حویلی پہنچا تھا جہاں اس کا زبردست استقبال کیا گیا تھا۔

اس کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی نکاح کی رسم ادا کی گئی تھی جس کے بعد فضا مبارک سلامت اور فائرنگ کی زبردست آواز سے گونج اٹھی تھی۔ خاندان کے سبھی لڑکے اور داؤد کے دوست اسے زبردستی کھینچ کر حویلی کے وسیع و عریض صحن میں لے آئے تھے۔ جہاں ڈھول کی تھاپ پہ اتن (پٹھانی طرز کی لڈی) کرتے اور شور مچاتے سب نے خوب رونق لگائی تھی۔ ایسے میں کب اور کہاں سے بنا کسی آواز کے فائر ہوا تھا، کسی کو کچھ پتا نہیں چلا۔

وہ تو جب داؤد بے اختیار زمین پہ گرا، تب سب کو ہوش آیا تھا مگر تب تک وہاں برپا ہونے والے حشر میں پچھلے گیٹ سے ملازم کا بھیس بدل کر اندر داخل ہونے والا مسلح شخص، نہایت ہوشیاری اور تیزی سے اپنے ساتھی کے ساتھ موٹر سائیکل پہ فرار ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام کے پانچ بجنے والے تھے اور لاؤنج میں سکندر بخت کے برابر بیٹھے ذکا کی نظریں بظاہر ٹی وی پر لیکن دھیان پوری طرح سینٹر ٹیبل پر پڑے اپنے موبائل پہ مرکوز تھا۔ کچھ یہی حال لاؤنج میں موجود باقی تین نفوس کا بھی تھا۔ جن کی بے چینی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ایسے میں اچانک ذکا کے موبائل پہ آنے والی کال نے بے اختیار ان تینوں کو اس کی جانب دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ جو بنا کسی تاثر کے انتہائی پر سکون انداز میں کال ریسیو کرتا موبائل کان سے لگا چکا تھا۔

"ہاں بولو خدا بخش۔" ٹانگ پہ ٹانگ جمائے وہ بے اختیار صوفے کی پشت سے کمر ٹکا گیا تھا۔ خدا بخش شہر میں رکھا ہوا سکندر بخت کا خاص آدمی تھا۔ اس کے نام پہ انہوں نے چونک کر تیزی سے گردن گھماتے ہوئے اپنے بائیں جانب دیکھا۔ جہاں ذکا سکندر کے چہرے پر پھیلتی فاتحانہ چمک اور مسکراہٹ انہیں حیرت سے گنگ کر گئی تھی۔

"شاباش! اب تم دونوں ایسا کرو کہ فوراً" اسے پیشتر اندرون سندھ روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہیں رات میں خود فون کروں گا۔" انہیں ہدایت دیتے ہوئے اس نے مسکرا کر لائن ڈسکنیکٹ کرتے ہوئے ساکت بیٹھے باپ کی طرف دیکھا تھا جن کی بے یقین نگاہیں اس کے چہرے پہ جمی تھیں۔

"آپ لوگوں نے کیا سوچا تھا کہ آپ کی باتیں چھپانے اور پہرے بٹھانے سے میں رک جاؤں گا؟ یا میرا ارادہ بدل جائے گا؟ میں نے قسم کھائی تھی بابا کہ اگر میری بہن داؤد کی وجہ سے برباد ہوئی ہے۔ تو نجیب جلال کم از کم گاؤں میں تو اس کے سر پہ کبھی سہرا نہیں سجا سکے گا اور اپنا قول نبھانے کے لیے مجھے اگر اپنی جان سے بھی گزرنا پڑتا تو میں گزر جاتا۔" اس نے مضبوط لہجے میں اپنی بات مکمل کی تو حیران پریشان بیٹھے سکندر بخت بے اختیار چلا اٹھے۔

"اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا کبھی سوچا ہے تم نے؟ وہ تمہیں کہیں بھی اور کسی بھی وقت بھون کے رکھ دیں گے۔"

"تو رکھ دیں! اگر میری موت اسی طرح لکھی ہے تو کوئی تدبیر مجھے بچا نہیں سکتی۔ لیکن کم از کم مجھے اتنا سکون تو رہے گا کہ میں نے اپنی بہن کو زندہ درگور کرنے والوں کو ایسا سبق سکھایا ہے کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی ذکا سکندر کو یاد رکھیں گی۔" غصے سے بولتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا سکندر صاحب کے چہرے پہ درد کی پرچھائیاں اتر آئیں۔

"تم یہ کہہ سکتے ہو کیونکہ تم ایک باپ نہیں۔۔۔ ذرا میرے دل سے پوچھو۔ بیٹی کا غم کیا کم تھا جو تم نے اسے ایک نیا روگ لگا دیا ہے۔ تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے ذکا بہت برا۔" تاسف سے کہتے ہوئے انہوں نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا تو لب بھینچتے ہوئے ذکا کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ خاموش تماشائیوں کی صورت کھڑے بختیار، بہروز اور بلال ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے سکندر بخت کا موبائل بج اٹھا۔

"جی فیض چچا۔" انہوں نے اسکرین پہ جگمگاتے نمبر کو دیکھ کر تیزی سے فون کان سے لگا لیا۔

"سکندر! داؤد کا قتل ہو گیا ہے۔" انہوں نے چھوٹتے ہی انہیں مطلع کیا تو سکندر بخت بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچ کر رہ گئے۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اگر ذکا تمہارے ساتھ شہر میں ہے تو پھر یہ قتل کس نے۔۔۔"

"اسی نے کروایا ہے۔" وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

"کیا؟" ان کی حیران پریشان سی نظریں بے اختیار سامنے کھڑے جمال بخت کی جانب اٹھی تھیں۔ جن کا دل آن واحد میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ دوسری طرف سکندر بوجھل لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

"وہ اپنی ساری تیاری مکمل کیے بیٹھا تھا فیض چچا اور یہاں ہم سمجھ رہے تھے کہ۔۔۔"

"بہت برا ہوا ہے سکندر بہت برا! ذکا کو اتنا بڑا قدم کسی طور نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔" ملال سے سرہلاتے وہ انتہائی دکھ سے بولے۔

"نجیب کے ساتھ ساتھ اب تو یوسف کا خاندان بھی اٹھ کھڑا ہو گا۔" انہوں نے مراولی بی کے بھائی کا حوالہ دیا تو سکندر بخت لب بھینچ کر رہ گئے۔

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟" انہیں اپنے چاروں جانب اندھیرا نظر آ رہا تھا۔

"اس وقت ہماری پہلی ترجیح ذکا کی حفاظت ہے۔ تم ایسا کرو فوراً" اپنے ڈی آئی جی دوست کے پاس جاؤ اور اسے پوری بات ماسوائے اس کے کہ ذکا نے بڑی حویلی میں جا کے جو بات کی تھی یا جو کچھ اب کیا ہے، بتا کر پولیس پروٹیکشن طلب کرو۔ میں اور جمال بھی یہاں تھانے جاتے ہیں۔ ہم انہیں بتائیں گے کہ نجیب جلال سے ہماری حال ہی میں چپقلش ہوئی ہے۔ لہٰذا اگر وہ اس قتل کے لیے ہم میں سے کسی کو مورد الزام ٹھہرائیں تو بنا کسی ثبوت کے کوئی کارروائی نہ کی جائے۔۔۔۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم سارا وقت ذکا کے ساتھ تھے نا؟"

وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ہر پہلو پہ اچھی طرح غور کر لینا چاہتے تھے۔ مبادا کوئی بات بعد میں ان کے لیے نقطہ اعتراض نہ بن جائے۔

"جی۔" وہ بغور ان کی بات سنتے ہوئے بولے تھے۔

"اور وہ بندہ اب کہاں ہے؟" انہوں نے ایک نظر جمال بخت کی جانب دیکھا تھا جو ان کی گفتگو سے تمام حقیقت جان چکے تھے اور اب سخت پریشانی کے عالم میں پشت پہ ہاتھ باندھے مسلسل کمرے میں چکرا رہے تھے۔

"اسے ذکا اندرون سندھ روانہ کر چکا ہے۔" سکندر صاحب ان کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولے۔ تو فیض بخت کو قدرے تسلی ہوئی۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم فوراً" نکلنے والی بات کرو۔ لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔ ذکا اب اپنا منہ بند رکھے۔" انہوں نے سکندر بخت کو خاص ہدایت کی تو وہ اپنے سامنے موجود تینوں لڑکوں کو شعلے برساتی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولے۔

"وہ کیا، یہ چاروں اب اپنا منہ بند رکھیں گے۔" اور ان تینوں کی نظریں بے اختیار ایک دوسرے کی جانب اٹھی تھیں۔

فیض صاحب اور جمال بخت کے ذریعے جب ساری حقیقت بی بی خرد سمیت تمام گھر والوں کے علم میں آئی تو چھوٹی حویلی میں گویا کہرام برپا ہو گیا۔

اپنی موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے بقا کا جو بند، صبر اور سمجھداری سے، مرجان بی بی نے باندھا تھا۔

اسے ذکا کا ایک غلط اور جذباتی فیصلہ بنا لے گیا تھا۔ جس کے بعد اب انہیں سوائے تباہی کے اور کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ ایسے میں فیض بخت انہیں حوصلہ دیتے جمال صاحب کو لیے تھانے چلے آئے تھے گو کہ وہ جانتے تھے کہ وہ ذکا کے جرم پر پردہ ڈالنے کا گناہ کررہے ہیں۔ مگر اس سچائی کو بے نقاب کرنے کا بھلا کیا فائدہ تھا جو ان کے بھائی کے خاندان کو خون میں نہلا دیتی۔

داؤد کی جوان سال موت کا ان کو از حد دکھ تھا۔ مگر یہ وقت جذبات کے بجائے ہوش سے کام لینے کا تھا۔ وگرنہ آنے والے دنوں میں انہیں ایک کے بجائے نہ جانے کتنی جوان لاشوں پہ رونا پڑ جاتا۔

تھانے میں اپنا بیان درج کروانے کے بعد وہ اپنے بیٹوں کے ہمراہ داؤد کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے تھے۔ جہاں موجود سبھی لوگ ان سے بہت سرد انداز میں پیش آئے تھے۔ مگر انہوں نے نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ سب اس وقت کس قدر نازک اور مشکل دور سے گزر رہے تھے۔

لیکن تدفین کے بعد تو ایک طوفان اٹھ آیا تھا۔ بڑی حویلی کے تمام افراد اور یوسف خان کا سارا خاندان، چھوٹی حویلی والوں خصوصاً" ذکا کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

نجیب جلال اپنے بھائی بندوں کو لیے سیدھا تھانے پہنچے تھے۔ جہاں انہوں نے ذکا کو اپنے بیٹے کا قاتل گردانتے ہوئے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروانے اور فوری گرفتاری کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ معاملہ پہلے ہی پولیس کے علم میں آچکا تھا۔ اسی لیے انہوں نے نجیب صاحب سے ان کے بیان کی تصدیق کے لیے ثبوت مانگا تھا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے ذکا کا ڈیڑھ ماہ قبل اپنے گھر میں اسلحہ لے کر آنے اور داؤد کو جان سے مار دینے کی دھمکی دینے والی پوری بات کہہ سنائی تھی۔ لیکن چونکہ اس واقعہ کا بڑی حویلی والوں اور ان کے ملازمین کے سوا تیسرا کوئی گواہ نہ تھا۔ اس لیے پولیس نے اس ثبوت کو ناکافی مانتے ہوئے ذکا کی گرفتاری عمل میں لانے سے انکار کر دیا تھا۔ ہاں لیکن شک کی بنیاد پہ انہوں نے اس کے خلاف ایف آئی آر ضرور درج کرلی تھی۔ لیکن یہاں بھی وہ تفتیش آگے بڑھانے سے قاصر تھے کہ سکندر بخت، اپنی اور نجیب جلال کی دشمنی کو وجہ بنا کر اپنے بیٹے کے لیے پہلے ہی پولیس پروٹیکشن طلب کرچکے تھے۔

ساتھ ہی وہ یہ بھی بیان دے چکے تھے کہ اگر مستقبل میں ان کے بیٹے یا خاندان کے کسی فرد کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی تمام تر ذمہ داری نجیب جلال اور اس کے خاندان پر ہوگی، جو اپنے بیٹے کے قتل کا الزام ان کے بیٹے پہ لگا رہے ہیں۔

ان کے اس اقدام نے جہاں قانونی کارروائی کو کمزور کر دیا تھا وہیں بڑی حویلی والوں کے ہاتھ بھی باندھ دیے تھے۔ کیونکہ اگر ذکا کو کچھ ہوتا تو ان کے لیے بھی فرار کے راستے مسدود تھے۔ دوسری جانب یوسف خان کے گاؤں والوں نے انہیں اور ان کے خاندان کو، خان جلال بخت کے بیٹوں کی اس پرانی عداوت میں دخل دینے سے منع کر دیا تھا۔ مبادا ان کے گاؤں کے لیے کوئی نئی مشکل نہ کھڑی ہو جائے۔

یوں یوسف خان اور ان کے بیٹے چاہ کر بھی نجیب جلال کا ساتھ نہ دے سکے تھے۔ ایسے میں نجیب جلال کے پاس سوائے خون کے گھونٹ بھرنے کے دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔ مراد بی بی اور ان کی اولاد اپنے ہی زعم اور ہٹ دھرمی کے پھیر میں آگئی تھی۔ انہوں نے ساری زندگی مصلحت پسندی اور صبر کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا۔ لیکن وقت نے بالآخر انہیں یہ دونوں اسباق سکھا کر دم لیا تھا۔ مگر اس تاخیر کی انہیں بہت بڑی قیمت چکانی پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر ذکا نے گاڑی اندر بڑھاتے ہوئے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ آج سکندر بخت کی معیت میں داؤد کی

موت کے ڈیڑھ ماہ اور اس سارے قصے کے تین ماہ بعد حویلی آیا تھا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کرتے ہوئے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ بے اختیار گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بے تاب نظروں سے ان مانوس در و دیوار کو دیکھا تھا۔ جن سے دوری کے محض چند ہی ماہ نے اسے ان کی قدر و منزلت سے بخوبی آگاہ کر دیا تھا۔

اپنے اندر اترتے سکون کے گہرے احساس کو محسوس کرتے ہوئے وہ ملازموں سے حال احوال دریافت کرنے لگا۔ جب لکڑی کا بھاری داخلی دروازہ دھکیل کر بہت سے بے تاب چہرے باہر آئے تھے۔ جن میں سب سے آگے گل مینا تھی جو تیز قدموں سے برآمدے کی سیڑھیاں عبور کرتی، بھاگ کر بھائی کے سینے سے آلگی۔

"آپ نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتی۔" اس کے سینے سے لگی وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی تو ذکا کے بازو بے اختیار اس کے گرد آن ٹھہرے۔

"اور اگر میں تمہارے ان آنسوؤں کا حساب نہ لیتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا۔" اس کا سر چومتے ہوئے ذکا نے اپنی آنکھوں کی نمی خاموشی سے اپنے حلق میں اتارتے ہوئے جواب دیا تو بھائی کی اس درجہ محبت گل مینا کے آنسوؤں میں تیزی لے آئی۔

اسی اثنا میں باقی سب بھی ان کے قریب چلے آئے۔ تو گل مینا اپنے آنسو صاف کرتی اس سے علیحدہ ہو گئی۔ سب سے ملنے کے بعد وہ ماں کے سامنے آکھڑا ہوا تو زمرد کتنی ہی دیر اسے سینے سے لگائے روتی چلی گئیں اور جب دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو بے اختیار اپنی پریشانی کو زبان دے بیٹھیں۔

"تمہیں ابھی یہاں نہیں آنا چاہیے تھا بیٹا۔" انہوں نے متفکر نگاہوں سے اپنے لاڈلے کا چہرہ دیکھا۔

"آپ بے فکر رہیں اماں۔ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" انہیں ساتھ لگائے تسلی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے ذکا نے اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

"آپ یہ بتائیں بی بی جان کی ناراضی دور ہوئی یا نہیں؟"

"نہیں۔" وہ بوجھل لہجے میں بولیں تو نا چاہتے ہوئے بھی ذکا کے چہرے پر مایوسی در آئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی حکم عدولی نے بی بی خرد کو بہت دکھ پہنچایا تھا اور اس کے لیے یہ احساس ندامت کا باعث تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مان جائیں گی۔" جمال بخت نے اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"سچ ابی؟" اس کی بجھی بجھی سی آنکھوں میں یک لخت امید کی روشنی نمودار ہوئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ لیکن تمہیں انہیں تھوڑا وقت دینا ہو گا۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہوا بہرکیف اچھا تو نہیں ہوا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے تو ذکا لب کاٹ کر رہ گیا۔

"وہ ہیں کہاں؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے بوجھل لہجے میں پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔" اور ذکا کے قدم بے اختیار ان کے کمرے کی جانب اٹھ گئے۔

دروازے پہ ہلکی سی دستک دے کر وہ کمرے میں داخل ہوا تو نظر سیدھی صوفے پہ براجمان بی بی خرد سے جا ٹکرائی۔ جو تسبیح میں مصروف تھیں۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر انہوں نے بے اختیار رخ موڑ لیا تو ذکا تیزی سے ان کے قدموں میں بیٹھتا ہوا ان کے گھٹنے تھام گیا۔

"مجھے معاف کردیں بی بی جان۔ میں آپ کا حکم کبھی نہ ٹالتا اگر جو وہ میری ذات سے متعلق ہوتا۔ آپ میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کردیں تو میں کبھی اف نہیں کروں گا۔ لیکن یہ معاملہ میری بہن، میری غیرت کا تھا۔ انہوں نے میری معصوم بہن کی زندگی برباد کردی۔ میں انہیں کسی قیمت پہ نہیں بخش سکتا تھا۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا تو مرجان بی بی کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی۔ ذکا کا اور ان کا درد کوئی جدا تو نہ تھا۔ وہ اس کی اذیت کا اندازہ کر سکتی تھیں۔ ان کی گل مینا ہمیشہ کے لیے ان کی دہلیز سے جڑ

گئی تھی۔۔۔یہ دکھ کوئی چھوٹا تو نہ تھا۔

"میں جانتی ہوں بچے کہ تم نے جو کچھ بھی کیا۔ اپنی بہن پہ ہونے والے ظلم کے جواب میں کیا۔ لیکن ذکا تمہارے اس ایک قدم نے تمہیں دشمنوں کے نشانے پہ لا کھڑا کیا ہے اور مجھ بڑھیا میں اب اپنے بچوں کی مزید کوئی تکلیف دیکھنے کی ہمت نہیں۔" اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور ذکا کی آنکھیں ان کی اس درجہ محبت پہ بھر آئی تھیں۔۔۔بے اختیار وہ ان کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے چوم گیا۔

"آپ کی دعائیں جب تک ہمارے ساتھ ہیں۔ کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا اور اگر بالفرض موت آ بھی جاتی ہے۔ تب بھی کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میں نے اپنے بھائی ہونے کا فرض ادا کیا۔"

"خدا تمہیں سلامت رکھے میری جان۔۔۔ تم ہمیشہ اپنی بہنوں کا مان اور ماں باپ کے کلیجے کی ٹھنڈک بن کر جیو لیکن بعض دفعہ انسان کو حق پہ ہونے اور قوت انتقام رکھنے کے باوجود عفو و درگزر سے کام لینا پڑتا ہے۔ صرف اس لیے کہ اس کے پیش نظر بہت سے لوگوں کی بہتری ہوتی ہے اور میں نے یہی سوچ کر تم سب کو منع کیا تھا۔ بدلے کی یہ آگ اب کس کس کو نگلے گی کس کو کیا معلوم۔" خدشات ایک بار پھر آنسوؤں کی صورت ان کی کمزور آنکھوں میں چمکنے لگے تو ذکا اٹھ کر ان کے برابر بیٹھتے ہوئے محبت سے ان کے شانے کے گرد بازو پھیلا گیا۔

"آپ کی ہر بات درست۔ لیکن بی بی جان ہر غلطی درگزر کرنے والی نہیں ہوتی۔ مراد بی بی اور اس کی نسل کو آپ لوگوں کی نیکیاں یاد رہیں یا نہ رہیں۔ لیکن ذکا سکندر کا انتقام ضرور یاد رہے گا اور یہی میری فتح ہے۔" سنہری آنکھوں میں سفاکانہ چمک لیے وہ مسکرا کر بولا تو مرجان بی بی بے اختیار اک بوجھل سانس لے کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

شہر سے ذکا اور بختیار کے مشترکہ دوست آئے ہوئے تھے اور وہ چاروں سب کے منع کرنے کے باوجود ان کے ساتھ شکار کھیلنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ خرم کو بھی انہوں نے زینب پھپھو کی طرف سے لے لیا تھا اور اب وہ سب ایک بھرپور دن گزار کے، راستے میں آنے والے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھے گرما گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

چونکہ یہ ہوٹل قدرے اونچائی پہ واقع تھا۔ اس لیے یہاں سے ارد گرد کا نظارہ خاصا خوب صورت تھا۔

چائے کا کپ ختم کرکے ذکا ریلنگ کے پاس آ کھڑا ہوا۔ محویت سے سبزے سے ڈھکے پہاڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے جیب میں پڑا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر ایک سگریٹ لبوں میں دباتے ہوئے اسے شعلہ دکھایا تھا۔ لائٹر واپس جیب میں رکھتے ہوئے جونہی اس نے چہرہ اوپر اٹھایا، نظر نیچے ڈھلان پہ کھڑے ایک نسوانی وجود پر جا ٹھہری۔

آسمانی شلوار قمیص پہ سفید اور آسمانی چادر اوڑھے وہ قدرے ترچھی کھڑی سر جھکائے اپنے ہاتھوں میں پکڑے پرندے کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ اپنی جگہ پہ بیٹھ گئی۔ نرمی سے باری باری پرندے کے دونوں پر اٹھاتے ہوئے اس نے کچھ دیکھنا چاہا تھا، مگر چند پلوں کی کوشش کے بعد اس نے پرندے کو آہستگی سے نیچے اپنے قریب چھوڑتے ہوئے نرمی سے ہاتھ سے قدرے آگے کو کیا۔ شاید دیکھنا چاہ رہی تھی کہ وہ اڑنے کے قابل ہے یا نہیں۔ مگر پرندہ محض چند قدم پھدک کے رک گیا اور اوپر کھڑے ذکا کو آن واحد میں پتا چل گیا تھا کہ پرندہ بری طرح زخمی اور قریب المرگ تھا۔ مگر وہ لڑکی اس بات سے انجان تھی، جبھی تو ایک بار پھر اسے ہاتھ سے آگے کر رہی تھی۔

ریلنگ پہ ہاتھ جمائے قدرے آگے کو جھکے کھڑے ذکا نے بغور اس منظر کو دیکھتے ہوئے سگریٹ کا گہرا کش لیا تھا۔

اگلے ہی لمحے نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی تھی

کہ وہ پلٹ کر ٹیبل پہ رکھی اپنی شارٹ گن اٹھا لایا۔ سگریٹ لبوں میں دبائے اس نے گن کاندھے سے لگاتے ہوئے نشانہ لیا تھا اور فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔

زخمی پرندہ تڑپ کر ساکت ہوا تھا اور اتنی ہی شدت سے وہ تڑپ کے سینے پہ ہاتھ رکھے چیخ مارتی ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی۔ وحشت سے پھٹی ہوئی نظریں سامنے پڑے بے جان پرندے پہ جمائے وہ کتنے ہی پل بے یقینی سے اسے دیکھے چلی گئی تھی۔

"کیا مارا ہے؟" بہروز نے پیچھے سے آواز لگائی تو وہ لاپروائی سے سگریٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے قصداً بلند آواز میں بولا۔

"یونہی ایک بیمار پرندہ تھا۔" اس کی آواز پہ نیچے کھڑی لڑکی نے ایک جھٹکے سے گردن گھماتے ہوئے اوپر دیکھا تھا۔ جہاں ریلنگ پہ گن ٹکائے کھڑے ذکا نے جونہی اس کی جانب دیکھا تو وہ گویا پلکیں جھپکنا بھول گیا۔

بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لیے، وہ سورج کی ڈھلتی نرم کرنوں میں وادی کا سارا حسن خود میں سموئے ایک پل کے لیے اسے مبہوت کر گئی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں سے لپکتے نفرت کے شعلے، ذکا کو چونکانے کے ساتھ ساتھ حیران بھی کر گئے تھے۔

مانا کہ اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا۔ لیکن ایک قریب المرگ پرندے کو زخموں کی اذیت سے نجات دلا کر اس نے کوئی اتنا بڑا گناہ بھی نہیں کر دیا تھا جو وہ لڑکی اسے اس قدر تنفر سے دیکھ رہی تھی۔

اس کا انداز بے اختیار ذکا کی پیشانی پر بھی سلوٹیں بکھیر گیا۔ اپنا دوسرا ہاتھ ریلنگ پہ جمائے اس نے قدرے جھکتے ہوئے اپنی مغرور سنہری آنکھیں نیچے کھڑے وجود کی آنکھوں میں گاڑ دی تھیں۔ لیکن دوسری طرف نہ تو تاثرات میں کوئی فرق آیا تھا اور نہ ہی انداز میں کوئی جھجک بلکہ وہ اسی بے خوفی سے کھڑی اسے سخت نظروں سے گھورتی رہی۔ پھر اچانک اس پہ سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے اس نے اپنے قدموں کے پاس پڑے بے جان پرندے کو دیکھا تھا۔

بے اختیار نیچے بیٹھتے ہوئے اس نے اس مردہ وجود کو اٹھا کر ایک کڑی نگاہ اوپر کھڑے ظالم شخص پہ ڈالی اور اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر تیز قدموں سے نیچے اترتی چلی گئی تھی۔

اس کے تیور ذکا کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گئے تھے۔ اس کا موڈ یک لخت بری طرح آف ہو گیا تھا۔ جسے پھر دوستوں کی گفتگو اور رات میں فارم ہاؤس پہ سجنے والی محفل بھی بحال نہ کر سکی تھی۔ وہ کیوں اس لڑکی کو اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرے خیال میں بی بی اب ہمیں آبگینے کو رخصت کروا کے حویلی لے آنا چاہیے۔" کھانا کھاتے ہوئے نجیب جلال نے اچانک بی بی کلاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہاں موجود سبھی لوگ ایک پل کے لیے خاموش ہو گئے۔ جبکہ بلقیس کی آنکھوں میں یک لخت آنسو چمکنے لگے تھے۔ کتنا سمجھانا چاہا تھا انہوں نے ان سب کو مگر ان ضدی اور خود پرست لوگوں نے ان کی ایک نہ سنی اور آج ان کا لخت جگر ہمیشہ کے لیے ان سے چھن گیا تھا۔

"ٹھیک ہے میں آغا لالہ سے بات کرتی ہوں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مراد بی بی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ کمرے کی فضا میں چھایا بوجھل پن اچانک بڑھ گیا تھا۔

مراد بی بی کے کہنے پہ یوسف خان اور آبگینے کے والد عبدالصمد خان نے بنا کسی پس و پیش کے ان کی تجویز قبول کرتے ہوئے رخصتی کی تاریخ طے کر دی تھی۔

آبگینے عبدالصمد خان داؤد نجیب کی بیوہ تھی اور اسے اب اپنی ساری زندگی، اپنی روایات کے مطابق اپنے شوہر کے نام پر گزارنی تھی۔ یہ رخصتی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ وہ الگ بات تھی کہ وقت رخصت نہ تو وہ دلہن بنی تھی اور نہ ہی ماحول میں کسی قسم کی کوئی

خوشگواری تھی۔
عام سے کپڑوں میں وہ ہر طرح کی آرائش سے بے نیاز' ویران وجود اور متورم آنکھیں لیے خاموشی سے گاڑی میں اپنی ساس کے برابر آبیٹھی تھی۔
قرآن پاک کا سایا' ماں باپ اور گھر والوں کی نیک تمنائیں حتیٰ کہ اس کا ہم سفر کچھ بھی تو اس کے ساتھ نہ تھا۔
سسرال پہنچنے پر نہ تو اس پہ پھولوں کی بارش کی گئی تھی اور نہ ہی چاہتوں اور خوشیوں سے لبریز کوئی رسم ادا کی گئی تھی۔ ہاں لیکن سب نے فرداً" فرداً" اسے گلے سے لگا کر رونے کا فریضہ ضرور انجام دیا تھا اور آخر میں اسے داؤد کے خالی اور خاموش کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔
جہاں وہ کتنی دیر ویران آنکھوں سے بے جان در و دیوار کو تکتی رہی تھی اور جب احساس زیاں حد سے سوا ہونے لگا تو قفس میں قید کسی لاچار و بے بس پنچھی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ساری رات بے خوابی کے عالم میں گزارنے کے بعد وہ اگلی صبح اٹھ کر نہایت خاموشی سے کچن میں چلی آئی۔ گو کہ اس حویلی میں ملازموں کی کمی نہ تھی۔ مگر یہاں کون اس کے ناز اٹھانے والا تھا۔
پھر خود کو کسی طور مصروف اور دوسروں کے لیے قابل برداشت بھی تو بنانا تھا۔ جبھی تو اس نے بلقیس بیگم اور بی بی کلاں کے منع کرنے کے باوجود گھر کی بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔ یوں دن ایک ایک کرکے ہی سہی لیکن سرکنے تو لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"آبگینے!" وہ کچن سمیٹ کر ابھی لاؤنج میں آکے بیٹھی ہی تھی۔ جب بلقیس اسے پکارتی ہوئی اندر چلی آئیں۔
"جی اماں۔" وہ انہیں دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"بچے آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اس لیے تم فاروق کے آنے پہ اس سے کھانے کا پوچھ لینا۔" وہ تھکے تھکے انداز میں بولیں تو آبگینے بے اختیار اثبات میں سر ہلا گئی۔ ان کے جاتے ہی اس کی نظریں وال کلاک کی جانب اٹھی تھیں۔ جہاں رات کے دس بج رہے تھے اور فاروق گیارہ ساڑھے گیارہ سے پہلے آنے والا نہ تھا۔ اس کی لیٹ روٹین کے باعث روز اس کے لیے بلقیس بیگم جاگا کرتی تھیں اور جب کبھی وہ اس سے بھی زیادہ دیر کر دیتا تو پھر مجبوراً" وہ سونے کے لیے چلی جاتی تھیں۔
لیکن آج یہ ڈیوٹی اسے نباہنی پڑ گئی تھی۔ سو وہ وقت گزاری کے لیے آہستہ آواز میں ٹی وی لگا کے بیٹھ گئی

خدا خدا کرکے سوا گیارہ کے قریب گیٹ کھلنے اور پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی تو وہ اپنی جمائی روکتی سیدھی ہو بیٹھی۔
"السلام علیکم!" لاؤنج کا دروازہ کھول کے فاروق اندر داخل ہوا تو وہ آہستگی سے سلام کرتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے دھیان میں اندر آتے فاروق کے ارد گرد رات کے اس سناٹے میں گویا جلترنگ بج اٹھا۔
بے اختیار چونکتے ہوئے اس نے اپنے دائیں جانب گردن گھمائی تو صوفوں کے قریب ہلکے گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس مومی وجود پہ نظریں جیسے جم سی گئیں۔
"تم بھی کمال کرتے ہو فاروق نجیب' گھر میں ایک اپسرا موجود ہے اور تم باہر نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھر رہے ہو۔" دل نے اس کی بے خبری پہ اسے لتاڑا تو وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتا دو قدم آگے بڑھ آیا۔
اسے یوں ایک ٹک اپنی جانب تکتا پا کر آبگینے نے گھبرا کر سر پہ جما دوپٹہ کھینچ کر پیشانی تک بڑھا لیا۔
"اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے کھانے کا پوچھ لوں ---- آپ کھانا کھائیں گے؟" گھر پہ چھایا سناٹا اور خود پہ جمی فاروق کی عجیب سی نظریں آبگینے کا حلق خشک کر رہی تھیں۔ مگر وہ اپنے گلے پڑی مصیبت سے جان چھڑائے بنا یہاں سے نکلنے سے قاصر تھی۔
"ہاں لگاؤ۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" اس کی یہاں اس وقت موجودگی اور بلقیس بیگم کی غیر حاضری' دونوں کی وجہ اسے اب سمجھ میں آئی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ کھانا آج باہر اپنے دوستوں کے ساتھ کھا کر آیا تھا وہ اس نادر موقعے کو اپنے ہاتھوں سے نہیں گنوانا چاہتا تھا۔
اس کے اوپر کی جانب بڑھتے ہی' آبگینے تیز قدموں سے کچن کی طرف بڑھی تھی۔ وہ اس کے واپس آنے سے پہلے کھانا گرم کرکے کچن میں موجود چھوٹی سی ٹیبل پر لگا کے وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔
اسے فاروق کی موجودگی کے احساس سے ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ٹیبل لگا کر اس نے بریانی ڈش میں نکال کر میز پہ رکھنے کے بعد جلدی جلدی فریج میں سے کباب نکال کر مائیکرو میں رکھے تھے۔ لیکن ابھی انہیں نکالنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ فاروق کچن کے دروازے میں آ کھڑا ہوا۔
اسے یوں بیچ دروازے میں جما دیکھ کر آبگینے نے دھیرے سے گردن گھمائی تھی اور یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئی تھی کہ وہ اسی پہ نظریں گاڑے کھڑا تھا۔
مائیکرو کے بزر نے کچن میں چھائی خاموشی میں ارتعاش سا برپا کیا تو وہ تیزی سے پلیٹ کے کباب نکال کر ٹیبل کی جانب بڑھ گئی۔
"آ---- آئیں لالہ کھانا لگا دیا ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کرتی آہستگی سے بولی تو فاروق دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے پاس سے گزرتا ہوا 'قصداً" اپنا بازو اس کے شانے سے ٹکرا گیا اور آبگینے عبدالصمد کے پیروں تلے سے گویا زمین نکل گئی۔
ایک جھٹکے سے رخ موڑتے ہوئے اس نے اپنی جھکی نظریں اٹھاتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ جہاں فاروق نجیب چہرے پر حظ اٹھانے والی کیفیت لیے اس کے رنگ بدلتے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔
"کیا ہوا؟" اس نے انجان بنتے ہوئے بھنویں اچکائیں تو آبگینے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے پلٹ کر آگے بڑھنے لگی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دوسرا قدم اٹھاتی فاروق نے تیزی سے آگے آتے ہوئے اس کا بازو تھام لیا۔
"کہاں جا رہی ہو' میرا ساتھ نہیں دو گی؟" وہ اس کی بازو کی نرمی اپنی انگلیوں پہ محسوس کرتا ذومعنی لہجے میں بولا تو وحشت زدہ سی آبگینے نے اپنے وجود کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا اور اگلے ہی لمحے دوڑتی ہوئی کچن سے نکلتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کمرے کی تنہائی میں موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہ تھی۔
بے یقینی' خوف اور بے بسی نے مل کر آبگینے عبدالصمد پہ ایسا دھاوا بولا تھا کہ وہ رات بھر پھوٹ پھوٹ کر روتی اور اپنی حرماں نصیبی کا ماتم کرتی رہی تھی۔ زندگی نے تو اسے پہلے ہی ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں چھائے اندھیرے نے اس کے دل کی ہر خواہش اور آنکھوں کا ہر خواب چھین کر اس کے وجود کو بنجر کر دیا تھا اور اب اس بنجر وجود کو بھی اس کے اپنے ہی محافظ بری نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ وہ بھلا غیروں سے کسی بھلائی کی توقع کر سکتی تھی۔
عورت کی ذات اپنے محرموں کے سائے بنا اتنی حقیر' اتنی ارزاں بھی ہو سکتی ہے اسے آج پتا چلا تھا اور اسی انکشاف نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔
وہ تو کسی کو اپنے منہ سے کچھ کہنے کے بھی قابل نہ تھی۔ فاروق نجیب کا ایک جملہ اسے ہمیشہ کے لیے رسوائیوں کی کن اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل سکتا تھا وہ اس حقیقت اور اپنی اوقات سے ---- واقف تھی۔ جبھی تو آنسو خشک ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔
اس نئی ٹینشن کا نتیجہ اگلی صبح بخار کی صورت نکلا تھا۔
اس کی اس درجہ طبیعت خرابی نے بلقیس بیگم کے

ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے اور جب ڈاکٹر نے اس طبیعت خرابی کی وجہ ذہنی دباؤ بتایا تو سب ایک دوسرے سے نظریں چرا کر رہ گئے۔

نازک سا یہ وجود تنہائیوں کی جس صلیب پہ چڑھایا جا چکا تھا وہ سب اس کی اذیت سے ــــ واقف تھے۔ لیکن گونگے اور بہرے بنے وہ محض اپنی فرسودہ رسومات کو زندہ رکھنے کے لیے چشم پوشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ پھر چاہے یہ خاموشی کسی بے گناہ کو نگل لیتی یا ذہنی مریض بنا دیتی' ارباب اختیار کو ایسے محکومین سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔

بلقیس بیگم کی خاص توجہ کے باعث آبگینے کی ظاہری طبیعت تو جلد سنبھل گئی تھی۔ لیکن اسے جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ اس نے اپنے کمرے سے نکلنا بھی خاصا کم کر دیا تھا اور یہ بات بلقیس بیگم کو از حد پریشان کر گئی تھی۔ اس کے درد کو وہ ایک بیٹی کے درد کی طرح محسوس کرنے لگی تھیں۔ مگر وہ بڑی بے بس ماں تھیں جو نہ جانے والے کو بچا سکی تھیں اور نہ اس تڑپتے وجود کے لیے کچھ کر سکتی تھیں۔

"آبگینے! اٹھو کمرے سے باہر نکلو بچے۔ دیکھو کتنا پیارا موسم ہو رہا ہے۔" انہوں نے آگے بڑھ کر کھڑکی پر پڑے پردے پیچھے ہٹاتے ہوئے کھڑکی کھولی تو تازہ ہوا کا تیز جھونکا اس کے بالوں سے شرارت کرتا' اسے باہر دیکھنے پر مجبور کر گیا۔ جہاں آسمان پر چھائے بادل اس کا دل بہلا گئے تھے۔

"اماں۔" کھلے آسمان پر نگاہیں جمائے وہ بے اختیار انہیں پکار بیٹھی۔

"ہاں!" بلقیس چلتے ہوئے بیڈ پہ اس کے برابر آ بیٹھیں۔

"میں کچھ دیر کے لیے باہر ہو آؤں۔" وہ آہستگی سے بولی تو بلقیس بیگم مسکرا دیں۔

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ اٹھو باہر نکلو۔" انہوں نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

"میں حویلی سے باہر جانے کی بات کر رہی ہوں۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے ان کی جانب دیکھا تو ایک پل کے لیے بلقیس خاموش ہو گئیں۔ وہ اس حقیقت سے ــــ واقف تھیں کہ آغا ماما کے گھر کا ماحول چھوٹی حویلی کی طرح' ان کے گھر سے قدرے مختلف اور کھلا تھا۔ جبکہ یہاں نجیب جلال ذرا سخت طبیعت کے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم کپڑے تبدیل کرو۔ میں زلیخا اور سکینہ سے کہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ جائیں۔" اس کی طبیعت کے پیش نظر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں تو آبگینے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام گئی۔

"آپ بہت اچھی ہیں اماں۔" اور بلقیس نجیب کے لب مسکرا دیے۔

"نہیں میری بیٹی زیادہ اچھی ہے۔ اب تم تیار ہو جاؤ۔ میں تب تک جا کے بی بی سے بھی اجازت لے لوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں تو آبگینے بھی اٹھ کر واش روم کی جانب بڑھ گئی۔

پھر مراد بی بی سے انہوں نے کیا کہا اور کیا نہیں لیکن اسے بہرحال زلیخا اور سکینہ کے ساتھ باہر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

ڈرائیور انہیں آبگینے کی ہدایت پہ آبادی سے تھوڑی دور کھلی فضا میں چشموں کے کنارے لے آیا تھا۔ جہاں اتر کر تازہ ہوا میں وہ خود کو کتنی ہی دیر پرسکون کرتی رہی۔

چشمے کے ٹھنڈے شفاف پانی میں پاؤں ڈالنے پر اسے بے اختیار اپنی دونوں بہنیں اور کزنز یاد آئی تھیں۔ وہ سب ایسے موقعوں پر مل کر کتنا انجوائے کیا کرتی تھیں۔ شرارتیں اور کھلکھلاہٹیں تو رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں اور اب ــــ

ماضی سے نکل کر دھیان حال کی جانب لوٹا تو بے اختیار اس کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

"بی بی جی وہ سامنے دیکھیں کتنا بڑا باغ ہے خوبانیوں کا۔" سکینہ کے متوجہ کرنے پہ اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا جہاں تھوڑے فاصلے پہ خوبانیوں کا بہت بڑا باغ تھا۔

"ہاں۔" وہ بے دھیانی سے بولی تو سکینہ پرجوش سی بولی۔

"بی بی چل کر تھوڑی سی خوبانیاں توڑیں؟"

"بری بات ہے سکینہ۔ یوں بنا اجازت پھل توڑنا چوری کرنا ہوتا ہے۔" اس نے نرم لہجے میں سرزنش کی تو سکینہ کا سارا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"اچھا ہم باغ میں چل کر گھوم تو سکتے ہیں نا؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پر امید نظروں سے آبگینے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ چاہ کر بھی اسے منع نہ کر سکی۔ حالانکہ وہاں پر باغ کی رکھوالی کے لیے موجود ملازموں میں سے کوئی بھی انہیں کبھی بھی مل سکتا تھا۔

"اچھا چلو۔ لیکن دیکھو پھل کو ہاتھ مت لگانا۔" اٹھتے ہوئے اس نے انہیں تنبیہہ کی تو وہ سر ہلاتی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ ہو لیں۔

باغ میں پہنچ کر دونوں لڑکیاں اٹکھیلیاں کرتی ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ان کی ہنسی چار سو بکھر گئی ایک سوگوار سی مسکراہٹ آبگینے کے لبوں پر بھی بکھر گئی جو وہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی تھی۔

بے دھیانی سے انہیں دیکھتے کب خیالات کی رو بھٹکتی ہوئی ایک بار پھر فاروق نجیب اور اپنی بے بسی پہ جا ٹھہری' اسے پتا ہی نہیں چلا۔

اپنے آپ میں گم وہ خاموشی سے سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ جب اچانک درختوں کی اوٹ سے نکل کر کوئی اس کے سامنے آ رکا۔

"کون ہو تم؟" فراخ پیشانی پہ بل سجائے ذکا نے اچنبھے سے کالی چادر میں لپٹے اس وجود کو دیکھا جو سر جھکائے ہوئے تھا۔

اس کی اس اچانک مداخلت پہ اپنے دھیان میں بیٹھی آبگینے بری طرح ڈر گئی تھی۔ تیزی سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ جہاں سفید کلف لگے کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس ایک لمبا چوڑا نوجوان کھڑا اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے آنسو صاف کرتی چادر سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

جبکہ دوسری جانب اس کے سر اٹھاتے ہی ذکا کی نظریں اس کے سراسیمگی لیے بھیگے سرخ چہرے پر جیسے ٹھہر سی گئی تھیں۔ بے اختیار ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا اور وہ پہاڑ پہ نظر آنے والی اس لڑکی کو یوں اچانک اپنے ہی باغ میں روبرو پا کر حیران رہ گیا تھا۔

"معاف کیجیے گا ہم بنا اجازت آپ کے باغ میں چلے آئے۔" وہ چہرہ چادر کی اوٹ میں کرتی نگاہیں جھکائے شائستگی سے بولی تو ذکا اس کی آواز کی خوب صورتی کو محسوس کرتا لفظ ہم پر الجھ سا گیا۔ جبکہ وہ اس کی الجھن سے بے نیاز اپنے نرم لہجے میں بولی تھی۔

"لیکن ہم نے پھل کو ہاتھ نہیں لگایا۔" اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے ذکا کو نہیں پہچانا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے رخ موڑتے ہوئے زلیخا اور سکینہ کو پکارا تو دور سے دو لڑکیاں دوڑتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ اور ذکا کی الجھن دور ہو گئی تھی۔

"لیکن آپ ہیں کون؟" اس کی لمبی گھنیری پلکوں پہ نگاہیں جمائے وہ عجیب سی بے اختیاری کے زیر اثر بولا تو آبگینے ایک ناگوار سی نظر اس کے چہرے پر ڈالتی بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے پیچھے تیز قدموں سے چلتی وہ دونوں لڑکیاں بھی اپنی مسکراہٹ دبائے باغ سے باہر نکل گئیں تو شرمندہ سا ذکا بے اختیار لب بھینچ کر رہ گیا۔

"پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے؟" وہ سر جھٹکتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔ عین اسی لمحے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تو وہ تیزی سے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ جہاں قدرے فاصلے پہ کھڑی نجیب جلال کی لینڈ کروزر میں انہیں سوار ہوتا دیکھ کر ذکا کی حیرت دوچند ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ذکا گھر لوٹا تو طبیعت عجیب پژمردہ سی ہو رہی تھی۔ جبکہ ذہن میں مسلسل آج شام کا واقعہ گردش کر رہا

تھا۔

وہ جب آج دوپہر کھانے کے بعد باغوں میں فصل کا معائنہ کرنے کے ارادے سے نکلا تھا تو اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہاں اسے وہ چہرہ نظر آجائے گا جسے وہ خاصی کوشش کے بعد ذہن سے جھٹکنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ لڑکی کیوں اس کی یادداشت میں محفوظ رہ گئی تھی وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

لیکن آج اسے اچانک سامنے پاکر جہاں وہ حیران ہوا تھا' وہیں اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ اسی بے اختیاری کے زیر اثر وہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوا تھا۔ لیکن اس کے سوال کا یہ جواب تھا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

اس لڑکی کا تعلق بڑی حویلی سے تھا۔ اس حقیقت نے اسے نا صرف حیران کردیا تھا بلکہ تب سے لے کر اب تک ایک عجیب سی افسردگی تھی جس نے اس کے دل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور ایسا کیوں ہو رہا تھا' وہ پہلے کی طرح اب بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

شاید وہ لڑکی اسے اچھی لگی تھی۔ لیکن پھر اچھی تو اسے اور بھی بہت سی لڑکیاں لگتی رہی تھیں۔ جن میں سے کچھ کے ساتھ تو اس کی دوستی' پسندیدگی اور ہلکے پھلکے لگاؤ تک بھی جا پہنچی تھی۔ مگر کسی کے لیے محض دو اتفاقی ٹکراؤ کی بنیاد پہ ایسی کیفیت اس نے پہلی بار محسوس کی تھی اور اپنی یہی کمزوری اسے رہ رہ کر غصے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"میری بلا سے وہ مراد بی بی کی پوتی ہو یا کوئی اور' مجھے اس سے کیا لینا دینا۔" با آواز بلند خود کو باور کرواتے ہوئے وہ ہاتھ میں پکڑی سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

لابی کراس کر کے وہ اپنے دھیان میں سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ نیچے سے آتے سکندر بخت کی بلند آواز نے اسے چونکنے اور تیزی سے زینہ عبور کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

"میں پوچھتا ہوں تمہیں انہیں حویلی کا پتا دینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو وہاں موجود تمام بڑوں کے علاوہ اپنی دونوں پھپھیوں کو دیکھ کر بے اختیار چونک گیا۔ جبکہ سکندر بخت خاصے غصے میں کمرے کے وسط میں کھڑے اپنی بہن زینب کو دیکھ رہے تھے۔

"لالہ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ دل میں کیا سوچے ہوئے ہیں۔ ہماری ان سے اچھی خاصی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ وہ بے حد اچھے اور خاندانی لوگ تھے۔ ان سے یہ دوستی قائم رہے بس یہی سوچ کر میں نے انہیں یہاں کا پتا اور فون نمبر دے دیا تھا۔" وہ شرمندہ سے لہجے میں گویا ہوئیں تو الجھا ہوا سا ذکا آگے بڑھ آیا۔

"کیا بات ہے لالئی آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" اس نے ایک نظر باپ کے خفا چہرے پر ڈالتے ہوئے پھپھی کی جانب دیکھا جو بے اختیار سامنے کھڑے بھائی کو دیکھتے ہوئے نظریں چرا گئی تھیں۔

"آج کچھ لوگ کراچی سے گل مینا کا رشتہ لے کر آئے تھے۔" جواب زینب کے بجائے سلطانہ چچی نے دیا تو ذکا حیرت زدہ سا ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"کراچی سے؟ کون تھے وہ؟"

"ارے بچے تھے کوئی بھلے مانس جب یہ سب کراچی گئے تھے تو وہاں وہ ہمارے گھر کے ساتھ والے بنگلے میں نئے نئے شفٹ ہوئے تھے۔ ان کے آنے پہ ملنا ملانا ہوا تو انہیں کہیں ہماری گل مینا پسند آگئی۔ لیکن انہوں نے تمہاری لالئی سے ذکر نہیں کیا۔ مگر ان کی واپسی پہ انہوں نے فون نمبر اور ہمارے گھر کا پتا لے لیا تھا اور آج وہ تمہارے جانے کے بعد اچانک شام میں گھر آگئے اپنے کپتان بیٹے کا رشتہ لے کے۔" بی بی خرو نے رسان سے اسے پوری تفصیل سے آگاہ کیا تو ذکا کو اپنے باپ کے اس درجہ غصے اور ناراضی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ مگر اس سارے قصے میں حقیقتاً" زینب پھپھو کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ جبھی وہ ان کی شرمندگی اور ماحول پہ چھائی کشیدگی کو دور کرنے کی خاطر نرم لہجے میں بولا۔

"چلیں کوئی بات نہیں۔ اب ان لوگوں کو بھی کیا معلوم تھا کہ ہماری گل مینا کے ساتھ کیا حادثہ ہو چکا

ہے۔"

"یہی سوچ کر تو میں نے بھی رسان سے کام لیا تھا۔ لیکن وہ تو ہمارے انکار کی وجہ جان کے الٹا ہمیں ہی قرآن اور حدیث کے حوالے دے کر سمجھانے لگے۔ یہ بتانے لگے کہ ہم اپنی عورتوں اور بچیوں کے ساتھ کتنا ظلم کر رہے ہیں۔" سکندر بخت غصے سے بولے تو ذکا کی پیشانی پر بھی شکنیں در آئیں۔

"وہ کون ہوتے ہیں ہمیں بتانے والے کہ ہم کیا غلط کر رہے ہیں اور کیا نہیں۔ ہماری اپنی روایات' اپنی پہچان ہے۔ ہمیں ان کے مشوروں کی ضرورت نہیں۔" وہ ناگواری سے بولا تو اس پہ جمی زمرد سکندر کی مان بھری نظریں خاموشی سے جھک گئیں۔ نہ جانے کیوں لیکن انہیں یہ یقین سا تھا کہ جب ساری بات ذکا کو پتا چلے گی تو وہ ضرور آنے والوں کے حق میں فیصلہ دے کر اپنے باپ کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اپنی بہن کی محبت میں وہ ضرور اس کے لیے آواز اٹھائے گا' لڑے گا۔ لیکن اس کی بات نے تو ان کا پہلا اور آخری سہارا بھی چھین لیا تھا۔ مان ٹوٹنے کی اذیت پہ بے اختیار انہیں اپنے سینے میں ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ جس نے ان کی آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔

ان کا پڑھا لکھا بیٹا اندر سے ایک روایتی جاگیردار نکلا تھا' انہیں یہ حقیقت جان کے اپنی تربیت اور اس کی تعلیم پہ افسوس ہو رہا تھا۔ جو ایک طرف تو اپنی بہن سے شدید محبت کا دعوے دار تھا لیکن دوسری طرف اپنی فرسودہ اور ظالمانہ رسموں کو سینے سے لگائے اسی بہن کو اپنے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر رہا تھا۔

ان کے خاندان کے سب مرد ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے تھے۔ ظالم اور بے حس! جن کے دوغلے اور جھوٹے اصول ان کی اپنی ذاتوں کے لیے کچھ اور تھے اور اپنی ہی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے لیے کچھ اور۔

"یہی جواب میں نے بھی انہیں دیا تھا۔ مگر وہ اس بات کو وجہ بنا کر انکار سننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ہمیں سوچنے کے لیے وقت دے کر پھر آنے کا کہہ گئے ہیں۔" وہ غصے سے بھری ایک نظر زینب بیگم پہ ڈالتے ہوئے بولے تو ذکا کی ناگواری میں اضافہ ہو گیا۔

"اگر ایسی بات ہے تو اگلی بار میں خود ان سے ملوں گا۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" باپ کو تسلی دیتا وہ ماں کی اذیت دوچند کر گیا تھا۔ ضبط کے باوجود زمرد بیگم کی سسکی لبوں کی فصیل توڑ کے کمرے کی فضا میں بکھر گئی تھی۔

ان کے یوں سسک اٹھنے پہ سکندر بخت کھا جانے والی نظروں سے بیوی کو گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تھے۔ ان کے پیچھے لب بھینچے ہوئے ذکا اور متاسف سے جمال بخت بھی باہر کی جانب بڑھ گئے تو بی بی خرو نے اک بوجھل سانس لیتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر روتی ہوئی زمرد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ جن کے آنسوؤں میں اپنی مشفق ساس کے سینے سے لگتے ہی کچھ اسی طرح سے شدت آئی تھی کہ وہاں موجود بھی خواتین کی آنکھیں بے اختیار بھر آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

فاروق خاصے غصے کے عالم میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ اسے یوں تن فن کرتا دیکھ کر لاؤنج میں موجود بی بی کلاں سمیت بلقیس اور ان کی دونوں دیورانیاں بے اختیار چونک گئیں۔

"کیا ہوا فاروق بچے' کیوں اتنے غصے میں ہو؟" مراد بی بی نے متفکر نظروں سے پوتے کے سرخ چہرے کی جانب دیکھا جو ان کے استفسار پہ مٹھیاں بھینچے تنفر سے بولا۔

"نہیں دیکھا جاتا مجھ سے ذکا سکندر کا یہ طنطنہ۔۔۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ پورے علاقے میں گردن اکڑائے پھرتا ہے اور ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" مارے جھنجلاہٹ کے اس نے صوفے پہ مکا مارا۔ تو مراد بی بی اک گہری سانس کھینچتے ہوئے زہرخند سی بولیں۔

"میں دیکھتی ذکا سکندر کا یہ طنطنہ کہاں جاتا اگر جو اس کا باپ اور فیض بخت اسے بچانے کے لیے داؤ پیچ

نہ لڑاتے۔ ساری زندگی اس خاندان نے مجھے اور میری اولاد کو تکلیفیں دینے کے سوا کیا ہی کیا ہے؟"

"کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کے اس کمینے کو بیچ سڑک میں اتنی گولیاں ماروں کہ اس کے گھر والوں سے اس کی صورت پہچاننا مشکل ہو جائے۔" فاروق دانت پیستے ہوئے بولا تو بلقیس نے دہل کر بیٹے کو دیکھا۔

"خبردار! جو تم نے ایسا کچھ کرنے کے بارے میں سوچا بھی پہلے ہی ایک کو باپ نے اپنی ضد کی بھینٹ چڑھا دیا اور اب تم خود کو دشمنی کی نذر کر دو۔" وہ ایک شکایتی نظر سامنے بیٹھی ساس پہ ڈالتے ہوئے سخت لہجے میں بولی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ بی بی کلاں انہیں کچھ کہتیں' آبگینے قہوے کی ٹرے اندر لیے داخل ہوئی۔ اسے آتا دیکھ کر جہاں لاؤنج میں خاموشی چھائی تھی۔ وہیں فاروق نجیب کی آنکھوں میں غصے کی جگہ حریصانہ سی چمک اتر آئی۔

وہ آج کتنے دنوں کے بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ ورنہ اس روز کے بعد سے تو وہ اپنے کمرے میں جیسے گوشہ نشین ہو گئی تھی اور وہ چاہ کر بھی اسے دیکھ نہ پایا تھا کہ اس کی طبیعت خرابی کے باعث ہمہ وقت کوئی نہ کوئی اس کے پاس موجود ہوتا تھا اور ان کے ہاں اتنی بے تکلفی نہ تھی کہ وہ دندناتا ہوا اس کے کمرے میں چلا جاتا۔

اپنے دھیان میں اندر داخل ہوتی آبگینے کی نظر جونہی وہاں کھڑے فاروق پہ پڑی' وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پہ رک گئی۔ یک لخت اس کے چہرے نے رنگ بدلا تھا اور ہاتھ میں پکڑی ٹرے کانپ اٹھی۔

"دھیان سے بیٹا! تمہیں کس نے کہا تھا یہ سب کرنے کو۔" بلقیس نے تیزی سے اس کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ہوئے ڈپٹا تو وہ لب کاٹتی پلکیں جھکا گئی۔

"ادھر آ بچے میرے پاس۔" مرادی بی نے اسے پیار سے پچکارا تو وہ نا چاہتے ہوئے بھی ان کے پہلو میں آ بیٹھی۔ اسے ان کے برابر جگہ سنبھالتے دیکھ کر فاروق بھی مقابل بڑے صوفے پر بیٹھتا قہوے کی پیالی تھام

گیا۔

"آج شام نقیب اللہ کی بیٹی کی مہندی ہے۔ اس کے گھر والی خاص طور پہ تم سب لڑکیوں کا بلاوا لے کے آئی تھی۔ تم نے بھی شام میں ضرور جانا ہے۔" اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے اپنے پرانے ملازم کا حوالہ دیا تو وہ لب بھینچے اثبات میں سر ہلا گئی۔ جھکی نظروں کے باوجود وہ خود پہ جمی فاروق کی نگاہیں محسوس کر سکتی تھی اور یہ احساس اس کی پلکیں بھگو گیا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟" معاً فاروق کی آواز کمرے میں گونجی تو اپنے آنسو ضبط کرتی آبگینے کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ نظریں جھکائے بمشکل تمام اپنے اندر اٹھتی نفرت کی لہر پہ قابو پاتے ہوئے بولی۔ ورنہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس گھٹیا شخص سے مخاطب ہونا تو دور اس کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ کرتی۔

"اپنا خیال رکھا کرو۔ یہ گھر اور یہاں رہنے والے بھی لوگ تمہارے اپنے ہیں۔ تمہیں کسی بھی چیز کی کبھی بھی ضرورت پڑے تو تم بلا جھجک کہہ سکتی ہو۔" وہ "کسی" اور "کبھی" پہ زور دیتا بظاہر بڑے خلوص سے بولا تھا۔ اس کا یوں بھابھی کو مان دینا بلقیس کو اندر تک سرشار کر گیا۔

"فاروق بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے بچے۔ یہ گھر اور ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم دوبارہ کبھی خود کو تنہا سمجھ کے پریشان مت ہونا۔" اس کی پشت سہلاتے ہوئے مرادی بی نے بھی پوتے کی ہاں میں ہاں ملائی تو اس کی بات کا اصل مفہوم سمجھتی آبگینے کے اندر تک آگ لگ گئی۔

بے اختیار اپنی جھکی نگاہیں اٹھاتے ہوئے اس نے اک شعلے برساتی نظر سامنے بیٹھے شخص کے مکروہ چہرے پر ڈالی جو محظوظ ہوتی نظروں سے اس کا جائزہ لیتا ہوا ہاتھ میں پکڑا کپ لبوں سے لگا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے میں بیٹھی بے دلی سے ہاتھ میں پکڑے

میگزین کے ورق پلٹ رہی تھی' جب بجی بنی وژمہ اور زرسانگہ دروازہ کھول کے اندر چلی آئیں۔ وہ دونوں زبیر جلال کی بیٹیاں تھیں۔

"آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں بھابھی؟" اسے گھر کے کپڑوں میں بیڈ پہ نیم دراز دیکھ کر دونوں تیز قدموں سے اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔

"نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا جانے کو۔" وہ انہیں دیکھتی سیدھی ہو بیٹھی۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو تم دونوں۔" اس نے بغور دونوں بہنوں کا جائزہ لیا جو یوں بنی سنوری بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

"آپ ہمیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کیوں نہیں چل رہیں؟" منہ بناتی وژمہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ اک گہری سانس لیتی دھیمے سے مسکرا دی۔

"بس یونہی دل نہیں کر رہا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ حالانکہ بی بی نے خاص طور پہ آپ کو کہا تھا اور ابھی بھی انہوں نے ہی ہمیں یہ دیکھنے کے لیے بھیجا تھا کہ آپ تیار ہوئی ہیں یا نہیں۔" وژمہ نے بولتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چلیں نا بھابھی آپ کا دل بھی بہل جائے گا۔" وہ چھوٹی سی لڑکی محبت سے بولی تو آبگینے جیسی بامروت کے لیے اپنی بات پہ قائم رہنا مشکل ہو گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" نرم لہجے میں کہتی وہ ہلکا سا مسکرائی تو دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔

"یہ ہوئی نا بات! آپ فٹافٹ جا کے فریش ہوں۔ میں تب تک آپ کے کپڑے نکالتی ہوں۔" زرسانگہ تیزی سے الماری کی جانب بڑھ گئی تو وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاور لے کر وہ باہر آئی۔ تو دونوں لڑکیاں کپڑوں کے علاوہ اپنا میک اپ اور جیولری بھی نکالے بیٹھی تھیں۔

"یہ سب کیوں لائی ہو؟" وہ ایک نظر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے سامان پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"آپ کو تیار کرنے کے لیے۔" زرسانگہ نے اسے شانوں سے تھام کر آئینے کے سامنے بٹھانا چاہا تو آبگینے نے نرمی سے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔" وہ افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولی تو زرسانگہ اس کا مطلب سمجھنے کے باوجود شوخی سے مسکرا دی۔

"مجھے پتا ہے بھابھی کہ آپ بہت خوب صورت ہیں اور آپ کو واقعی ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہلکی سی لپ اسٹک اور تھوڑا سا کاجل لگا لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔" اس نے کہتے ہوئے آبگینے کو اپنے سامنے بٹھا کر لائٹ پنک کلر کی لپ اسٹک اور کاجل کی ہلکی سی لکیر اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں لگا دی تو وہ کتنی ہی دیر اپنے عکس کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی اور جب آئینہ دھندلانے لگا تو دھیرے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ باہر آئی تو بلقیس بیگم کو کمرے میں اپنا منتظر دیکھ کر ان کے قریب چلی آئی۔

"یہ میں تمہارے لیے لائی تھی۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ڈبا کھول کے اس کی جانب بڑھایا تو وہ زرقون کے نفیس سے لاکٹ سیٹ کو دیکھ کر جھجک سی گئی۔

"لیکن اماں لوگ کیا کہیں گے؟" اس نے اپنی واہموں میں گھری آنکھیں اٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"کسی کی مجال نہیں جو وہ نجیب جلال کی بہو کو ایک لفظ بھی کہہ سکے۔" انہوں نے ڈبے میں سے سیٹ نکال کر اسے پہنا دیا۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔" انہوں نے بے اختیار کالے کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس آبگینے کی پیشانی چوم لی۔ جس کا روپ محض اتنی سی تیاری سے ہی دمک اٹھا تھا۔

تیار ہو کے وہ گاڑی میں سوار منزل کی جانب روانہ ہوئی تھیں جب کچھ دور جا کے اچانک گاڑی جھٹکے کھا کر رک گئی۔

"کیا ہوا چاچا؟" آبگینے نے پریشانی سے ادھیڑ عمر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں بی بی میں دیکھتا ہوں۔" وہ نیچے اتر کر بونٹ کھول کر کھڑا ہو گیا تو نصیر چچا کی زرتاشہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"اب پتا نہیں کتنی دیر لگے گی۔"

"بھابھی کیوں نا ہم پیدل نقیب چاچا کے گھر چلے جائیں۔ یہ دو گلیاں چھوڑ کے تو ان کا گھر ہے۔" وژمہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

"نہیں پہلے چاچا کو دیکھ لینے دو' پھر اگر گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی تو ہم پیدل چلے جائیں گے۔"

مگر جب کافی کوشش کے بعد بھی گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی تو مجبوراً وہ تینوں بچیوں کو لیے نیچے اتر آئی۔

وژمہ کے اصرار پہ وہ ڈرائیور کو منع کرتی تنہا ہی ان کے ساتھ چل دی تھی۔ جو اس چھوٹی سی واک کو انجوائے کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ وگرنہ ان کی زندگی تو محض قریبی قصبے میں واقع اسکول اور کالج سے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یا پھر خاندانی تقریبات تک یا بہت ہوا تو کبھی کبھار مردوں کے ساتھ شہر جا کے شاپنگ کر لی جاتی تھی اور بس۔ اس سے زیادہ آزادی کے نجیب جلال قائل نہ تھے اور مردوں کے لیے وہ ہر پابندی کے خلاف تھے۔

اسی دوہرے معیار کو سوچتی وہ بے دھیانی کے عالم میں چل رہی تھی۔ جب گلی کا موڑ مڑتے شخص سے وہ بری طرح ٹکرانے لگی تھی کہ اچانک ساتھ چلتی زرتاشہ نے تیزی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک جانب کیا تھا۔

اس اچانک افتاد پہ جہاں وہ بری طرح چونکی تھی' وہیں اس کا پاؤں بھی رپٹ گیا تھا۔ بے اختیار سی کی آواز کے ساتھ اس نے لڑکھڑا کر وژمہ کے بازو کا سہارا لیا اور تبھی اس کی چادر' اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کے سر پہ سے بھی سرک گئی۔

"دھیان سے!" اس کے یوں لڑکھڑا جانے پہ مقابل بے اختیاری کے عالم میں گویا ہوا تھا۔ لیکن جونہی اس کی نظر آبگینے کے چہرے سے ٹکرائی وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑستی' وہ کاجل لگی آنکھوں میں نمی لیے' تکلیف کے عالم میں اپنی گلابی لبوں کو دبائے' پاؤں میں اٹھتی ٹیسوں کو برداشت کرنے کی کوشش میں خود سے بھی بے گانہ کھڑی تھی۔ مگر اس بے گانگی کے باوجود وہ ذکا سکندر کا سارا دھیان اس حد تک اپنی جانب مبذول کروا چکی تھی کہ اس کے لیے اس کے دمکتے چہرے سے نگاہیں ہٹانا دشوار ہو گیا تھا۔

"آپ' آپ ٹھیک تو ہیں؟" بمشکل تمام اس کے کانوں میں لٹکے ڈائمنڈ کے پھولوں سے نگاہیں چراتے ہوئے اس نے آبگینے کے پاؤں کی طرف دیکھا تھا۔ جو کالی جوتی میں موم سے بنا لگ رہا تھا۔

یک لخت ذکا کو اپنا آپ بڑا بے بس اور بے اختیار سا محسوس ہوا تھا۔

"جی۔" مقابل کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی اس نے تیزی سے اپنی چادر درست کرتے ہوئے اپنا چہرہ اس کی اوٹ میں کیا۔ لیکن ذکا کو یہ احتیاط اب بے سود لگی تھی۔

"چلو وژمہ۔" خود پہ ضبط کرتی وہ اپنے برابر کھڑی لڑکی کے بازو پہ زور ڈالتی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئی۔

اک ٹرانس کے عالم میں ذکا نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔ جہاں وہ دھیرے دھیرے چلتی گلی کا موڑ مڑ گئی تھی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ذکا بھی جیسے خود میں لوٹ آیا تھا۔

اپنی لمحاتی بے خودی کا احساس اسے بے اختیار لب بھینچنے پہ مجبور کر گیا تھا۔

اس تمام عرصے میں اس نے اک نگاہ غلط بھی ذکا پہ نہ ڈالی تھی۔ جبکہ ذکا کے لیے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا وہ پچھلی دو مرتبہ کی طرح اب بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ بلکہ وہ تو اب تک اس احساس کو بھی سمجھ نہیں پایا تھا جو اسے یوں اچانک اپنے روبرو پا کے ذکا کو خود پہ چھاتا محسوس

ہوا تھا۔ حتی کہ اپنا نظر انداز کیے جانا بھی اسے آج گراں نہ گزرا تھا۔ بلکہ اس کی بے نیازی اور اس کی تمکنت ذکا کے لیے اس کی کشش میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔

اور یہ کوئی خوش آئند بات نہ تھی۔ اس کا تعلق جس گھر سے تھا۔ اس سے وہ نفرت کا کوئی نیا رشتہ تو جوڑ سکتا تھا مگر محبت کا تعلق کبھی استوار نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے اپنے دل سے لاتعلقی کیوں نہ اختیار کرنی پڑ جاتی۔

☼ ☼ ☼

آبگینے چند دنوں کے لیے اپنے میکے گئی تھی۔ واپسی پہ اپنی کچھ چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کتابوں کا بھی اک ڈھیر اٹھا لائی تھی۔ جسے اب وہ سکینہ کے ساتھ ترتیب سے دیوار میں بنے بک شیلف میں لگوا رہی تھی۔

"بی بی آپ نے یہ سب کتابیں پڑھی ہوئی ہیں۔" سکینہ نے حیرت سے ایک نظر کتابوں سے بھرے شیلف پہ ڈالتے ہوئے آبگینے کی جانب دیکھا جو اس کے سوال پہ مسکرا دی تھی۔

"ہاں۔"

"بی بی آپ مجھے بھی پڑھنا سکھا دیں گی؟" وہ لجاجت سے بولی تو آبگینے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم پڑھنا چاہتی ہو؟"

"جی بی بی بلکہ میری تو ساری سہیلیوں کو بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے۔" وہ اشتیاق سے بولی تو ایک خیال آبگینے کے ذہن میں کوندے کی مانند لپکا۔ کیوں نہ ان نادار بچیوں کے لیے وہ علم کی روشنی بکھیرنے کا ذریعہ بن جائے۔ لیکن کیسے؟

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے نجیب جلال سے خود اس بارے میں بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گو کہ اسے اپنی کامیابی کا دس فیصد بھی امکان نہ تھا' مگر پھر بھی وہ اس کار خیر کے لیے ایک کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی۔

اس کی بات سن کے نجیب جلال خلاف توقع کچھ نہیں بولے تھے۔ مگر اگلے دن انہوں نے بی بی کلاں اور سب گھر والوں کے سامنے اسے حویلی سے کچھ دور واقع اپنے خالی پڑے گھر میں اسکول کھولنے کی اجازت دے کر حیران کر دیا تھا۔

ان کے اس فیصلے پہ مراد بی بی خاصی چیں بہ جبیں ہوئی تھیں۔ فاروق اور نصیر چچا کے احمد اور شیر علی نے بھی خاصا شور مچایا تھا۔ مگر جب تنہائی ملنے پہ نجیب جلال نے انہیں اپنے اس فیصلے کے اصل محرکات سے آگاہ کیا تو سبھی خاموش ہو گئے تھے۔

دراصل آئندہ آنے والے الیکشن میں نجیب جلال نے اپنے علاقے سے کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنے جوان بیٹے کی موت وہ بھولے نہیں تھے۔ اس کا بدلہ وہ نا صرف چھوٹی حویلی میں رہنے والوں بلکہ فیض بخت سے بھی لینا چاہتے تھے اور اس کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ وہ اپنے علاقے میں ان سے بھی مضبوط پوزیشن حاصل کر لیتے۔ یہ تبھی ممکن تھا جب وہ الیکشن جیت جاتے اور آبگینے کی اس خواہش نے انہیں جیسے اپنی سوچ پہ عمل پیرا ہونے کے لیے پہلی سیڑھی مہیا کر دی تھی۔ جبھی انہوں نے نا صرف اسے اجازت دے دی تھی۔ بلکہ خالی پڑا گھر بھی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ لوگوں پہ اپنی نیکی اور خدا ترسی کی دھاک بٹھانا چاہتے تھے اور اپنے ارادے میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک ہفتے سے بھی کم وقت لگا تھا اور نجیب جلال نے آبگینے کی سوچ کو تعبیر دے دی تھی۔ جبکہ وہ خود اپنی کامیابی پہ اب تک بے یقین سی تھی۔ پتھر میں جونک لگنے لگی وہ اس بات کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ مگر اپنی زندگی کو مقصد مل جانے پہ وہ بہت خوش تھی۔ اب دن کا زیادہ وقت وہ اسکول میں گزارنے لگی تھی اور یوں اس کے ذہن پہ ہمہ وقت سوار فاروق کا خوف بھی قدرے کم ہو گیا تھا گو کہ اسکول میں ابھی محض پانچ' چھ

بچیاں ہی تھیں مگر اسے یقین تھا کہ رفتہ رفتہ ہی سہی لیکن علم کے اس نور نے لوگوں کے ذہنوں پہ چھائے اندھیرے کو ضرور شکست دے دینی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے سنا ہے نجیب جلال نے اپنے گھر میں گاؤں کی بچیوں کے لیے اسکول کھولا ہے۔" ذکا نے ملازمہ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے سامنے بیٹھے باپ اور چچا کی جانب دیکھا۔

"سنا تو ہے مگر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے کپ سے سپ لی۔

"لیکن نجیب اور کوئی کام اپنے فائدے کے بنا کر جائے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ان کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں در آئیں۔

"ہاں تو الیکشن میں کھڑے ہونے کا ارادہ جو ہے۔" ذکا نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو سکندر بخت کے برابر بیٹھے جمال بھی چونک گئے۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" انہوں نے الجھ کر بیٹے کو دیکھا۔

"ہے کوئی اندر کا بندہ۔" اس نے کپ لبوں سے لگایا۔

"بس لالہ اب آپ بھی الیکشن میں کھڑے ہونے کی تیاری پکڑیں۔ آخر کو نجیب جلال کو حریف بھی تو ٹکر کا ملنا چاہیے۔" جمال بخت نے مسکراتے ہوئے کہا تو سکندر صاحب بھی دھیرے سے مسکرا دیے۔

"کیا خیال ہے ایک چکر اسکول کا لگا کر آئیں؟" بختیار نے کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے ذکا کی طرف دیکھا۔ تو وہ اس کی حظ اڑاتی نظروں کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"چلو۔" اور وہ دونوں سکندر بخت کے منع کرنے کے باوجود اٹھ کر باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

اپنے پیچھے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے ذکا نے ایک نظر سامنے موجود نئی پینٹ شدہ عمارت پہ ڈالتے ہوئے بختیار کی جانب مسکرا کر دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں آگے پیچھے چلتے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے تھے۔

انہیں یوں اندر آتا دیکھ کر بوڑھا چوکیدار جو کس انداز میں اپنی کرسی سے اٹھا تھا۔ مگر جونہی اس کی نگاہ ان کے چہروں پہ پڑی وہ پریشانی کے عالم میں اپنی جگہ پہ کھڑا رہ گیا۔

ذکا سکندر اور بختیار جمال کو تنہا روکنا اس کے بس میں نہ تھا اور انہیں اندر چھوڑنے پہ نجیب جلال نے اس کی حالت غیر کر دینی تھی۔

"پریشان مت ہو بابا، ہم صرف اسکول دیکھنے آئے ہیں۔" اس کے چہرے سے ٹپکتی مظلومیت پہ ذکا نے بے اختیار آگے بڑھ کے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو وہ بے بسی سے اپنے خشک لبوں پہ زبان پھیر گیا۔

"خان جی تھوڑا جلدی کر لینا۔" دو ہاتھیوں کی لڑائی میں جو حال گھاس پھوس کا ہوا کرتا ہے، وہی حال اس گاؤں کے لوگوں کا بھی تھا۔ جو دونوں حویلیوں میں بسنے والوں میں سے کسی کے سامنے بھی سر اٹھانے کی جرات نہیں رکھتے تھے۔

اثبات میں سر ہلا کر وہ اردگرد کا جائزہ لیتا بختیار کے ساتھ چلتا ہوا صحن کے وسط میں کھڑا ہوا تھا۔ جہاں سامنے برآمدے میں موجود کمروں میں سے ایک کے کھلے دروازے سے بچیوں کے اونچا اونچا گنتی پڑھنے اور پڑھانے والی کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

"اچھا گیم پلان ہے۔ کیوں نہ ہم بھی ووٹ کے لیے لڑکیوں کے لیے کالج بنوا دیں۔" بختیار نے ذکا کی طرف دیکھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا تو دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنس دیے۔

ان کے قہقہوں کی آواز پہ اندر موجود آبگینے نے الجھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔ اور صحن میں کھڑے دو اجنبیوں کو دیکھ کر وہ تیزی سے چادر سے چہرہ چھپاتی دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"کون ہیں آپ؟ اور اندر کس لیے آئے ہیں؟" کڑی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سخت لہجے میں استفسار کیا تو ذکا کے مسکراتے لب سمٹ سے گئے۔ اس کی نظریں چادر میں چھپے وجود کی جانب اٹھی تھیں اور دل کی دھڑکن میں بے اختیار ارتعاش سا برپا ہوا تھا۔

نہ جانے کیوں ہر بار یہ لڑکی اچانک اس کی راہ میں چلی آتی تھی۔ اگر اسے یہاں اس کی موجودگی کا علم ہوتا تو وہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔

اگلے ہی لمحے وہ لب بھینچے اپنی نگاہیں پھیر گیا تھا۔ جبکہ بختیار گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتا شوخی سے بولا۔

"ہم انسان ہیں میڈم جی اور اندر نجیب صاحب کا گیم پلان سمجھنے کے لیے آئے ہیں۔"

"کیا بدتمیزی ہے۔ آپ کو بات کرنے کی تمیز نہیں ہے کیا؟" بختیار کا انداز آبگینے کا خون کھولا گیا تھا۔ بے اختیار وہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔

"اوں، ہوں کیا آپ سکھا دیں گی؟" وہ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بنا اپنے سابقہ انداز میں بولا تو آبگینے کا ضبط جواب دے گیا۔

"خان بابا! کون ہیں یہ؟ اور آپ نے انہیں اندر کیوں آنے دیا؟" وہ غصے سے گیٹ کے پاس کھڑے چوکیدار سے مخاطب ہوئی تو وہ پریشان سا تیز قدموں سے آگے آتا ہوا بولا۔

"بی بی، یہ یہ، چھوٹی حویلی سے آئے ہیں۔" اور ذکا کی نظریں بے اختیار آبگینے کی طرف اٹھی تھیں جس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ وحشت سے ان کی جانب دیکھتی وہ بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹی تھی اور باوجود اس کے کہ اس کا چہرہ چادر کی اوٹ میں تھا۔ ذکا کو اس کا ڈر اس کی آنکھوں میں پھیلتا صاف دکھائی دے گیا تھا۔

"کیوں میڈم جی، ڈر گئیں کیا؟" بختیار اس کی حالت سے حظ اٹھاتا طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تو آبگینے کی نفرت عود آئی۔

"تم جیسے درندوں سے ہر شریف انسان ڈرتا ہے۔" نفرت اس کے ڈر پہ حاوی ہونے لگی تو آنکھوں سے بھی چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اس کے شوہر کے قاتلوں میں سے دو آج اس کے سامنے کھڑے تھے وہ بھلا کیسے خود پہ قابو رکھ سکتی تھی۔

"اے بی بی! زبان سنبھال کے بات کرو۔ تمہارا خاندان کتنا شریف ہے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔" ذکا کے لیے اس کی بات اور انداز دونوں ہی ناقابل برداشت تھے۔ جبھی وہ اسے سخت نظروں سے دیکھتا غصے سے بولا تو خوف زدہ سا چوکیدار ہاتھ جوڑے ان کے پاس چلا آیا۔

"خان جی، خدا کے لیے آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔"

"یہ آپ کسے خدا کا واسطہ دے رہے ہیں بابا۔ انہیں اگر خوف خدا ہوتا تو یہ یوں اس کے لوگوں پہ ظلم نہ کرتے۔" وہ ایک استہزائیہ نظر ان کے چہروں پر ڈالتی ہوئی بے خوفی سے بولی تو ذکا کے لبوں پہ اک تنفر بھری مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"اپنے ساتھ ہونے والے ظلم پہ تو بڑی جلدی تم لوگوں کو خدا یاد آ گیا..... دوسروں کے ساتھ لالچ، مکاری اور دھوکا دہی کرتے تمہارا خوف خدا کہاں چلا جاتا ہے؟ کہاں ہے تمہاری انسانیت یہ نیا ڈرامہ رچاتے ہوئے۔" اس نے بازو پھیلاتے ہوئے اردگرد اشارہ کیا۔

"نجیب جلال سے کہو ووٹ کے لالچ میں معصوم اور غریب لوگوں کے جذبات سے نہ کھیلے۔ یہ بے چارے تو ویسے ہی جدھر کو ہانکو گے چل پڑیں گے۔" اور اس کی بکواس سنتی آبگینے اس الزام پہ کھول اٹھی۔ اسکول کا خیال تو کلی طور پہ اس کا اپنا تھا۔ جس سے نجیب جلال یا کسی اور کا کوئی لینا دینا نہ تھا۔ پھر یہ مکار لوگ ان کے بارے میں ایسی افواہیں پھیلا کے کیوں گاؤں والوں کے درمیان ان کے لیے غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہ رہے تھے؟ کیوں یہ کوئی بھلائی کا کام نہیں ہوتا دیکھ سکتے تھے؟

"تم جیسوں سے یہی امید تھی۔ جب اور کچھ نہیں

بن پڑا تو خان صاحب پہ غلط الزام لگا کر ان کی نیک نیتی پہ سوالیہ نشان کھڑا کر دیا۔ آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟ کیوں اس گاؤں میں کوئی بہتری اور نیکی کا کام نہیں ہونے دیتے؟" مارے جھنجلاہٹ کے وہ بے اختیار آگے بڑھ آئی۔

"یا تو تم بہت زیادہ ہوشیار ہو یا بہت سیدھی! تمہارے "خان صاحب" کتنے نیک ہیں اور انہوں نے آج تک اس گاؤں کے لیے کتنے نیک کام کیے ہیں یہ تم بھی جانتی ہو اور ہم بھی۔ وہ بنا فائدے کے اپنے بہن بھائیوں کے نہیں تو غیروں کے کیا ہوں گے۔ ہم سے بات کرنے سے پہلے اپنے گھر کے مردوں سے پوچھو۔ تمہاری ساری خوش فہمی دور ہو جائے گی۔" ذکا تمسخرانہ انداز میں "خان صاحب" پہ زور دیتا ہوا بولا

اس کا پر یقین لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی آبگینے کو سوچنے پر مجبور کر گیا تھا۔ واقعی نجیب جلال جیسے تنگ نظر شخص کا یوں آرام سے مان جانا خاصا غور طلب تھا۔

اس کی خاموشی محسوس کر کے ذکا کی سنہری آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

"اور بائے دا وے ہم اچھے یا برے جو بھی ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ پہ ہیں۔ تمہارے "خان صاحب" کی طرح منافق نہیں ..... میں نہیں جانتا داؤد سے تمہارا کیا رشتہ تھا۔ مگر اس نے اپنی اور اپنے باپ کی اسی منافقت اور دھوکا دہی کی سزا پائی ہے۔" وہ اپنی بات مکمل کرتا، پلٹ کر آگے بڑھنے کو تھا کہ آبگینے کی سرد آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"سزا اور جزا کا عمل اپنے ہاتھ میں لینے والے آپ لوگ کون ہوتے ہیں؟ داؤد اگر دھوکے باز تھا تو اس کا معاملہ اللہ پہ چھوڑتے، لیکن آپ نے تو فرعونیت کی حد کر دی۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ اس لڑکی پہ کیا گزرے گی جس کے نکاح والے دن آپ لوگوں نے اس کا شوہر مار دیا۔" شدت جذبات سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ لیکن ذکا پہ اس کے آنسوؤں کا چنداں اثر نہ ہوا تھا۔

"اس نے ہماری گل مینا کے بارے میں سوچا تھا جو ہم اس لڑکی کے بارے میں سوچتے گل مینا کو برباد کر کے وہ خود بھلا کیسے آباد ہو سکتا تھا۔" وہ پلٹ کر بے نیازی سے بولا تو آبگینے کا دل اس درجہ سفاکی پہ کٹ کر رہ گیا۔

"اپنی گل مینا سے اتنی محبت تھی تو داؤد کے بجائے ان رسموں کا خاتمہ کیا ہوتا جنہوں نے اس کی زندگی برباد کر ڈالی ہے۔ لیکن تم میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان ظالم رسموں سے اپنی عورتوں کو نجات دلا سکے۔ تم بڑی بہادری سے غیرت کے نام پہ ایک دوسرے کے گلے تو کاٹ سکتے ہو لیکن غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح نہیں کہہ سکتے۔ شریعت کے نام پہ خود تو چار چار شادیاں رچا سکتے ہو لیکن اس شریعت نے جو عزت، جو مقام عورتوں کو بخشا ہے اس پہ عمل کرنا تو دور اس کے بارے میں سننا تک تمہیں گوارا نہیں۔ تمہیں اس لڑکی سے کوئی غرض نہیں لیکن اپنی گل مینا سے تو ہے نا۔ میں پوچھتی ہوں کیا لگتا تھا داؤد گل مینا کا جو اس کے نام پہ اسے بٹھا رکھا ہے۔ کیوں "ونی، سنگ چٹی" جیسی رسموں کی بھینٹ صرف عورتیں چڑھتی ہیں۔ کیوں کبھی کسی مرد کا نکاح قرآن سے نہیں پڑھوایا گیا۔ کیوں؟" برستی آنکھیں لیے وہ بنا کسی لحاظ مروت کے بولتی چلی گئی تو ساکت کھڑا ذکا اس کے یوں پھٹ پڑنے پہ حیرت زدہ سا اسے دیکھے گیا۔

"یہ یک لخت اسے کیا ہوا ہے؟" اس کے آنسوؤں پہ نگاہیں جمائے اس نے پریشانی سے سوچا تھا۔

"چل یار! استانی جی تو ہمیں بھی لیکچر دینے کے موڈ میں ہیں۔" بختیار کی تمسخرانہ آواز نے ماحول پہ چھائی خاموشی کو توڑا تو ذکا بھی جیسے خود میں لوٹ آیا۔

ایک گہری نظر اس کی برستی آنکھوں پہ ڈالتا وہ اگلے ہی لمحے پلٹ کر صحن پار کر گیا تھا۔ اور پیچھے کھڑی آبگینے کے لیے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسکول میں جو کچھ بھی ہوا تھا، آبگینے نے سختی سے چوکیدار کو نجیب جلال کو بتانے سے منع کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک چھوٹی سی بات پہ کوئی نیا فساد اٹھ کھڑا

ہو۔

باقی جہاں تک تعلق نجیب جلال کی نیت اور ارادوں کا تھا۔ تو اگر وہ شخص سچ بول رہا تھا تو اسے ان کی منافقت اور چالاکی پہ از حد دکھ ہوا تھا۔ وہ تو ان کے اس قدم کو ان میں آنے والے ایک مثبت بدلاؤ سے منسوب کیے بیٹھی تھی۔ جو شاید کل کو ان کے اپنے خاندان کی بہو، بیٹیوں کے لیے بھی کوئی بہتری کی نوید لے کے آتا۔ لیکن یہاں تک سارا کھیل ہی طاقت اور پوزیشن کے حصول کے لیے کھیلا جا رہا تھا انسانیت اور نیکی کا تو دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

مگر اس کی اپنی نیت میں تو کہیں کھوٹ نہ تھا اور اس نے یہ قدم محض اس گاؤں کی غریب بچیوں کی فلاح کے لیے اٹھایا تھا۔ سو اب اگر اسے اپنے مقصد کی بقا کے لیے اپنے باپ، دادا کا بھی سہارا لینا پڑتا تو وہ گریز نہ کرتی کیونکہ اگر اس نے کسی کی آنکھوں میں امید کے دیے روشن کیے تھے تو پھر ان معصوم آنکھوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر عطا کرنا بھی اس کا ہی فرض تھا۔ پھر چاہے اس کے لیے اسے اپنوں کی ناراضی کیوں نہ مول لینی پڑ جاتی۔

لیکن چونکہ فی الحال ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اس لیے آبگینے نے بھی خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔ آنے والے وقت میں نجیب جلال کیا فیصلہ کرتے اور وہ کیا لائحہ عمل اختیار کرتی، وہ تب کی تب دیکھی جاتی۔

☼ ☼ ☼

نصیر چچا کے سالے کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ سو وہ سب ہی پچھلے دو دنوں سے وہاں مصروف تھے اور آج قلوں کی فاتحہ کی وجہ سے سب گھر والے اکٹھے فیروزہ چچی کے ہاں گئے ہوئے تھے۔

وثمہ کی چونکہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے آبگینے، عابدہ چچی کے کہنے پہ اسے لے کر ڈرائیور کے ہمراہ جلدی گھر آ گئی تھی۔ دودھ کے ساتھ اسے دوا دے کر وہ اپنا چائے کا مگ لیے، وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

لیکن جب تھوڑی دیر بعد وثمہ کی آنکھ لگ گئی تو وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ریک میں سجی کتابوں میں سے ایک کتاب نکال کر وہ بیڈ پہ آ بیٹھی تھی۔

محویت سے پڑھتی وہ پوری طرح ناول میں گم تھی جب اچانک راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ نے اس کا دھیان اپنی جانب مبذول کروایا تھا۔ کتاب ہاتھ سے رکھتی وہ دیکھنے کی نیت سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتی، آنے والا آہستگی سے دروازہ کھولتا اندر چلا آیا اور کمرے کے وسط میں کھڑی آبگینے کا سانس رک گیا تھا۔

"مجھے پتا تھا کہ تم یہیں ہو گی، تبھی میں سیدھا یہاں چلا آیا۔" اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے فاروق نے خباثت سے مسکراکر سہمی کھڑی آبگینے کی جانب دیکھا تھا۔ جس کا رنگ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔

"تم؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی؟" وہ دہشت زدہ سی پیچھے کو ہٹی تھی۔

"تو تم کیا مجھے بزدل سمجھے ہوئے تھیں۔" وہ بھنویں اچکاتا ہوا مسکرا کر بولا تو آبگینے کی آنکھوں میں آنسو در آئے۔

"دیکھو فاروق میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں۔ تم خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔"

"ارے رو کیوں رہی ہو؟" وہ سارے جہاں کی نرمی اپنے لہجے میں سموئے آگے کو بڑھا تو آبگینے تیزی سے کتنے ہی قدم پیچھے کو ہٹی۔ اسے یوں پیچھے ہٹتا دیکھ کر فاروق بے اختیار اپنی جگہ پہ رک گیا۔

"تم تو ڈر بھی رہی ہو۔ ارے میں تو یہاں صرف تھوڑی دیر کے لیے تم سے باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"مگر مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ یک لخت چلا کر بولی تو فاروق کے چہرے پہ سرد مہری اتر آئی۔

"ایسے تو نہیں چلے گا آبگینے۔ تمہیں تھوڑا تعاون تو

کرنا ہی پڑے گا۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی؟ میں تمہارے بھائی کی بیوہ ہوں۔ اس گھر کی عزت! کچھ تو رشتوں کا لحاظ کرو۔" وہ اس کی جانب دیکھتی نفرت سے بولی تو وہ استہزائیہ انداز میں ہنس دیا۔

"کس بھائی کی بات کر رہی ہو۔ وہ جس کی تم نے شکل تک نہیں دیکھی۔ بے وقوف لڑکی، تمہارے حسن کا یہ بیش بہا خزانہ کسی مردہ آدمی کی یاد میں جلانے کے لیے نہیں، بلکہ کسی جیتے جاگتے انسان کے لیے ہے۔ جو تمہیں چاہ سکے، سراہ سکے۔" بولتے ہوئے اس نے ایک ہی جست میں درمیانی فاصلہ پھلانگ کے اس کی کلائی تھامنا چاہی تو آبگینے نے اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اسے زور کا دھکا دیتے ہوئے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی۔ لڑکھڑا کے سنبھلتے فاروق نے پلٹ کر اس کا دوپٹہ پکڑ لیا۔

آبگینے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دیوار کے ساتھ رکھے شیشے کے اسٹینڈ پہ سے کرسٹل کا گلدان اٹھا کے اس کے ہاتھ پہ دے مارا۔ چھناکے کی آواز کے ساتھ فاروق کی کراہ بھی کمرے میں گونجی تھی۔ مگر آبگینے پلٹے بنا ہچکچاتے ہاتھوں سے دروازہ کھولتی، باہر کی جانب دوڑ گئی تھی۔

پاگلوں کی طرح، راہداری میں بنا دوپٹے ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے اس نے چلا کر ملازموں کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ مگر کہیں سے بھی کوئی جواب نہ پا کر وہ بری طرح روتے ہوئے دیوانہ وار کچن کی جانب بھاگی تھی۔ جہاں موجود پچھلا دروازہ کھول کے وہ اگلے ہی لمحے پچھلے لان میں تھی۔

دہشت سے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے کانپتے وجود کو سنبھالنا چاہا تھا۔ مگر بے سود! شام کی سرخی اندھیرے میں مدغم ہو رہی تھی۔ جس نے اس کے خوف میں اضافہ کر دیا تھا۔ سسکتے ہوئے اس نے چوکیدار کو پکارا تھا مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ گھر کی پچھلی جانب کھڑی تھی، جہاں سے اس کی آواز اتنی آسانی سے چوکیدار تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

تبھی اس کے پیچھے کھٹکا ہوا تھا اور وہ ایک بار پھر ڈر کے آگے کو بھاگتی بیرونی دیوار کے ساتھ لگے درختوں کی اوٹ میں ہو گئی۔ اپنے لبوں پہ ہاتھ رکھے اس نے اپنی سسکیوں کو گلا گھونٹتے ہوئے ڈرتے ڈرتے ذرا سا سر نکال کے جھانکا تھا اور فاروق کو لان کے وسط میں کھڑا دیکھ کے اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی۔ زارو قطار روتے ہوئے اس نے دل کی گہرائیوں سے اپنے رب سے مدد مانگی تھی۔

فاروق اب چونکنے انداز میں اپنے چاروں جانب نظریں دوڑاتا ہوا آگے بڑھ کے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ آبگینے نے ایک بار پھر سر نکال کے جھانکا تو اس کا رخ دوسری جانب پا کے اس نے بے قراری سے اپنے فرار کا کوئی راستہ تلاشنا چاہا تھا اور تبھی گہرے ہوتے اندھیرے میں اسے چند قدم کے فاصلے پہ بیرونی دیوار میں سے کچھ اینٹیں نکلی ہوئی نظر آئی تھیں، یوں جیسے کسی نے نقب لگانے کی کوشش کی ہو۔ مگر چونکہ رات میں حویلی کی حفاظت کے لیے کتے بھی کھول دیے جاتے تھے۔ اس لیے نقب لگانے والا اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا ہو گا۔ وگرنہ سوراخ تو دیکھنے میں ہی اتنا بڑا لگ رہا تھا کہ با آسانی ایک دبلا پتلا بندہ دوسری طرف نکل جائے۔ یہ سوراخ اب تک گھر کے ملازمین اور چوکیدار کی نظروں سے کیسے چھپا ہوا تھا، وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رب کی بے پناہ شکر گزار بھی تھی، جس نے اس کی عصمت کی حفاظت کے لیے بچاؤ کا راستہ نکال دیا تھا۔

ڈرتے ڈرتے اس نے ایک بار پھر فاروق کی طرف دیکھا تھا جو اب پودوں کے لیے بنائے گئے سن روم کا دروازہ احتیاط سے کھول کے اندر جھانک رہا تھا اور تبھی سینے میں بری طرح پھڑپھڑاتے دل اور پسینے میں شرابور وجود لیے وہ دیوار کے ساتھ لگی آگے کو کھسکتی ہوئی سوراخ کے قریب پہنچ کر زمین پہ بیٹھ گئی تھی اور اگلے ہی لمحے گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی دیوار کے پار نکل گئی تھی۔

بے اختیار پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے یقینی سے اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے اس کی آنسو برساتی آنکھیں تشکرانہ انداز میں آسمان کی جانب اٹھی تھیں۔ پتا نہیں اس کی کون سی نیکی تھی جو آج ایک درندے کے سامنے اس کی ڈھال بنا دی گئی تھی۔ ورنہ ... اور اس ورنہ کے آگے تو وہ سوچنے سے بھی خوفزدہ تھی۔

ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے، اس نے پریشان نظروں سے اپنے گرد پھیلے اندھیرے اور انجان جگہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کہاں جائے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ تو اب تک پوری طرح یہاں کے راستوں سے بھی واقف نہیں ہوئی تھی۔ اپنی دگرگوں حالت پہ بے اختیار اسے ڈھیروں رونا آیا تھا۔ جو آج ننگے پاؤں ننگے سر اپنے ہی گھر کے باہر بے سرو سامانی کے عالم میں کھڑی اپنے نصیب کو کوس رہی تھی۔

اپنے لب کاٹتے ہوئے اس نے متوحش نظروں سے چاروں جانب دیکھا اور پھر سمت کا تعین کیے بنا اس نے بھاگنا شروع کر دیا تھا اس دوران کتنی ہی بار اسے اندھیرے کے باعث ٹھوکر لگی تھی۔ کتنے ہی پتھر، کنکر اسے ننگے پیروں میں چبھے تھے۔ مگر وہ ہر چوٹ، ہر درد سے بے نیاز بھاگتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ مین روڈ تک پہنچ گئی۔ لیکن اس نے اپنی رفتار، بے تحاشا پھولتی سانس کے باوجود کم نہ کی تھی۔

ایک عجیب سی وحشت تھی جو اس پہ سوار ہو چکی تھی۔ پیروں کے زخم اب رسنے لگے تھے۔ بال کھل کے بکھر گئے تھے۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں سی جم گئی تھیں۔ بس ایک آنکھیں تھیں جو برسنا بند نہیں ہوئی تھیں اور دل میں خود کو فنا کر دینے کی آرزو تھی جو لحظہ بہ لحظہ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ ایسے میں سامنے سے آنے والی گاڑی کا ہارن سننے کے باوجود اس نے راستے سے ہٹنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی اور اگر جو مقابل بروقت بریک نہ لگاتا تو گاڑی اس کے وجود کو کچل ڈالتی۔

ذکا نے غصے سے کھولتے ہوئے اور پسنجر سیٹ پہ بیٹھی بی بی خرد نے ونڈ اسکرین کے پار، ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نہائے وجود کو دیکھا جو گاڑی کے رکتے ہی، خود بھی نڈھال سا سڑک پہ گھٹنوں کے بل گر گیا تھا۔

معاً ذکا کو اس بکھرے وجود پہ کسی جانے پہچانے چہرے کا گمان ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولتا باہر کو لپکا۔ جہاں نیچے سڑک پہ وہ اس کے اندیشے صحیح ثابت کرتی، بکھری حالت میں بے یارو مددگار بیٹھی تھی۔

"کیا، کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ متوحش سا آگے بڑھتا اس کے پاس دو زانو بیٹھ گیا۔ مگر وہ بے خبر بیٹھی یک ٹک سامنے زمین کو تکے جا رہی تھی۔

اس کی حالت چیخ چیخ کر جس بات کا اعلان کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ذکا کا دل اسے قبول کرنا تو دور سننے کو بھی تیار نہ تھا۔

"بی بی، بی بی جان، جلدی جلدی آئیں۔" وہ پریشان سا اٹھ کر گاڑی کے دوسری جانب دوڑا۔ مگر اس کے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی اگلی سیٹ سے بی بی خرد اور پچھلی سیٹ سے ان کی دونوں ملازمائیں اتر آئی تھیں۔

"دیکھیں۔ اسے، اسے کیا ہو گیا ہے۔" وہ گھبرائے ہوئے پریشان لہجے میں بولا تو بی بی خرد نے چونک کر ایک نظر پوتے پر اور دوسری نظر سامنے گری ہوئی لڑکی پر ڈالی۔ جوان کے لیے تو انجان تھی۔ مگران کے پوتے کے لیے ہرگز انجان نہ لگ رہی تھی۔

لیکن ذکا کو اس پل سوائے اس بکھرے ہوئے وجود کے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ جس کے منہ سے وہ صرف اس کی خیریت سننے کے لیے بے قرار تھا۔

"کون ہے یہ بچی؟" بی بی خرد نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے سوال کیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ پیچھے سے آتی رحمت نے روشنی میں نظر آتے چہرے کو آن واحد میں پہچان لیا۔

"ہائے بی بی! یہ تو، یہ تو داؤد خان جی کی بیوہ ہے۔ نجیب جلال کی بہو۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھے حیران پریشان

سی بولی تھی اور ساتھ کھڑے ذکا کو لگا تھا جیسے اس سے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔

"کیا؟ کیا کہا؟" وہ بے یقین سا رحمت کی جانب پلٹا تھا۔

"میں صحیح کہہ رہی ہوں خان جی۔ یہ داؤد نجیب کی بیوہ ہیں۔" اور ذکا سکندر کو زمین اپنے قدموں کے نیچے سے سرکتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔

"تو یہ' یہ داؤد کی بے ــــ اف میرے اللہ۔" ساکت کھڑا وہ بے اختیار اپنا سر تھام گیا۔ جبکہ مرجان بی بی' حقیقت جان کے متفکر سی اس کے کندھے کو تھام گئی تھیں۔ جواب تک ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔

"بیٹا! ادھر میری طرف دیکھو۔ مجھے بتاؤ بچے تم ٹھیک تو ہو؟" اس کے کندھے کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے انہوں نے پریشانی سے اس کا سپاٹ چہرہ دیکھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی آواز اس تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔

"میرے خیال میں ذکا' ہمیں اسے لے کر حویلی چلنا چاہیے۔" وہ پریشان سی بولیں تو لب کاٹتا ذکا دھیرے سے اثبات میں سر ہلا گیا۔ مگر سامنے بیٹھے پتھرائے ہوئے وجود میں لفظ حویلی نے جیسے شور سا برپا کر دیا تھا۔

"نہیں! میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی حویلی۔" یک لخت وہ ہذیانی انداز میں چلاتی ان کا ہاتھ جھٹکنے لگی۔ جو اسے سنبھالنے کو بے اختیار آگے ہوئی تھیں۔ اسے یوں ہاتھ پاؤں چلاتا دیکھ کے رحمت اور نادرہ' بی بی جان کی مدد کو آگے بڑھی تھیں۔ ان دونوں کی گرفت میں وہ بری طرح مچلتے ہوئے بالآخر پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔

"چھوڑو' چھوڑ دو مجھے۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر وہاں۔ وہاں نہیں جاؤں گی۔" وہ سسکتے ہوئے ٹوٹے بکھرے لہجے میں ایک ہی بات کی گردان کیے گئی تو مرجان بی بی بے بس سی ایک نظر اس کے تڑپتے وجود پہ ڈالتے ہوئے ذکا کے بازو کا سہارا لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ ان کے اشارہ کرنے پہ دونوں ملازماؤں نے اس کے بازو چھوڑ دیے۔

"اچھا ٹھیک ہے' ہم وہاں نہیں جاتے۔" نرمی سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کا سر سہلایا تو وہ روتی ہوئی ان کے سینے سے لگ گئی۔ وہ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ اسے یوں زار و قطار روتا دیکھ کے لب بھینچے کھڑے ذکاء نے بے اختیار اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کا ہر آنسو ذکا کو اپنے دل پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس پہ مستزاد کچھ دیر پہلے ہونے والا انکشاف ــ وہ حقیقتاً" اپنے اندر درد کا اک سمندر موجزن پا رہا تھا۔

اس دن کتنے سکون اور بے حسی سے اس نے اس لڑکی سے لاتعلقی ظاہر کی تھی جو داؤد نجیب کی بیوہ تھی۔ پھر آج کیوں اپنے قدموں میں گری بلکتی اور تڑپتی ہوئی لڑکی کا یہ تعارف اس کے دل پہ بجلی بن کر گرا تھا؟ کیوں اس کا ننگا سر' بکھرے بال اور رستے پاؤں اس سے دیکھے نہیں جا رہے تھے؟ کیوں وہ اس تلخ اتفاق پہ قسمت سے شاکی ہو رہا تھا؟

شاید اس لیے کہ آج اس لڑکی کے لیے وہ اپنے اندر نرم احساسات کا تعلق محسوس کر رہا تھا سو جب اپنے دل پہ ہاتھ پڑا تھا تو اسے بھی اپنے ظلم کا احساس ہو گیا تھا۔ کاش ایک بار فقط ایک بار اس نے اپنی بہن کا بدلہ لینے سے پہلے اس بہن اور بیٹی کے احساسات اور ارمانوں کے بارے میں بھی سوچ لیا ہوتا جس کی بارات والے دن اس نے اس کا شوہر مارنے کی قسم کھائی تھی۔ کتنا صحیح کہا تھا بی بی جان نے کہ بعض دفعہ انسان کو بدلے کی طاقت رکھنے کے باوجود صبر اور درگزر سے کام لینا پڑتا ہے۔ صرف اس لیے کہ اس کے پیش نظر اور بھی بہت سے لوگوں کی بہتری ہوتی ہے۔ مگر اس نے تو اپنے ماں باپ اور آنے والی نسلوں کے لیے نہیں سوچا تھا تو وہ بھلا اس پرائی لڑکی کے لیے اتنے ہمدردانہ انداز میں کیسے سوچ سکتا تھا۔

سوچ کی یہ وسعت' ظرف کی یہ بڑائی اللہ کسی کسی کو ہی عطا کرتا ہے۔ اور وہ اس پل یہ حقیقت تسلیم کر رہا تھا کہ خدا نے کم از کم اس کا اور اس جیسے بہت سے انا پرست غیرت مندوں کا شمار ان خوش نصیب لوگوں میں

نہیں کیا تھا جنہیں وہ اپنے خوف سے لبریز دل اور روشن دماغ عطا کرتا ہے۔

"پر بچے تم مجھے بتاؤ تو سہی کہ تم اس وقت' اس حالت میں کہاں بھاگتی ہوئی جا رہی تھیں؟ کیوں خود کو مارنے پہ تلی ہوئی تھیں؟" بی بی خرد کی آواز ذکا کو اس کی سوچوں سے باہر کھینچ لائی تو وہ اک بوجھل سانس فضا کے سپرد کرتا اس کی طرف دیکھنے لگا جواب بھی ان کے سینے سے لگی بلک بلک کے رو رہی تھی۔

"میں' میں تو کب کی مر چکی ہوں' بس اس وجود سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جسے اپنے ہی نوچ کھانے' کھانے۔" آنسوؤں کی یلغار نے اسے اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ مگر اس ادھورے جملے نے بھی وہاں موجود چاروں افراد کے سر پہ جیسے بم گرا دیا تھا۔

"کیا؟ کیا کہا؟" بی بی جان نے دہل کے اسے شانوں سے پکڑتے ہوئے خود سے الگ کیا تھا۔ اور ذکا کی تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو چلی تھی۔

"وہ' وہ' ف ــ فاروق ــ" وہ ایک بار پھر ان کے سینے میں چہرہ چھپا گئی تو بی بی جان کی دھڑکن ایک پل کے لیے رک سی گئی۔ جبکہ ذکا نے کرب کے مارے آنکھیں بھینچ لیں۔ رحمت اور نادرہ دونوں اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی تھیں۔

"بس کر بچی بس کر! ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔" اسے خود سے لگائے بی بی ـ نے وحشت زدہ لہجے میں التجا کی تھی۔

"میں کہتی ہوں ہم پہ قہر خداوندی کیوں نازل نہ ہو' کیوں یہاں آفتیں نہ آئیں۔ جب اپنے ہی گھروں میں بیٹیوں کی عزت ــــ" وہ بات کرتے کرتے بے اختیار رو پڑیں ان کے کمزور لہجے کی لرزش نے ذکا سکندر کے مضبوط وجود کی بنیادیں تک ہلا ڈالی تھیں۔ احساس جرم یک لخت اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ اسے سانس گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"بس کریں بی بی جان آپ کی طبیعت پہلے ہی خراب ہے۔" رحمت اپنے آنسو صاف کرتی آگے بڑھی تھی۔ لیکن ــــ بی بی کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

"کیسے بس کروں رحمت! مجھے تو اس معصوم کی صورت میں اپنی گل مینا نظر آ رہی ہے۔ وہ بدنصیب بھی تو اسی کی طرح ظالم روایتوں کے پھندے میں جکڑی گئی ہے۔" ان کی دہائی ذکا کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کے اتری تھی۔ اس کے سینے پہ بے اختیار اک گھونسا سا لگا تھا۔

"اپنی گل مینا سے اتنی محبت تھی تو داؤد کے بجائے ان رسموں کا خاتمہ کیا ہوتا' جنہوں نے اس کی زندگی برباد کر ڈالی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیا لگتا تھا داؤد' گل مینا کا جو اس کے نام پہ اسے بٹھار کھا ہے؟" کسی کی آواز بازگشت بن کے اس کے ارد گرد گونج اٹھی تو وہ جیسے چونک گیا۔ واقعی کیا حاصل ہوا تھا گل مینا کو داؤد کی موت سے وہ تو اب بھی پہلے کی طرح تباہی کے دہانے پر

کھڑی تھی۔ اس کی زندگی میں تو کوئی مثبت تبدیلی نہیں آئی تھی۔ آخر انہیں یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو چھوڑ جانے والوں کے نام پہ ساری عمر باندھ کے رکھ دیں؟ کیا ان کی ــــ آرزوئیں ــــ تمنائیں نہ تھیں یا احساسات صرف مردوں کی جاگیر تھے؟ مسلمان ہو کے محض اپنے مفادات کے لیے جب وہ احکام اور حدود خداوندی کی خلاف ورزی کر رہے تھے تو برائیوں اور گناہوں نے تو از خود پیدا ہونا تھا۔

بے اختیار اس کی آنکھوں میں ڈولتی نمی چہرے پہ چھلک آئی تو وہ اپنے آنسو صاف کرتا' بی بی جان کے برابر بیٹھتا ہوا ان کے شانے کے گرد بازو پھیلا گیا۔

"حوصلے سے کام لیں بی بی جان۔ میں آپ سے اپنی ہر کوتاہی کے لیے معافی مانگتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی گل مینا کو ان پھندوں سے نجات دلا کر رہوں گا۔" اور مرجان بی بی کی بوڑھی آنکھیں مارے حیرت کے اس کے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"بالکل سچ! اور اب آپ انہیں سہارا دیں' اسے بھی واپس پہنچانا ہے۔" بوجھل لہجے میں کہتا وہ بی بی جان کو سہارا دیتے ہوئے اٹھانے لگا تو رحمت اور نادرہ نے بھی آگے بڑھ کے نیم جان سی آبگینے کو پکڑ کے گاڑی میں بٹھا دیا' جس کی منزل اب بڑی حویلی نہیں بلکہ یوسف خان کی حویلی تھی۔

☼ ☼ ☼

بقعہ نور بنی چھوٹی حویلی کے آنگن میں کھڑے تمام لوگوں کی آنکھیں پر نم تھیں' مگر دل بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ کیونکہ آج ان کی گل مینا اپنے بھائی کے ہاتھ میں پکڑے قرآن کے سائے تلے کیپٹن معاذ کے سنگ خوشیوں کے نئے سفر پہ روانہ ہوئی تھی۔

اس کے حق کی جنگ ذکا سکندر نے کیسے لڑی تھی' یہ ایک الگ کہانی تھی۔ لیکن بالآخر اس نے کراچی سے آنے والی فیملی کو مثبت جواب دلوا کے دم لیا تھا۔

جہاں تک آبگینے' عبدالصمد کا تعلق تھا' تو اس رات مرجان بی بی اور ذکا سکندر کے ساتھ اپنی بے حال بیٹی کو آتا دیکھ کر یوسف خان کی حویلی میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ لیکن جب بی بی خرد کے منہ سے ساری تفصیل وہاں رہنے والوں کے علم میں آئی تو ہر سو موت کا سناٹا چھا گیا۔ جس کے بعد یوسف خان اور عبدالصمد خان کی نجیب جلال اور مراد بی بی سے بازپرس کے نتیجے میں ان کا آپس میں ہر تعلق ختم ہو گیا تھا۔

مگر جب حالت سنبھلنے پہ آبگینے کو اپنے مددگاروں کے بارے میں علم ہوا تھا تو وہ ساکت رہ گئی۔ چھوٹی حویلی والے اور ذکا سکندر کی ذات ساری زندگی کے لیے اسے ایک عجیب سی ادھیڑبن میں مبتلا کر گئے تھے ..... وہ اس کے دشمن تھے یا محافظ' وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ ایک حقیقت ایسی بھی تھی جس سے وہ لاعلم تھی اور وہ ذکا سکندر کے دل میں پنپتی اس کی محبت تھی۔

اس کے نصیب کو جو گرہن وہ لگا چکا تھا اس کے لیے تو وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ مگر وہ خود کو اس کا مقروض سمجھتے ہوئے نا صرف گل مینا کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بلکہ اس نے آبگینے کے جانے کے بعد' اپنے گاؤں کی نادار بچیوں کے لیے اسکول کے علاوہ عورتوں کے لیے ایک فلاحی مرکز بھی قائم کیا تھا۔ جہاں ان کے لیے امور خانہ داری سے متعلق بہت سے چھوٹے چھوٹے کورسز کے ساتھ ساتھ ان کی تیار کردہ مصنوعات کو شہر کی مارکیٹ تک پہنچانے کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ اپنے ہنر کو اپنی ذات اور اپنے بچوں کے لیے کام میں لا سکیں۔

جہاں تک اس کی ذاتی زندگی کا سوال تھا تو بہت جلد زمرد بیگم کی بھانجی اس کی شریک سفر بننے والی تھی۔ لیکن اگر بات اس کے دل کی تھی تو اس کا ایک گوشہ ہمیشہ اس بے نام محبت کے نام رہنے والا تھا' جس کی داستان بڑی عجیب سی تھی اور جس کے کاسے میں چند یادوں کے سوا اور کچھ نہ تھا' مگر جو ذکا سکندر کا سرمایہ حیات تھیں۔

☼ ☼

صدف آصف

انگنا پھول کھلے

"مما پلیز! مجھے کچھ پیسے ادھار دے دیں، تنخواہ ملتے ہی واپس کردوں گی۔" حرا نے لجاجت سے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"اصل میں ریان کے اسکول میں امتحانات سے قبل سالانہ چارجز کی ادائیگی ضروری ہے۔ فیس تو میں تنخواہ ملتے ہی بھر دیتی ہوں، مگر اب جو یہ پرائیویٹ اسکول والے مختلف بہانوں سے سارا سال پیسے منگواتے رہتے ہیں، اس سے ہم جیسے سفید پوش لوگوں کا بجٹ آؤٹ ہوجاتا ہے۔" حرا نے تفصیل سے اپنا مسئلہ بیان کرکے بڑی پرامید نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ آمنہ بیگم شرمندہ سی ہوگئیں۔

مہینے کا آخر تھا۔ ابھی کل ہی تو انہوں نے ردا کو کالج کی کتابیں اور کچھ ضروری سامان خریدنے کے لیے مہینے کے خرچے میں سے بچائے ہوئے دو ہزار روپے دیے تھے۔ کرایہ اور ردا کی کوچنگ کی تنخواہ ملنے میں بھی کچھ دن باقی تھے۔ اب تو وہ خود خالی ہاتھ ہوگئی تھیں۔ صرف پانچ سو روپے بچے تھے، جو انہوں نے سبزی ترکاری لانے کے لیے رکھے تھے، تاہم بیٹی کو منع کرتے ہوئے بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جانتی تھیں کہ وہ اس وقت ہی ان سے کچھ مانگتی ہے، جب کہیں سے آسرا نہ ہو اور ضرورت بہت شدید ہو، ورنہ اپنے مسائل ان سب سے حتی الامکان مخفی ہی رکھتی ہے۔

"تم بیٹھو! میں چائے بناتی ہوں، پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔" انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کچن میں چلی گئیں۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھا۔ کرائے داروں کے بچے سے سموسے منگوانے کے لیے اوپر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچنے لگیں کہ ان لوگوں سے ہزار روپے ادھار مانگ لیتی ہوں۔

"خالہ پلیز! ایک ہزار روپے ادھار چاہئیں۔ اگلے مہینے کے کرائے کے پیسوں میں سے کاٹ لیجیے گا۔"

آمنہ بیگم بہت حلیم الطبع خاتون تھیں۔ کبھی اپنے کرائے داروں پر بے جا رعب نہ جمایا، نہ ہی انہیں تنگ کیا۔ ہمیشہ اخلاق سے ملیں۔ برسوں سے ایک ہی کرائے دار تھے، کبھی زیادہ پیسوں کی لالچ میں ان سے گھر بھی خالی نہیں کرایا۔ اب تک دونوں کی بڑی سہولت سے نبھ رہی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ لوگ بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ کرائے کی ادائیگی کے معاملے میں ان ماں بیٹیوں کو کبھی تنگ نہیں کیا۔ جانتے تھے، شوہر کے انتقال کے بعد آمنہ بیگم کے گھر کا خرچ اسی پر چلتا ہے، سو وہ ان کے مطالبہ کیے بغیر خود ہی سال کے سال کرایہ بڑھا دیتے تھے۔

"ارے آمنہ بیٹا! پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ کرائے کا معاملہ اپنی جگہ، یہ پیسے اپنی جگہ۔ جب سہولت ہو، تب واپس کردینا۔" خالہ جی نے پاندان میں سے ہزار کا نوٹ نکال کر ان کی مٹھی میں دبا دیا۔

خالہ جی کا ایک بیٹا بہو تھے۔ بیٹا ماں کا فرماں بردار تھا۔ بہو بھی نیک سیرت تھی۔ وضع دار گھرانہ تھا۔ ابھی بھی سارے گھر کا خرچا خالہ جی کے ہاتھوں میں تھا۔ خالہ کی محبت پر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نفسا نفسی کے دور میں بھی ایسے مخلص لوگ موجود ہیں۔

آمنہ بیگم خوشی خوشی بیٹی کے لیے چائے نکالنے لگیں۔ کمرے میں آئیں، تو وہ صوفے پر لیٹی سو چکی تھی۔ انہیں ایک دم اس پر بڑا ترس آیا۔ صبح چھ بجے اٹھ کر وہ کولہو کے بیل کی طرح لگتی تھی، تو رات بارہ بجے کے بعد ہی سونا نصیب ہوتا تھا۔ دل میں ایک ملال سا جاگا۔ اپنے ابو کی کتنی لاڈلی تھی وہ۔ کیا حال بنالیا ہے اس نے اپنا۔

حرا خاندان بھر کی سب سے خوبصورت، شوخ و چنچل اور خوش اخلاق لڑکی تھی۔ جس محفل میں چلی جاتی، مرکز نگاہ بن جاتی۔ جامہ زیبی اس پر ختم تھی۔ اسے ہر فیشن کا پتا تھا۔ ہر لباس اس پر ایسے سجتا تھا جیسے اس کے لیے ہی بنا ہو۔ آج اسے دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ یہ وہ ہی حرا ہے۔ معمولی سے حلیے میں بے انتہا تھکی تھکی، ہاتھ سر کے نیچے دبائے وہ بے خبر سو رہی تھی۔ ماں کو بے انتہا پیار آیا۔ اس کے پاس بیٹھ کر بغور دیکھنے لگیں۔

چمپئی رنگت میں زردیاں سی گھل گئی تھیں۔ غلافی

آنکھوں کے گرد حلقے بہت ہی واضح نظر آرہے تھے۔ سیاہ لمبے گھنے بال اب پتلی سی چٹیا میں تبدیل ہوچکے تھے۔ سانچے میں ڈھلا جسم اوپر تلے تین بچوں کی آپریشن سے پیدائش کے بعد قدرے فربہی مائل ہوگیا تھا۔ آمنہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"ہائے یہ ناداں محبت کیسے کیسے خراج وصول کرے گی۔ کاش! یہ بے وقوف اس وقت میری بات مان کر کلیم کے لیے ہاں کردیتی تو آج اتنی پریشانی تو نہ ہوتی۔" لاڈلی بیٹی کی حالت دیکھ کر انہوں نے ماضی کو آواز دی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔ رات کی سبزی بھی بنانی تھی۔ ردا نے آج آلو بیگن کی فرمائش کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے مما! آپ نے مجھے اٹھایا نہیں۔ بچے گھر پر میرا انتظار کررہے ہوں گے۔" ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام سے سونے کے بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جلدی سے واش روم میں جاکر منہ ہاتھ دھو کر آئی۔ اتنے میں آمنہ بیگم نے چائے دم دے دی تھی۔ پلیٹ میں سموسے اور کباب نکالے۔

"یہ لو! چاچا کی دکان کے سموسے کھاؤ، جو تم اپنے ابو سے ضد کرکے منگواتی تھیں۔" باپ کے ذکر پر اس کی نظریں جھک گئیں۔

"نہیں مما! کچھ نہیں کھاؤں گی۔ بچے اکیلے ہوں گے۔ اب گھر چلوں گی۔"

"بیٹا! جیسے تمہیں اپنے بچوں کی فکر رہتی ہے، ایسے ہی میرا دل بھی اپنی بچی کی تکلیف پر دکھتا ہے۔ یہ لو جلدی سے سب کچھ ختم کرو۔" انہوں نے ٹرے بچی کے آگے رکھی۔ وہ جانتی تھیں کہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے اسے اپنے خون پسینے کا ایندھن استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ حرا نے تو اب اپنی پروا کرنا بھی چھوڑ دی تھی، مگر وہ ماں تھیں، بیٹی کا خیال کرنا کیسے چھوڑ سکتی تھیں۔

"نہیں مما! میرا دل نہیں چاہ رہا۔ بس چائے پی کر نکلوں گی۔ جاکر بچوں کے لیے کھانا بھی پکانا ہے۔ آفس سے سیدھی آپ کے پاس چلی آئی۔ پتا نہیں انہوں نے گھر پر کیسا اودھم مچایا ہوا ہوگا۔" حرا نے مسکراتے ہوئے چائے ختم کی اور جانے کے لیے چادر اوڑھنے لگی۔

"ٹھہرو! میں ابھی آتی ہوں۔" وہ جلدی سے کچن سے کچھ شاپرز لے کر واپس آئیں۔

"یہ کباب ہیں فرقان کو بہت پسند ہیں نا، اور یہ سموسے ریان کے لیے لے جاؤ۔" انہوں نے محبت سے نواسوں کا نام لے کر تھیلیاں اسے پکڑائیں۔

"یہ چکن قورمہ کل بنایا تھا۔ نادیہ کو دینا اور کہنا نانو بہت یاد کررہی تھیں۔" آمنہ بیگم کے لہجے میں نواسے، نواسی کی محبت بول رہی تھی۔ تھیلیاں پکڑتے ہوئے اس نے تشکر سے انہیں دیکھا۔ جانتی تھی، وہ اتنے بہانے بنا کر اسے یہ چیزیں اس لیے دے رہی ہیں کہ اسے جاکر کھانا نہ بنانا پڑے۔

"مما! لگتا ہے ردا امتحانوں کی وجہ سے بہت مصروف ہوگئی ہے۔ اس سے ملاقات ہی نہیں ہو پاتی۔ اسے میرا پیار دیجیے گا اور کہیے گا ٹائم نکال کر میرے گھر کا چکر لگا جائے۔ بچے بھی اپنی آنی کو بہت مس کرتے ہیں۔" اس نے چھوٹی بہن کے لیے محبت سے پیغام دیا۔

"خیر! مصروف تو تم دونوں ہی ہوگئی ہو۔ تم کون سا اب ماں کے پاس دیر تک رکتی ہو، بس ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہو۔ کبھی رہنے ہی آجاؤ۔ ماں سے دل کی باتیں کرو، کچھ ہماری باتیں سنو۔ اور وہ تمہاری چھوٹی بہن اس پر بھی پڑھائی کا بھوت سوار ہے۔ کوچنگ جاتی ہے تو بس وہیں کی ہو رہتی ہے۔ پہلے خود پڑھتی ہے، پھر چھوٹی کلاسز کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔" آمنہ بیگم نے اسے خفگی سے جھڑکا تو وہ کھسیا کر ہنس دی۔

"کیا کروں مما! جاب کی وجہ سے مصروف ہوگئی ہوں۔ ایک چھٹی ملتی ہے تو اس میں بھی پورے ہفتے کے کام نمٹانے ہوتے ہیں۔ ردا کی پڑھائی بھی اتنی ٹف

ہے' پھر وہ پڑھاتی بھی تو ہے' اسی لیے اسے بھی زیادہ ٹائم دینا پڑتا ہے۔" اس نے انہیں گلے لگا کر اپنی اور چھوٹی بہن کی صفائی پیش کی۔ وہ مسکرا دیں۔

شوہر کے انتقال کے بعد آمنہ بیگم بڑے حوصلے سے وقت کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے عام عورتوں کی طرح کبھی اپنے دکھوں کی تشہیر نہیں کی بلکہ عملی اقدامات اٹھائے۔ کچھ پیسے جمع کیے ہوئے تھے' کچھ زیور بیچا اور گھر کی اوپری منزل پر ایک چھوٹا سا پورشن بنوا کر کرائے پر دے دیا۔ یہ بھی شکر تھا کہ حرا کے والد نے اپنی زندگی میں ہی ایک اچھے علاقے میں یہ گھر خرید لیا تھا۔ اب ان کو ہر مہینے کرائے کی مد میں ایک معقول رقم مل جاتی تھی۔ آمنہ بیگم سلائی بھی جانتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں صفائی بھی بہت تھی' سو محلے بھر کے کپڑوں کی سلائی اور شادی بیاہ کے موقعوں پر جہیز کی تیاری اور ٹکائی کا کام انہیں ہی ملتا تھا' جس سے ان کی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ کچھ ریڈی میڈ گارمنٹس والے بھی کپڑوں کی سلائی کا کام انہیں ہی دیتے تھے' یوں عزت سے گزارا ہو جاتا تھا۔ اب تو ردا بھی پڑھانے لگی تھی تو مشکلات میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی' مگر حرا کے حالات پر ان کا دل ہر وقت کڑھتا رہتا تھا۔

"اگر تم اس وقت کلیم کے بارے میں صحیح فیصلہ کرتیں تو آج خود بھی عافیت میں ہوتیں اور ہم بھی تمہاری طرف سے پرسکون ہوتے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بیٹی سے شکوہ کر بیٹھیں۔

"ممّا پلیز! جو گزر گیا سو گزر گیا۔ ماضی کے آئینے میں جھانکنے سے حال کی شکل تو تبدیل نہیں ہو جائے گی۔" حرا بری طرح چڑ گئی۔ شاید اس کے اندر کی آواز بھی اسے یہ ہی کہہ کر ستاتی تھی۔ اس نے جانے کے لیے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ آمنہ بیگم کو افسوس ہوا کہ ناحق یہ ذکر نکلا۔

"یہ لو! ریان کے اینول چارجز ادا کر دینا۔" انہوں نے ہزار روپے کا نوٹ بیٹی کے ہاتھوں میں دبایا۔ حرا کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ ناراضی بھلا کر ماں کے گلے لگ گئی۔ واقعی ماں جیسی محبت دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا' یہ بات اسے خود ماں بننے کے بعد سمجھ آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نادیہ بیٹا! یہ چیزیں لے لو۔ نانو نے بھیجی ہیں' خود بھی کھاؤ' بھائیوں کو بھی کھلا دو۔ میں تھوڑی دیر آرام کر لوں' پھر اٹھ کر تم لوگوں کے لیے پراٹھے بنا دوں گی۔" اس نے تھکے ماندے وجود کو بستر پر گرایا۔

"نہیں ممی! پاپا اپنے دوست کے یہاں دعوت میں گئے تھے۔ وہاں سے بریانی لائے تھے۔ میں نے بھائیوں کو کھلا دی ہے۔ اب دونوں کو ہوم ورک کرنے بٹھایا ہے۔ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی' آپ تھوڑا فریش ہو جائیں' تو کھانا کھالیں گے۔" نادیہ بڑی صابر بچی تھی' جانتی تھی کہ ماں تھکی ہوئی آئی ہے' سو بھوک لگنے کے باوجود اسے آرام کرنے کا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

حرا نے بغور اپنی بارہ سالہ بچی کو باہر جاتے دیکھا جس کے چہرے پر بڑوں والی سنجیدگی اور ذمہ داری کا احساس تھا۔ اس کے آفس ٹائم میں بھی وہ دونوں بھائیوں کا خیال رکھتی تھی۔ ان کو اپنی عمر کے حساب سے چائے بنا کر پاپے سے یا رات کے بچے ہوئے کھانے کو گرم کر کے انہیں کھلا دیتی۔ چھوٹے بھائیوں کا یونیفارم بدل دیتی۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے کام بھی کر دیتی تاکہ آفس سے آنے کے بعد حرا کو کچھ دیر آرام کا موقع ملے۔ حرا کو محسوس ہونے لگا تھا اس کے دونوں بیٹے اس سے زیادہ اپنی بڑی بہن سے مانوس ہوتے جا رہے ہیں۔

"میں اپنی بچی کے ساتھ کیا کر رہی ہوں؟ ایک میں تھی' گھر بھر کی لاڈلی اور شوخ و چنچل۔ ایک یہ میری بچی اتنی خاموش طبع کہ اس کی موجودگی کا بھی پتا نہیں چلتا۔ اف! میرے حالات نے میری نادیہ کو قبل از وقت ہی بڑا کر دیا ہے۔ شاید میں اچھی ماں ثابت نہیں ہو سکی' جیسے کہ میری ماں ہے' سائے دار درخت کی طرح جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر سکون ملتا ہے۔ میں تو اتنی مضبوط بھی نہیں ہوں۔" آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ ماں کے سامنے تو حال دل بھی نہ کہہ سکی' مگر تنہائی میں دل کا درد آنکھوں سے بہہ نکلا۔

"امی ٹھیک ہی کہتی ہیں' ماضی کی غلطیوں نے میرے حال کو تباہ کر دیا ہے۔"

حسن بے حد خوبرو اور باتوں کا شہنشاہ تھا۔ حرا کی کم عمری' حسن کی خوبصورت شخصیت کے حصار میں کھو گئی۔ حرا کو لگتا تھا کہ اس کے سارے حسین خواب حسن کی خوبصورت شخصیت سے ہی منسلک ہیں۔ شادی کے بعد حسن کے اونچے اونچے دعوے محض کھوکھلے ڈائیلاگ ثابت ہوئے تو اس کے سارے حسین خواب بکھر گئے۔ زندگی صرف محبت کے سہارے نہیں گزرتی۔ محبت بھی اس وقت تک ہی اچھی لگتی ہے جب تک پیٹ بھرا ہو۔ وہ سوچوں میں گم تھی' جب ہی اسے نادیہ نے پکارا۔

"ممی! کھانا کھالیں۔" نادیہ نے پیار سے اسے اٹھایا تو بھوک نہ ہونے کے باوجود وہ کھانے کی میز تک آئی۔ جانتی تھی کہ اگر وہ کھانا نہیں کھائے گی تو نادیہ بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھا سکے گی۔ وہ بڑی حساس بچی تھی۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے برتن دھوئے اور کچھ وقت بچوں کے ساتھ گزارا۔ اسکول کا کام چیک کیا۔ ان کی دن بھر کی روداد سنی' پھر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

"دیکھو! اگر تم مان جاؤ تو میں تمہیں ہر وہ خوشی دوں گا' جس کی تم خواہش کرو گی۔ پلیز! انکار مت کرنا۔" بھیگا بھیگا سا ملتجیانہ لہجہ اس کی نیند میں جاگا۔ یہ آواز پھر سے حرا کو بے چین کر رہی تھی۔ وہ سوتے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر پانی پیا۔

"اف! کیا میں نے کلیم کے ساتھ زیادتی کی تھی؟ مجھے اس کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے تھا۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"آج حرا آئی تھی۔" آمنہ بیگم نے ردا کے برابر بیڈ پر لیٹتے ہوئے اسے بتایا۔

"کیسی ہیں آپی؟ سب خیریت تو تھی؟" ردا نے کتابیں سمیٹتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں! سب خیریت ہے۔ ہزار روپے چاہیے تھے' اسے ریان کے اسکول میں جمع کرانے ہیں۔" آمنہ بیگم نے افسردگی سے بتایا۔

"اچھا! اس کا مطلب ہے آپی کے حالات ذرا بھی نہیں بدلے۔" ردا نے کمبل ماں کے پیروں پر پھیلاتے ہوئے تاسف سے کہا۔

"گھر کے حالات میں تبدیلی اسی وقت ہی آتی ہے' جب گھر کا مرد لگ کر کام کرے۔ اس مہنگائی کے دور میں حسن کی ہوائی روزی پر تو گھر نہیں چل سکتا نا۔" آمنہ بیگم نے غصے سے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا' حسن بھائی جم کر کام کیوں نہیں کرتے؟ اچھی بھلی نوکری لگ جاتی ہے مگر جہاں کوئی بات مزاج کے خلاف ہوئی' وہ فوراً نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔" ردا کا دل بڑی بہن کے حالات پر بہت کڑھتا تھا۔

"ارے! اس کا تو دماغ ہی خراب ہے۔ کسی کی بھلی بری وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ سیانے کہتے ہیں کہ نوکری کی نخرو کی' مگر حسن تو شروع سے ہی مزاج کا گرم ہے۔ باقی کی کمی بیوی کے دلار نے پوری کر دی۔ آسمان پر بٹھا رکھا ہے۔ نہ خود کچھ بولتی ہے اور مجال ہے جو کسی اور کو بھی ایک لفظ بولنے دے۔ بھلا بتاؤ! ایسے میں بندے کا دماغ خراب ہو گا کہ نہیں۔ اللہ کی شان دیکھو! دوست یار بھی ایسے ملے ہیں کہ جان نچھاور کرنے والے۔ لندن' امریکہ میں بیٹھ کر بھی حسن کی خیر خبر رکھتے ہیں۔ کوئی کپڑے بھجوا رہا ہے تو کوئی پرفیوم۔ یہ ہی سب پہن کر' بج سنور کر گھر سے نکل جاتا ہے۔ پیچھے بیوی بچوں کا جو بھی حال ہو۔ اسی لیے تو وہ چھوٹی موٹی نوکری کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اللہ نے ایک شکل صورت ہی اچھی دے دی ہے' بس اسی کا غرور ہے۔ یہاں تو آتا ہی نہیں۔ پتا ہے نا' میں ایسے

لیتے لوں گی کہ بھاگتے ہی بنے گی۔" آمنہ بیگم جذباتی ہو گئیں۔

"خیر مما! یہ بات تو ماننے کی ہے کہ حسن بھائی کی شخصیت میں ایسا عجب سا سحر ہے کہ جو ایک دفعہ ان سے مل لیتا ہے' وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپی ان پر ایسے ہی تو نہیں مرتی تھیں نا۔ پھر ان کے بات کرنے کا انداز۔ غصہ تک ان پر سوٹ کرتا ہے۔" ردا نے مسکراتے ہوئے بہنوئی کی بھرپور تعریف کی۔

"ایسی خوبصورتی کو چاٹنا ہے کیا؟ نوکری اس سے ہوتی نہیں۔ دوستوں اور جاننے والوں کے یہاں فنکشنز میں گانے گالیتا ہے۔ دو' تین ہزار روپے مل جاتے ہیں۔ اسی میں خوش ہے۔ بدصورت ہوتا' مگر حرا کو خوش رکھتا تو مجھے بھی خوشی ہوتی۔" آمنہ نے چمک کر کہا تو ردا ان کے انداز پر ہنس پڑی۔ سمجھ گئی کہ آج حرا کی حالت دیکھ کر وہ داماد سے بہت ناراض ہیں۔

"صبح آپی کو کال کروں گی۔ ہمارے انسٹیٹیوٹ کے نئے کیمپس کے لیے کوآرڈینیٹر کی ایک پوزیشن نکلی ہے۔ یہاں سیلری تو اتنی ہی ہوگی' جتنی ان کو اپنے پرانے آفس میں مل رہی ہے' مگر کام کے اوقات' ان کے آفس کے مقابلے میں کم ہوں گے اور ہفتے میں دو دن چھٹی بھی ملے گی۔" ردا نے سونے کے لیے لیٹتے ہوئے ماں کو تسلی دی۔ آمنہ بیگم قدرے مطمئن ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو ردا! اس جاب کے لیے ہم نے ایک ماسٹرز لڑکی کو ٹرائل پر بلایا ہے جبکہ حرا صاحبہ کی تعلیمی قابلیت کم ہے۔" کوچنگ کے مالک' نعمان نے حرا کا سی وی دیکھنے کے بعد ردا کو انکار کر دیا' مگر ردا نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اپنے گھر والوں کی بہبود کے لیے سب سے لڑ سکتی تھی' پھر یہ تو اس کے منہ بولے بھائی بھی تھے۔ ان سے تو حق سے بات کرتی تھی۔

"نعمان بھائی پلیز! اگر آپ میری آپی کو بھی ایک دن ٹرائل بیس پر بلالیں' تو مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گی۔ ان کی تعلیمی قابلیت کم سہی لیکن ان کے پاس اچھا خاصا تجربہ ہے اور آپ اپنے نئے کیمپس کو ناتجربہ کار ہاتھوں میں سونپنے کا خطرہ یقیناً" مول نہیں لیں گے۔" ردا نے اتنے پرزور طریقے سے بہن کا مقدمہ لڑا کہ وہ بے بس ہو گئے۔

"اوکے' میری پیاری بہن! تم جیتیں' میں ہارا۔ اپنی آپی کو بھیج دو' مگر یاد رہے! ہم فیشو ٹرائل کی بیس پر ہی جاب دیں گے۔" نعمان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل اٹھی۔

"نوازش' کرم' شکریہ' مہربانی! بھابھی کو بھی سلام کہیے گا' میری کلاس ہے' میں جا رہی ہوں۔" اس نے شرارت سے کہا اور آفس سے نکل گئی۔

نعمان نے مسکرا کر اسے جاتے دیکھا۔ انہیں یہ چھوٹی لڑکی بہت عزیز تھی۔ جس طرح اتنی کم عمری میں وہ اپنے گھر کی گاڑی کھینچنے کے لیے ماں کے ساتھ جدوجہد کر رہی تھی' نعمان کے دل میں اس کی توقیر حد سے بڑھ گئی تھی۔ ان سے زیادہ اس کی دوستی ان کی بیگم سے ہو گئی تھی۔ وہ بھی اسے چھوٹی نند کا درجہ دیتی تھی۔ نعمان' ردا کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ان کے موبائل کی بیل بجی۔ گھر کا نمبر دیکھ کر انہوں نے جلدی سے فون ریسیو کیا۔

"السلام علیکم! خیریت تو ہے بسمہ! ابھی تو گھر سے آیا ہوں اور اتنی بے قراری کہ تھوڑی دیر میں ہی فون چلا آرہا ہے۔" انہوں نے بیگم کی آواز سنتے ہی چھیڑا تو وہ ہنس دی۔

"وہ دراصل امی کا پھر فون آیا تھا۔ ان کا وہی سوال تھا کہ دانیال بھائی کے لیے اچھی لڑکی ڈھونڈی کہ نہیں۔ ان لوگوں کو جلد ہی واپس جانا ہے۔ بھلا بتائیے! میں کیا کروں؟ آپ کو تو پتا ہے میں ٹھہری کتابوں کی شیدائی۔ زیادہ دوستیاں پالیں' نہ لوگوں سے اتنے مراسم بڑھائے۔ گنتی کے چند لوگوں سے مراسم ہیں۔ اب میں کہاں سے لڑکی ڈھونڈوں؟ رشتہ کروانے والیوں سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں الٹے سیدھے لوگوں میں نہ پھنسوا دیں۔ میرا اکلوتا بھائی ہے' ہمیشہ کے لیے جدا

ہو جائے گا۔ پلیز! آپ کچھ کریں نا۔" بسمہ ایک بار جو شروع ہوئی تو کہیں رکنے کا نام ہی نہ لیا۔

"میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے کون سا ان کاموں کا تجربہ ہے' پھر دانیال کے ساتھ مسئلہ بھی تو ہے۔" نعمان نے لاچاری ظاہر کی۔

"اب ایسی بات بھی نہیں۔ میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے۔ دبئی میں انجینئر ہے۔ اس کے لیے لڑکی ملنا اتنا مشکل بھی نہیں۔ میں خود آپ کو ڈھونڈ کے دکھاؤں گی۔" نعمان کی بات پر بسمہ نے خاصا برا مانا' تو وہ ہنس کر چپ ہو گئے۔ دانیال بہت اچھا تھا یہ بات وہ بھی جانتے تھے' مگر اچھے لوگوں کی زندگی میں ہی امتحانات ہوتے ہیں۔

"اچھا! باقی باتیں گھر آکر کروں گا۔ ابھی بہت سارا کام ہے' اب فون رکھو۔" انہوں نے بسمہ کو پیار بھری جھڑکی دی۔

"ارے! وہ چڑیل تمہیں سلام بول رہی تھی۔" نعمان کو ایکدم ردا کا خیال آیا تو وہ جلدی سے بولے۔

"کون ردا؟ کیسی ہے وہ؟ بڑی پیاری اور معصوم ہے۔ ہر ایک سے گھل مل جاتی ہے۔ میری طرف سے گھر آنے کا کہیے گا۔" بسمہ اسے بہت پسند کرتی تھی۔

"اوکے! میں کہہ دوں گا۔" نعمان نے بات ختم کی۔

"ارے سنیں تو! میرے ذہن میں ایک بڑا اچھا آئیڈیا آیا ہے۔ اگر دانیال بھائی کی شادی ردا سے کروا دیں تو کتنا اچھا ہو۔ دونوں کی جوڑی کتنی جچے گی نا؟" بسمہ نے پرجوش انداز میں خیال پیش کیا۔

"پلیز! تم اپنے یہ فضول خیالات اپنے تک ہی محدود رکھنا۔ ردا ابھی صرف بیس سال کی ہے جبکہ تمہارا بھائی پینتیس سال سے اوپر کا ہو چکا ہے۔ ردا کو تمہارے ارادوں کی بھنک بھی پڑ گئی تو ہو سکتا ہے' وہ یہ جاب ہی چھوڑ دے۔ مائی ڈارلنگ وائف! میں ایک اچھی ٹیچر کو کھونا ابھی افورڈ نہیں کر سکتا۔ لگتا ہے تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے' جب ہی ایسے منصوبے تمہارے ذہن میں آرہے ہیں۔ فون رکھو اور پلیز جا کر کھانا کھاؤ۔" انہوں نے بسمہ کی بات مذاق میں اڑائی۔

"پلیز! سوچیے تو یہ کچھ ایسی انہونی بھی نہیں ہوگی۔" بسمہ نے اصرار کیا تو وہ غصہ ہو گئے۔

"واٹ ربش! میں اسے بہن کہتا ہی نہیں' سمجھتا بھی ہوں۔ اب تم یہ فضول بات دوبارہ اپنے منہ سے نہیں نکالنا۔" نعمان کبھی حق بات کہنے میں چوکتے نہیں تھے' وہ یہ بھی نہیں دیکھتے تھے کہ سامنے کون ہے۔ بسمہ' میاں کی مزاج شناس تھی۔ جانتی تھی اب کچھ بولنا بے کار ہے' اسی لیے اس وقت تو خاموش ہو گئی' مگر اس معاملے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔

دوسرے دن بڑا سا چاکلیٹ کیک اور تازہ پھلوں کا بکے خرید کر ردا کے گھر جا پہنچی۔ ردا کوچنگ گئی ہوئی تھی۔ بسمہ نے سوچا' یہ صحیح وقت ہے آرام سے بات ہو جائے گی۔ آمنہ بیگم' بسمہ کو اپنے گھر دیکھ کر حیران ہوئیں تاہم بڑی خوشدلی سے ملیں۔ بسمہ بھی ان سے مل کر بڑی خوش ہوئی۔ آمنہ بیگم اس کی آمد کا مقصد سمجھ رہی تھیں' تاہم وضع دار خاتون تھیں' سو خود سے کچھ نہیں پوچھا۔ بسمہ تھوڑی دیر تو ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ آخر بلی تھیلے سے باہر آہی گئی۔

بسمہ نے اپنے بھائی دانیال کا رشتہ ردا کے لیے دیا۔ اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے خاصی تفصیل سے آمنہ بیگم سے بات کی۔ وہ رشتوں میں سچائی کی قائل تھی۔ اس کی سوچ تھی کہ جہاں دھوکہ فریب ہوتا ہے' وہاں رشتے نہیں پنپتے' بلکہ دلوں میں رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا۔

"آنٹی! مجھے امید ہے کہ میرا بھائی ردا کو ہر خوشی دے گا۔ میں ان کی تصویر لائی ہوں تاکہ آپ انہیں دیکھ لیں۔" بسمہ نے پرس سے تصویر نکال کر ان کو دی۔ انہیں دانیال کی شخصیت بہت متاثر کن لگی۔ وہ اپنی عمر سے خاصے کم دکھائی دے رہے تھے۔ آمنہ بیگم نے اس سے کچھ اہم سوال کیے' پھر ردا اور حرا سے بات

کر کے جواب دینے کے لیے کہا۔

☼ ☼ ☼

"مما! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ابھی تو میں نے شادی کا سوچا بھی نہیں۔ ابھی مجھے بہت پڑھنا ہے' ویسے بھی میں آپ کو ــــ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔" ردا تو ماں کی بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں کافی پلاننگ کر رکھی تھی اور اتنی جلدی شادی کر کے وہ سب کچھ ختم نہیں کر سکتی تھی۔

"پلیز مما! آپ بسمہ بھابھی کو صبح فون کر کے منع کر دیں۔ میں ابھی اس بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتی۔" ردا نے کالج کا یونیفارم استری کرتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"ردا! مجھے لگتا ہے تم آج وہی غلطی دہرا رہی ہو جو برسوں پہلے حرا نے کی تھی۔" آمنہ بیگم نے افسردگی سے کہا۔

"مما پلیز! مجھے بتائیں گی کہ ایسا کیا ہوا تھا؟ جس کا اکثر ذکر تو ہوتا ہے' مگر مجھے تفصیلات بتانے سے آپ لوگ گریز کرتی ہیں۔" استری مکمل کرنے کے بعد اس نے یونیفارم ہینگر میں لٹکایا اور ان کے پاس آ بیٹھی۔ آمنہ بیگم کو لگا کہ یہ صحیح وقت ہے جب ردا کو بھی یہ باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔

"یہ اس وقت کی بات ہے' جب تم بارہ سال کی اور حرا نے بیسویں سن میں قدم رکھا تھا۔ تم میں اور حرا کی پیدائش میں اچھا خاصا وقفہ تھا' چنانچہ وہ کئی سال تک اس گھر میں اکلوتی بچی رہی۔ تمہارے ابو حرا سے بے حد پیار کرتے۔ وہ اس کی ہر فرمائش فوراً" پوری کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے۔ حرا سے ان کا بے جا لاڈ پیار دیکھ کر میں ڈر جاتی تھی۔ انہیں بہت ٹوکتی کہ لڑکی ذات ہے اس کی ہر بات پر ہاں نہیں کہا کریں۔ اسے کبھی نہ سننے کی بھی عادت ہونی چاہیے' مگر وہ میری ایک نہیں سنتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں حرا کے مزاج میں خود سری پیدا ہو گئی۔ وہ بہت خوب صورت آواز کی مالک ہے یہ تو تم جانتی ہی ہو۔ کالج کے متعدد پروگراموں میں وہ گانے گاتی تھی۔ اس کی خوب صورتی اور لوگوں کی تعریفوں نے اس کا دماغ عرش تک پہنچا دیا تھا۔

ایک دن کالج کے فنکشن میں ریڈیو کے ایک پروڈیوسر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے حرا کا گانا سنا تو اس کو نوجوانوں کے ایک شو میں گانا گانے کی دعوت دی۔ حرا کے لیے اس سے زیادہ خوشی کا کیا مقام ہو سکتا تھا۔ اس وقت وہ خوابوں میں رہنے والی نو عمر لڑکی تھی۔ اس نے گھر آ کر باپ سے بات کی۔ انہوں نے اسے ریڈیو پر کام کرنے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ میں بھی یہی چاہتی تھی' لیکن وہ حرا ہی کیا' جو کسی کی بات مان لے۔ اس نے پہلے تو بحث مباحثہ کے ذریعے ہمیں قائل کرنے کی کوشش کی' مگر ہمارے نہ ماننے پر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ جو پورے گھر میں رونق لگا کر رکھتی تھی۔ اب گھر میں ہوتے ہوئے بھی نہ ہوتی۔ کسی کونے کھدرے میں خاموش بیٹھی رہتی۔

دو تین دن میں ہی میں اور تمہارے ابو گھبرا اٹھے۔ اس کی خاموشی ہمیں دکھ دے رہی تھی۔ ہم نے اس شرط پر اسے ریڈیو جا کے شو میں شمولیت کی اجازت دی کہ وہ اپنی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرے گی۔ حرا جو مکمل طور پر ناامید ہو چکی تھی اجازت ملنے پر خوشی سے اچھل پڑی۔ ہمارے گھر کی خوشیاں لوٹ آئیں۔"

پرانی یادوں نے آمنہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ردا گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے ماں کی باتیں بغور سن رہی تھی۔ یہ سارے اس کے بچپن کے واقعات تھے۔ کچھ دھندلا سا اسے یاد آ رہا تھا۔ آمنہ بیگم نے اپنی بات جاری رکھی۔

"تمہاری سلیمہ پھوپھی' تمہارے ابو کی سگی خالہ زاد بہن ہیں۔ ان کے میاں بہت بڑے زمیندار تھے۔ اس وقت وہ لوگ حیدر آباد میں رہتے تھے۔ ان کا کراچی بہت کم آنا ہوتا تھا۔ اکثر فون پر ہی خیر خیریت لے لی جاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ کسی جاننے والوں کی شادی میں شرکت کرنے کراچی آئیں تو ہمارے گھر آ کر رکیں۔ اتنے پیسے والی ہو کر بھی ان میں غرور نام کو بھی نہیں تھا۔ میں نے ان جیسی مخلص خاتون آج تک نہیں دیکھی۔ بازار جاتیں تو اپنی شاپنگ کے ساتھ ہم سب کے لیے بھی ڈھیروں کپڑے لے آتیں۔ وہ خصوصی طور پر حرا کے لیے شاپنگ کرتیں' مگر حرا ان سے چڑتی تھی' کیونکہ ان کی آمد کی وجہ سے تمہارے ابو نے اس کی بیرونی سرگرمیوں پر پابندیاں لگا دی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ حرا کی ایک نہیں سن رہے تھے۔ میرے حساب سے یہ کام انہیں بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ شروع سے حرا کی پرورش اعتدال پسندی سے کرتے تو آج وہ اپنی ضد کی وجہ سے یہ دن نہیں دیکھ رہی ہوتی۔" ماضی کا قصہ سناتے ہوئے آمنہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ردا جلدی سے ان کے لیے اٹھ کر پانی لے آئی۔ انہوں نے ایک گھونٹ بھرا۔

"جس دن سلیمہ آپا کو جانا تھا' انہوں نے فون کر کے اپنے بیٹے کو بلوا لیا۔ کلیم ایک ڈاکٹر تھا۔ حیدر آباد میں اس نے ایک بڑا میڈیکل سینٹر قائم کیا تھا جو بہت زیادہ چلتا تھا۔" انہوں نے خالی گلاس ردا کو تھمایا۔

"صبح صبح ان کی شاندار گاڑی ہمارے دروازے پر آ کر رکی۔ ان کا بیٹا کلیم ڈرائیور کے ساتھ آیا تھا۔ کلیم کو دیکھ کر مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی' کیونکہ سلیمہ آپا جتنی خوبصورت تھیں' وہ انتہائی معمولی شکل صورت کا تھا۔ بھاری بھر کم جسامت کے ساتھ اس کی رنگت بھی کچھ دبتی ہوئی سی تھی' لیکن جب اس نے بات چیت شروع کی تو اس کا رکھ رکھاؤ اور تعلیم جیسے دھیرے دھیرے کھل کے سامنے آ گئی۔ اسے ہر موضوع پر عبور حاصل تھا۔ تمہارے ابو اس کی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ مجھے بھی وہ پسند آیا۔" آمنہ نے تکیہ کو کمر نیچے لگاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں؟" ردا ماں کی بات پر کنفیوز ہو گئی' اس لیے ماں کی بات کاٹ کر بولی۔

"بعض اوقات ہم صرف ظاہری دلکشی سے انسانی شخصیت کو جانچتے ہیں' تاہم کچھ لوگوں کے اندر کی خوبصورتی ان کی بات چیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ کلیم بھی ایسا ہی تھا۔ وہ اتنا بڑا آدمی تھا' مگر اس کے مزاج میں ذرا جو غرور ہو۔ زمین پر بچھے دستر خوان پر بیٹھ کر اس نے ہمارے ساتھ ناشتا کیا۔ اتنے میں حرا کالج جانے کے لیے مجھ سے کرائے کے پیسے مانگنے ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہ سفید یونیفارم میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ صبح صبح اس کا چہرہ شبنم سے دھلا لگ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کلیم اسے بغور دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے حسن میں کھو سا گیا تھا۔ حرا جیسی حسن پرست لڑکی کی نظر میں معمولی شخصیت کے کلیم کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے نظر بھر کے بھی اسے نہیں دیکھا۔ وہ بے زار چہرہ لیے کھڑی رہی۔

"کلیم بیٹا! تم حرا کو کالج چھوڑ آؤ۔ میں اتنی دیر میں سامان سمیٹ لوں گی۔" کمرے کی خاموشی کو سلیمہ آپا کی بلند آواز نے توڑا۔ کلیم باہر نکل گیا۔ حرا جانا نہیں چاہ رہی تھی مگر میرے اشارے پر اس کے پیچھے چلی گئی۔

ڈرائیور کی موجودگی میں حرا کو کلیم کے ساتھ بھیجنے میں چھپی مصلحت نے میرے اندر خوشی کی گھنٹیاں بجا دیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم جیسے غریبوں پر اللہ ایسے مہربان بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آپا کو حرا اپنے بیٹے کے لیے پسند آئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد کلیم واپس آ گیا۔ میں منتظر تھی کہ آپا کوئی بات کریں گی' مگر دونوں ماں بیٹے ہم سے مل کر بڑی خوش دلی سے رخصت ہو گئے۔ مجھے اپنے اندازے کی غلطی پر بڑا افسوس تھا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ وہ کلیم کے لیے حرا کا رشتہ مانگیں گی' مگر ان کے خاموشی سے جانے کی وجہ سے میری ساری امیدیں ٹوٹ گئیں۔ مجھے لگا کہ حرا نے ہی کام بگاڑا ہو گا۔ اسی لیے میں نے حرا کو کریدا کہ کلیم نے راستے میں اس سے کیا باتیں کیں؟" تو وہ لاپروائی سے بولی۔

"کچھ خاص نہیں' بس تعلیم کے بارے میں پوچھتے رہے۔" اور جب میں ان باتوں کو بھولنے لگی تو ایک دن سلیمہ آپا پھر چلی آئیں۔ اس بار مٹھائی کا بڑا سا ٹوکرا اور سب کے لیے تحفے بھی لائی تھیں۔ دولہا بھائی بھی ساتھ تھے۔ وہ باقاعدہ طور پر حرا کا رشتہ مانگنے آئی

تھیں۔ ہمارے تو پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ تمہارے ابو نے فوراً "ہاں کر دی۔ سلیمہ آپا نے کہا بھی کہ حرا کی مرضی معلوم کرنے کے بعد ہامی بھرو، مگر انہیں حرا پر مان تھا کہ وہ ان کی بات نہیں ٹالے گی۔ میں بھی اس رشتے پر خوش تھی، مگر مجھے حرا کی حسن پرست طبیعت کی جانب سے خدشہ تھا۔ پھر میں نے سوچا مرد کی شکل نہیں کمائی دیکھنی چاہیے۔ جب حرا آرام و سکون کی زندگی گزارے گی تو سب بھول جائے گی۔" آمنہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھری اور آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو پونچھا۔

"ہمارے مجبور کرنے پر حرا نے اس وقت تو خاموشی سے منگنی کی انگوٹھی پہن لی مگر ان کے جاتے ہی اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اسے کلیم پسند نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسے بدشکل آدمی کے ساتھ جب وہ باہر نکلے گی تو دنیا کیا کہے گی؟" گزرے دنوں کی یاد آنسو بن کر ان کی آنکھوں میں جھلملا رہی تھی۔

"اس وقت تمہارے باپ کو پہلی بار زندگی میں اس پر شدید غصہ آیا۔ انہوں نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ وہ حرا کے انکار پر بہت پریشان تھے۔ سلیمہ آپا کے سامنے شرمندگی کے علاوہ انہیں جوان بیٹی کے یوں ہاتھوں سے نکلنے کا بہت غم تھا۔ پہلی بار ہمارے گھر کا ماحول کشیدہ ہوا۔ تمہارے ابو سوئے نہیں۔ پوری رات ٹہلتے رہے میں ان کی خراب طبیعت دیکھ کر ہولتی رہی۔

دوسرے دن غضب یہ ہوا کہ کچھ خواتین ہمارے گھر حرا کا رشتہ لے آئیں۔ پتا چلا کہ یہ سب حرا کے ایما پر ہی ہوا ہے۔ حسن تب بھی ریڈیو پر گانے گاتا تھا۔ حرا اس کی پرکشش شخصیت اور آواز کے سحر میں کھو چکی تھی۔ ان لوگوں نے واضح طور پر بتایا کہ حسن کا مستقل کوئی روزگار نہیں ہے۔ حرا ہی کے زور دینے پر حسن نے یہ رشتہ بھیجا ہے ورنہ وہ تو خود ابھی کیریر بنانے میں سنجیدہ ہے اور فوری طور پر شادی کرنا اس کے لیے مشکل ہوگا۔ ہاں وہ تین چار سال کے لیے منگنی کر لے گا۔ حسن کے گھر والے خاصے معقول لوگ تھے، اسی لیے انہوں پوری سچائی سے مجھے ہر بات بتا دی۔

حرا کے اس اقدام پر مجھے ان لوگوں کے سامنے بہت شرمندگی ہوئی۔ میں نے ان سے معذرت کی اور بتایا کہ حرا کی تو اپنی پھوپھی کے بیٹے سے منگنی ہو چکی ہے۔ حسن کی بڑی بہن اس بات پر بہت ناراض ہو گئیں۔"

"اگر یہ سچ ہے تو حرا کو یہ سب تماشا کرنے اور حسن کو بے وقوف بنانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ غصہ میں مجھے باتیں سناتی ہوئی چلی گئیں۔

"ہائے! یہ اولاد بھی کبھی والدین کے لیے کیسا امتحان ثابت ہوتی ہے۔" آمنہ بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے تاسف سے کہا تو ردا کو پہلی بار آپی پر بہت غصہ آیا جن کی وجہ سے ان کے والدین کیسی پریشانیوں میں گھر گئے تھے۔

"حسن بھائی کے رشتے پر ابو نے کیا کہا؟" ردا نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

"تمہارے ابو کی طبیعت حرا کی وجہ سے پہلے ہی بہت خراب تھی، اس لیے میں نے ان سے یہ بات چھپالی، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ جس وقت حرا مجھ سے حسن کے رشتے کے لیے لڑ رہی تھی، تمہارے ابو اتفاقاً اسی وقت آفس سے جلدی آگئے۔ حرا کی آواز ان تک پہنچ رہی تھی۔ حرا نے حسن کے لیے ہاں کرنے اور کلیم کے لیے انکار کرنے کا فیصلہ سنایا، ورنہ خودکشی کرنے کی دھمکی دی۔ جانے اس وقت اس پر کیسا جنون سوار تھا کہ ہم لوگ اسے اپنے دشمن نظر آرہے تھے۔ تمہارے ابو نے کمرے میں داخل ہو کر ہمیں خاموش کرایا۔

دوسرے دن حرا سے حسن کو بلوایا اور ایک ہفتے میں حرا سے سادگی سے نکاح کر کے رخصت کرنے کو کہا۔ حسن ٹال مٹول کر رہا تھا مگر اس کی ایک نہ چلی تو اسے مانتے ہی بنی۔ تمہارے ابو اپنی بیٹی سے بہت مایوس ہو گئے تھے۔ انہوں نے سلیمہ آپا کو فون کر کے منگنی توڑنے کا اعلان کیا تو وہ غصہ ہو گئیں۔ فون پر ہی ہمیں خوب برا بھلا کہا۔ ان کا بھی قصور نہ تھا ان کے شوہر اس

رشتے پر بڑی مشکل سے مانے تھے۔

"عبداللہ بھائی! آپ کو یہ بھی خیال نہیں آیا کہ آپ کے بھائی میاں کیا کہیں گے تو مجھ پر سخت خفا ہوں گے، پھر میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ اپنی بیٹی سے پوچھ لیں، مگر آپ کو تو اپنی تربیت پر بڑا ناز تھا۔ بھلا بتاؤ میں سب کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ میں نے اپنے پورے سسرال میں منگنی کے لڈو بھی بانٹ دیے تھے۔" فون پر روتے ہوئے انہوں نے تمہارے ابو سے بہت شکوے کیے اور پھر ہم لوگوں کے ساتھ جینا مرنا ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

"پھوپھو کو ایسا سنگدلانہ اقدام نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ آخر اس میں ابو کا کیا قصور تھا۔" ردا کو اپنے باپ کی حالت کا سوچ کر بہت افسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں بیٹا! تمہاری پھوپھو وہ سب کرنے میں حق بجانب تھیں۔ غلطی ہم لوگوں کی ہی تھی۔" ماضی کے سارے واقعات تازہ ہو کر آمنہ بیگم کی نظروں میں گھوم رہے تھے۔

"تمہارے ابو آفس جا چکے تھے۔ تمہیں اسکول بھیج کر میں کھانا پکا رہی تھی کہ دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو کلیم بڑا پژمردہ سا دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کا خستہ حلیہ اس کی ذہنی پریشانی کی عکاسی کر رہا تھا۔

"آؤ بیٹا! اندر آؤ نا۔ دروازے پر کیوں کھڑے ہو؟" میں نے اسے جلدی سے راستہ دیا۔ اس نے بڑی شکوہ بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نظریں چرالیں۔

"ممانی جان! یہ آپ لوگ کیا غضب کر رہے ہیں؟ زندگی میں پہلی بار تو میرے دل کو کسی نے چھوا تھا۔ پلیز! مجھ پر یہ ظلم نہ کریں۔ میں حرا کے مستقبل کے لیے ہر قسم کی شیورٹی دینے کے لیے تیار ہوں۔ امی کے منع کرنے کے باوجود آپ لوگوں سے بات کرنے آیا ہوں۔ پلیز! مجھے لٹنے سے بچالیں۔" اس نے میرا ہاتھ تھام کے کہا تو میرا دل کٹ سا گیا۔ اف! میں کتنی مجبور ہو گئی تھی۔ وہ اتنا اچھا لڑکا تھا مگر میں کیسے اپنی بیٹی کی کمزوری اس کے سامنے عیاں کرتی۔

"انکار ممانے نہیں، میں نے کیا ہے۔" حرا، کلیم کی آواز سن کر کمرے سے باہر آگئی۔ اسے ذرا سا بھی دکھ نہیں تھا کہ اس کے ایک غلط فیصلے نے کتنی آنکھوں کو رلا دیا ہے۔

"کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟ پلیز! ایک بار بولو تو سہی، میں وہ سب کچھ کروں گا جو تم کہو گی۔" کلیم بے قراری سے حرا کی طرف پلٹا تھا۔

"کیا آپ خوبصورت بن سکتے ہیں؟ آپ کا رنگ گورا ہو سکتا ہے؟ آپ کی آواز ایسی ہو سکتی ہے، جسے سن کر مجمع جھوم اٹھے؟ آپ خود سوچیں! میں آپ کے پہلو میں چلتی ہوئی کیسی لگوں گی؟"

مجھے حرا سے ایسی بچکانہ باتوں کی توقع نہیں تھی، مگر نہیں، وہ عقلمند ہوتی تو یوں اپنی زندگی کے ساتھ کھلواڑ نہ کرتی۔ اس کے مذاق اڑاتے لہجے نے کلیم کا دل جیسے توڑ دیا تھا۔ بغیر کوئی جواب دیے، سر جھکائے گھر سے باہر جانے لگا۔ میرے بہت روکنے پر بھی نہ رکا۔ اس دن زندگی میں پہلی بار میں نے حرا پر ہاتھ اٹھایا۔

"حرا کی اتنی سادگی سے رخصتی پر خاندان والوں نے بڑی باتیں بنائیں، پھر حسن اور اس کے گھر والوں نے بھی کچھ خاص جوش و خروش کا اظہار نہ کیا، بلکہ اس کی بڑی بہن تو بیماری کا بہانہ بنا کر اس شادی میں شریک ہی نہیں ہوئیں۔" ان کا لہجہ بالکل ٹوٹ سا گیا۔ ردا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

"تمہارے ابو کا دل تو پہلے ہی کمزور ہو چکا تھا۔ وہ دنیا والوں کی باتیں نہ سہہ سکے۔ دل کا دورہ پڑا۔ دو دن آئی سی یو میں رہے اور پھر اسپتال سے ان کی لاش ہی گھر آئی۔" آمنہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ ردا بھی ماں سے لپٹ کر آنسو بہانے لگی۔ اسے آج پتا چلا تھا کہ اس کی ماں بظاہر تو پرسکون بہتے پانی کی طرح ہیں مگر اپنے اندر ہزاروں طوفان سمیٹے ہوئے تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ماں بیٹی کو قرار آیا۔

"والدین کی نافرمانی کی سزا حرا کو یوں ملی کہ سب سے پہلے تو حسن نے اس کے ریڈیو میں کام کرنے اور گانا

گانے پر پابندی لگادی کہ ہمارے یہاں کی عورتیں دوسروں کی محفلیں نہیں سجاتیں۔ تمہیں ہمارے گھر کے ماحول میں ڈھلنا ہوگا' پھر تمہارے ابو کی بے وقت موت نے بھی اس پر بڑا برا اثر ڈالا۔ وہ اس کا ذمہ دار بھی اپنے آپ کو سمجھتی ہے۔ اس وقت میں نے بھی اس سے بات چیت بند کردی تھی مگر پھر اس کی حالت دیکھ کر مجھے اس پر ترس آگیا۔ ہم دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے گلے مل کر بہت روئیں۔ اب تو اس کی شخصیت میں بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ اس نے ضد اور احتجاج کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اب تو وہ جائز ضروریات کے لیے بھی حسن سے نہیں لڑتی۔ شاید اس طرح سے وہ اپنے آپ کو سزا دے رہی ہے۔ یہ تو میں نے زبردستی اپنی دوست کے آفس میں اسے جاب دلوادی تو اس کے حالات کچھ بہتر ہونا شروع ہوئے ہیں۔" آمنہ بیگم کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر پھیلے اندھیروں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"حسن بھائی نے جاب کی اجازت کیسے دی؟ ان کو تو اپنی انا بہت عزیز ہے' بیوی بچے بھلے سے بھوکے رہیں۔" ردا اپنے بہنوئی کی فطرت سے واقف تھی۔

"اس کے لیے بھی میں نے اس کے ساتھ طویل بحث مباحثہ کیا۔ ایک ہی شرط رکھ دی کہ جتنی تنخواہ یہاں مل رہی ہے تم باقاعدگی سے حرا کے ہاتھ پر لادھرو۔ حرا جاب کا خیال دل سے نکال دے گی۔ بس ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔" آمنہ بیگم نے لیٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا! اب تم سوجاؤ۔ صبح کالج بھی جانا ہے۔ میں تمہیں یہ سب باتیں کبھی نہیں بتاتی' مگر مجھے امید ہے کہ اپنی بہن کی زندگی کے واقعات کے تناظر میں اب تمہیں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت ملے گی۔ قسمت دروازے پر ایک بار ہی دستک دیتی ہے خصوصاً" ہم جیسے گھرانوں پر قسمت کی دیوی بار بار مہربان نہیں ہوتی۔ اور ہاں! یہ بھی یاد رکھنا کہ زندگی کوئی فلم یا تھیٹر کی کہانی نہیں ہے' جہاں سب کچھ پرفیکٹ ہو۔ یہاں کمی بیشی کے ساتھ انسان کو حالات کے حساب سے ایڈجسٹ کرکے جینا پڑتا ہے۔" ان کی باتوں میں زندگی کا تجربہ بول رہا تھا۔ لائٹ بند کرکے دونوں ماں بیٹی سونے کے لیے لیٹ گئیں' مگر نیند دونوں کی آنکھوں سے دور تھی۔ ایک کو مستقبل کے اندیشے ڈراتے رہے تو دوسری ماضی میں لگنے والے زخموں کو سہلاتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"سنو ردا! میں تمہیں شاپنگ کے بہانے سے گھر لے کر جارہی ہوں' کیونکہ میں چاہ رہی تھی کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تم دانیال بھائی سے اور وہ تم سے مل لیں۔ اگر تم دونوں کو لگے کہ ایک دوسرے کے لیے سوٹ ایبل نہیں ہو تو ہم بات یہیں ختم کردیں گے۔" ردا نے چونک کر بسمہ کو دیکھا۔ اسے تو نعمان بھائی نے کلاس ختم ہونے کے بعد اطلاع دی تھی کہ بسمہ اسے اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جانا چاہ رہی ہے' سو وہ بیگ اٹھا کر کوچنگ سے باہر آگئی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس سے ٹکرا کر سردیوں کی آمد کی اطلاع دے رہے تھے مگر اسے بسمہ کی گاڑی کا انتظار تھا سو آرام سے کھڑی رہی۔ مما کو میسج کرکے شاپنگ پر جانے کی اطلاع کردی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ردا کی چوائس بہت اچھی تھی' اسی لیے اکثر بسمہ اسے پک کرلیتی۔ دونوں خوب گھومتیں' شاپنگ کرتیں' پھر ڈرائیور اسے گھر چھوڑ آتا۔

"میں نہیں چاہتی کہ ہمارے تعلقات ان معاملات کی وجہ سے خراب ہوں۔ تمہارے بھیا بھی اس وجہ سے پریشان ہیں کہ کہیں نئے رشتے جوڑتے جوڑتے میں پرانے رشتوں کو نہ توڑ بیٹھوں۔ پلیز! مجھے غلط مت سمجھنا۔ اسی لیے ان سے بھی شاپنگ کا بہانہ کیا ہے مگر ہم گھر جارہے ہیں۔ امی بھی تم سے مل لیں گی۔"

ردا کو یہ بات کچھ اتنی بھائی نہیں' مگر نعمان بھائی اور بسمہ سے تعلقات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ ایک دم سے ناراضی کا اظہار کرنا بھی مناسب نہ تھا' سو خاموشی سے اسے دیکھے گی۔

"بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے میں نے تمہاری اجازت کے بغیر یہ قدم اٹھایا ہے۔ تم دو اچھے لوگوں کو ایک کرنے کی کوشش میں یہ بسمہ غریب اپنے میاں جی سے کئی بار جھاڑیں کھاچکی ہے۔ تم جانتی ہو نا کہ وہ تمہارے لیے کتنے حساس ہیں۔" بسمہ نے بچوں کی طرح منہ بسور کر مسخرے پن سے کہا' تو دانیال سے ملاقات کی بات سن کر ردا پر جو گھبراہٹ طاری ہوئی تھی' وہ زوردار قہقہہ میں ڈھل گئی' یہ ہی تو بسمہ چاہ رہی تھی ورنہ ردا کی خاموشی نے اسے تھوڑا متفکر کردیا تھا۔

"اللہ جی! دنیا میں اتنے پیارے اور مخلص لوگ موجود ہیں' جب ہی تو تیری دنیا قائم ہے۔" ردا نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔

"واقعی نعمان بھائی اور بسمہ بھابھی بے مثال ہیں۔ آج کل کے دور میں کوئی کسی کے لیے اتنا کہاں سوچتا ہے؟" اپنے اردگرد اتنے محبت کرنے والوں کا حصار دیکھ کر اس کا دل محبت کے نور سے روشن ہوگیا۔

"بسمہ بھابھی اتنی معصوم اور پیاری ہیں' ہوسکتا ہے بھائی بھی اتنا ہی لونگ اور کیئرنگ ہو۔" دل کی آواز پر وہ گھبرا گئی۔ فوراً" ہی گاڑی کی کھڑکی سے باہر دوڑتے ہوئے نظاروں میں اسے بہلانے لگی۔

"ماشاءاللہ' جیسا ذکر سنا تھا' اس سے بڑھ کر پایا۔" بسمہ کی امی نے اس کا ماتھا چوما اور پیار سے بولیں۔ وہ بے انتہا پرکشش اور مشفق خاتون تھیں۔ ردا کو ان سے مل کر دلی خوشی محسوس ہوئی۔

"میں تم لوگوں کے لیے لزانیہ بنارہی ہوں' اس لیے تھوڑی دیر میں تم لوگوں کو جوائن کرتی ہوں۔" وہ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف مڑ گئیں۔

"تم آرام سے چادر اتار کر بیٹھو۔" بسمہ نے صوفے پر اس کے برابر میں گرتے ہوئے اسے بھی ریلیکس ہونے کی تاکید کی۔ دونوں گرما گرم کافی سے لطف اندوز ہورہی تھیں جو بسمہ کی امی نے نوکرانی کے ہاتھوں ڈرائنگ روم میں بھجوائی تھی۔

"کیلے اکیلے کافی پی جارہی ہے۔ پردیسی بھائی کا تو خیال ہی نہیں ہے۔" بھاری مردانہ آواز پر وہ چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم!" ردا کو اپنا اعتماد بحال کرنے میں چند سیکنڈز ہی لگے تھے۔

"وعلیکم السلام!" دانیال ان دونوں کے سامنے والی نشست سنبھال کر بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے شائستگی سے جواب دیا۔ وہ ردا کے خیالوں سے بھی بڑھ کر مردانہ وجاہت کا شاہکار تھے۔

"میں ذرا سندس اور دانش کو دیکھوں' کیا کررہے ہیں؟" بسمہ انہیں بات کرنے کا موقع دے کر باہر نکل گئی۔

دانیال نے اس کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ بھانپ لی' اسی لیے ردا کی فیملی کے بارے میں چھوٹے چھوٹے سوالات کرنے لگے۔ بات سے بات نکالنا انہیں خوب آتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ردا نے خاصے پرسکون انداز میں ان سے تمام معاملات اور شادی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے متعلق کھل کر بات کی۔ کسی حد تک انہوں نے اسے اس بارے میں مطمئن بھی کیا۔ ردا نے بھی ان کی زندگی اور دوسرے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اسے ان کی کسی بات پر اعتراض نہیں تھا۔ لنچ کے بعد وہ گھر آگئی۔ بسمہ کی امی نے اسے بہت خوبصورت سوٹ اور مما کے لیے نفیس سی شال دی جو اس نے بڑے تکلف کے بعد رکھ لی۔ ان کی محبت کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ بسمہ اور دانیال اسے مسلسل چھیڑتے رہے۔ بڑا مکمل گھرانہ تھا۔ یہ ردا کی زندگی کا بہترین دن تھا۔

☼ ☼ ☼

"مما! مجھے دانیال سے شادی پر اعتراض نہیں' مگر میں آپ کو یہاں اکیلا بھی تو نہیں چھوڑ سکتی۔ اس لیے آپ بسمہ بھابھی کو انکار کردیں۔" ردا نے بڑے دکھی دل سے یہ سب کہا۔ دانیال کے لیے نرم گوشہ اس کے دل میں پیدا ہوگیا تھا۔

آمنہ بیگم اس کی کیفیت سمجھ رہی تھیں' مگر وہ اپنی

وجہ سے بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے بسمہ کو فون کرکے ساری بات بتادی۔ ساتھ میں یہ بھی کہا کہ وہ یہ رشتہ کرنا چاہتی ہیں۔

"آنٹی! آپ یہ بتائیے کہ آپ سلائی کرسکتی ہیں نا؟ مجھے روا کے جدید انداز کے سوٹ سلے دیکھ کر اندازہ ہوا ہے کہ آپ کے ہاتھ میں کتنی صفائی ہے... اوکے! یہ مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔" بسمہ بڑی جلدی میں تھی۔ فوراً فون بند کردیا۔

آمنہ بیگم مسکراتی ہوئی چائے بنانے چل دیں۔ انہیں یقین تھا کہ بسمہ اس مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ نکالے گی۔

☼ ☼ ☼

"آنٹی! یہ میری امی ہیں۔ دبئی میں انڈین اور پاکستانی کپڑوں کا بوتیک چلا رہی ہیں۔ امی کا کام اب وہاں کافی بڑھ گیا ہے۔ انہیں اپنی شاپ کے لیے ایک 'ایماندار خاتون چاہیے جو سلائی اور ڈیزائننگ کی سمجھ رکھتی ہوں' اس لیے امی آپ کو اپنے بوتیک میں جاب آفر کررہی ہیں۔ میرا خیال ہے، آپ لوگ تنخواہ وغیرہ کے معاملات آپس میں طے کرلیں۔" بسمہ کی زبان کی تیز رفتاری پر آمنہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ان کا گمان بسمہ کے لیے غلط نہ تھا۔

روا کا اعتراض خود بخود ختم ہوگیا۔ اس کے پاس اب انکار کا جواز باقی نہ رہا۔ مما کی دبئی میں جاب والے معاملے نے روا کے دل سے دانیال کے گھر والوں کے متعلق سارے شکوک دور کردیے۔ کس طرح انہوں نے روا کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہوئے، مما کے اکیلے پن کا مسئلہ حل کیا۔ الٹا دانیال کی امی تو بار بار ان لوگوں کی شکر گزار ہورہی تھیں کہ آمنہ بیگم نے ان کے بوتیک میں جاب کی ہامی بھر کر ان کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہلکا کردیا۔ روا کے دل میں ان لوگوں کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ اسے لگا اس کے آنگن میں پھول کھل اٹھے ہوں۔

☼ ☼ ☼

"مما! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ آپ نے روا کی شادی دو بچوں کے باپ سے طے کردی ہے؟" حرا پریشان حال دروازے سے داخل ہوئی۔

"بیٹا! یہ سب روا کی مرضی سے ہورہا ہے۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ کیا شریعت ہمیں شادی شدہ مرد سے شادی کرنے سے روکتی ہے؟" وہ حرا اور دنیا کے سوالوں کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھیں۔

"مما! آپ مذہب کو بیچ میں مت لائیں۔ ابھی روا کم عمر ہے۔ اسے اچھے رشتے مل جائیں گے، پھر دنیا کیا کہے گی۔" حرا نے ماں سے بحث کی۔ اسے لگا کہ مما چھوٹی بہن پر کوئی ظلم کررہی ہیں۔

"مذہب کو بیچ میں کیوں نہ لائیں؟ اسلام تو ہماری زندگی کے ہر ایک معاملے میں شامل ہے۔ وہ ہی تو ہماری رہنمائی کرتا ہے، پھر ہم زندگی کے معاملات اور مذہب کو دو حصوں میں کیوں بانٹ دیتے ہیں؟ اس وقت ہمارے معاشرے میں جو مسائل ہیں ان کے پیچھے ایک بڑی وجہ مذہب سے دوری بھی ہے۔ اگر لڑکا اچھا ہے، اپنی بیوی کا بوجھ اٹھا سکتا ہے تو پھر اس سے شادی کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ آج کل کے والدین جو لڑکیوں کی شادی کے لیے پریشان ہیں تو وہ اسی لیے ہیں کہ انہوں نے از خود کچھ معیار بنا لیے ہیں، وہ اسی حساب سے لڑکے ڈھونڈتے ہیں اور لڑکیوں کی عمریں نکال دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دونوں کی عمروں میں فرق ہے تب بھی کوئی بڑی بات نہیں، بلکہ میرے حساب سے تو ایک لڑکے کو سیٹل ہونے میں جتنا ٹائم لگتا ہے، اس حساب سے وہ کم عمر تو نہیں رہتا نا؟ کم عمر لڑکوں سے شادی کے بعد کیا مسائل ہوتے ہیں، یہ مجھ سے بہتر تم جانتی ہو۔" انہوں نے بیٹی کو مفصل جواب دیا اور اس کے لیے چائے لینے چلی گئیں۔

"کیسی ہیں آپی؟ مما! میں بھی چائے پیوں گی۔" روا آج ایکسٹرا کلاسز لے کر بہت تھک گئی تھی۔ اس نے بیگ بیڈ پر پھینکا اور پیر پھیلا کر سکون سے بیٹھ گئی۔

"روا! یہ تم لوگ کیا فیصلہ کررہے ہو؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کچھ تو خیال کرو۔ کتنی باتیں بنیں گی۔" حرا اپنے موقف پر قائم تھی۔ دو بچوں والے سے بہن کی شادی کی بات اسے ہضم نہیں ہورہی تھی۔

"آپی! یہ میری زندگی کا صحیح فیصلہ ہے۔ غلط فیصلہ تو آپ نے کیا تھا۔ میں نے تو اس سے سبق حاصل کیا ہے اور لوگوں کا کیا ہے، وہ تو ہر حال میں باتیں بناتے ہیں۔ جب آپ نے حسن بھائی سے شادی کی تھی، تب بھی تو بڑی باتیں بنی تھیں جبکہ وہ تو غیر شادی شدہ اور کم عمر بھی تھے۔" روا بڑی بہن سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر شاید اسے آئینہ دکھانا ضروری تھا۔ حرا اس کے دوٹوک انداز پر خاموش ہوگئی۔

"ویسے بھی دانیال نے بیوی کے ایکسیڈنٹ میں وفات پاجانے کے بعد طویل عرصے تک اپنی اولاد کو سوتیلی ماں سے بچانے کے لیے اکیلے زندگی گزاری ہے۔ ان کی بیٹی کو اب ایک ماں کی ضرورت ہے۔ وہ ہر بات اپنے باپ سے تو شیئر نہیں کرسکتی نا۔ اگر اب میں ان سب کو خوشیاں دوں گی، تو وہ بھی میرے گھر والوں کا خیال مجھ سے بڑھ کر کریں گے۔" روا نے بہت دور کی سوچی تھی۔

دانیال سے ملنے کے بعد حرا اور حسن کے دل سے سارے خدشے مٹ گئے۔ انہوں نے شادی کے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دلہن بنی روا بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بسمہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے۔ کبھی وہ دانیال کو چھیڑتی تو کبھی روا کو۔ دانیال کے دونوں بچوں کی بھی نئی ممی سے خوب دوستی ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایئرپورٹ پر حرا کو گلے لگاتے ہوئے روا نے بہت آنسو بہائے۔ وہ دانیال کے ساتھ دبئی روانہ ہورہی تھی۔ دانیال کی چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں۔

آمنہ، دانیال کے بچوں اور بسمہ کی امی کو ایک ہفتے بعد دبئی جانا تھا۔ اس طرح وہ لوگ نئے جوڑے کو پوری تنہائی فراہم کررہے تھے تاکہ دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے۔

"آپی! آپ کو جاب کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ خالہ جی کی بڑی بیٹی نے ہمارا نیچے کا پورشن بھی کرائے پر لے لیا ہے۔ امی کے دبئی جاتے ہی وہ یہاں شفٹ ہوجائے گی۔ پورے گھر کا کرایہ آپ کی اپنی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہے، جو ___ ملے گا۔ اس سے آپ کے مسائل کافی حد تک کم ہوجائیں گے۔ میں نے دانیال سے بات کرلی ہے مما کے ہاتھوں حسن بھائی کے کاغذات بھجوا دینا اور پلیز! ان کو راضی کرلینا۔ دانیال جلد ہی انہیں دبئی میں کوئی اچھی جاب دلوادیں گے۔" روا نے ایئرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں گرما گرم کافی پیتے ہوئے حرا کو آئندہ کا لائحہ عمل سمجھایا۔

حرا چھوٹی بہن کے آگے خود کو بہت چھوٹا محسوس کررہی تھی۔ اس کے ایک غلط فیصلے نے جہاں ان کے گھر کا شیرازہ بکھیر دیا تھا، روا کے صحیح عمل نے ان سب کے مسائل حل کردیے تھے۔ حرا آنکھوں میں آنسو بھرے اس طیارے کو دیکھ رہی تھی جس میں روا دبئی روانہ ہوگئی تھی۔

☼ ☼

صباحت یاسمین

"ہاں ہاں وقت پہ پہنچ جاؤں گا' بالکل فکر مت کرو۔" میں نے حبہ کو یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔

"آئی نو مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں' بس ایسے ہی تاکید کررہی تھی۔" جواباً" ماؤتھ پیس سے اس کی مطمئن سی آواز ابھری۔

"او کے یار' اب میں چائے پی لوں' ٹھنڈی ہورہی ہے۔" میں نے چائے کے کپ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے میرا لنچ ٹائم بھی اوور ہونے والا ہے' سی یو سون۔" اس نے گفتگو سمیٹ دی۔

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟" میں نے چائے کا پہلا سپ لیتے ہوئے سعد سے سوال کیا جو کب سے کڑے تیور لیے مجھے گھور رہا تھا۔

"کیوں بھابھی کے ساتھ ظلم کررہے ہو فرخ۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"ایسا بھی کیا کردیا ہے میں نے جسے تم ظلم کہہ رہے ہو۔" مجھے تو اس کی بات سن کے پتنگے ہی لگ گئے تھے۔

"ایک خوب صورت' پڑھی لکھی' ذہین بیوی کے ہوتے ہوئے تم سابقہ گرل فرینڈ کے ساتھ تین روز ٹھہرنے جارہے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ کوئی بات ہی نہیں۔" میرا جگری یار مجھ پہ طنز کررہا تھا' میرا ایسٹر تو گھومنا ہی تھا' جبھی میں بولا۔

"دیکھو' ہم صرف گھومنے جارہے ہیں' کچھ غلط نہیں کرنے والے جو تم یوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہو۔"

"مرد اور عورت تنہا ہوں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے ان کے بیچ' جانتے ہو نا؟"

"اوہ کم آن ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا' جس کا تمہیں خدشہ ہے' یہ تمہاری سطحی سوچ کے سوا کچھ بھی نہیں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"پھر بھی تم بھابھی کے حصے کا وقت' ان کے حصے کی توجہ کسی اور کو دیتے رہو تو کیا یہ زیادتی نہیں؟"

"سعد پلیز یار حبہ کے ساتھ گھومنا' پھرنا میرے معمولات میں شامل نہیں ہے' کبھی کبھار کی ہی تو بات ہے۔"

"اچھا! اگر کبھی کبھار مریم بھابھی اپنے کسی کزن یا کلاس فیلو کے ساتھ پکنک منانے جائیں اور تم گھر بیٹھے رہو تو تم سے برداشت ہوگا یہ کبھی کبھار۔" اس نے کبھی کبھار خاصا چبا کر کہا تھا۔

"یار حبہ کی شادی ہوگئی تو میں کب اس سے ملوں گا؟ مریم کی حیثیت کبھی کوئی اور نہیں لے سکتا اور حبہ....."

"کب ہوگی اس کی شادی؟" سعد نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"جلد ہی ہوجائے گی۔"

"یہی جواب تم نے سات ماہ پہلے بھی دیا تھا' جب تم اس کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گئے تھے۔" سعد بہت تلخ ہورہا تھا۔

"یار اسے میری ضرورت ہے' تم نہیں جا....."

"تم نہیں جانتے کہ وہ کتنی ڈسٹرب ہے' اس کی مورل سپورٹ میرا اخلاقی فرض ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہی سب کہنے والے تھے نا تم؟" اس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔

"ہاں کہنے والا تھا اور یہ کوئی رٹا رٹایا اسکرپٹ نہیں'

حقیقت ہے۔ تمہیں خوامخواہ مریم سے ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں ہے' سمجھ آئی؟" میں نے بھی اب کی بار کسی قسم کا کوئی لحاظ نہیں کیا تھا' اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر تن فن کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"کتنی ذہین ہے نا میری بیٹی۔" سب افراد خانہ اس وقت ڈائننگ ٹیبل کے سامنے موجود دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ تمام لوگ باری باری میری زوجہ محترمہ کی تعریف میں حسبِ توفیق حصہ ڈال رہے تھے۔

"بالکل اور ماشاءاللہ سے حاضر دماغ بھی ہے۔" یہ میری والدہ ماجدہ تھیں جنہوں نے اپنے مجازی خدا کے نکتہ نگاہ کی تائید بھی کی اور اپنی طرف سے بھی معقول حصہ ڈالا۔ مجھے اس تعریفی سیشن کے سیاق و سباق سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا میں نے احوال قصہ جاننے کی ذرا بھی سعی نہ کی' میں جلد از جلد پیٹ بھرنے کی کوشش میں تھا' کیونکہ کھانے کے فوراً بعد مجھے نکلنا تھا۔"

"آپ کی چائے۔" میں نے آخری نوالہ منہ میں منتقل کیا ہی تھا کہ اس نے میرے سامنے چائے لا رکھی۔ چائے میری کمزوری تھی اور مریم کے ہاتھ کی بنی ہو تو شدید ترین کمزوری' لہٰذا میں آرام آرام سے چائے کی چسکیاں لے کر اپنی کمزوری کو انجوائے کرنے لگا۔

"اب آپ کو دیر نہیں ہو رہی؟" وہ برتن سمیٹتے ہوئے شرارت سے پوچھ رہی تھی۔ میں اپنی ہی افراتفری میں تھا' سب لوگ کب اٹھ گئے مجھے پتا ہی نہیں چلا۔

"جناب یہ آپ کی چائے کا ہی کرشمہ ہے' جس نے ہمیں بٹھا دیا۔"

"اچھا جی۔" وہ اپنی ذہین آنکھوں سمیت میری طرف متوجہ ہوئی تھی۔

اس کی آنکھیں بہت روشن تھیں' ان میں ذہانت کی چمک تھی' وہ بہت حاضر جواب تھی' کم گوئی اس کی عادت تھی' مگر جب وہ بولتی تو اپنے مخاطب کو لاجواب کر دیتی اور جب چلتی تو اس کی چال میں اتنا اعتماد ہوتا گویا دنیا اس کے قدموں تلے ہو' مگر وہ میری بیوی تھی' اسے مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ بہت عاجز و انکسار تھی۔ وفا' محبت' حیا' ایثار.... مشرقی عورت کے تمام رنگوں کا عکس اس کی ذات میں بے حد واضح تھا۔ وہ بہت الگ سی تھی' مگر خود کو بہت عام سا سمجھتی تھی' اسے منفرد رہنے کا' خود کو منفرد کہلوانے کا کوئی شوق نہ تھا۔

موبائل کی رنگ ٹون نے میری محویت کو توڑا' چائے کب کی ختم ہو چکی تھی۔

"مریم۔" میں نے کچن کی طرف دیکھتے ہوئے اسے پکارا اور حبہ کو ویٹ کا میسج کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ مریم نے مجھ سے یہ تک نہ پوچھا تھا کہ محرم کی چھٹیوں میں کس قسم کی کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہے' جس میں میری شرکت لازم تھی۔ شاید یہ اس کا اندھا اعتماد تھا کہ وہ مجھ سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا کرتی تھی۔

"آپ نے بلایا؟" دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتی ہوئی وہ ایک بار پھر اپنی ذہین آنکھوں سمیت میرے سامنے تھی۔ شاید وہ برتن دھو کر آئی تھی۔

"ہاں وہ میرا ہینڈ کیری اور گھڑی لے آؤ' میں گاڑی نکالتا ہوں۔"

"جی اچھا۔" وہ سادہ سے لہجے میں کہتی ہوئی ہمارے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ بات محسوس کر کے کمینی سی مسرت محسوس ہوئی کہ کتنا آسان تھا میرے لیے اس ذہین و فطین عورت کو چکما دینا۔

☆ ☆ ☆

میں ابھی گاڑی کا لاک ہی کھول رہا تھا کہ وہ میرا

سامان اور گھڑی لے کر آ گئی۔ میں اس کے ہاتھ سے گھڑی لے کر کلائی پر باندھنے لگا کہ اس کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا' وہ کہہ رہی تھی۔

"اسلام آباد تک ہی رہیے گا۔" میں سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"فیاض بھائی کی جب تک مری پوسٹنگ ہے محتاط رہیے۔" وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگا' میرا دل یک لخت ہی کسی انہونی کے احساس سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"پچھلی دفعہ بھی جب بھائی نے آپ کو کسی کے ساتھ دیکھا تو میں نے بڑی مشکل سے آپ کی پوزیشن کلیئر کی تھی۔" وہ اپنے مخصوص سادہ سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ میری نظریں بنا کسی شعوری کوشش کے زمین میں گڑ گئیں۔ کوئی رونا دھونا' کوئی شکوہ' شکایت' کوئی روک ٹوک نہیں' حسبِ معمول اس نے بہت مختصر بات کی تھی' حسبِ عادت اس کا لہجہ بہت سادہ تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی اور میں نے دیکھا حسبِ سابق اس کی چال میں وہی اعتماد تھا' جیسے دنیا اس کے قدموں تلے ہو۔ وہ بہت پریکٹیکل اپروچ والی لڑکی تھی۔

میرے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے خود بخود حرکت کر کے حبہ کی بار بار آنے والی کال کاٹ دی۔ میرے پاؤں آگے بڑھنے سے انکاری تھے۔ وہ مجھے کچھ اس ڈھب سے بے بس کر گئی تھی کہ میں آگے بڑھتا تو کبھی اس کے سامنے سر نہ اٹھا پاتا' پیچھے مڑتا تو بھی معافی کی چوکھٹ عبور کیے بنا' ندامت کی بے ساکھی کا سہارا لیے بنا اپنے گھر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے حدود و قیود نہ لگائی تھیں' وہ گڑگڑائی بھی نہ تھی' اپنے حق کی حفاظت کے لیے اس نے مجھے واسطے بھی نہ دیے تھے۔ اپنی ذات کے وقار پر اس نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا' بلکہ بڑی مہارت سے میرے پر کاٹ کر میری پرواز کی راہیں مسدود کر دی تھیں' وہ واقعی ذہین تھی۔

☆ ☆

نایاب جیلانی

نویں قسط

"میں آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔" وہ اپنے وعدے کے عین مطابق صبح صبح دروازے پر کھڑا تھا۔ عفیفا کے پاس نہ تو اب کوئی بہانہ تھا اور نہ ہی کوئی جائے فرار۔

سو وہ خاموشی کے ساتھ بغیر بحث و تکرار میں پڑے بیگ ہاؤس میں چلی آئی تھی اور شاہنواز نے نہ جانے کتنی ہی مرتبہ اسے یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ راحت بیگم کے اصرار پر اسے لینے کے لیے آیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی تمام تر گفتگو سنتی رہی تھی۔ سفر کے دوران بھی اس کی چپ نہیں ٹوٹی تھی۔

گھر میں داخل ہونے کے پہلے مرحلے میں ہی عفیفا گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔ سامنے ثریا خالہ بڑے خطرناک تیور لیے کھڑی تھیں اور عفیفا پورے وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ خالہ ثریا اپنی عادت کے عین مطابق اس کی شکل بھول چکی تھیں۔ حالانکہ کئی مرتبہ نفیسہ بیگم کی وفات کے بعد بھی وہ عفیفا کے گھر میں آتی رہی تھیں۔ مگر اس وقت ان کے تیور خاصے خطرناک تھے۔ وہ دہائیاں دیتی سخت مشتعل ہو رہی تھیں۔

"اب کس کو اٹھا کر گھر لے آئے ہو' میری جان کے عذاب۔" عفیفا کو دیکھ کر تو وہ غش کھانے کو بے قرار ہو رہی تھیں۔ شاہنواز گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے ہی اندر آیا تھا۔ ادھر ثریا جہاں لال' ہری ہو رہی تھیں۔ پہلے رباب کا ہوّا سر پر سوار رہتا تھا اور اب یہ نہ جانے کون سی مجسم بلا آن موجود ہوئی تھی۔ وہ غش نہ کھاتیں تو اور کیا کرتیں۔

"یہ کس کو ساتھ لائے ہو۔ کون ہے یہ بے شرم عورت۔ کیسے دیدہ دلیری سے میرے گھر میں گھس آئی ہے۔" وہ تو گویا رو دینے کو تھیں۔ شاہنواز کی دھمکیاں اس وقت حقیقت کا روپ دھارے سامنے تھیں۔ وہ روزانہ ہی تو انہیں جلاتا تھا کہ کسی دن ہاتھ سے پکڑ کر کسی کو ساتھ لے آؤں گا۔ بس آپ دیکھتی رہ جائیے گا۔ وہ سچ مچ دیکھتی ہی رہ گئی تھیں۔ جب تیزی سے بیرونی سیڑھیاں اترتی حریم اندر داخل ہوئی تھی۔ ادھر عفیفا کی بھی گویا جان میں جان آئی تھی اور شاہنواز ہنوز مسکرائے جا رہا تھا۔

"خالہ جی! یہ عفیفا ہے۔ نفیسہ پھوپھو کی بیٹی۔" حریم کے تعارفی جملے نے ثریا جہاں کو شرمندگی کے مارے پانی پانی کر دیا۔ وہ جو ہتھیاروں سے لیس مقابلے کے لیے کھڑی ہو رہی تھیں پانی کے جھاگ کی طرح تخت پر بیٹھتی چلی گئیں اور پھر اپنی شرمندگی مٹانے کی غرض سے کچھ سوچ کر اٹھی تھیں۔ عفیفا کے سر پر ہاتھ پھیر کر نرمی سے بولیں۔

"معذرت چاہتی ہوں بیٹی! بس پہچان نہیں پائی۔ حالانکہ پہلے بھی دیکھ رکھا ہے تمہیں۔ بس یہ میرا

ناہنجار بیٹا کوئی سیدھی بات نہیں بتاتا۔ ادھر آؤ، یہاں بیٹھو میرے پاس۔" وہ خلوص دل سے اسے زبردستی اپنے پاس بٹھا رہی تھیں۔ حریم بھی عفیفا سے ملنے کے بعد بیٹھ گئی تھی۔ تبھی ثریا جہاں شکوہ کناں انداز میں بولیں۔

"چلو، اسی بہانے حریم بھی نیچے آگئی ہے۔ کبھی نہیں اس نے نیچے کا چکر لگایا۔ سارا دن تنہا خود سے باتیں کرتی رہتی ہوں یا ان دیواروں سے۔ کبھی زیادہ دل گھبراتا ہے تو اوپر چلی جاتی ہوں۔"

"میں تو کہتی ہوں خالہ جان! اب آپ بھی بہو لے ہی آئیے گھر میں کچھ رونق تو ہو جائے گی۔" حریم نے بھی مخلصانہ مشورہ پیش کیا تھا۔ شاہنواز کو کچن میں کھڑے کھڑے کھانسی آگئی۔

"خالہ جان کو اپنی راجدھانی کی تقسیم کہاں گوارا ہے خاتون! بہو کے نام پر تو انہیں تاپ چڑھ جاتا ہے۔"

"لو اور سن لو۔" ثریا جہاں کو فیفا کے سامنے یہ کڑوا سچ خاصا کھلا تھا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے تاپ چڑھانے کی۔ تم ایک چھوڑ دس لے آؤ۔ رہی بات راج دھانی کی تو یہ کون سا محل سرا ہے۔ اوپر والا حصہ تو کب کا ماہیر خرید چکا۔ نیچے والا پورشن اور یہ درختوں سے بھرا جنگل جیسا صحن ہے، جتنی مرضی لیتے آؤ اور سب کو کسی نہ کسی درخت کے تنے سے باندھتے جانا۔" انہوں نے گویا کان پر سے مکھی اڑائی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے غلط فہمی میں عفیفا کو دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو رہی تھیں اور اب وہ خیر سے صاف مکر چکی تھیں۔ ادھر حریم کچھ چونک سی گئی تھی۔

"ماہیر کیا اوپر والا پورشن خرید چکے ہیں۔ اگر ایسی کچھ بات تھی بھی تو انہوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔" وہ صرف حیران ہی نہیں بلکہ خوش بھی ہو رہی تھی۔ بھلا اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے گھر میں سے نکل کر اپنے ہی گھر کی چھت تلے رہائش پذیر تھے۔ منوں بوجھ تھا جو دھیرے دھیرے اس کے کندھے سے خود بخود سرک گیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ لمحوں میں ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔

"اماں حضور! وہ میری بیویاں ہوں گی۔ باڑے کی بھیڑ بکریاں نہیں کہ انہیں درختوں کے تنوں سے باندھتا پھروں گا۔" شاہنواز بلینڈر کا جگ اٹھائے باہر آگیا تھا۔ ہاتھ میں دو تین گلاس بھی پکڑ رکھے تھے۔

"کم از کم ٹرے میں رکھ کر ہی لے آتے۔" وہ ٹوکے بنا نہیں رہ سکی تھیں۔

"آپ آم کا شیک پئیں..... ایٹی کیٹس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں۔" وہ گلاس لبالب بھر کے فرداً فرداً حریم اور عفیفا کو دینے کے بعد ثریا جہاں کو پکڑانے کے بعد بولا۔

اب اس کا سارا دھیان عفیفا کی طرف تھا۔ جو گلاس پر نظر جمائے بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی تھی۔

"عفیفا کو اوائل عمر ہی میں خاموشی کا سانپ تو نہیں سونگھ گیا۔ ارے میں تو اس طرح خاموش اگر بیٹھ جاؤں تو میرے جبڑے ہی دکھتے رہ جائیں۔"

"تجھے تو مسخریاں ہی سوجھتی ہیں۔ تم کیا جانو کہ بچی بے چاری پر کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔" ثریا جہاں کا لہجہ خوب رقت زدہ ہو گیا تھا۔

"تو بچی نے خود پر کیونکہ پہاڑ ٹوٹنے دیے ہیں۔ اللہ نے عقل اور فہم سے اسی لیے نوازا ہے نا کہ بندہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے۔ پہاڑوں سے اندھا دھند سر ٹکرانے کے بعد خود ہی پاش پاش ہونا تھا نا۔" وہ بہت سادہ سے انداز میں بہت گہری بات کر رہا تھا۔

"میرے بھائی! تقدیر اور نصیب کا لکھا کوئی نہ بدل سکتا ہے نہ مٹانے کی قدرت رکھ سکتا ہے۔" حریم نے ٹھنڈی سانس بھر کے گلاس خالی کر دیا تھا۔ اب وہ اٹھنا چاہتی تھی۔ کچن میں کافی پھیلاوا بکھرا تھا۔ آج فیفا کے لیے اس نے لنچ میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ سو اسی سلسلے میں تیاریاں کر رہی تھی۔

"اس دیسی انگریز کو بھلا کیا جتاتی ہو۔" انہوں نے تاسف کا برملا اظہار کیا تھا۔ ادھر دیسی انگریز اس طرز تخاطب پر اچھل ہی پڑا۔ فیفا کی وجہ سے جو شائستگی کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ وہ چولا بھی اتار پھینکا تھا۔

"اماں جان! نہ تو میں دیسی ہوں نا میں ولایتی ہوں۔ آپ دو خوب صورت خواتین کے سامنے مجھے ڈی گریڈ کرنے کی کوشش مت کریں۔ ورنہ آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ ادھار رکھنے کا میں کبھی بھی قائل نہیں رہا ہوں۔"

"مہمان بچی کو پہلے روز ہی اپنی اصلیت دکھا دو۔" انہوں نے اسے شرم دلانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ مہمان بچی اپنے دودھ کے دانت گرنے کے وقت سے مجھے جانتی ہے۔ میری اصلیت کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ کیوں عفیفا! ذرا اماں کو بتاؤ نا۔" شاہنواز نے براہ راست کب سے سر جھکائے بیٹھی عفیفا کو مخاطب کیا تھا۔ مقصد صرف اسے اپنی طرف متوجہ کرنا ـــ تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فیفا ابھی تک اپنی گزشتہ زندگی کے بوجھ تلے دبی اس وقت بھی یہاں موجود نہیں تھی۔

"مجھ سے کچھ کہا ہے شاہنواز۔" وہ ایک دم گڑبڑا کر شاہنواز کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور پھر اپنی بے اختیاری پر خود ہی شرمندہ بھی ہو گئی۔

"کہنا تو آپ سے بہت کچھ ہے مگر کیا کروں..... خوفزدہ ہوں، ڈرا ہوا ہوں، کہہ نہیں پاتا۔ یاد ہے تمہیں کہ ایک دفعہ کچھ کہنے کی کوشش کی تھی میں نے اور تم نے جا کر ماہیر سے شکایت لگا دی اور اس خبیث اعظم نے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا تھا۔ بس اس دن سے لڑکیوں کو میں نے کچھ خاص کہنا چھوڑ دیا ہے۔" وہ بھی تو شاہنواز تھا بغیر جھجکے ہر بات منہ پر دے مارنے والا اور نہ جانے ماضی کے کون سے قصے پھر سے اس نے گرد جھاڑی تھی۔ تاہم فیفا بے چاری تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ ثریا جہاں اور حریم کی موجودگی نے اسے بے تحاشا شرمندہ کر دیا تھا۔

"تم آج بھی کمینے، منہ پھٹ اور جھوٹے ہو شاہنواز۔"

وہ گویا دانت پیس کر رہ گئی۔

"فیفا کو یاد ہو نہ ہو مگر مجھے اور بیگ صاحب کو اچھی طرح سے تمہارا کارنامہ یاد ہے۔ تمہاری اسی کارگزاری کی بدولت ہم لوگ اپنی کالونی والا مکان چھوڑ کر ادھر کوٹھی خرید کر شفٹ ہوئے تھے۔" ثریا جہاں کو بھی اسے تپانے کا موقع مل گیا۔

حریم مسکراتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ فیفا بھی اس کی پیروی میں اٹھ گئی حالانکہ ثریا جہاں ابھی مزید نشست چاہتی تھیں۔ تاہم عفیفا کا یہاں مستقل قیام کا سوچ کر مطمئن ہو گئیں۔

اور یہ محض بیس اکیس دن بعد کا واقعہ تھا۔ اس رات مولی پر پھر سے دورے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی مگر مسئلہ صرف یہ تھا کہ امی اور فیفا دونوں سو چکی تھیں۔ ماہیر بھی آفس ورک مکمل کرنے کے بعد سو گیا تھا۔ بس حریم نہ جانے کیوں عجیب سی بے کلی کے باعث سو نہیں پا رہی تھی۔ بیڈ روم میں گھٹن کے باعث وہ برآمدے میں آکر بیٹھ گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد عجیب سی غرغراہٹ کی آواز نے حریم کو چونکا دیا۔ یہ آواز مولی کے کمرے سے آرہی تھی۔ حریم تقریباً" دوڑتے ہوئے کمرے میں آئی تھی۔ مولی بیڈ پر چت لیٹا، آنکھیں بند کیے عجیب سی سرگوشیاں کر رہا تھا تاہم اس کے سینے اور حلق سے غرغراہٹ کا شور ابھر رہا تھا۔

"مولی!" حریم کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔ مگر مولی اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ مگر وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں تو نہ جانے کون کون سا منظر دیکھ رہی تھیں۔

"بھابھی۔" مولی نے بغیر اس کی طرف دیکھے گویا سرگوشی کی تھی۔ شاید وہ اس کے قدموں کی بے آواز چاپ سے اندازہ لگا چکا تھا کہ حریم ہی آئی ہے مگر یہ حریم کی بھول تھی۔ وہ اس کے قدموں کی چاپ سے اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ وہ تو دل کی بند کھڑکی کو کھولے سارے دھندلے منظر دیکھ رہا تھا۔ دیکھے جا رہا تھا۔

"آگئی ہو بھابھی! میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔" آواز پہلے سے کچھ بلند تھی۔ حریم کی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

"میرا انتظار، مگر کیوں؟" حریم اندر کے خوف کو چھپاتے ہوئے بولی۔

"آپ کو کچھ بتانا ہے نا۔ کیا سنو گی میری بات؟" وہ اب بھی چھت کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے ایک دفعہ بھی پلکوں کو جنبش نہیں دی تھی۔

"ہاں، ضرور سنوں گی۔ مگر یہ بتاؤ، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ دھک دھک دھڑکتے دل کو ڈپٹتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بول رہی تھی۔ پہلے تو ایک دفعہ دل میں خیال آیا تھا کہ مولی کو بھاڑ میں جھونک کر خود اپنے کمرے میں بند ہو جائے مگر پھر نہ جانے کون سی طاقت نے اسے روک لیا تھا۔ حریم خود کو بے بس سمجھنے لگی تھی اور پھر خود بخود پائنتی کی طرف بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"میری طبیعت کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں بھابھی! مجھے بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں، میرے اردگرد، آس پاس جو رہتا ہے۔ وہ مجھے کچھ بھی ہونے نہیں دیتا۔ میں نے اس سے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر محبت کی ہے۔ بھلا وہ مجھے کسی تکلیف میں مبتلا کر سکتا ہے۔"

"تمہارے اردگرد کون رہتا ہے؟" حریم کی سانسیں گویا لمحہ بھر کے لیے تھم سی گئیں۔

"مجھے اس وقت یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔" وہ خوفزدہ سی سوچتی چلی گئی۔

"میرے اردگرد جو رہتا ہے۔ میں اس کے عشق کی حد تک محبت کرتا ہوں اور وہ مجھے وصال یار کے جام بھر بھر کے پلاتا ہے۔" نیلی آنکھوں کے گوشے پانی سے بھیگ رہے تھے۔ بھیگتے جا رہے تھے۔ مگر مجال ہے جو آنکھوں کی حفاظت پر مامور پلکوں نے ایک دفعہ بھی رخسار کو چومنے کی کوشش کی ہو۔ وہ سچ مچ کسی اور جہان کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"زمین و آسمان میں محبت سے پیار و الفت کے شادیانے بجتے ہیں۔ بلند بختی اور جوان بختی کے نقیب میرے ہمدم ہیں۔ ہم قدم ہیں کون کہتا ہے، مجھے ادھورے جسم کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ مجھے میرے بنانے والے نے بہت پیار سے بنایا ہے اور میں کیوں نہ اس کا شکر گزار بندہ بنا رہوں۔" اس کے لہجے کا سوز اور گمبھیرتا آج سے پہلے حریم کی سماعتوں نے ہرگز نہیں سنی تھی۔

"اللہ کریم کے تمام ملک ہیں۔ تمام شہر ہیں۔ تمام بستیاں اور علاقے ہیں جو اس کی کریم ذات نے کرہ ارض پر بسائے ہیں اور ان میں بسنے والوں میں کہیں نہ کہیں میرے جیسے لوگ بھی موجود ہیں اور ان کی گھنگھرو سے بندھی زندگی میری آنکھ کی پتلی کے بالکل سامنے ہے اور میں اپنے رحیم رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایک گندی زندگی اور نیچ مقام سے نہیں نوازا۔ میں لوگوں کی گھڑی بھر مسرت اور خوشی کا سبب نہیں بنا۔ میرے قدموں نے رقص و سرود کی محفلوں میں تھرک کر خود کو دو کوڑی کا نہیں کیا۔ ہاں، وصال یار کے دیدار کی امید مجھے حال سے بے حال ضرور کر دیتی ہے۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ میں کچھ ساعتوں کے لیے ایک اور جہاں کے سفر پر نکل جاتا ہوں۔ پھر میرے قدموں کو کوئی روک نہیں سکتا۔ میرے دل کی دھڑکنوں کو کوئی اپنے اختیار میں نہیں کر سکتا۔ میں ماضی، حال اور مستقبل سے بے نیاز ہو جاتا ہوں۔ میری روح میرا جسم اور میری ہر سانس اس کے نام کا ورد کرتی ہے۔ رب رحیم نے مجھے عزم راسخ سے نوازا ہے، میرے حوصلے اور ہمت کبھی ٹوٹی نہیں۔ مجھے ایک اور زندگی اگر عطا کر دی جائے۔ مجھے اختیار بھی دیا جائے تو میں خواجہ سرا ہی بننا چاہوں گا۔ میں اگر عام انسان ہوتا۔ پرفیکٹ ہوتا، ہر لحاظ سے مکمل ہوتا تو شاید قرب عشق کو اتنی گہرائی سے محسوس نہ کر پاتا۔ یا پھر میرا دل عشق یار سے اس قدر بھرا بھرا بھی نہ ہوتا۔" حریم نے دیکھا تھا۔ شفاف موتیوں جیسے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

"تم نے بھی کبھی کسی سے محبت کی ہے نیب۔" حریم کی آواز بھی سرگوشی نما تھی۔

"محبت۔" نیب شاید مسکرایا تھا۔

"میں محبت کی آخری سرحد پر کھڑا ہوں بھابھی! ابھی تو منزل عشق کی شروعات ہے۔ اس سفر کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔ اک انوکھی سی لذت اور سرور ہے۔ اس زندگی سے اچھی کوئی زندگی نہیں۔ جو میں باطن کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔"

"تم نے کس سے محبت کی ہے نیب! کون ہے، جو تمہارے آس پاس رہتا ہے؟" حریم کا دل گویا معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔

"وہ جو جہانوں کا رب ہے۔ جس کے قبضہ قدرت میں سب مخلوقات کی جان ہے اور میرے دل نے اس کی محبت کی لذت کو محسوس کیا ہے۔ میں نے کسی سے سنا تھا یا شاید کہیں پڑھا تھا یا پھر کسی نے عالم خواب میں مجھ سے کہا تھا کہ "مصائب اور وسوسے اے میرے دل! ہر طرح سے تجھ پر حملہ آور ہوں گے اور تیرا رب تجھے محفوظ رکھتا ہے۔ تیری کفایت کرتا ہے۔ تو دنیاوی زندگی کی طرف متوجہ ہو کر اپنے رب سے شکوہ مت کرنا۔" سو میں نے شکووں کے دفتر پھاڑ کر ریزہ ریزہ کر دیے ہیں۔" حریم نے دیکھا تھا۔ نیب کی متوازن سانس اب پھولنا شروع ہو چکی تھی۔ یقیناً" دھیان و گیان کے بعد اس پر وجد کی کیفیت طاری تھی اور وہ عربی زبان میں کچھ شعر پڑھ رہا تھا۔ حریم نے یہ شعر پہلے بھی کہیں پڑھ رکھے تھے یا پھر سن رکھے تھے تاہم ان کا ترجمہ نرم دل والوں کو خون کے آنسو رلا دیتا تھا۔ مولی کی زبان اب لکنت زدہ ہو رہی تھی تاہم اس کی آواز میں اب بھی بلا کا سوز تھا۔

"اے میرے دل! اللہ تعالیٰ نے تجھے رنج و غم، دکھ اور ہر طرح کے مصائب سے، جس کا تو شکار رہا ہے۔ ہر طرح کی اس اذیت سے، جس میں تو مبتلا رہا ہے۔ اپاہج اور نامکمل اس زندگی سے جسے تو بوجھ سمجھتا رہا ہے۔ اے میرے دل! اللہ تعالیٰ نے تیری کفایت کی۔ تجھے اندھیاری رات میں تجھے روشن راہوں کا مسافر بنایا ہے۔ اے میرے دل! تو شاد ہو جا بھلا اب تجھے کس چیز کی تمنا رہی ہے۔ تو غم کے آنسو نہ رو تو تکلیف پر

صبر کر۔ تجھے وحشتوں سے نکالنے والی ذات پاک موجود ہے۔ جس نے تیری روح کو بھی پاک صاف کر دیا اور اے میرے دل! تجھے ہر طرح کے وسوسے سے آزاد کردیا ہے۔ اے میرے دل! تو شام کا ستارہ ہے یا صبح پرنور کا سب سے روشن تارہ۔ جو آسمان کے ستاروں کی طرح جگمگاہٹ اور روشنی رکھتا ہے اور جس کی تابناکی سے آسمان کے حسن میں اور بھی نکھار آجاتا ہے۔" موبی اب خاموشی کی طرف گامزن ہو رہا تھا۔ مگر حریم کے لبوں پر مچلتے سوال اس کی خاموشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

"موبی! میرے دو تین سوالوں کے جواب دو گے؟"

"ہاں 'بولو نا۔" کھلی آنکھوں میں کوئی بھی ایسا تاثر تو ہرگز نہیں تھا۔ جسے پڑھنے کے بعد حریم تھوڑا سا بھی مطمئن ہو جاتی۔

"علم الیقین بھلا کیا ہوتا ہے؟" وہ بہت سادہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ محض اس لیے کہ دنیاوی اور باقاعدہ طور پر دینی تعلیم سے موبی ہمیشہ نابلد رہا تھا۔ اس نے برائے نام علم حاصل کر رکھا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایک بھی ڈگری نہیں تھی۔ حریم بس اس کے جواب سے 'اس کی موجودہ علمی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ موبی کے شعور اور لاشعور میں علم کے معاملے میں کتنا فرق اور فاصلہ ہے۔

"علم الیقین 'یعنی یقینی کا علم؟" موبی نے بغیر رکے کہنا شروع کیا تھا۔

"میں نہ کوئی مفتی ہوں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں نہ ہی مذہبی اسکالر ہوں۔ منیب عالم تو بہت حقیر سا ایک آدمی ہے۔ بلکہ آدمی کے مقام سے بھی بہت نیچے تاہم علم الیقین کا علم تو ضرور رکھتا ہے۔ یہ وہ علم ہے۔ جو غور و فکر 'سوچ و بچار اور دلیل سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک ہوتا ہے عین الیقین 'یہ وہ یقین ہے جو بذریعہ کشف 'اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ عطا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک حق الیقین ہوتا ہے۔ یہ وہ یقین ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ حقیقی حاصل ہو جائے اور انسان اپنے وجود سے بے خبر ہو جائے' دراصل یہی مقام وصل ہے۔ جس کی مجھے امید ہے۔ جو کبھی مجھے بھی ضرور حاصل ہو گا مگر اس کے لیے طویل ریاضت کا سفر درکار ہے۔"

"ان گھڑیوں میں تم نے اور کیا دیکھا تھا؟" حریم گویا لحہ بھر میں بالکل بے خوف ہو گئی تھی۔

"میں نے بھلا کیا دیکھا؟" موبی کا انداز پرسوچ تھا۔

"میں نے دیکھا ہے۔ روپ اور دھوپ کو اور جو دھوپ ہے وہ روپ کو چاٹ جاتی ہے۔" موبی کی آواز اب ڈوبتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا گویا بہت دور سے سنائی دے رہی ہے۔

"کالج کے شہر کی داسی زنجیریں توڑ رہی ہے۔ قسمیں توڑ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک طوفان کی لہریں ہیں۔ اس طوفان کا اگر ایک بھی بگولا اٹھ گیا تو ہر شے تہس نہس ہو جائے گی۔ دعا کرو 'یہ آندھی کے تیز جھکڑ کسی اور سمت نکل جائیں۔ تمہارا دل اور تمہارا گھر محفوظ رہے۔ دعا کرنا بھابھی! محبت میں اگر کوئی دل ہار جائے تو اسے صبر آجائے اور جسے صبر نہیں آتا۔ وہ جبر کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس کا دل سخت ہو جاتا ہے۔ پتھر ہو جاتا ہے اور پتھر کسی کے درد کو محسوس نہیں کر سکتا۔ اس پتھر کی ضرب 'جس جس دل پر پڑے گی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ پاش پاش ہو جائے گا۔ بعض لوگ محبت میں فنا ہو کر موم کی طرح نرم ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو محبت میں فنا ہو کر فولاد بن جاتے ہیں اور پھر دوسروں کی خوشی اور شادمانی بھی قائم دائم نہیں رہنے دیتے۔ بس فنا کر دیتے ہیں۔" موبی کی آنکھیں اب خشک ہو رہی تھیں۔ یوں نظر آرہا تھا گویا اک بنجر زمین ہے۔ جس پر ہریالی کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔

"موبی! چپ کیوں ہو گئے ہو؟ بولو نا۔" حریم کے پورے وجود میں بے چینیاں سی اتر گئی تھیں۔ دل کی حالت عجیب تر تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ موبی کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ وہ سب کچھ اس کے ساتھ برتنے والا تھا۔ برتا جا رہا تھا۔

"رنگین ملبوسات 'پائل اور جھانجھریں ایک دفعہ پھر میرا دم گھونٹنے کے لیے میرے قریب قریب ہیں۔ بہت قریب آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔" اب موبی پر ہمیشہ والی غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اب وہ گہری پرسکون نیند سونا چاہتا تھا۔ اور جب اس نے پلکیں اچھی طرح سے موندلی تھیں۔ نیند اس پر مکمل طور پر حاوی ہو چکی تھی تب حریم سنبھل کر اس کے قریب سے اٹھ گئی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے موبی کے معصوم 'بے حد پرسکون چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ عجیب سی روشنی نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے اور اٹھی ہوئی ستواں ناک کے قریب ننھا سا تل گویا مسکرا رہا تھا۔ لہریے دار بال پیشانی سے چپک گئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ ایک قیامت کی منزل سے گزرا تھا۔

اس کا پورا وجود پسینہ پسینہ تھا۔ سفید رنگ کی شرٹ پسینے سے یوں تر تھی گویا بالٹی میں بھگو کر اس نے پہن رکھی تھی۔

یوں ہی حریم نے طائرانہ سی نظر سے کمرے کو دیکھا تھا۔ موبی کا مخصوص جائے نماز ایک کونے میں ہمیشہ کی طرح بچھا ہوا تھا۔ تسبیح بھی رکھی تھی۔ نہ جانے وہ نماز کب پڑھتا تھا۔ حریم نے تو آج تک اسے کبھی بھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ ایسا ہی ایک جائے نماز پرانے گھر میں ایک کونے میں بچھا ہوا نظر آتا تھا۔ حریم نے پہلے بھی موبی کے کمرے میں بچھے اس جائے نماز کو دیکھ کر کوئی سوال نہیں کیا تھا اور اب بھی اس گھر میں شفٹ ہونے کے بعد اس نے راحت بیگم کے کہنے پر جائے نماز موبی کے کمرے میں بچھا دیا تھا۔ ایک بوتل میں آب زم زم بھی رکھا ہوا نظر آتا تھا مگر اس بوتل کا پانی بھی جوں کا توں تھا۔ موبی کا کمپیوٹر 'کتابیں اور رسائل وغیرہ بھی رکھے ہوئے تھے۔

اس کمرے میں ایسا کچھ بھی تو نہیں تھا جو موبی کو صوفی یا ولی ظاہر کرتا۔ مگر کچھ تو تھا اس میں جو سب سے انوکھا اور الگ تھا۔ غیر معمولی اور عجیب تر تھا۔ کچھ پوشیدہ تھا کچھ ظاہر ہو رہا تھا۔ کچھ ایسے بھید بھی ہوتے ہیں جن پر سے کبھی پردہ نہیں اٹھایا جاتا وہ راز ہمیشہ راز ہی رہتے ہیں۔ مگر حریم ان پانچ چیزوں میں بری طرح سے الجھ رہی تھی۔ وہ پانچ چیزیں اس کے ارد گرد بکھری نہیں تھیں۔ وہ پانچ چیزیں اس کی نگاہ کے سامنے بھی نہیں تھیں۔ ان پانچ چیزوں کے پانچ سوال اس کے دل میں ابھر رہے تھے۔ اور ان کے جواب دے کر حریم کے دل کو مطمئن کرنے والا گہری پرسکون نیند سو رہا تھا۔ وہ منیب عالم سے وصل اور زہد کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے تکبر اور رضا کے بارے میں سوال کرنا چاہتی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ بقا اور فنا میں بھلا کیا فرق ہے؟ اور حریم 'ماہیر عالم اس سے آخری سوال یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کالج کے اس شہر کی "قیدی" بھلا کون ہے؟ کیا زوباریہ درانی؟

☆ ☆ ☆

عفیفا کی آمد کے ساتھ ہی حریم کے گھریلو کاموں کا بوجھ خود بخود تقسیم ہوتا چلا گیا تھا۔ وہ بھی حریم کی طرح علی الصبح اٹھنے کی عادی تھی۔ معمول کی عبادت کے بعد دونوں ہی مل جل کر جھٹ پٹ ناشتا بنا لیتی تھیں۔ اسی طرح عفیفا آفس جانے سے پہلے غیر محسوس طریقے سے صفائی ستھرائی میں بھی حریم کا ہاتھ بٹاتی چلی جاتی تھی۔ اکثر تو وہ صبح کے وقت ہی دوپہر کے سالن کی ابتدائی تیاری بھی کر دیتی تھی۔

چھٹی والے روز اگر عفیفا مشین لگا لیتی تو پھر حریم کو گھر بھر کے کپڑے استری کرنے میں کافی آسانی ہو جاتی تھی۔ سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ عفیفا کی آمد کے ساتھ ہی راحت بیگم کا مزاج بے حد شگفتہ ہو گیا تھا۔ بات بے بات جلنا' کلسنا اور طنز و طعنے سے کافی پرہیز کر رہی تھیں۔ ان دنوں میں تو وہ اچھی خاصی حریم پر بھی مہربان ہو رہی تھیں۔ اس کا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگی تھیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ زمیلہ اپنے شوہر کے پاس بخیر و خوبی پہنچ چکی تھی اور جانے سے پہلے وہ حریم سے اپنے گزشتہ تلخ و شیریں رویے کی معذرت بھی کرتی رہی تھی اور حریم

نے اسے کھلے دل کے ساتھ معاف بھی کر دیا تھا کہ وہ دل میں کینہ رکھنے کی عادی بھی نہیں تھی۔

ویسے بھی حریم، راحت بیگم اور زمیلہ کے مزاج کو اچھی طرح سے سمجھ چکی تھی۔ وہ دل کی صاف اور زبان کی ذرا تلخ صرف اس لیے تھیں کہ حالات نے انہیں تلخیوں کی سوغات دی تھی۔ والد کی وفات، موبی کی طرف سے ہروقت کی کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت اور پھر راحت بیگم کی بیماری نے ازمیلہ کو بھی ذہنی طور پر خاصا پسماندہ کر دیا تھا۔

یکایک ہی حریم کو محسوس ہونے لگا تھا کہ پچھلے کچھ عرصے سے دل و دماغ پر چھایا غبار اور گھٹن چھٹنے لگی ہے۔ اب زندگی میں آسانیوں کی شروعات ہو گئی تھی اور اس کا سہرا کبھی تو عفیفا کے سر چلا جاتا اور کبھی آنے والے نومولود کو بلند بخت سمجھا جاتا۔

ماہیر کو جو ٹرمنیشن لیٹر پکڑایا جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں غائب ہو چکا تھا اور اس کے بدلے میں جو نیا ایگری منٹ منظور ہوا تھا اور ماہیر کی ذہانت، کوشش اور محنت کے بل بوتے پر، اس نئے ایگری منٹ کی منظوری کی بے تحاشا خوشی کی بدولت ماہیر کی پروموشن ہو گئی تھی اور نا صرف پرموشن کی گئی تھی بلکہ اس کے ٹرانسفر آرڈر بھی کینسل ہو چکے تھے۔ کمپنی نے اس گاڑی کی سہولت کے ساتھ بہت ہینڈسم بونس بھی دیا تھا۔ سو اس خوشی کو ماہیر نے بہت اچھی طرح سیلبریٹ کیا تھا۔ پی سی میں کینڈل لائٹ ڈنر حریم کے حصے میں آیا تھا۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ ماہیر کے ساتھ اس نے ہوٹلنگ کی تھی اور اس کے بعد ماہیر نے اسے بے حد شاپنگ کروائی۔ بہترین، نئے نکور، انتہائی نفیس ملبوسات لے کر دیے تھے۔ ایک نفیس سا گولڈ کا بریسلیٹ اس کی کلائی میں سج گیا تھا۔ ماہیر بھی گویا اپنے دل کی ساری خوشی کو کھول کھول کر حریم پر لٹائے جا رہا تھا۔

آفس کی طرف سے اسے دس دن کے لیے دوبئی جانا تھا اور اس دفعہ بھی وہ زبردستی حریم کو ساتھ لے کر گیا تھا۔ وہ بے تحاشا خوفزدہ تھی اور ہوائی سفر سے تو اور بھی خوفزدہ ہو رہی تھی مگر ماہیر نے اس کی ایک نہیں سنی تھی اور کمال کی بات یہ تھی کہ راحت بیگم نے بھی حریم کو جانے سے نہیں روکا تھا۔ بلکہ انہوں نے اسے دعاؤں کے سائے تلے رخصت کیا تھا۔

جب وہ اپنی زندگی کے یادگار بہترین دن دوبئی میں گزار کر واپس آئی تو راحت بیگم نے اس کی بخیریت واپسی کی خوشی میں نظر اتاری تھی۔ صدقہ دیا تھا اور میٹھی چیز پکا کر نیاز بانٹی تھی۔ حریم کو ابھی تک گویا یقین نہیں آیا تھا کہ وقت سچ مچ اس پر مہربان ہو چکا ہے۔

ماہیر نے پہلی فرصت میں اوپر والے پورشن کی تعمیر و تزئین شروع کروا دی تھی۔ کچن، باتھ سفید ٹائلوں سے جگمگا اٹھے تھے۔ خصوصاً" کچن تو بالکل جدید طرز کا بنوایا تھا۔ حتیٰ کہ سارا فرنیچر بھی بدلوا دیا تھا۔ بیڈ رومز سارے کارپٹڈ تھے۔ دو نئے اے سی بھی لگوائے تھے۔ حریم نے شاہنواز سے گملے بھی منگوا لیے تھے۔ بالکونی نما صحن کی ریلنگ تک نئی لگوائی تھی۔

گھر کی صفائی ستھرائی اب اور بھی آسان ہو چکی تھی۔ مشکلات کے ایک دور کا اختتام ہو چکا تھا۔ گھر کی تزئین و آرائش کے بعد روٹین لائف پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ مگر اس روٹین میں اب کوئی افراتفری نہیں تھی۔ کوئی مشکل نہیں تھی۔ تھکن تو گویا چھو کر بھی نہیں گزرتی تھی۔

اتوار کے روز عفیفا کو بھی چونکہ چھٹی ہوتی تھی اور ماہیر بھی گھر میں ہوتا تھا۔ سو لاؤنج میں خاصی چہل پہل رہتی۔ اکثر شاہنواز بھی اوپر آدھمکتا تھا۔

اس دن بھی وہ اور فیفا لنچ کی تیاری کر رہی تھیں۔ شاہنواز اور ماہیر لاؤنج میں شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے تھے۔ راحت بیگم نیچے ثریا خالہ کے پاس گئی تھیں۔ موبی ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں بند تھا۔

"فیفا! تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟" کٹے ہوئے کریلوں پر نمک چھڑکتے ہوئے حریم نے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت کچن میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

"کیا سوچنا ہے بھلا۔" فیفا چکن فرائی کرنے کے

لیے تیل کڑاہی میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"زندگی بھر کیا ایک ناقابل بھروسہ آدمی کی خاطر جوگ لوگی۔ تمہیں تو اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ سہیل جیسے کانوں کے کچے مرد کی اصلیت پہلے سے ہی کھل گئی ہے۔" حریم کا انداز ناصحانہ تھا۔

"میں تو منتظر ہوں کہ وقت بھلا کیا کیا دکھاتا ہے۔" فیفا نے گہرا طویل سانس کھینچ کر کہا۔

"وقت کی فطرت ہے کروٹیں بدلنے کی۔ کبھی دکھ کی تو کبھی سکھ کی۔۔۔ ٹھہرا ہوا پانی بھی بدبودار ہو جاتا ہے فیفا! زندگی کو بدبو کا جوہڑ بننے سے بچانے کی خاطر کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔" حریم ساتھ ساتھ کریلوں کے لیے مسالا بھی تیار کر رہی تھی۔ آج لنچ پر بھی خصوصی اہتمام کرنا تھا۔ اکثر چھٹی والے روز وہ ماہیر کی پسند کا مینیو ترتیب دیتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بہت سادہ خوراک کا شوقین ہے۔

"دیکھتے ہیں کہ بھلا کون زندگی کے اک نئے موڑ پر ٹکراتا ہے۔" فیفا کا لہجہ ہلکا پھلکا سا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی شرارت کا تاثر تھا۔

"ٹکرانے والے تو کب کے راستے میں کھڑے ہیں۔ آپ ہیں کہ برابر سے اجنبیوں کی طرح نکل جاتی ہیں۔" شاہنواز نہ جانے کب کچن کے چوکھٹے میں آ کھڑا ہوا۔

"تم میرے منہ نہ ہی لگا کرو۔" فیفا سر سے لے کر پیر تک سلگ اٹھی۔ وہ شاہنواز کے اوپر نیچے کے پھیروں سے پہلے ہی عاجز رہتی تھی۔

"چپکے چپکے کسی کی گفتگو کو سننا بڑی غیر اخلاقی حرکت ہے۔"

"جناب! میں کن سوئیاں لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ آپ خوامخواہ غلط فہمی کا شکار مت ہوں۔ میں تو پانی لینے کے لیے آیا تھا۔ آپ کا رقت انگیز لہجہ سن کر رہا نہیں گیا۔ سو ٹکرانے کی آفر کر دی ہے۔" شاہنواز شرارت بھری مسکان سجا کر بولا۔

"مجھے لگتا ہے۔ تمہیں اپنی بے عزتی اور وہ مار بیکسر بھول چکی ہے۔ کہو تو دوبارہ یاد کروا دوں۔" فیفا سلگ کر بولی۔ جواباً" شاہنواز نے بھی گویا خوب ہی لطف لیا تھا۔ پہلے پہل فیفا کم ہی شاہنواز کی باتوں پر ردعمل دکھاتی تھی۔ مگر وہ بھی تو شاہنواز تھا۔ اس حد تک زچ کر دیتا تھا کہ مقابل خود بخود بھنا کر بولنا شروع کر دیتا۔ اور وہ اپنی بے تکلفانہ عادت کے باعث خود بخود مقابل کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا مگر یہاں تو معاملہ بھی دوسرا تھا۔ عفیفا سے نا صرف بچپن کی جان پہچان تھی بلکہ ایک زمانے میں شاہنواز فیفا کا پڑوسی بھی رہ چکا تھا۔ تاہم اس وقت بھی فیفا اس بلائے جان شاہنواز سے عاجز ہی رہتی تھی۔

"یاددہانی کی ضرورت تو نہیں تھی۔ پھر بھی آپ کا بہت بہت شکریہ۔" وہ فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر ماہیر کی پکار سن کر باہر نکل گیا تھا۔

"یہ شاہنواز بھی نہ جانے کیا چیز ہے۔" حریم کو ہنسی آ گئی۔

"اس کی باتوں میں مت آنا حریم! یہ آدمی بلا کا جھوٹا ہے۔" فیفا ابھی تک بھنا رہی تھی۔

"اور اس کی بے شرمی دیکھو۔ کیسے ڈھٹائی کے ساتھ تین وقت کا کھانا کھا کر جاتا ہے۔"

"وہ کہاں آتا ہے بے چارا۔ ماہیر خود ہی بلا لاتے ہیں۔" حریم فوراً" اس کی فیور میں بولی۔

"بے چارا نہیں، یہ تو پورا کمینہ ہے۔ بچپن سے اسے دوسروں کے گھروں میں روٹیاں کھانے کی عادت ہے۔" فیفا جل بھن کر رہ گئی۔

"اور تمہیں روٹیاں گننے کی عادت ہے۔" شاہنواز بھی چپ نہیں رہ سکتا تھا۔

"تم پھر بوتل رکھنے کے بہانے آئے ہو۔" فیفا تلملائی۔

"آپ کیوں خوش فہمیوں کے سمندر میں غوطے لگا رہی ہیں محترمہ! میں تو بغیر کسی بہانے کے بھی کچن کے چکر اکثر لگاتا رہتا ہوں۔" وہ مزے سے بولا۔

"وہ تو مجھے پتا ہی ہے۔ کچن میں تمہارا بس چلے تو بستر ہی لگا کر سو جاؤ۔" فیفا چکن کی طرف متوجہ تھی اور حریم کریلوں کی طرف اور شاہنواز کا سارا دھیان ان

دونوں کی طرف تھا۔ کیونکہ اتفاقاً" چکن کریلے بھی اس کی پسندیدہ ڈشز میں شمار ہوتے تھے۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ شاہنواز کو اتنا بھی پیٹو مت سمجھو۔" ماہیر بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

"مجھے لگتا ہے آپ کا آج گرمی کھانے کا ارادہ ہے۔" حریم مسکراتے ہوئے ٹونٹی کھول کر برتن دھونے لگی۔

"میں تو شاہنواز کو لینے آیا ہوں۔" ماہیر نے شاہنواز کے کندھے پر دھپ لگا کر کہا۔

"اور شاہنواز اکیس توپوں کی سلامی کے بغیر نہیں جائے گا۔" شاہنواز بھی مسکان لبوں میں دبا کر چکا۔

"مت اتاولے ہو میری جان! ہر طرح کی سلامی تمہیں دیں گے۔ بس کچھ اور صبر کرلو۔"

"اور کتنا صبر کروں؟ اب نہیں ہوتا مجھ سے صبر عظیم۔ میں نے شادی کا لڈو کھا کر پچھتانا ہے۔" شاہنواز بچوں کی طرح مچلا۔

"تو تم پچھتانے والا لڈو لازمی کھانا چاہتے ہو۔" حریم کو ہنسی آگئی۔

"میرا خیال ہے کہ اس لڈو کے علاوہ کوئی اور لڈو نہیں ملتا۔" شاہنواز کا انداز پر سوچ تھا۔

"آپ کا خیال سو فیصد درست ہے۔" ماہیر خوبانیوں سے بھری ٹوکری اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔

شاہنواز بھی سوچتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ عفیفا نے گویا سکھ کا سانس لیا تھا۔ تبھی زمیلہ کی کال آگئی۔ حریم فون اٹھا کر نیچے چلی گئی تھی کہ زمیلہ نے راحت بیگم سے بات کرنا تھی۔ جب واپس آئی تو فیفا کریلوں کو مسالے میں بھوننے کے بعد دم دے رہی تھی۔

ایسے ہی باتوں باتوں میں زمیلہ کا ذکر چھڑ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں ہمیشہ ہی حریم کو محسوس ہوتا تھا کہ زمیلہ اور فیفا کے درمیان اجنبیت کی دیوار سی موجود ہے۔ یہ اجنبیت نو سال پہلے ان دونوں کے درمیان حائل ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید زوباریہ درانی ہی تھی۔ اور آج پھر بغیر کسی خواہش کے زوباریہ کا قصہ بھی خود بخود چھڑ گیا۔

"فیفا! تمہاری کبھی زوباریہ سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی؟" حریم نے بلا ارادہ ہی پوچھ لیا۔ فیفا ایک دم ٹھٹک سی گئی تھی۔

"نہیں۔" اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

"اور زوباریہ نے بھی تم سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔" وہ ہنوز نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"اور ماہیر سے بھی کبھی اس نے رابطہ نہیں کیا؟ مقام حیرت کیا تم سمجھتی ہو کہ زوباریہ کی محبت دودھ کے ابال جیسی تھی۔" حریم تو ایسے ہی بات برائے بات کر رہی تھی۔ اس گفتگو کا کچھ خاص مقصد بھی نہیں تھا مگر بعض دفعہ بہت عام سی باتیں بھی بری طرح سے ٹھٹکا دیتی ہیں۔

"نہیں۔" وہ ایک مرتبہ پھر نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"تو پھر کیا؟" حریم نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ فیفا کے چہرے پر آن کی آن میں سنجیدگی چھا چکی تھی۔ گہری، خاموش اور بھید بھری سنجیدگی۔

"زوباریہ کی محبت کو ناپنے والا میرے پاس کوئی پیمانہ نہیں۔ اس نے محبت نہیں، شاید عشق کیا تھا۔" فیفا کے خاموش لب لمحہ بھر کے لیے پھڑپھڑائے تھے۔

"تھا سے کیا مراد؟ کیا یہ عشق، محبت ماضی کا حصہ بن چکے ہیں؟" نہ جانے کیوں حریم اپنے وسوسوں کے شکار دل کو تسلی ودلاسے کا سہارا دینا چاہتی تھی۔

"شاید ہاں۔" فیفا کا لہجہ اب بھی مبہم سا تھا۔

"کیا تمہاری کبھی ماہیر کے ساتھ اس موضوع پر بات ہوئی ہے؟"

"نہیں۔"

"تم نے کبھی زوباریہ کے بارے میں ماہیر سے پوچھا ہے؟" فیفا سر جھکائے میز کی سطح کھرچتے ہوئے بولی۔

"کبھی نہیں۔"

"تمہیں خبر ہے کہ زوباریہ اب کہاں ہے؟" فیفا کے لہجے میں عجیب سا سناٹا تھا۔ حریم کا پھر سے نفی میں

سر ہلتا چلا گیا۔

"نہیں۔ ہوں۔۔۔" فیفا نے محض ہنکارا بھرا تھا۔ تاہم حریم کچھ اور بھی الجھ گئی۔

"کیا تم جانتی ہو کہ زوباریہ کہاں ہے؟"

"میں جانتی ہوں۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد فیفا نے دھیمی آواز میں کہہ دیا تھا۔

"تو پھر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

"بس ایسے ہی۔" فیفا کا لہجہ دھیما سا تھا۔ کافی بھرا بھرا سا بھی۔

"کیا اس لیے نہیں بتایا کہ میں ماہیر سے یا پھر زمیلہ سے اس بات کا ذکر نہ کردوں؟" حریم بھی دبی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ اس لیے بھی کہ لاؤنج میں موجود ماہیر اور شاہنواز تک ان کی آواز نہ پہنچ جائے۔

"ایسی بات نہیں۔" فیفا نے لب کچلتے ہوئے کہا تھا۔

"ماہیر اور زمیلہ بھی جانتے ہیں۔"

"کیا جانتے ہیں؟" حریم بے چین سی ہوگئی۔

"زوباریہ کے بارے میں۔"

"تو پھر مجھے بھی بتادو۔ کیا اس کی شادی ہوچکی ہے۔" حریم نے پہلے جیسی بے قراری سے پوچھا تھا۔

"زوباریہ نے شادی نہیں کی۔"

"کیا ابھی تک نہیں کی؟ نو، دس سال ہوچکے ہیں۔ آج کے دور میں کوئی پاگل ہی جوگ لیتا ہے۔" حریم نے عام سے لہجے میں کہا تھا۔ نہ جانے کیوں فیفا پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

"زوباریہ درانی کسی پاگل سے کم نہیں تھی۔ ذرا اپنے دل سے پوچھنا، ماہیر عالم کے لیے جوگی بن سکتا ہے نا۔" وہ فیفا کی بات کے جواب میں کچھ پل کے لیے خاموش رہ گئی تھی۔

"میری خواہش ہے کہ میں زوباریہ کو دیکھوں، اس سے ملوں اور اسے سمجھاؤں کہ وہ ایک لاحاصل سفر کا انتخاب کیوں کرچکی ہے۔" حالانکہ زوباریہ سے ملنے کا اسے کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ تو بس ایسے ہی۔

"تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔" فیفا کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے تھے۔

"کیا زوباریہ ملنا نہیں چاہے گی؟"

"زوبارہ تم سے مل ہی نہیں سکتی۔" فیفا دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کو رگڑ رہی تھی۔

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ زوباریہ درانی مرچکی ہے۔" فیفا نے ایسا لرزا دینے والا انکشاف کیا تھا کہ حریم حق دق ہی تو رہ گئی تھی۔ کئی لمحے تو اس سے بولا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ بس پتھرئی عفیفا کو دیکھے جا رہی تھی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو عفیفا!" اسے ابھی تک گویا یقین نہیں آیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ سو فیصد سچ ہے۔" فیفا اب قدرے سنبھل گئی تھی۔ اسی لیے سلاد کے لیے کھیرے اٹھا کر کاٹنے لگی تاہم حریم سے تو اپنے پیروں پر کھڑے رہنا دشوار تھا۔ تبھی تو وہ اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔

"اور یہ کب کی بات ہے؟"

"نو سال ہوچکے ہیں۔" فیفا کا سر جھکا ہوا تھا۔ حریم اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"وہ طبعی موت سے مری یا پھر حادثاتی؟"

"اس نے تیسری مرتبہ خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی شاید۔۔۔ مگر اس دفعہ کسی کی دعا اور دوا اسے واپس نہیں لاسکتی تھی۔" وہ کھیرا کاٹ چکی تو پھر ٹماٹر اور پیاز کے چھلے بنانے لگی۔ شاید وہ خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی اور وہ اپنی اس کوشش میں کتنا کامیاب تھی۔ وہ تو اس کے چہرے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا۔

"جب وہ مرگئی تو تم لوگوں کو کس نے اطلاع دی؟" نہ جانے کیوں حریم وکیلوں کی طرح جرح کرنے لگی تھی۔

"کیا تم نے زوباریہ کا آخری دیدار کیا تھا؟"

"نہیں۔" فیفا نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"مگر کیوں؟"

"اسے دفن کرنے کے بعد اطلاع دی گئی تھی۔ بلکہ میں نے خود ہی اس کے گھر فون کیا تھا اور مجھے پتا چلا کہ زوباریہ کو مرے ہوئے آج پانچواں دن ہے۔" فیفا نے

اک طویل گہرا سانس خارج کیا۔

"اور ماہیر کا بھلا کیا ردعمل تھا؟" حریم نے کچھ چبھتے لہجے میں پوچھا۔

"ماہیر نے کہا 'جو فصل بوئی جاتی ہے بالآخر کٹائی بھی اسی کی ہوتی ہے۔ زوباریہ اپنا کیا بھگت رہی ہے۔ جس قبر میں اسے اتارا گیا ہے۔ دراصل وہ قبر خود ہی زوباریہ نے اپنے لیے کھدوائی تھی۔"

"تم ماہیر کے اس رویے کو بھلا کیا کہتی ہو؟" حریم کی نگاہوں میں بے چینیوں کے عذاب اتر آئے تھے۔ آنکھوں میں الگ سے ریت چبھ رہی تھی۔

"حق بجانب۔" فیفا نے دو لفظوں میں بات سمیٹی۔

"کیا وضاحت کرو گی۔" حریم کا لہجہ بلا کا ملتجیانہ تھا۔

"زوباریہ نے خود اپنے ساتھ ظلم کیا تھا۔ اسے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ محبت میں پاگل ہو رہی تھی۔ جبکہ دوسری طرف ماہیر کے محسوسات اس کے لیے قطعاً" مختلف تھے۔ وہ اسے اچھے کلاس فیلوز اور دوستوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ زوباریہ نے جو کچھ بھی کیا تھا۔ یہ خالص اس کا اپنا بھگتان تھا۔ ماہیر کے ہاتھ اور دل کے ساتھ ساتھ ضمیر بھی مطمئن ہے' صاف ہے۔ وہ ایک جنونی کی جنوں خیزی کو محبت تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس کے نزدیک محبت ایک الگ سا سبجیکٹ تھا۔ جسے سمجھنا کسی پاگل کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ماہیر کے نزدیک محبت کی کیمسٹری الگ ہی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہتا تھا کہ محبت تو یہ ہے اگر حریم مجھے کہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے اور میں ماہیر عالم اس کے راستے سے ہٹ جاؤں تو میں اللہ کی قسم' حریم کے دل کی خوشی کی خاطر اپنے دل کی خوشی کو قربان کر سکتا تھا۔

محبت قربان نہیں ہوتی بلکہ قربانی مانگتی ہے۔ ایثار چاہتی ہے۔ کسی کو دل میں بسانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نا صرف متکبر ہو جاؤ بلکہ اپنے سے وابستہ رشتوں کو بھی ذلیل کرنا شروع کر دو۔ انہیں مرجانے کی دھمکی سے رات دن خوفزدہ کرنا محبت کی کون سی قسم ہے۔ اپنے پیاروں کو ستانا' محض کسی اجنبی کی خاطر' اس کے حصول کی خاطر' میرے نزدیک یہ محبت نہیں۔ سراسر خود غرضی ہے۔" فیفا کے وضاحتی بیان نے حریم کو اندر تک ٹھنڈا ٹھار کر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس پل حریم کو ماہیر عالم پر گویا ٹوٹ ٹوٹ کے پیار آیا۔

"زوباریہ کی موت کے ساتھ اس کی جنونی محبت کی یہ داستان بھی خود بخود بند ہو گئی تھی۔" فیفا نے گویا ٹھنڈی آہ بھری۔ اسی پل فون کی گھنٹی نے حریم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ فیفا اپنا کام ختم کر کے کچن سے باہر نکل گئی تھی۔ حریم نے سیل آن کر کے کان سے لگایا تھا۔ اسکرین پر وہ حانی کا نمبر تو دیکھ ہی چکی تھی۔ حانی نے چھوٹتے ہی ہمیشہ کی طرح شکوہ کیا۔

"کبھی ایک فون کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ نہ جانے کس دنیا میں رہتی ہو تم۔"

"تو تم ہی کبھی یاد کر لیا کرو۔" حریم نے ہنس کر اس کا شکوہ سنا۔

"میں ہی تو کرتی ہوں۔ تم نے کب ایک کال کرنا بھی گوارا کیا ہے۔ کبھی بوا اور بابا کا حال ہی پوچھ لیا کرو۔" حانی سخت خفا ہو رہی تھی۔

"اچھا' بتاؤ نا۔ بابا کی طبیعت کیسی ہے؟ اور بوا کے موڈ کی بھی سناؤ۔" حریم نے پیار سے اسے پچکارا۔

"رہنے دو بی بی! تمہیں ہمارے حال سے کیا لینا دینا۔" وہ تاسف سے بول رہی تھی۔

"دل تو نہیں کرتا' تمہیں فون کرنے کو مگر۔۔۔"

"تو پھر کیوں کرتی ہو۔" حریم نے ہنسی ضبط کر کے پوچھا۔

"زرجان بھیا کہتے ہیں۔ حریم کا حال احوال پوچھ لیا کرو۔" حانی بے نیازی سے بولی تھی۔ جبکہ حریم تھم سی گئی۔

"زرجان آتا جاتا ہے کیا؟"

"تو اور کیا۔۔۔ وہ تمہاری طرح بے وفا تھوڑی ہیں۔" حانی لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔

"اچھا جی! میں بے وفا ہی سہی۔ یہ بتاؤ' بابا چیک اپ تو کروا رہے ہیں نا۔" اس کی آواز میں تفکر کی نمی تھی۔

"ہاں' زرجان بھیا باقاعدہ ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتے ہیں۔"

"ایک بات کہوں حانی! برا تو نہیں مانو گی؟" حریم نے کچھ سوچ کر دھیمی آواز میں کہا۔

"برا ماننے والی بات ہوئی تو ضرور ناراض ہو جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر میں نہیں کہتی۔" حریم نے بھی جتا کر کہا تھا۔ وہ حانی کی متجسس طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔ جب تک اس سے اگلوا نہ لیتی اس نے چین نہیں لینا تھا۔

"بولو نا۔۔۔ بتا بھی چکو۔" وہ بے صبرے پن سے بولی۔

"حانی! پلیز غصہ مت کرنا۔" حریم نے ملتجیانہ کہا تھا۔

"بات تو بتاؤ۔" حانی اور بے چین ہوئی۔

"زرجان سے کہنا ہمارے گھر مت آیا کرے۔" بالآخر اس نے سوچ سوچ کر کہہ ہی دیا۔ حانی بھی کچھ پل کے لیے چپ سی ہو گئی۔ پھر جب بولی تو اس کا لہجہ خاصا کٹیلا تھا۔

"ہائے داوے' زرجان بھیا تمہارے گھر میں تو نہیں آتے اور جس گھر میں وہ آتے ہیں۔ وہ گھر ان کے بابا کا ہے۔ آپ روکنے والی کون ہوتی ہیں۔"

"تم غصہ کر گئی ہو نا۔" مریم کو تاسف نے گھیر لیا۔

"غصہ کیا نہیں پیا ہے میں نے۔ اگر تم میرے سامنے اس وقت موجود ہوتیں تو میں نے تمہارا سر پھاڑ دینا تھا۔" حانی کے ارادے خاصے خطرناک تھے۔

"اوف' کتنی ظالم ہو چکی ہو تم حانی۔" حریم نے مصنوعی جھرجھری لی۔

"ویسے اسلام آباد والوں کی کوئی خیر خبر ہی سنا دو۔" اب وہ حانی کو چھیڑ رہی تھی۔

"محسن کا بچہ پاس ہو گیا ہے اور اب خیر سے جاب کی تلاش جاری ہے۔" فی الفور حانی کا موڈ بھی بدل گیا تھا۔

"پاس کیسے ہو گیا! لگتا ہے' اس دفعہ۔۔۔ نقل وقل تو ضرور۔۔۔ کی' ہو گی اس نے۔" حریم نے مسکراتے ہوئے حانی کو مزید چھیڑا۔

"جی نہیں۔" حریم کی توقع کے عین مطابق وہ سرعت سے نفی میں بولی۔

"اس دفعہ محسن نے خوب محنت کی تھی۔"

"ظاہر ہے' منگنی کی خوشی کیا کم تھی۔ خوشی کے مارے ہی وہ پاس ہو گیا۔"

"یہی سمجھ لو۔" حانی جان گئی تھی کہ حریم محض اسے چڑا رہی ہے سو وہ چڑنے کی بجائے الٹا مسکرانے لگی۔

"خالہ کب تک چکر لگائیں گی؟" اب وہ ذرا سنجیدگی کا دامن تھامنے لگی تھی۔

"یہ تو پتا نہیں۔"

"اور محسن نہیں آئے گا؟" حریم کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

"کہہ رہا تھا کہ جاب کی مٹھائی لے کر ہی آؤں گا۔"

"چلو' اللہ بہتر کرے گا۔ اس کی جاب لگنے کے فوراً" بعد شادیانے بج اٹھیں گے۔" حریم کی آنکھیں اس تصور سے ہی جگمگانے لگی تھیں۔ حانی کی خوشی میں ہی ان کی خوشیاں پوشیدہ تھیں۔ اس کے لب اور دل ہمہ وقت حانی کے لیے دعاگو رہتے تھے۔ یہ اس کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ حانی بہت چاہنے والی خالہ کے گھر جا رہی تھی۔ حانی سے اس کی محبت بھی بہت عجیب تھی۔ کبھی ایک دوسرے کے علاوہ انہیں تیسرے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ حانی کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد وہ اسے اور بھی عزیز ہو گئی تھی۔ اور کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ اگر حانی کے لیے اسے جان بھی دینا پڑے تو وہ دے سکتی ہے۔ بہن' بھائیوں کے ساتھ محبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں میں خود بخود اترتی ہے اور یہ خون کے رشتے ہوتے ہیں جو دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے رکھتے ہیں۔ اگر کبھی یہی رشتے قربانی مانگیں تو دل تک اپنے پیاروں

پر قربان ہونے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔

یہ محبتوں کے مان ہی تو ہیں جو ایک بھائی دوسرے بھائی کے لیے خود سولی پر چڑھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ دل کا رشتہ ہی تو ہے کہ بہنیں خون بہا میں خود کو پیش کر کے اپنے بھائیوں کے سر کی بلا کو اپنے سر لے لیتی ہیں۔ یہ خون کا ناتا ہی تو ہے جو رشتوں کو تسبیح کے موتیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے ہوئے ہے۔ محبتوں کے یہ سلسلے اول سے لے کر ابد تک قائم دائم رہیں گے۔ چاہے یہ محبت بیٹی کی اپنے باپ اور بھائی سے ہو، شوہر یا اولاد سے ہو۔ تاقیامت "محبت" کسی بھی رشتے کی صورت میں قربان ہوتی بھی رہے گی۔ قربانی چاہتی بھی رہے گی۔ بس رگوں میں دوڑتے والے لہو کی گرمی اور حدت کا قائم رہنا شرط ہے۔

☼ ☼ ☼

نائن اسٹار میں آج شاید کوئی میوزک کنسرٹ تھا۔ منچلوں کی ٹولیاں بیسمنٹ کی سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ بے فکرے، ہنستے مسکراتے چہرے۔ خوشبوئیں لٹاتی عورتیں، اور نثار ہوتی نظروں سے دیکھتے مرد حضرات۔

ماہیر نے اگرچہ ایک الگ تھلگ سی ٹیبل کا انتخاب کیا تھا۔ تاہم انٹرس ڈور سے بہت آگے تک ہونے والی چہل پہل ان کی نظروں کے بالکل سامنے تھی۔

"بھلا ان لوگوں کی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے۔" ماہیر متاسف سا چھ، سات لڑکیوں کے ایک گروپ کو جاتا دیکھ رہا تھا۔ جو ان کے قریب سے ہی گزر کر بیسمنٹ کی طرف جا رہی تھیں۔

"کیوں مقصد نہیں۔" حریم نے فوراً" بات اچک لی۔

"آپ جیسے کئی مرد حضرات آنکھوں کو تراوٹ بخش رہے ہیں۔ اس سے بڑا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت بھری تھی۔ آج ماہیر ذرا جلدی آفس سے لوٹ آیا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس نے زبردستی باہر ڈنر کا پروگرام بنا لیا تھا۔ حالانکہ حریم کو ہوٹلنگ کچھ اتنی پسند بھی نہیں تھی اور کچھ اسے راحت بیگم کی ناراضی کا بھی خدشہ لاحق تھا۔ مگر کمال مہربانی سے جب انہوں نے انہیں باہر جانے کی اجازت دے دی تو حریم کو ایک دم ہی بے تحاشا خوشی کے احساس نے چھو لیا۔ بہت مشکل سے ہی سہی اس کی جگہ راحت بیگم کے دل کے کسی کونے میں بن ہی چکی تھی۔ اب یا تو زمیلہ کے دور چلے جانے کا کمال تھا یا پھر گھر میں پہلے سے بھی زیادہ خوشحالی کی آمد نے ان کا مزاج بدل کر رکھ دیا تھا۔ جو بھی تھا، حریم نے اسی میں بہت سی تبدیلیاں نوٹ کی تھیں۔

شادی کے اوائل دنوں سے جو سرد مہری وہ فیفا اور ماہیر کے درمیان دیکھتی رہی تھی اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں تھا۔

"تم کہاں کھو گئی ہو؟ ویٹر کھانا سرو کر چکا ہے میڈم۔" ماہیر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرائے۔ حریم کچھ شرمندہ سی ہو کر سنبھل گئی۔

"تم ان ماڈلز سے زیادہ خوب صورت ہو۔ خوامخواہ انہیں اس قدر حسرت سے نہ دیکھو۔" ماہیر ایک لمبی بانس سی طرح دار لڑکی کو دیکھتے ہوئے بولا تھا جو حریم کی نظر کے حصار میں تھی۔

"میں اس کی لمبائی دیکھ رہی ہوں۔" حریم کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"کمال ہے۔ دوسروں کی لمبائی چوڑائی ناپتی رہو۔ اور میں جو ایک نظر الفت کا منتظر ہوں۔ میری طرف کسی کا دھیان ہی نہیں۔" ماہیر بسور کر بولا۔

"دن رات آپ کے درشن ہی تو ہوتے ہیں۔ نظر بھرتی کہاں ہے۔" اس کی آنکھوں میں گرم گرم سی شرارت تھی۔

"میرے دل خوش فہم کو اتنا بھی خوش نہ کرو۔ اللہ کی قسم! ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔" ماہیر نے گویا دہائی دی۔

"آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں ماہیر۔" وہ

کوک کے چھوٹے چھوٹے سپ لے رہی تھی۔ فرائی فش جوں کی توں اس کی پلیٹ میں رکھی تھی۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کون سا کوندا لپکا تھا۔

"محبت۔" ماہیر کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

"بھلا لفظوں میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ چلو، کبھی آزما کر دیکھ لینا۔"

"کیسے آزماؤں گی؟" وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا تم سچ مچ میری محبت کو آزمانا چاہتی ہو؟" وہ کھانا چھوڑ کر حریم سے پوچھ رہا تھا۔ سنجیدگی اس کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ حریم مذاق کر رہی ہے۔

"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حالانکہ حریم کی ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ مگر کبھی کبھی بغیر خواہش کے بھی لبوں سے بہت کچھ نکل جاتا ہے۔ انسان جانتا تک نہیں اور اس کے کہے گئے ادا کیے گئے لفظ پکڑ میں آجاتے ہیں۔

"اگر میں کہوں.... ماہیر عالم میری محبت کی خاطر مجھے چھوڑ دے تو کیا آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟" حریم کے لبوں سے بے ساختہ پھسل گیا تھا اور پھر وہ خود بھی حیران ہو رہی تھی کہ اس نے بھلا کیا بول دیا ہے۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" ماہیر نے ناراضی سے سر کو جھٹکا۔

"بتائیے نا۔" اس کا اصرار خود اس کی اپنی سمجھ سے بھی بالاتر تھا۔

"میں تمہاری خاطر، تمہیں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ تم کہو گی تو یہ خطہ چھوڑ دوں گا۔ براعظم چھوڑ دوں گا حتیٰ کہ یہ دنیا تک چھوڑ دوں گا مگر حریم جمال کو چھوڑنا میری زندگی کا خاتمہ ہے۔ اگرچہ کوئی کسی سے بچھڑ کر مر نہیں جاتا۔ مرتا تو انسان اس وقت ہے جب اس کا دنیا میں دانا، پانی ختم ہو جاتا ہے۔ موت کسی کے جدا ہونے سے نہیں آتی بلکہ زندگی کے دن ختم ہو جانے کی وجہ سے مرنا پڑتا ہے۔ جدائی میں انسان کا دل مرتا ہے۔ روح نہیں مرتی۔" وہ پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ حریم بھی فرائی فش کو ٹونگنے لگی۔

"جب دل مر جائے تو محبت بھی تو مر جاتی ہے۔" حریم سوچے جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد ماہیر نے کافی آئس کریم منگوالی تھی جبکہ اسے یہ فلیور ہرگز پسند نہیں تھا۔ وہ فروٹ آئس کریم شوق سے کھاتی تھی۔ مگر ماہیر کی پسند کو ناپسند کرنا دراصل حریم کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"شاپنگ کرو گی؟" وہ بل پے کر چکنے کے بعد پارکنگ کی طرف آرہے تھے۔ فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے ماہیر نے بڑی فیاضی کے ساتھ پوچھا تھا۔ حریم نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا دیا۔

"یار! حانی کے لیے ہی کچھ خرید لو۔" ماہیر کے اصرار پر وہ ایک شاپنگ مال میں داخل ہو گئے تھے۔ ونڈو شاپنگ کرتے کرتے اسے ایک سوٹ اور بیگ پسند آہی گیا اور اس نے حانی کے لیے مزید چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی خرید لی تھیں۔ پھر اس نے فیفا اور راحت بیگم کے لیے بھی ایک ایک سوٹ خرید لیا۔ موبی کے لیے ریفو مزوالا پیک خرید کر جوں ہی وہ دونوں باہر نکلنے لگے تھے۔ حریم سامنے سے آتی ایک بے حد گریس فل عورت کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ نفیس سی ساڑھی میں ملبوس محترمہ فلک ناز بے نیازی سے ان کے قریب سے گزرتی چلی گئی تھیں۔ ماہیر اسے رکتے دیکھ کر خود بھی رک گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ اس کا ہاتھ پکڑے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" حریم ابھی تک محترمہ فلک ناز کی پشت کو دیکھے جا رہی تھی۔

"یہ عورت کون ہے؟ کیا تم جانتی ہو اسے۔" ماہیر کچھ سوچتا ہوا پوچھ رہا تھا۔ اس عورت کو ماضی میں دیکھ رکھا تھا اس نے۔

"نہیں تو۔" حریم نے گہرا طویل سانس کھینچا۔ اسے کیا ضرورت تھی بھلا ختم ہو چکی رشتہ داری کو کوئی نام دینے کی۔

"آپ کیا جانتے ہیں انہیں؟"

"کاروباری شخصیت ہیں شاید۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔" اب وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

"یہ خاتون ہماری چاچی کے منصب پر فائز رہ چکی ہیں۔ زرجان کی والدہ ہیں۔"

"زرجان کی والدہ۔" ماہیر ایک دم الجھ کر رہ گیا۔

"ان کا نام کیا ہے؟"

"فلک ناز۔"

"مگر اس شکل کی خاتون کا نام فلک ناز تو نہیں تھا۔ ان کا نام تو کچھ اور تھا۔ شاید میری نظر کا دھوکا ہو۔ بات بھی تو خاصی پرانی ہے۔ اور میرا کون سا ان کے ساتھ کوئی دوستانہ تھا کہ مجھے ان کی شکل یاد رہتی۔ بس ایسے ہی فلک ناز صاحبہ کو دیکھ کر ایک خیال سا گزرا تھا۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولتا ہوا نارمل اسپیڈ سے گاڑی چلا رہا تھا۔

"کیسا خیال؟" حریم الجھ کر بولی۔

"کچھ نہیں۔" وہ ٹال گیا تھا۔ اس وقت تو بات دب کر رہ گئی تھی۔ حریم نے بھی زیادہ کریدا نہیں۔ ویسے بھی اس کی زیادہ کریدنے والی عادت نہیں تھی۔

اگلے کچھ دن پھر سے مصروفیت کے نذر ہو گئے۔ جمعہ کے روز ماہیر نے اپنی شادی کی سالگرہ کو خاصا دھوم دھام سے منایا تھا۔ اس دفعہ بھی راحت بیگم خرچہ ہوتا دیکھ کر بھی نہیں بولی تھیں۔ حتیٰ کہ نیلم کا سیٹ جو ماہیر نے سب کے سامنے حریم کو پہنایا تھا۔ اسے دیکھ کر بھی وہ خوش ہی ہوتی رہی تھیں۔ یہ مقام حیرت ہی تھا۔ حالانکہ حریم سیٹ کو دیکھ کر کافی دیر ناراض ہوتی رہی۔

"کیا ضرورت تھی۔ اس فضول خرچی کی۔"

"مجھے روکا مت کرو۔ میں تمہاری ساری خواہشات پوری کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے مشکل وقت میں میرا بہت ساتھ دیا ہے حریم! اور میں تمہاری ہر خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہوں اور یہ میرے دل کی سب سے بڑی خوشی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ چوم کر بول رہا تھا۔

"مگر ماہیر!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ماہیر نے اسے ٹوک دیا۔

"کوئی اگر مگر نہیں۔ کچھ مت کہو حریم! ابھی مجھے اپنے دل کی خوشی پوری کر لینے دو۔" وہ اس کی روشن پیشانی چوم رہا تھا۔ اس کا دل ماہیر کی اس بے لوث، شدید محبت پر بے اختیار رو پڑا۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک شام کی بات تھی جب موبی چپکے سے اس کے کمرے میں چلا آیا۔ آج سے پہلے وہ اس کے کمرے میں کبھی نہیں آیا تھا۔

"آؤ موبی۔" وہ لیٹی ہوئی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ موبی دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آکے بیٹھ گیا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ موبی!" کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولی تھی۔

"کون سی بات؟"

"کیا تم زوباریہ کو جانتے ہو؟" حریم نے موبی کو چونکا دیا تھا۔

"کون زوباریہ؟"

"وہی جو زمیلہ کی دوست تھی۔" وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر پوچھ رہی تھی۔

"زمیلہ کی دوست تو نہیں تھی۔" موبی نے دھیرے دھیرے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر کون تھی؟" حریم کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"بس تھی ایک پجارن۔" موبی نے گویا سر جھٹکا۔

"پجارن۔" اس کے لب بے آواز پھڑپھڑائے۔

"پجارن تھی وہ۔ پاگل تھی میں تو اسے پاگل ہی کہوں گا۔ انسان بھی تو مٹی کا ایک پتلا ہے۔ ایک بت کی طرح ہے۔ بھلا پتھروں اور پتلوں کی پوجا صاحب علم اور عقل رکھنے والا کر سکتا ہے؟ میرے نزدیک وہ پاگل تھی جو عشق مجاز سے حقیقت کے راستوں کی طرف جاتے ہوئے بھٹک کر ایک اور راہ کا انتخاب کر بیٹھی تھی۔" موبی کی آواز پھر سے ستر سالہ بوڑھے کی طرح ہو گئی تھی۔ لرزیدہ اور پھٹی پھٹی آواز۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی رعشہ زدہ بوڑھا بول رہا ہے۔

"اور وہ راہ کون سی تھی؟" حریم کی آواز پر بھی لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ موبی کی یہ عجیب سی کیفیت ہمیشہ کوئی انوکھا سا انکشاف کر دیتی تھی۔

"جنوں کی راہ۔۔۔ جو عقل و شعور اور فہم تک چھین لیتی ہے۔" موبی کی آنکھیں سکڑ رہی تھیں۔

"اور اس جنوں کی راہ نے زوباریہ درانی کو قبر میں اتار دیا۔" حریم نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔

"کون سی قبر؟" موبی پھر سے آنکھیں کھول رہا تھا۔ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

"وہی جس میں مردوں کو دفناتے ہیں۔" حریم اب کے کچھ اور بھی خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"آپ نے زوباریہ کی قبر دیکھی ہے؟" یوں لگ رہا تھا گویا سامنے بیٹھا یہ بیس، اکیس صدیاں جینے والا بوڑھا دھیرے سے مسکرایا ہو۔

"نہیں۔" حریم نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر اس کی قبر کس نے دیکھی ہے؟" بوڑھے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چپک کر رہ گئی تھی۔

"عفیفا نے اور شاید ماہیر نے بھی۔" وہ اپنے دھک دھک کرتے دل کو ڈپٹ رہی تھی۔ مگر یہ دل تھا کہ خوف کی وجہ سے کپکپائے جا رہا تھا۔

"اور وہ قبر کسی بھی وجود سے خالی ہے۔" بوڑھے نے شاید قہقہہ لگانا چاہا تھا مگر اس کوشش میں اس کے آنسو نکل پڑے تھے اور وہ روتا روتا ہی سو گیا تھا۔ نیند اس حالت میں اس پر بہت جلدی حاوی ہو جاتی تھی۔

"کیا مطلب؟" حریم پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر پوچھ نہیں پائی تھی۔ اسی پل فیفا نے کمرے میں پہلا قدم رکھا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی فیفا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

عفیفا کو اپنے گھر سے کچھ سامان لے کر آنا تھا۔ سو وہ آفس سے واپسی پر ادھر آگئی تھی۔ گھر کی چابیاں اس کے پاس ہی ہوتی تھیں۔ ابھی اس نے مکان کو کرائے پر دینے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ویسے بھی کرائے دار کمال گھر کی حفاظت کرتے تھے۔

وہ گیٹ کھول کر اندر آگئی تھی۔ پورے گھر میں گندگی کے ڈھیر لگے تھے۔ ویسے بھی یہ آندھی و طوفان کا موسم تھا۔ عفیفا نے پتوں کے ڈھیر دیکھ کر سب سے پہلے صفائی کرنے کی ٹھان لی۔ پائپ لگا کر اس نے لاؤنج، کچن، برآمدہ اور صحن تک دھو دیا تھا۔ پھر وائپر لگانے کے بعد اس نے ڈسٹنگ والا کپڑا اٹھا کر کھڑکیاں دروازے اور فرنیچر تک صاف کیا۔ باتھ روم ز گرد گرد ہوئے تھے۔ اس کام سے فراغت کے بعد وہ اسٹور روم میں گھس کر اپنا ضروری سامان نکال کر بیگ میں رکھ رہی تھی۔ الماری میں کچھ پیسے اور زیور بھی موجود تھا۔ جو وہ اپنی کم عقلی کی بنا پر ادھر ہی چھوڑ گئی تھی۔

ابھی وہ اسٹور روم میں ہی تھی جب پپو آگیا۔ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹتے ہی پوچھنے لگا۔

"باجی! اپنے گھر واپس آگئی ہو کیا؟"

"ہاں۔" بچے کا دل توڑنا اسے مناسب نہیں لگا۔

"اب اسی گھر میں رہو گی؟"

"نہیں۔" یہ سوال خاصا مشکل تھا۔ تاہم جھوٹ بولنا بھی اسے مناسب نہیں لگا تھا۔

"کیوں نہیں واپس آجاؤ نا۔ اب تو میں کسی اور کے گھر سے سالن بھی لینے نہیں جاتا۔" پپو نے بسور کر کہا تھا۔ فیفا کو ہنسی آگئی۔ وہ دوسرا شاہنواز تھا۔ اپنے گھر کا سالن اسے پسند نہیں آتا تھا سو اکثر ہی پپو پلیٹ اٹھائے ان کے گھر آجاتا۔

"میں واپس نہیں آسکتی۔ بھلا اکیلی کیسے رہوں گی۔ ڈر لگے گا مجھے۔" فیفا نے اس کے گال تھپتھپا کر کہا۔

"ہاں 'یہ بات تو ہے۔" پپو نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کے پاس سو جایا کروں؟"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" فیفا نے نفی میں سر ہلایا۔

"مگر کیوں؟" پپو بسورا۔

"پھر تمہاری امی اکیلی کیسے رہیں گی۔ انہیں ڈر لگے گا۔"

"ہاں 'یہ بات تو ہے۔ میرا بھائی بھی ڈرتا رہے گا۔" وہ بڑے پن سے بولا۔

"اچھا" آپ کے کھانے کے لیے کچھ لاؤں۔ امی نے پوچھا ہے۔ چائے یا پھر شربت۔" پپو کو یقیناً آداب ہمسائیگی ادا کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ فیفا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اپنی امی کو شکریہ کہہ دینا۔ اس وقت میں جلدی میں ہوں۔ پھر آؤں گی تو تمہاری امی سے بھی ملوں گی۔" وہ اسٹور روم کو تالا لگا رہی تھی۔ پپو کو شاید کھیلنے کے لیے جانا تھا۔ سو وہ سر ہلا کر بھاگ گیا۔ فیفا ابھی لاؤنج میں ہی کھڑی تھی۔ جب گیٹ پر لمبی سی چمکیلی گاڑی آرکی ۔۔۔ برآمدے میں کچھ متحیر سی کھڑی شخصیت کو دیکھ کر عفیفا مختار کو زمان و مکان بھول گئے تھے۔

"تم۔۔۔" فیفا کے لبوں سے چیخ نما آواز برآمد ہوئی۔

"ہاں ۔۔۔" وہ مسکرا دی تھی۔ بہت ہی دلکشی کے ساتھ۔

"اس میں اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔ میں ملک سے گئی تھی مگر دنیا سے تو نہیں مگر اس میں تمہارا ابھی بھلا کیا قصور ہے۔ تم لوگوں کو جو بتایا گیا۔ وہ ہی تم لوگوں نے ٹھیک سمجھا اور میری غائبانہ فاتحہ پڑھ کر پر سکون ہو گئے۔ چلو، خس کم اور جہاں پاک۔ یہ تو تمہارے تصور میں بھی نہیں ہو گا کہ میں زندہ ہوں اور سانس بھی لیتی ہوں مگر ان سانسوں کے بوجھ کو سنبھالنا بڑا مشکل تھا میں نے دس سال انتظار کیا ہے۔ طویل ترین' تھکا دینے والا انتظار۔۔۔۔ اور میں آج تمہارے سامنے ہوں۔ تمہاری کہی گئی باتوں کو جھٹلانے کے لیے۔ تم نے کہا تھا نا اور چار سال گزرنے کی دیر ہے۔ یہ محبت کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا اور تم نے کہا تھا کہ بھول جاؤ گی زوبی! کہ تم نے کبھی کسی سے محبت بھی کی تھی۔ مگر میں تمہیں آج جتانا چاہتی ہوں کہ اوائل عمری میں لگا دل کو محبت کا پہلا روگ رب کی قسم تمام عمر نہیں بھولتا۔ میرا کردار ان دس سالوں میں بے داغ رہا ہے۔ میری زندگی میں کوئی اجنبی میرے دل کے مقام تک نہیں پہنچا۔ اللہ کی قسم! میرے دل کے ایوانوں میں ایک دفعہ جھانک کر دیکھ لو۔ تمہارے ماموں زاد کا عشق آج بھی اول روز کی طرح موجود ہے اور اس عشق کی گرمی نے دس سال تک مجھے ایک سرور بخش انتظار میں باندھے رکھا تھا۔" فیفا پتھر کا گویا بت بنی کھڑی تھی اور اس کی نظریں زوباریہ کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے آنسوؤں پر گویا جم کر رہ گئیں۔

"برابر والے گھر میں کون رہ رہا ہے۔ ماہیر کہاں چلا گیا؟ مجھے بتا دو فیفا میرا دل پہلے ہی اندیشوں کا مارا ہوا ہے۔" وہ اسی طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بہت طویل سفر تھا ۔۔۔ کاش کبھی کوئی اس پل صراط سے نہ گزرے۔ مجھے میری ماں نے ایک قسم اور وعدے میں باندھ کر رکھا تھا۔ مگر جب آنکھیں جدائی کا عذاب سہتے سہتے تھک گئی تھیں۔ صبر کا جام میرے

ہاتھ سے گر پڑا تو میں نے الٹے قدموں دوڑ لگا دی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ ان دس سالوں میں ماہیر کتنا اسٹیبلش ہوا ہے۔ وہ کس منصب پر ہے؟ وہ کیا کرتا ہے! اس نے معاشرے میں اپنا کیسا مقام بنایا ہے؟ میں کچھ بھی تو نہیں جانتی۔ بس میرے دل کو اتنی خبر ہے کہ اگر ماہیر عالم گداگر بھی ہوا تو میں اس کے ساتھ مل کر کشکول پکڑ لوں گی۔ میری محبت کی انتہا بس یہیں تک ہے۔ اللہ کا واسطہ دیتی ہوں۔ مجھے انتظار کا کوئی اور اسم مت بتانا جس کے ورد میں میری سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے۔" فیفا نے ایک اور قیامت منظر دیکھا تھا۔ زوباریہ اب اس کے قدموں میں بیٹھ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیروں پر رکھ دیے۔

"مجھے بتاؤ' میرا ماہیر کہاں ہے؟" وہ سسکتی جا رہی تھی۔

"جان کر کیا کرو گی زوباریہ!" فیفا نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"ماہیر عالم کب تمہارا ہوا تھا؟ وہ تو اول روز سے ہی کسی اور کا اسیر ہے۔ کیوں خود کو برباد کر رہی ہو پگلی۔"

"کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کے دل میں کسی اور کی محبت ہے۔ میرے لیے ماہیر عالم کا حصول ہی کافی ہے۔" اس کے آنسوؤں نے فیفا کے پیر بھگو دیے تھے۔ فیفا گویا کانپ کر جھکی تھی۔

"زوباریہ! تم بھی نا۔" فیفا کو لگ رہا تھا کہ آج بھی وہ اکیس سالہ زوباریہ کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے سامنے پونی ٹیل جھلاتی اکیس سالہ زوباریہ ہی کھڑی تھی۔ جذباتی' جنونی' دیوانی پگلی۔

"میں پاگل ہوں مگر اسے پاگل نہیں کر سکی۔" اس کے چہرے پر افسردگی کی گرد چھائی ہوئی تھی۔

"بتاؤ نا' ماہیر یہ گھر چھوڑ گیا ہے؟ اب وہ کہاں ہے؟ یقیناً" تم جانتی ہو گی۔" بے قراری اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ فیفا کا دل گویا مٹھی میں آگیا۔

"م ' مجھے خبر نہیں۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"یوں جھوٹ تو نہ بولو' مانا کہ ہمارے درمیان دوستی

کا تعلق ختم ہو چکا ہے۔ مانا کہ میری خود غرضی مجھے تمہارے جیسی اچھی دوست سے بہت دور لے گئی تھی۔ مگر جھوٹ تو تم نے تب بھی کبھی نہیں بولا تھا۔" زوباریہ پیاسی نظروں سے برابر والے گھر کو دیکھ رہی تھی۔ ان نگاہوں کی سرخیوں نے عفیفا کو اک نامعلوم سے خوف میں مبتلا کر دیا۔

"زوباریہ! تم کیوں ان اونچے نیچے راستوں پر پلٹ آئی ہو؟"

"اس لیے کہ ان راستوں کی گرد آج بھی میری آنکھوں میں اڑ رہی ہے۔ مجھے انہی راہوں پر پلٹنا تھا کہ میرا دل انہی گلیوں اور کوچوں کے درمیان بھٹک رہا ہے۔" وہ گویا بچ بچ تھک کر ٹوٹ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا اس کے سامنے مٹے مٹے حروف والی ایک کتاب کھلی ہے۔ جس کے ہر صفحے پر آنسوؤں کے نشان تازہ ہیں۔ شاید اس لیے کہ یہ آنسو خون کے آنسو تھے۔ اور ان آنسوؤں کے نشان کبھی مٹ نہیں سکتے تھے۔

"زوبی! اپنے اس نادان دل کو سمجھالو۔ طلب عشق کی اس آگ کو بجھا ڈالو۔ یہ کام ذرا سا مشکل ہے۔ رائی کے دانہ کے برابر مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ تمہارا دل ایک لاحاصل طلب میں فنا ہو رہا ہے، جھلس رہا ہے۔ اس بے کار شوق تمنا کی زنجیروں سے خود کو آزاد کیوں نہیں کر لیتیں۔ ماہیر عالم نہ کل تمہارا کبھی تھا نہ آج تمہارا ہے اور نہ ہی کبھی ہو گا۔ تم صبر کر لو اس چیز پر جو ازل سے اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھ دی ہے۔ خواہ وہ نفع ہے یا ضرر، آرام ہے یا سختی، آسانی ہے یا تنگی، محبت کا حصول ہے یا کلستہ دل کو ہمیشہ خالی رہنا ہے۔ اس معاملے میں صبر کر لو، دیکھو، صبر سے بڑی کوئی دوا نہیں۔" فیفا گویا تڑپ کر اس کی خالی خالی آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی۔ جن میں آج بھی نو سال پہلے والا جوش اور طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"نہیں فیفا! صبر دوا نہیں، زہر کا پیالہ ہے۔ نو سال سے ہر روز آنکھیں بند کر کے پیتی رہی ہوں۔ مگر اس زہر نے میرے دل میں لگی آگ کو ٹھنڈا تو نہیں کیا۔ بلکہ روز روز بھڑکایا ہے۔ ہر روز یہ آگ اپنا ایک نیا رنگ بدل لیتی تھی۔ میں کیا کروں، میرے اردگرد آگ اور دھوئیں کی لپیٹیں اٹھ رہی ہیں اور یہ آگ دیدار کے بعد ہی ٹھنڈی ہو گی۔ مجھے بتا دو، ماہیر عالم کہاں ہے؟ تم نہیں بتاؤ گی۔ تب بھی میرا یہ دل مجھے ان ان راہوں کی طرف لے جائے گا جہاں پر ماہیر کے قدموں کے نشان ابھی باقی ہیں۔ میں اس کی خوشبو سے اسے ڈھونڈ لوں گی۔ تم نہ بتاؤ گی تو بھلا کیا فرق پڑے گا۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔ تاہم اس کی آنکھیں اب بھی رو رہی تھیں۔

"تم نہ بتاؤ گی تو بھلا کیا فرق پڑے گا۔ میرے وجود کا روم روم ایک دعا کا ورد کر رہا ہے۔ کیا میں اللہ کی اس قدر ناپسندیدہ ہوں کہ وہ میری ایک دعا کو قبولیت کا شرف نہیں بخش سکتا۔ اس کے باوجود کہ میں نے نو سال ایک سجدے کے عالم میں سر جھکائے گزار دیے ہیں۔ کیا میں پوری کائنات میں سب سے زیادہ اس کی ناپسندیدہ ہستی ہوں جو وہ میری ہر دعا اور ہر عبادت کو ٹھکرا رہا ہے۔" زوباریہ سانس روکے، نظر آسمان پر جمائے سسک رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی زمین پر رکھے تھے۔ اور وہ فیفا کے اٹھانے کے باوجود بھی نہیں اٹھنا چاہ رہی تھی۔

"اللہ اپنے کسی بھی بندے سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ تو ہر ایک کو نوازتا ہے، وہ بھی جو اس کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور وہ بھی جو سرے سے اللہ کی وحدانیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ پگلی! تمہاری دعا ٹھکرائی نہیں گئی بلکہ وہ رحمان رب تمہیں وہ ہی چیز عطا کرنا چاہتا ہے جو تمہارے لیے بہتر ہے، بہترین ہے۔ اس کے ہر کام میں بہتری اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ماہیر عالم کا نہ ملنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا تو پھر تم اپنے اس نادان دل کو سمجھا کیوں نہیں لیتیں۔" فیفا نے اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام لیا تھا۔ عام سے نقوش سے سجا چہرہ اتنا ساحر تو نہیں تھا کہ ماہیر عالم گھڑی بھر کے لیے بھی ٹھہر جاتا۔ ہاں اس عام سے چہرے والی زوباریہ کا دل نہ جانے کس چیز سے بنایا گیا تھا۔ مگر اس دل میں

ماہیر عالم نے جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر ایک دفعہ بھی وہ زوباریہ کے دل میں جھانک لیتا' اس دل میں چھپی محبت کو چھو لیتا تو ماہیر عالم شاید پتھر ہی ہو جاتا اور حریم جمال کی طرف جانے والے اس کے سارے راستے کھوٹے ہو جاتے۔

"وہ لمحہ بھر کے لیے اس موڑ پر رکتا تو سہی' اللہ کی قسم! میرے عشق کی آگ اور اس کی تپش ماہیر عالم کے دل تک نہ پہنچتی تو زوباریہ درانی ایک دفعہ پھر سے موت کو گلے لگا لیتی یا ہمیشہ کے لیے خود کو دریاؤں کے حوالے کر دیتی۔" کیسا یقین بول رہا تھا اس کے لہجے میں اور وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ اگر ماہیر عالم اس کے عشق کی گرمی کو محسوس کر لیتا تو کسی اور طرف اس کے قدم اٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔

"ماہیر کہاں ہے فیفا؟" وہ ایک دفعہ پھر پرابر والے مکان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جسے اب کوئی اور مکین آباد کر چکے تھے۔

"وہ یہ گھر چھوڑ چکا ہے۔" فیفا کی آواز دکھ کے احساس سے بوجھل ہو گئی تھی۔

"اس نے یہ گھر چھوڑ دیا مگر کیوں؟" وہ بے قراری تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

"شاید اس لیے کہ زمیلہ کو کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ یا شاید اس لیے کہ مامی کو خوف لاحق تھا۔ زرق برق کپڑے والے ایک دفعہ پھر سے گھر کی چوکھٹ کو پکڑ کر مومی کو لینے کا مطالبہ نہ کر دیں یا شاید اس لیے کہ ماہیر عالم نہیں چاہتا تھا کہ کوئی زوباریہ درانی ایک دفعہ پھر سے اس کے دل کا در کھٹکھٹانے پہنچ جائے۔" فیفا کی آواز میں خزاؤں کی خشکی بھر گئی۔

"اور شاید اس خوف سے بھی کہ میری متواتر دستک کے جواب میں ماہیر کو کواڑ کھولنے ہی نہ پڑ جائیں۔" زوباریہ روئی روئی آنکھوں سے مسکرا دی۔

"اس کے دل کے کواڑ کبھی نہیں کھل پائیں گے زوباریہ! کیوں خود کو تھکا رہی ہو۔ تم تو محلوں کی شہزادی ہو۔ کس غم کو سینے سے لگا بیٹھی ہو پگلی۔" فیفا اس کی قیامت آنکھوں میں دیکھ کر کانپ گئی۔

"اسے ایک نہ ایک دن تمام دریچے کھولنے ہوں گے اور تم دیکھ لینا ایسا ہو کر رہے گا۔ ماہیر عالم میری محبت کی شال کو اوڑھ لے گا اور زندگی درانی ہاؤس میں گویا کھل کر سانس لے گی۔"

"زوبی! مت دیکھو ایسے خواب' جن کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ کوئی تعبیر۔" فیفا گویا لرز لرز گئی۔

"اس دفعہ یہ خواب' حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ تم دیکھ لینا' ماہیر کو میرا بننا ہی ہو گا اور اس کی خاطر مجھے کئی محاذوں پر لڑنا پڑا تو میں دل اور جان کی بازی لگاؤں گی۔ یا تو یہ دل ہار جائے گا یا جان ہار دوں گی۔ اس دفعہ میں نامراد نہیں رہوں گی۔ یہ میرا خود سے نہیں اپنے دل سے وعدہ ہے۔" اس کے لہجے میں آن کی آن میں چٹانوں کی سی سختی در آئی۔

"زوبی! تجھے اللہ کا واسطہ دیتی ہوں۔ واپس لوٹ جاؤ میری جان! یہ دیس یہ نگری تمہارے جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ مت اپنے آبگینے جیسے دل کو مٹی میں رول لو۔" فیفا نے لب کچلتے ہوئے گویا التجا کی۔

"میں نے اپنا دل عالم سرخوشی میں ماہیر کے قدموں تلے رول دیا ہے اور مجھے ذرہ بھر افسوس بھی نہیں۔" گویا کسی اور ہی جہان میں گم تھی۔

"میرے عشق کا بھار اگر تیرے دل پر پڑے فیفا! تو یقین جانو' تمہارا دل اس بوجھ تلے دب کر چلا جائے۔ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے۔ اگر میں اپنی محبت کا راز تمہاری آنکھوں میں بھر دوں تو تمہاری آنکھیں اس راز کو برداشت نہ کر پائیں' ان کے سوتے سوکھ کر اس حد تک خشک ہو جائیں کہ آنکھوں کو دیکھ کر بنجر زمین کا گمان ہونے لگے۔ میں اپنے عشق سے لبالب بھرا جام تمہارے سامنے رکھ دوں تو تیری عمر بھر کی پیاس ختم ہو جائے۔ اگر میں اس عشق کا بھید کسی رواں چشمے میں ڈال دوں تو رب کی قسم' وہ پانی آگ بن کر بھڑک اٹھے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ میں اسے بھول جاؤں۔ تو میں اسے بھولنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ مگر میرا اللہ اس دل سے ماہیر عالم کے عشق کی گرمی کو کیوں نہیں نکالتا۔ میں تو چاہتی ہوں کہ میرا دل سرد خانہ بن جائے۔ مگر

جائے' ختم ہو جائے مگر مجھے یوں رسوا تو نہ کرے۔" وہ ایک دفعہ پھر سے بے آواز رونے لگی تھی۔

"ماہیر کہاں ہے فیفا۔ تجھے بتانا ہی ہو گا۔" وہ فقیروں کی طرح التجا کر رہی تھی۔

"ماہیر کی شادی ہو چکی ہے زوباریہ!" بالآخر عفیفا کو بتانا ہی پڑا اور زوباریہ اس طرح سے ساکت ہو گئی تھی گویا اس کے جسم میں جان تک باقی نہیں تھی اور اس کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا گویا کسی کپڑے کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر بے دردی سے پھاڑا جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی شفاف سطح ایسے ہی کپڑے کی طرح پھٹ گئی تھی۔

"ماہیر کی شادی ہو گئی۔" زوباریہ کے لبوں کی جنبش نے فیفا کو کپکپا کر رکھ دیا۔

"ماہیر نے شادی کر لی۔ اس لیے کہ وہ مجھے مردہ تصور کر چکا تھا۔ میری ماں نے مجھ پر فاتحہ خوانی کروا دی تھی۔ ماہیر نے شادی اسی لیے کر لی تھی کہ وہ مجھے مرا ہوا سمجھ چکا تھا۔ بتاؤ نا فیفا! اسی لیے ماہیر نے شادی کی ہے نا۔" وہ ایک دفعہ پھر ہاتھ باندھے التجا کر رہی تھی' پوچھ رہی تھی۔ اپنے جلتے بلتے دل پر تسلی کے پھاہے رکھنا چاہتی تھی۔ فیفا ایک شدید مشکل کا شکار ہو گئی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ زوبی کو کون سا جھوٹ بول کر دلاسا دے۔

"ہاں' شاید۔" اس کا انداز مبہم سا تھا۔ وہ اسے بتا نہیں سکی تھی کہ ماہیر کو تمہاری زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تمہارے مرجانے کی خبر سن کر بھی کسی چیز نے اسے چونکایا نہیں تھا۔

"تو پھر مجھے اسے بد عہد نہیں کہنا چاہیے۔ ماہیر کا اس میں بھلا کیا قصور' شادی تو اسے کرنا ہی تھی۔ اسے کیا خبر کہ میں زندہ ہوں۔ میری ماں نے مجھے صرف اسی لیے مار دیا تھا کہ ماہیر خود کو آزاد سمجھے۔ اور وہ کسی اور سے شادی کر لے۔ تاکہ میں جب واپس آؤں تو مایوس ہو جاؤں۔ مگر میری ماں نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں ماہیر عالم کے لیے دریاؤں کے رخ موڑ سکتی ہوں۔" وہ ایک دم ہی گویا بپھر گئی تھی۔

"میری ماں نہ جانے کس بھول میں ہے۔ اپنے تئیں انہوں نے بہت اچھی چال چلی ہے۔ مجھے بھجوا دیا۔ لوگوں کی نظروں میں مجھے مار بھی دیا تاکہ ماہیر کسی اور کو زندگی کا ساتھی بنا لے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتیں کہ میں آج تک خود کو ماہیر کا پابند سمجھتی ہوں یہ دیکھو ماہیر کے نام کی انگوٹھی' جو میری ماں نے مجھے اس تیسری انگلی میں پہنائی تھی۔ آج بھی اسی تیسری انگلی میں موجود ہے۔ نو سال ہو گئے ہیں۔ صبح و شام اس انگوٹھی کو دیکھ دیکھ کر خواب بنتے ہوئے۔ کیسے نوچ کھسوٹ کر ان خوابوں کو تہس نہس کر دوں؟" اس نے ایک دم دھواں دھار رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ زمین پر اپنی پیشانی پٹخ رہی تھی۔ یہاں تک کہ خون کی بوندیں اس کے ماتھے سے ابل ابل کر نکلنے لگیں۔

"ممی! آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" اس کا ماتھا فرش کی پتھریلی سطح سے بری طرح ٹکرائے جا رہا تھا۔ سرخ سرخ صحت مند خون کے دھبے جا بجا فرش پر چمکنے لگے تھے۔ فیفا کے وجود میں گویا بجلی بھر گئی۔

"زوبی! پاگل ہو گئی ہو؟ کیا کر رہی ہو؟ اٹھو یہاں سے۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہتی تھی۔

"ہاتھ نہ لگانا مجھے..... جل کر خاک ہو جاؤ گی فیفا! بھانبھڑ اٹھ رہے ہیں میرے وجود میں۔ میں ایک عورت نہیں کوئلوں کی بھٹی ہوں۔ بہت آگ بھری ہے مجھ میں' نہ جانے کون کون اس آگ کی لپیٹ میں آئے گا؟ نجانے کون کون راکھ کا ڈھیر بنے گا؟ اگر زوباریہ درانی ننگے سر اور ننگے پاؤں دھوپ میں جلی ہے تو پھر ماہیر عالم کی محبت کا روپ کسی اور کو بھی بخشنے نہیں دوں گی۔ جواں بختی کا تاج اگر زوباریہ درانی نہیں پہن سکی تو پھر کوئی اور بھی ماہیر عالم کی محبت کے تاج کا حق دار نہیں ہو پائے گا۔" اس کا ماتھا بری طرح سے زخمی ہو گیا تھا۔ فیفا بوکھلا کر اپنا دوپٹا اس کی پیشانی پر رکھنے لگی تھی۔ تاکہ بھل بھل نکلتے خون کو دوپٹے میں جذب کر سکے۔ مگر زوباریہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"نہیں فیفا! مت چھونا مجھے' کہیں میرے نصیب

کی گرمی تجھے جھلسا کر نہ رکھ دے۔" پیشانی سے بہتا خون ایک لکیر کی صورت میں اس کے گالوں پر بہنے لگا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ خون نکل رہا ہے۔

"اگر زوباریہ درانی بامراد نہ ہوئی تو کسی اور کو بھی مراد پانے نہیں دوں گی۔ یہ جنگ اب ماہیر کے حصول تک محدود نہیں رہی۔ یہ جنگ میری ماں کے اور میرے درمیان ہے۔ مجھے دنیا کی نظروں سے مار کر انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ ماہیر کو مجھ سے دور کر کے انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ بہت اچھا ڈرامہ ڈائریکٹ کیا ہے محترمہ تابندہ فلک ناز نے۔ اب اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہونا باقی ہے۔ دیکھو، کس کس کی آنکھ خواب دیکھتی ہے اور کس کس کی آنکھ عذاب دیکھتی ہے۔ میرے حصے کے عذاب اب کسی اور کی جھولی میں پڑنے والے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں ایک بپھر جانے والا طوفان دکھائی دے رہا تھا۔ یوں کہ عفیفا کی روح تک جھنجھنا اٹھی تھی۔ ادھر زوباریہ خون آلود فرش پر ننگے پیر کو رگڑنے کے بعد ناک کی سیدھ میں پلٹ رہی تھی۔

اس کے پیروں کی جوتیاں اسی جگہ پر پڑی تھیں جہاں خون کے دھبے اب جمنے کے قریب قریب تھے۔ عفیفا کی نظر اس کے خون آلود پنجوں کے نشان دیکھ رہی تھی اور اس کا دل دور، بہت دور کسی کنویں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ کسی کھائی میں گر رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ماہیر اور حریم کو اس بپھرے طوفان کی زد میں آنے سے بچا لے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ طوفانوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا اور طوفان جب بھی آتے ہیں۔ تباہی و بربادی کے سندیسے لے کر ہی آتے ہیں۔ وہ پورب کی طرف سے اُمڈ آنے والے اس جاہ و جلال لیے اُمڈنے والے طوفان کو دیکھ کر خدا کے حضور ہاتھ پھیلائے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ بعض گھڑیاں قبولیت کے درجات سے بہت دور ہوتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

"ماں ہو کر آپ نے مجھے ناگن کی طرح ڈسا ہے ممی آپ میری ماں نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ آپ تو کسی کی بھی ماں نہیں ہو سکتیں۔ نہ میری نہ زرجان کی۔"

محترمہ تابندہ ناز اس وقت اپنے اسٹڈی روم میں موجود تھیں۔ وہ بڑی اہم فائل کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ آج ان کا قیام درانی ہاؤس میں تھا۔ جب ایک دم ہی ملازمہ پھولی سانسوں سمیت اسٹڈی روم کا دروازہ دھاڑ سے کھولے اندر داخل ہوئی تھی۔ ابھی وہ ملازمہ کو اس بدتہذیبی پر ٹوکنا چاہتی تھیں جب ملازمہ نے سانس روکے گویا ان کی سماعتوں پر دھماکہ کیا۔

"بیگم صاحبہ! ہنی بی بی واپس آ گئی ہیں۔"

"کیا بکواس ہے یہ۔ ہنی کس طرح واپس آ سکتی ہے۔ مجھے بتائے بغیر، میری اجازت کے بغیر۔" وہ بے ربط سا بولتی بدحواسی سے کھڑی ہوئی تھیں یوں کہ ان کے نازک گلاسز، فائل اور قیمتی، نفیس سا قلم زمین بوس ہو گیا تھا۔

"ہنی آ چکی ہے ممی۔" وہ بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی روم میں داخل ہوئی۔

"اس قدر حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ قبر سے مردے اٹھ کر واپس نہیں آتے اس لیے۔ ویسے بات تو حیرانی کی ہے میں عالم بالا سے بھلا واپس کیسے آ گئی ہوں۔ اس گھر کے نوکر بھی حیران نہ ہوں، خوفزدہ نہ ہوں مجھے دیکھ کر۔ آج سے پہلے انہوں نے بھی کبھی نہیں سنا ہو گا کہ دوسری دنیا سے بھی کوئی لوٹ کر آ سکتا ہے۔" اس کے لبوں سے سانپ کے مشابہہ پھنکار برآمد ہو رہی تھی۔

"ممی! اپنے گھر کے نوکروں کو بتائیں تاکہ یہ دنیا بڑی عجیب شے ہے۔ یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ یہاں پر کسی کو بھی دھوکا دینا بہت آسان ہے۔ اسی لیے تو کبھی کبھی اولاد، والدین کو دھوکا دیتی ہے اور ماں باپ اپنے بچوں کو بھی فریب دے لیتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی انہونا نہیں ہوتا۔ ہر چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔" اس کے لبوں سے گویا تیزاب جیسے لفظ نکل رہے تھے۔ تبھی تو محترمہ تابندہ فلک ناز گم سم ہو کر رہ گئی تھیں۔ زوباریہ کی واپسی ان کے لیے کسی شاک سے کم نہیں

تھی۔ ان کا ذہن ہر قسم کے سگنل پکڑنے سے قاصر ہو رہا تھا۔ ابھی تک ان کے فہم میں یہ بات نہیں سما رہی تھی کہ زوباریہ بغیر اطلاع دیے واپس بھی آ سکتی ہے۔

"بہت اچھا ڈرامہ تحریر کیا تھا آپ نے ممی! میں تو آپ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے آئی ہوں۔ ایک کہانی کو آپ نے لکھا، ترتیب دیا اور پھر اسکرپٹ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں تھما دیے۔" وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی تھی۔ یوں کہ اس کی سلگتی سانسوں کی تپش ان کے چہرے کو جھلسائے دے رہی تھی۔ مگر ان کے لب یوں ایک دوسرے میں پیوست تھے گویا آج کے بعد کبھی کھلیں گے ہی نہیں۔

"میری ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ ماہیر کے گھر چلی گئیں۔ پھر آپ نے ایک بے نام سی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا کر مجھے ماہیر عالم کے ساتھ باندھ دیا اور میں احمق اسی خوشی میں دیوانی ہو کر آپ کے ترتیب دیے گئے ڈرامے کا ایک حصہ بنتی چلی گئی۔ میں آپ کے اصل مقصد کو سمجھ ہی نہیں پائی۔ آپ کا مقصد تو صرف مجھے ایک انگوٹھی تھما کر محض بہلانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مجھے منظر سے ہٹا کر آپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کو مردہ مشہور کر دیا۔ مگر میں اکلوتی کہاں ہوں۔ آپ کے تو پہلے سے تین بیٹے موجود تھے۔ ایک زوباریہ کے نہ ہونے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ آپ کی خواہش تو پوری ہو گئی تھی۔ مجھ سے وابستہ ان دو لوگوں نے مجھے مردہ سمجھ کر شکرانے ادا کیے ہوں گے۔ آپ تو صرف ماہیر تک میری موت کی خبر پہنچانا چاہتی تھیں سو آپ کا یہ مقصد بھی کامیاب رہا۔

اور ادھر آپ آج تک مجھے جھوٹے دلاسے دیتی رہی ہیں۔ آپ کہتی تھیں ناکہ تقریباً روزانہ آپ کی ماہیر سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ بہت محنت کر رہا ہے۔ اسے اپنے گھر والوں کی ذمہ داریوں سے آزاد ہونا ہے۔ ابھی کل رات کو آپ مجھے بتا رہی تھیں کہ آپ ماہیر سے ملاقات کر کے آ رہی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ آپ کو زوباریہ کے ماہیر کی شکل تک بھول چکی ہے۔

اس کے نقوش تک آپ کو یاد نہیں آج اگر وہ آپ کے سامنے آ جائے تو آپ اسے ہرگز بھی پہچان نہیں پائیں گی۔ بھلا کیڑے مکوڑے جیسے حقیر لوگ آپ کے حافظے میں کس طرح سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ تو پھر ممی! آج مجھے اتنا بتا دیں کہ کیوں آپ نے میرے ساتھ جھوٹ کی اتنی داستانیں منتقی کر دی تھیں۔ آپ کے ہر جھوٹ کا پول کھل گیا ہے ممی! نو سال مجھے انتظار کی سولی پر لٹکانے کا بہت بہت شکریہ۔ نو سال تک ایک مٹی کا دیا آپ نے میرے ہاتھ میں تھمائے رکھا۔ نو سال تک میرا دل خوش فہمیوں کے ہنڈولے میں جھولتا رہا۔ نو سال تک میں اسی خوش گمانی میں گم رہی کہ ماہیر عالم میرے لیے اپنے گھر والوں کی ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کی تگ و دو کر رہا ہے۔ میں اس کے نام کا ورد کر رہی ہوں اور وہ میرا پابند ہے۔ وہ کسی اور سمت نہیں دیکھ پائے گا۔ اس لیے کہ وہ بدعہد نہیں ہے۔ قول نبھانے والا ہے۔ وہ اس نام و نہاد منگنی کے رشتے کو قبول کر چکا ہے۔ مگر میں جانتی تک نہیں تھی کہ میری ساری خوش فہمیاں میرے منہ پر آن پڑیں گی۔" اس کی آنکھیں اب آنسوؤں سے خالی تھیں۔ ایک قطرہ بھی نمی کا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"میں صرف اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ ماہیر چاہے گھر کو بسائے یا دل کو، وہ کل بھی میرا تھا۔ وہ آج بھی میرا ہے اور میں اسے کسی اور کا ہونے نہیں دوں گی۔ ایک دفعہ آپ کی سازش نے اسے مجھ سے چھین لیا تھا اور دوسری مرتبہ وقت نے اب کے جو بھی میرے راستے کی دیوار بنا سب مجسم ہوتا جائے گا۔ آپ سے صرف اتنی گزارش ہے، برائے مہربانی میرے معاملات پر نظر رکھنے کی ضرورت نہیں، کل سے میں آفس جوائن کر لوں گی۔ اپنے بزنس کی دیکھ بھال میں خود کروں گی۔ بہت عرصہ آپ نے حکومت کی ہے۔ اب کسی اور کو بھی سلطنت کی سمجھ بوجھ میں حصہ لینے دیں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولتی بہت اجنبی دکھائی دے رہی تھی۔ محترمہ تابندہ فلک ناز کا دل گویا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ آگے بڑھ کر زبردستی اسے خود میں بھینچ چکی تھیں۔

"میری جان! میری زوبلی' میری ہنی! میں نے جو کچھ بھی کیا' تیری بھلائی کے لیے کیا ہے تجھے کسی بھی آزمائش سے بچانے کے لیے کیا۔ میری جان! مجھے غلط مت سمجھو۔ میرا یقین کرو۔ مجھ سے بدگمان مت ہو۔ مجھے جو مناسب لگا میں نے وہ ہی کیا۔ اگر تجھے مارنے کا ڈرامہ نہ رچاتی تو شاید ماہیر کے گھر والے آج تک تجھے اس کے ساتھ منسوب سمجھتے۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ جب میں نے ماہیر کے نام کی انگوٹھی اس کی ماں کے ہاتھ سے اتار کر تجھے پہنائی تھی تب میں نے ماہیر کے اسٹیٹس تک سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ اس کی غربت کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ میں جمشید کی کہانی دوہرانا نہیں چاہتی تھی۔ میں کسی غریب شہزادے کے حسن سے متاثر ہو کر اپنے باپ کی طرح تیری زندگی کو جہنم نہیں بنانا چاہتی تھی مگر تیری محبت نے ۔۔۔ مجبور کر دیا تھا۔ میں دل سے یہ رشتہ قائم کر کے آئی تھی مگر پھر کیا ہوا؟ نو سال پرانی بات ہے مگر میرا حافظہ اب اتنا بھی کمزور نہیں ہوا کہ کچھ باتیں بھی یاد نہ رکھ سکوں۔

تمہاری بات سچ ہے کہ میں نے ماہیر کو صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔ پھر اس کے بارے میں معلومات بھی اکٹھی کی تھیں۔ مگر مجھے واقعی اس کی شکل بھول گئی ہے۔ بس ایک چیز میری یادداشت سے کبھی بھی نکل نہیں سکی۔ کاش میں یہ بات بھی بھلا دیتی مگر ایسا نہیں ہو سکا۔" وہ اس کی زخم زخم پیشانی کو بوسے دیتی بول رہی تھیں اور زوباریہ ابھی تک پتھر کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے سانس تک روک رکھا تھا۔

"پتا ہے کیا ہوا؟" ان کی آنکھوں میں سرخیاں گہری ہونے لگیں۔

"ایک روز بلا ارادہ ہی میں ماہیر کے گھر چلی گئی۔ نہ جانے کیوں؟ کس لیے؟ کیا وجہ تھی؟ بس میرے دل میں ایک بات سمائی تھی اور میں نے گاڑی کا رخ ان چھوٹی چھوٹی گلیوں کی طرف موڑ لیا۔ مجھے دیکھ کر ماہیر کی ماں پہلے کی طرح تپ اٹھی تھی اور وہ میرا لایا ہوا سامان اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی۔ وہ مجھے برا بھلا کہہ رہی تھی اور میں بھی کمال ضبط کے ساتھ سنے جا رہی تھی۔

جب وہ گالیاں دے دے کر ہانپنے لگی تو میری نظر نے ایک اور منظر دیکھا۔ کیا قیامت کا منظر تھا زوبلی! عجیب سے احساس نے میرے دل میں اسی وقت چٹکیاں بھرنا شروع کر دی تھیں۔ وہ نوعمر بچہ' ماہیر کا چھوٹا بھائی تھا اور جانتی ہو' وہ کون تھا؟ ایک ہیجڑا' تھرکتے قدموں والا بے ڈھنگی چال والا۔ میرا دل نہ جانے کیوں بری طرح سے اوب گیا۔ میں نے اسی وقت گویا فیصلہ کر لیا۔ مجھے تمہارے لیے ایسے خاندان کا انتخاب نہیں کرنا تھا جس کی ہر نسل میں ایک ایسا بچہ ضرور پیدا ہوتا تھا۔ مجھے اس بچے سے نہ چاہتے ہوئے بھی کراہیت آنے لگی اور میں نے نام نہاد منگنی کو ختم کرنے کے لیے تمہاری موت کا شوشا چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ ماہیر کی ماں محض دکھاوے کا غصہ دکھاتی ہے۔ درپردہ وہ راتوں رات امیر ہونے کے لیے بے قرار ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔

میری جان! میں نے صرف تمہاری بھلائی کے لیے ایسا قدم اٹھایا تھا۔ ورنہ تمہاری خوشی تو مجھے اپنی زندگی سے بھی عزیز ہے۔ میرا خیال تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ تم ضرور سنبھل جاؤ گی۔ جب تمہاری شادی ہو گی بچے ہوں گے تو تم سب بھول بھال جاؤ گی۔ تمہیں اپنی جذباتیت پر افسوس ہو گا۔ مجھے خبر نہیں تھی بیٹا! تم اور زرجان دو مختلف مردوں کی اولاد ہونے کے باوجود ایک سا دل اور ایک سے جذبات رکھتے ہو۔

میں ایک بدقسمت ماں ہوں۔ جس کی اولاد نے عین شباب کے عالم میں اپنے شیشے جیسے دل کو نہ جانے کون کون سے روگ لگا رکھے ہیں۔ تم دونوں کی خوشی مجھے جس قدر عزیز ہے اسی قدر یہ خوشی لاحاصل نظر آتی ہے۔" وہ تھک کر گویا خاموش ہو گئی تھیں۔ مگر زوباریہ کے ساکت وجود میں جنبش نہیں ہوئی۔

"ہنی! تمہارے ماتھے پر یہ زخم کیسے آئے؟" اب وہ بے قراری سے اس کی خون آلود پیشانی کو چھو رہی تھیں۔

"ماتھے کا زخم اتنا گہرا نہیں ممی! اس زخم کی فکر مت کریں۔ بس ایک مرتبہ میرے زخم خوردہ دل کو دیکھ لیجیے گا۔ یہ کسی اور کی محبت خود میں سمونے کے قابل نہیں ہے۔ یہ ہر وقت پھوڑے کی طرح دکھتا ہے۔ اس جلتے بلتے دل کو قرار نہیں آتا۔ میرے دل کے زخموں پر مرہم رکھ دیجیے ممی! یا پھر کوئی ایسی دعا کریں کہ یا تو میں ماہیر کی محبت میں فنا ہو جاؤں یا پھر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤں۔" وہ ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہی تھی۔ کبھی رونے لگتی اور کبھی ہنسنے لگتی۔ کبھی ایک دم بپھر جاتی تھی۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات کا شکار ہو رہی تھی۔ تاہم عفیفا کے گھر سے واپسی کے دوران وہ اپنا تمام تر لائحہ عمل تیار کر چکی تھی۔ سو اب وہ نماز پڑھنے کے لیے وضو کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سکون حاصل کرنا چاہتی تھی۔

تبھی تو اس نے جائے نماز پر بیٹھنے کے بعد پہلا سجدہ ادا کیا۔ اور دل ہی دل میں ملن کی دعا بھی کی تھی۔ لگن سچی تھی' عشق خالص تھا' محبت باقی تھی۔ دعا میں رقت تھی۔ لبوں پر فریاد تھی۔ آنکھ میں آنسو تھے۔ دل سجدہ ریز تھا۔ رب رحیم کی عدالت میں سربسجود تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہاتھ خالی تھے۔ جھولی خالی تھی۔ کشکول خالی تھا اور اوپر جو سات آسمانوں اور سات زمینوں کا خالق ۔۔۔ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ جو رگ وجاں سے قریب تر ہے۔ کیسے نہ پکار کو سنتا کہ اس کا بندہ بھٹک بھٹک کر پھر سے اس کی طرف تو آتا تھا۔ ہر دفعہ خالی ہاتھ لوٹایا جاتا تو پھر وہ جاتا کہاں؟ اور کبھی کبھی وہ اپنے بندوں کو نواز کر بھی آزماتا ہے۔

اور جب اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو خوش رنگ ماضی کی ایک جھلک نے اسے اپنی طرف بلا لیا۔ اس نے ٹھنڈے فرش پر لیٹے لیٹے ہی آنکھیں موند لی تھیں۔ ذہن دور' بہت دور سوچ کی انگلی تھام کر لڑکپن کو قریب لے آیا تھا۔ جب زوباریہ درانی نے محبت کے میٹھے میٹھے درد کو پہلی مرتبہ محسوس کیا۔

جب محبت نے اس کے دل پر پہلی پہلی واردات کی تھی اور وہ تتلیوں اور جگنوؤں کے دیس میں چپکے سے نکل آئی۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب بنفشی دریچے میں کھڑا 'مندی مندی آنکھیں کھولتا بند کرتا وہ نوعمر لڑکا سپاٹ سڑک پر جھانک رہا تھا۔ اس کی نیند سے بھری آنکھوں میں کسی کا انتظار چبھن دے رہا تھا۔ اس کی نوکیلی اوپر کو اٹھی ہوئی خوب صورت پلکوں سے سجی آنکھوں میں ہلکا ہلکا غصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس غصے کی جھلک نے اس کی مغرور ناک کو کچھ اور بھی مغرور بنا دیا اور خوابناک آنکھوں کی سرخیاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔ سورج کی گرم شعاعیں عین اس کے رخساروں پر سایہ فگن تھیں۔ تبھی تو اس کے سرخ وسفید گال دھوپ کی کٹیلی تپش سے دہک رہے تھے۔

یہ دو منزلہ مکان تھا۔ جس کی نچلی منزل کے سامنے بنی راہداری پر بھی چھت موجود تھی۔ راہداری کے آخری سرے پر موجود بڑا سا پھاٹک بند تھا۔

اوپری منزل کے واحد برساتی نما کمرے کا بنفشی دریچہ کھلا ہوا تھا اور وہ چہرہ بے زاری کی انتہا پر تھا۔ تھوڑی دیر بعد کالونی کی سڑک کے آخری سرے پر ایک لمبی سی چمکتی گاڑی آرکی تھی۔ بیک ڈور خود بخود کھل گیا تھا۔ وہ پونی ٹیل جھلاتی گاڑی میں سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کا ڈرائیور ڈگی میں سے درمیانے سائز کی اسپورٹس سائیکل نکال رہا تھا۔

وہ لڑکی اب سائیکلنگ کرتی ہوئی اسی بنفشی دریچے والے مکان کے قریب آرہی تھی۔ یہ کالونی بسم اللہ چوک کے نام سے مشہور تھی۔ بنفشی دریچے والے مکان کے اور برابر والے گھر کے علاوہ اس پوری کالونی میں مکانوں میں جدت دکھائی دیتی تھی۔ کچھ گھروں میں تعمیراتی کام ابھی جاری تھا۔

چونکہ سہ پہر کا وقت تھا سو کالونی کی سڑکیں ابھی تک سنسان تھیں۔ وہ سائیکلنگ کرتی بنفشی دریچے کے عین سامنے آرکی۔

"ماہی! ماہی' کہاں ہو؟ سامنے آؤ نا۔" وہ پنجوں پر وزن ڈالے اچک اچک کر دریچے میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ماہی کیا سو گئے ہو؟ بہت دھوپ ہے یار! سامنے

آؤ نا۔" وہ مسلسل آوازیں دے رہی تھی۔ سورج گویا اس کے سر پر کھڑا تھا۔ شدید تپش گویا اس کے وجود میں گھس گئی تھی۔

"ماہی! کیا ٹیوشن پڑھنے نہیں جانا؟ آج چھٹی مارو گے کیا؟" جواب اب بھی ندارد تھا۔ کچھ سوچ کر وہ قدرے جھک کر زمین سے ایک پتھر اٹھا کر نشانہ باندھنے لگی تھی جب دریچے میں ایک دفعہ پھر بے زار بے زار چہرہ سج گیا۔

"کہاں تھے تم؟" وہ تنک کر پوچھ رہی تھی۔ پتھر ابھی تک اس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔

"کب سے دھوپ میں کھڑی ہوں۔ پیاس کے مارے میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔ واٹ یو ڈو تھنک؟"

"میں تربوز کھا رہا ہوں۔ کھاؤ گی؟" اسے دھوپ میں کھڑا دیکھ کر گویا بے زار بے زار اس لڑکے کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ وہ بھی تو کب سے انتظار میں کھڑا تھا۔ سو اب حساب برابر ہو چکا تھا۔

"تم خود ہی فضول چیزیں کھاؤ۔ مجھے کوئی شوق نہیں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"میں تو کھا رہا ہوں، تم نہ کھاؤ۔" ماہیر اسے سرخ سرخ تربوز کے پیس دکھا دکھا کر کھا رہا تھا۔

"یہ اوچھی حرکتیں نہ کرو اور فٹافٹ نیچے آؤ۔ میں دھوپ میں فرائی ہو جاؤں گی۔"

"میں تمہیں فون پر بتا چکا ہوں کہ مجھے آج ٹیوشن کے لیے نہیں جانا۔ تم کیوں آئی ہو؟ جب کہ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا۔" وہ تربوز کا آخری پیس اس کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ پیس ڈائریکٹ اس کی ناک پر لگا تھا۔ زوباریہ غصے سے بھنا اٹھی۔

"نان سینس۔" وہ اپنی ننھی سی ناک ہتھیلی کی پشت سے رگڑ رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتی فورا" کتابیں لے کر نیچے آجاؤ۔"

"آج میں چھٹی پر ہوں سو تم اور فیفا دونوں چلی جاؤ۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"میں تمہیں لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔" زوباریہ ضدی لہجے میں گویا ہوئی۔ دھوپ کی تمازت سے پسینہ اس کے بالوں کی جڑوں میں سے بھی پھوٹ پڑا تھا۔

"مگر میں آج نہیں جا سکتا۔" ماہیر جھنجلا گیا۔

"وجہ۔" اسے اور بھی غصہ آگیا۔

"آج میں نے جمال انکل کی طرف جانا ہے۔" بالآخر ماہیر کو بتانا ہی پڑا۔ بچپن سے زوباریہ جمال انکل کا نام سن رہی تھی مگر آج تک اس نام سے مانوس نہیں ہوئی تھی۔ جب بھی اسے جمال انکل کے گھر جانا ہوتا تھا زوباریہ کو بے پناہ غصہ آجاتا۔

"روز روز کسی کے گھر جانا اچھا نہیں ہوتا۔" وہ غصہ چھپانے کی کوشش میں ہلکان ہو گئی تھی۔ ایک تو اسے غصہ بھی بہت آتا تھا۔ خصوصا" اس وقت جب ماہیر کو کسی رشتے دار کے گھر جانا ہوتا۔

"ہر روز کہاں جاتا ہوں۔ انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ خبر گیری کرنے جاؤں گا۔" اس کا انداز پر سوچ تھا۔

"کبھی تمہارے انکل بیمار ہو جاتے ہیں کبھی تمہاری پھوپھو بیمار ہو جاتی ہیں۔ ان کی خبر گیری کے لیے فورا" بھاگ نکلتے ہو۔ جب کہ تمہیں میری پروا ہی نہیں۔" جب سے دھڑکنوں نے انداز بدلے تھے تب سے ہی زوبی کو ماہیر کی بٹتی توجہ سے لاتعداد شکوے شکایات ہونے لگی تھیں۔

"تم بھی بیمار ہو کر دیکھ لو۔ تمہاری احوال پرسی کرنے بھی دوڑا دوڑا جاؤں گا۔"

"اچھا، نیچے تو آؤ نا۔" سخت کٹیلی دھوپ سے بے نیاز وہ ماہیر سے کچھ اور ساعتیں مانگ رہی تھی۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ روزانہ ہی ڈرائیور کے ساتھ بسم اللہ چوک آجاتی تھی اور پھر فیفا اور ماہیر کے ساتھ ہی اکیڈمی جاتی تھی۔ مگر ان دنوں اس کا مزاج نہ جانے کیوں چڑچڑا ہو رہا تھا اور نہ جانے کیوں فیفا اور ماہیر کی بے تکلفی بھی اسے سخت کھٹکنے لگی تھی۔

"ماہی! نیچے آجاؤ نا۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔ زوبی کے علاوہ کسی اور کی بھلا کیا مجال تھی کہ ماہیر کے نام کو بگاڑ دیتا۔ بس زوبی نے ہی اس کے نام کو دو حصوں میں

تقسیم کر دیا تھا۔

"کیا چھلانگ لگا دوں؟" وہ اس سے مشورہ مانگ رہا تھا۔

"ارے، نہیں تمہیں چوٹ لگے گی ماہی! اوپر سے کودنا مت۔" زوبی گھبرا کر بول اٹھی۔

"تو پھر کیا کروں؟" اس کا انداز پر سوچ تھا۔

"تمہیں اور فیفا کو اکیڈمی بھی تو چھوڑ کر آنا ہے۔"

"میں تو اکیلی بھی جا سکتی ہوں۔ اپنی فیفا کی فکر کرو۔ تمہاری پھوپھو اسے اکیلا نہیں جانے دیں گی۔" زوبی نے منہ بنا کر کہا۔ اسی پل فیفا بھی کتابیں سینے سے لگائے برابر والے گھر سے نکل آئی۔

"تم آگئی ہو زوبی۔"

"نہیں، راستے میں ہوں۔" زوبی نے تلملا کر جواب دیا۔ وہ سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا اپنا کتابوں والا بیگ چیک کرنے لگی۔

"فیفا! کیا تم زوبی کے ساتھ اکیڈمی چلی جاؤ گی یا میں نیچے آؤں؟" ماہیر فکر مندی سے پوچھ رہا تھا اور اس کی یہ فکر مندی زوبی کو قطعا" نہیں بھا رہی تھی۔

"فیفا کڈنیپ نہ ہو جائے، بہتر ہے تم ہی اسے اکیڈمی چھوڑ آؤ۔"

"تم اپنے ڈرائیور کو روک لیتیں۔ ہم دونوں اس کے ساتھ ہی چلی جاتیں۔" فیفا اس کا طنز سمجھے بغیر سادگی سے بولی تھی۔

"ڈرائیور کی ایسی کی تیسی۔ میں خود نیچے آ رہا ہوں۔" کچھ دیر بعد وہ سچ مچ نیچے آچکا تھا۔ زوبی اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

"کیا جمال انکل کی عیادت کے لیے نہیں جاؤ گے؟" وہ اسے مسلسل چھیڑ رہی تھی۔

"جاؤں گا ضرور جاؤں گا جمال انکل میرے ابو کے سب سے بہترین دوست ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔" وہ جتا زوبی کو رہا تھا اور دیکھ فیفا کی طرف رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور فیفا اس شرارت کا مفہوم اچھی طرح سے سمجھتی تھی۔

"جمال انکل سے ملنا اچھا لگتا ہے یا پھر مریم جمال کو چپکے چپکے دیکھنا۔" فیفا کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پائی۔ ماہیر اور زوبی کے درمیان ریس لگ چکی تھی اور ماہیر اس سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ جبکہ زوبی مسلسل چیخ رہی تھی۔

"ماہی جیت گیا اور میں ہار گئی۔"

☼ ☼ ☼

نیا نیا کالج جانا شروع کیا تھا۔ سو فیفا اور ماہیر دونوں خوب سج سنور کر کالج جاتے تھے اور زوباریہ تو تھی ہی بلا کی نفاست پسند۔ اب تو اس کی ڈریسنگ پہلے سے بھی زیادہ کمال کی ہو گئی تھی۔ ان دنوں اسے اپنی صحت اور اسکن کی بھی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اور وہ اپنا بھرپور خیال رکھنے لگی تھی۔ چکنائی سے اور مسالوں سے خاصا پرہیز کیا جا رہا تھا۔ فیفا اور ماہیر دونوں ہی اسے چڑاتے تھے۔

"جم جوائن کر لو۔ بھلا سموسے نہ کھانے سے تم دبلی ہو پاؤ گی؟"

"میں موٹی کہاں ہوں؟" وہ صاف مکر جاتی۔

"موٹی تو تمہاری بہن ہے زمیلہ۔"

"زمیلہ موٹی کہاں ہے؟" فیفا کو برا لگتا۔

"ذرا صحت مند تو ہے۔"

"تو میں کیا عابدہ پروین ہوں۔" زوبی کو غصہ آجاتا۔ ویسے بھی غصہ تو اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ماہیر موسمی بخار کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ بخار تو معمولی تھا تاہم بد احتیاطی کی وجہ سے میعادی بخار کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ چھوٹی عمر میں ذمہ داریوں کے ادراک نے اسے خاصا حساس بنا دیا تھا۔ کالج، اکیڈمی اور جاب نے ماہیر کو چکرا کر رکھ دیا تھا اوپر سے لو کے اثر نے بھی اپنا کام کر دکھایا۔ اس کی طبیعت کی خرابی نے جہاں فیفا کو بے چین کیا تھا۔ وہیں زوباریہ کو گویا زمان و مکان بھول گئے تھے۔ دو دن تو وہ صبر سے کالج آ رہی تھی۔ اکیڈمی سے ان دنوں چھٹیاں لے رکھی تھیں۔ تیسرے دن بھی جب ماہیر اور فیفا کالج نہیں آئے تو ۔۔۔ سخت پریشان ہو گئی

اور اسی پریشانی کے عالم میں وہ فیفا کے گھر چلی آئی۔ ماہیر کے گھر اس کا آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ فیفا کے گھر بے تکلفی سے آجاتی تھی۔ پچھلے دو دن سے وہ عجیب سا خواب دیکھ رہی تھی اور اس کے خواب بہت کم عمری سے ہی ماہیر کے اردگرد گھومنے لگے تھے۔ فیفا کے بتانے پر کہ ماہیر ڈاکٹر سرور کے کلینک میں ایڈمٹ ہے۔ اور اسے شدید بخار ہے۔ زوباریہ ماہیر کی تکلیف کا سنتے ــــ ہی الٹے قدموں واپس بھاگی تھی۔ اس کا رخ سرور کلینک کی طرف تھا اور وہ فیفا کے آوازیں دینے پر بھی نہیں رکی تھی۔

پرائیویٹ روم میں اس وقت ماہیر اکیلا ہی تھا۔ وہ آنکھوں سے ہی بہت بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھتے ــــ ہی گویشاش سا ہو گیا۔

"دشمنوں کو آگئی ہے ہماری یاد۔"

"دشمن کسے کہا ہے۔" زوبی اس کے ہاتھ پر لگی ڈرپ کو دیکھ کر ایک دم رو پڑی۔

"تم اتنے بیمار ہو ماہی! تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"اب کس کے بتانے پہ آئی ہو؟" وہ خوشدلی سے بولا۔

"اپنے دل کے بتانے پر۔" زوبی اس کے بیمار بیمار چہرے کو دیکھتے ہوئے لب کچلنے لگی۔

"تمہارا دل بڑی انفارمیشن رکھتا ہے۔" ماہیر گویا اس کے دل کی "کوئیک سروس" سے خوب متاثر ہوا تھا۔

"صرف تمہارے بارے میں پل پل کی خبر رکھتا ہے۔" سچائی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"یہ اعزاز میرے ہی حصے میں کیوں؟" ماہیر اپنا بخار و خار سب بھول چکا تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ اسکول و کالج میں زوباریہ کا ساتھ تھا۔ فیفا سے دوستی تھی جبکہ کالونی فیلو صرف ایک ہی تھا شاہنواز مگر شاہنواز کی بہت ساری فضول عادتوں کی وجہ سے ماہیر اس سے خار کھاتا تھا۔ ایک تو شاہنواز کو بات بہ بات جھوٹ بولنے کی عادت تھی۔ جس کی وجہ سے ماہیر اب اسے کم ہی منہ لگاتا تھا۔

"اس لیے کہ تم دل کے آس پاس رہتے ہو۔ اور رگ و جاں کے بہت پاس۔" زوبی کی آنکھیں لحظہ بھر کے لیے گلاب رتوں کے گلابی پن سے بوجھل ہوئی تھیں۔ یہ وہی گھڑی تھی جب ماہیر پہلی مرتبہ ٹھٹک گیا تھا۔ مگر اپنے وہم کو وہ مزید کئی سال تک جھٹلاتا رہا۔ اگر اسے زوبی کے بہت آگے چلے جانے کی خبر ہو جاتی تو وہ اپنی راہیں اسی وقت ہی جدا کر لیتا۔

"یہ بھی اعزاز صرف میرے لیے ہے؟" وہ اسی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ بغیر جھجکے اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ویسے بھی وہ بلا کی بولڈ تھی۔ دل میں بات رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

"تم بیمار تھے ماہی! اور میرا دل بری طرح سے بے چین ہو رہا تھا۔ جب بھی میرا دل بے چین ہوتا ہے۔ تم کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہو۔" وہ بھی بہت سادگی سے اپنے دل کے نہاں خانوں میں پنپتے جذبوں کو عیاں کر رہی تھی۔

"یہ تو تمہارا خلوص ہے زوبی۔" ماہیر اس کے خلوص سے سچ مچ متاثر ہوا تھا اور پھر جتنے دن وہ ہسپتال میں رہا۔ زوبی کے پیروں میں گویا پہیے لگ گئے تھے۔ دنیا کا ہر کام بھلائے وہ باقاعدگی سے ہسپتال کے چکر لگاتی تھی۔ آج کل اسے جرم کلب سب بھول چکا تھا۔

اور جب صحت یابی کے بعد وہ پہلی مرتبہ دوبارہ کالج آیا تو زوبی نے چپکے سے مٹھی بھر روپے خیرات کر دیے۔ وہ اپنی ماں کو اس طرح کا عمل کرتے باقاعدگی سے دیکھتی رہی تھی۔ بارہا محترمہ فلک ناز اس کا اور زر جان کا صدقہ دیتی اور نظر اتارتی تھیں۔ وہ بھی اپر کلاس کی بظاہر بہت لبرل یاں تھیں مگر اندر سے بالکل ایک عام عورت کی طرح تھیں۔ وہم اور توہمات پالنے والی۔

"خلوص نہیں محبت۔" زوبی بھی اس نئے انکشاف کو ابھی سمجھ نہیں پائی تھی حالانکہ یہ جذبہ تو ماہیر کے لیے ازل سے اس کے اندر کہیں موجود تھا اور دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف زوبی بلکہ اردگرد

کے لوگوں پر بھی منکشف ہو رہا تھا۔

"محبت۔" ماہیر کچھ حیران ہوا۔

"کیا یہ محبت صرف میرے لیے ہے یا پھر فیفا بھی اس میں شریک ہے۔" اس کا انداز اب بھی ہلکا پھلکا سا تھا۔

"صرف تمہارے لیے۔"

"کیا میں شکریہ بولوں؟" ماہیر نے الجھ کر پوچھا۔

"بھلا کس بات پہ۔" زوبی حیران ہوئی۔

"تمہاری اس محبت پر۔"

"میری محبت تمہارے تھینکس کی محتاج نہیں اور محبت میں تھینکس نہیں بولتے۔ اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو شکریہ ادا نہ کرو۔ محبت کے بدلے میں محبت کر لو۔" اس نے بڑی گہری سمندروں کی گہرائی جیسی بات کی تھی۔

"اچھا' یہ محبت ہوتی کیا ہے؟" دوائیوں کے ذائقے اور نرسوں کی شکلیں دیکھ دیکھ کر وہ سخت اکتا گیا تھا۔ ایک نئے ٹاپک پر بات کرنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ورنہ یہاں تو جو بھی آتا بس بخار کی نوعیت پر لیکچر ہی دیتا تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے؟"

"نہیں تو۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی؟" وہ اس عمر میں محبت کی باتیں کر رہی تھی جب تتلیوں کے رنگ چرانے کے لیے لڑکیاں پاگل ہوتی تھیں۔

"کیوں نہیں ــ مجھے اپنے ابو اور امی سے بہت محبت ہے۔ زمیلہ اور موبی سے بہت پیار ہے۔ تم اور فیفا بھی بہت عزیز ہو۔"

"میں اس محبت کی بات نہیں کر رہی۔" زوبی نے قل قل ہنسنا شروع کر دیا۔

"تو پھر؟" وہ قطعاً "نہیں سمجھا۔

"وہ جو مجنوں کو لیلیٰ سے ہوئی تھی۔ جو سوہنی کو مہینوال سے ہوئی تھی جو ہیر کو رانجھا سے ہوئی تھی اور جو زوباریہ کو ماہیر عالم سے ہوئی ہے۔" وہ ایک خواب کی کیفیت میں زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

"بھلا کب ہوئی؟" ماہیر کی آنکھوں میں حیرانی در حیرانی تھی۔

"شاید عالم بالا میں۔ جب روحوں کا ایک دوسرے سے ملاپ ہوا تھا۔ شاید تب سے ہی میری روح کو تمہاری روح سے محبت ہو گئی تھی۔"

"یہ کیسی افسانوں سے بات ہے؟" ماہیر اور بھی حیران ہوا۔

"افسانوی نہیں' رومانوی۔"

"یہ کس چکر میں پڑ رہی ہو ــــ" ماہیر نے سر جھٹکا۔

"ابھی تو اپنی اسٹڈیز کی طرف دھیان دو۔"

"اسٹڈیز کے لیے میں تم سے زیادہ سیریس ہوں۔"

"اوکے' اب تم جاؤ۔" اچانک ماہیر کو گزرتے وقت کا احساس ہوا تھا۔

"کیوں؟" زوبی خفا سی ہو گئی۔

"شام گہری ہو رہی ہے۔" اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

"تو مجھے شام سے کیا لینا دینا۔"

"دن ڈھلے گھر سے باہر نہیں رہتے۔" ماہیر کا انداز ناصحانہ تھا۔

"کیوں؟" وہ تنک کر بولی۔

"مسافر راہ بھول جاتے ہیں۔"

"اور میں تو چاہتی ہوں کہ مسافر سچ مچ راہ بھول جائے۔" اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔

"بھلا کیوں؟" وہ چونکا۔

"اس لیے کہ بھولے بھٹکے مسافر کو زوبی کے دل کے راستے پر چلنا آسان ہو گا۔" وہ محبت کا چراغاں آنکھوں میں سجائے منتظر سی کھڑی تھی اور نجانے کیوں ماہیر عالم نے نگاہ چرا لی۔ اسے نگاہ چرانا ہی تھی۔ سامنے کھڑی لڑکی اس کی منزل نہیں تھی اور جو اس کی منزل تھی وہ سامنے نہیں کھڑی تھی۔ اسی شہر میں اس کا گھر تھا اور ماہیر عالم ٹھہرا بھی اسی موڑ پر تھا جہاں سے حریم کی محبت کی شروعات ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں زوبی کو کچھ اور سوجھتا ہی نہیں تھا۔ بسم اللہ چوک کی ان سڑکوں پر دھوپ بہت شدت سے اترتی تھی اور وہ گھنٹوں بنفشی دریچے کے سامنے کھڑی رہتی۔ ماہیر کبھی تو سو رہا ہوتا تھا اور کبھی کسی کام میں مصروف ہوتا۔ جب اسے خیال آتا کہ زوبی نیچے کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ تب وہ دریچے کے دونوں پٹ کھول کر نیچے جھانکتا۔

"کیوں دھوپ میں کھڑی رہتی ہو؟ ڈرائیور کے ساتھ ہی چلی جایا کرو۔ میں فیفا کو لے کر آتو جاتا ہوں۔"

"مجھے اس جگہ کھڑے ہو کر تمہارا انتظار کرنا اچھا لگتا ہے۔" زوبی کی ہر منطق ہی نرالی تھی۔

"یہ کیا پاگل پن ہے۔" وہ ہاتھوں کا چھجہ بنا کر ماتھے پر رکھ لیتا۔

"سورج دیکھو، سوا نیزے پر ہے۔ ہاتھ بڑھاؤں اور اسے چھولوں۔ لو لگ جائے گی زوباریہ۔"

"تو لگ جائے۔" اس کی بے نیازیاں عروج پر ہوتیں۔

"میں تو عمر بھر اسی جگہ کھڑی تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔"

"سبحان اللہ۔" اس کا انداز بھرپور طنزیہ ہوتا۔

"آج کل کون سی رومانوی کتاب زیر مطالعہ ہے۔"

"تمہیں حفظ کر لوں ــــ میرے لیے یہی بہت ہے۔" اس کا انداز شاہانہ ہوتا۔

"اچھا تو کر لیا حفظ۔" اس کا انداز ہنوز طنزیہ ہوتا۔

"ابھی تو ابتدا ہے۔ انتہا دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"حیران کیوں؟" وہ چونکتا۔

"یہ آگ کا تھال دیکھ رہے ہو۔" زوبی یوں ہی پنجوں کے بل کھڑے کھڑے گھوم کر آگ اگلتے سورج کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتی۔

"ہاں ــــ تمہارے سر پر کھڑا ہے۔" وہ کھڑکی کی اوٹ میں دھوپ سے بچنے کے لیے کھڑا تھا۔

"نہیں، میری ہتھیلی پر رکھا ہے۔"

"بہت فلسفہ بگھارتی ہو، یا اندر آجاؤ یا چلی جاؤ۔"

"میں اندر نہیں کر سکتی۔" اس کی آنکھوں میں سوچ کی رانی اتر آتی۔

"کیوں؟"

"تم دروازہ نہیں کھولتے۔" اس کا انداز اب بھی کھویا کھویا تھا۔

"کھول تو رہا ہوں۔" وہ نیچے اترنے کے لیے مڑنے لگتا۔

"آں ہاں۔" زوبی ہاتھ کے اشارے سے روکنے لگتی۔

"کیوں؟" وہ رک جاتا۔

"میں اس دروازے کی بات نہیں کر رہی۔" وہ جوتے کی نوک سے گیٹ کو ضرب لگاتی۔

"تو پھر۔" ماہیر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا۔

"اپنے بائیں پہلو کی طرف دیکھو۔ زوبی کو اس گھر میں اپنی جگہ بنانی ہے۔" اس کے لہجے میں بچوں جیسا ضدی پن تھا۔

"بھاڑ میں جائے زوبی۔" ماہیر کو غصے آجاتا تھا، دریچے کے دونوں پٹ غصے سے بند ہو جاتے۔

"غصہ تو نہ کرو۔" زوبی پکار اٹھتی۔

"ماہی! واپس آؤ نا ــــ پلیز، آجاؤ نا۔" وہ نیچے دہائیاں دیتی رہتی۔ کبھی کبھی راحت بیگم غصے سے بل کھاتی گیٹ پر آجاتی تھیں اور زوبی سائیکل کو یوں بھگاتی کہ راحت بیگم سنسان سڑک کو دیکھتی رہ جاتیں۔

ماہیر باہر نکل رہا تھا جب پیچھے سے امی نے آواز لگائی۔

"اللہ کے حوالے، دھیان سے جانا۔ کالی بلی راستہ نہ کاٹ لے۔ نہ جانے اس سرپھری لڑکی کو دھوپ میں کھڑے ہو کر پسینہ پسینہ ہونے میں کیا مزا آتا ہے۔ رنگت اور بھی جھلس گئی ہے اس پاگل امیر زادی کی بھلا کوئی یوں احمقوں کی طرح گیٹ کے باہر گھنٹوں کھڑا ہوتا ہے۔" راحت بیگم کو کسی بھی دور میں زوباریہ پسند نہیں رہی تھی۔ ایک تو معمولی سے نین نقش اور اوپر سے ان کے بیٹے کے ساتھ دوستی۔ اپنے گورے چٹے بلا کے خوبرو بیٹے کے ساتھ زوباریہ کا کھڑا ہونا بھی انہیں گوارا نہیں تھا مگر ماہیر اور فیفا اس لڑکی کا ساتھ چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ وہ تو زوباریہ کو چاند کا گرہن کہتی تھیں۔ ان کی ہر بات ماننے والا ماہیر اس امیر زادی سے دوستی کو ختم ہی تو نہیں کرتا تھا اور جب انہوں نے ماہیر کو اس معاملے میں کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا تو ماہیر نے خود بخود زوبی کے ساتھ تمام تر تعلق توڑ لیے۔

ہوا کچھ یوں۔

وہ بھی گرما کے ہی دن تھے۔ سورج ہمیشہ کی طرح انگارے برسا رہا تھا۔ دھوپ میں ہمیشہ کی طرح تپش تھی۔ سڑکیں آج بھی سنسان تھیں۔ کالونی کی زیادہ تر کوٹھیاں آباد ہو چکی تھیں۔ وقت پانچ، چھ سال مزید آگے سرک گیا تھا۔ وقت کے آگے بڑھنے کے ساتھ عمر رواں کے کچھ سال بھی آگے کی طرف کھسک گئے تھے۔ لڑکپن نے کب کا الوداع کہہ دیا تھا۔ سو ترجیحات بھی بدل رہی تھیں۔ بدل چکی تھیں۔ بنفشی دریچے کے سامنے اب کوئی سائیکل لے کر کلیلی تیز دھوپ میں کھڑا نہیں ہوتا تھا۔

چند ماہ پہلے فیفا، ماہیر اور زوباریہ یونیورسٹی جیسی عظیم درسگاہ کو الوداع کہہ چکے تھے۔ فیفا نے دو چوٹیاں کرنا چھوڑ دی تھیں اور زوبی کی پونی ٹیل بل کھاتی چوٹی میں بدل چکی تھی۔

ماہیر ایک کمپنی میں بہت اچھی جاب سے منسلک ہو گیا تھا۔ اس کی مصروفیت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ فیفا بھی جاب کی تلاش میں تھی۔ زندگی رواں دواں تھی۔ وقت رکا تھا نہ لمحے رک پائے تھے اور نہ ہی کبھی گھڑی کی سوئیاں رکی تھیں۔ ہاں، زندگی زوباریہ درانی کے اردگرد کہیں ٹھہر گئی تھیں۔ رک گئی تھی۔ وہ جہاں سے چلی تھی آج بھی وہیں تھی۔ اسی جگہ پر، اسی موڑ پر ــــ شاید اس لیے بھی کہ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس نے اس جہاں میں ماہیر عالم جیسا دل ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور اس کے چہرے جیسا کوئی چہرہ زوباریہ کی آنکھ میں جچا ہی نہیں تھا۔ ان آنکھوں کے طلسم نے آج تک زوباریہ کو جکڑ رکھا تھا۔ نہ جانے ان آنکھوں میں کون سا جادو تھا۔ یا پھر ماہیر عالم خود ہی کوئی ساحر تھا۔ جس کے سحر نے زوباریہ کے اردگرد حصار باندھ رکھا تھا۔

وہ اب بھی ماہیر سے ملنے کے لیے آتی تھی۔ مگر فیفا کے علاوہ اس نے زمیلہ سے تعلق بنا لیا تھا۔ فیفا سے تو اب اس کا برائے نام تعلق رہ چکا تھا۔ شاید اس کے کھلم کھلا اظہار محبت نے فیفا کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب یونیورسٹی میں ان کا آخری سال تھا۔ وہ لائبریری سے اٹھ کر گروپ کی شکل میں گراؤنڈ کی گھاس پر بیٹھے تھے۔ اس کے دائیں بائیں اس کی دو کلاس فیلوز تھیں۔ جو اسی کی طرح اپر کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ نوشی اور دوحہ کا شمار ان کی فیملی فرینڈز میں سے ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ رمضان اور منیر تھے۔ فیفا اور ماہیر بھی موجود تھے۔ وہ سب کسی نہ کسی مصروفیت میں الجھے تھے۔ دوحہ اپنے ساتھ لایا ہوا ایک میگ دیکھ رہی تھی۔ جو اس کے ہاتھ سے منیر نے جھپٹ لیا تھا۔ نوشی جو رمضان کے ہاتھ کی لکیروں میں اس کی قسمت کا حال جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوحہ کے ہاتھ پھیلانے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فیفا اور ماہیر نہ جانے کس موضوع پر گفتگو میں مصروف تھے۔ جبکہ زوباریہ یک ٹک ماہیر کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ یہ اس کی نظروں کی تپش ہی تھی جو ماہیر اور فیفا دونوں کچھ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ادھر دوحہ نے اپنا شور مچا رکھا تھا۔

"مجھے میرا رائٹ مین کب ملے گا؟" دوحہ بے صبرے پن سے چیخ رہی تھی۔

"کم از کم ہاتھ کی لکیروں میں یہ نہیں لکھا۔ کب؟ کیوں اور کیسے ملے گا۔" نوشی نے آنکھیں دکھائیں۔

"تو پھر کیا لکھا ہے؟" وہ بھنا اٹھی۔

"تمہارے ہاتھ کی لکیریں ہی ٹیڑھی میڑھی ہیں۔"

"دفع ہو جاؤ۔" دوحہ کو غصہ آگیا۔

"مجھے بھی تمہارا ہاتھ دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑے۔

"زوبی کا ہاتھ دیکھ لو۔" منیر نے خاموش بیٹھی زوبی کو متوجہ کیا۔

"ہاں' زوبی! ذرا ادھر لاؤ' اپنا ہاتھ۔" نوشی ایک دفعہ پھر سے پرجوش ہو گئی تھی۔

"میرا ہاتھ دیکھ کر کیا کرو گی؟" زوبی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"تمہارا رائٹ مین تلاش کرے گی۔" دوحہ کھلکھلائی۔

"میرا رائٹ مین ہاتھ کی لکیروں میں نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا ہی جو ماہیر اور فیفا دونوں چونک گئے تھے۔

"تو پھر کہاں ہے؟" وہ سب بیک زبان چلائے۔

"میری نظر کے سامنے۔" اس کی آنکھوں نے ماہیر کے رنگ بدلتے چہرے کو مسکرا کر دیکھا تھا۔ ماہیر تو کیا فیفا تک ٹھٹک گئی اور باقی سب کو بھی گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔

"کون ہے وہ؟" رمضان سمجھ کر بھی انجان بنا۔

"وہ ہی جسے اللہ نے اتارا ہی زمین پر میرے لیے ہے۔" نہ جانے کیوں اس کے لہجے میں تکبر جھلکنے لگا تھا۔ فیفا کے دل کی دھڑکنیں گویا تھم تھم گئی تھیں اور ماہیر عالم کا فشار خون ایک دم بلند ہونے لگا۔

"اور وہ بانصیب آدمی بھلا کون ہے؟" منیر نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"جس کی روشن پیشانی کو دیکھ کر میری محبت نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں جس سے میری روح اوپر آسمانوں سے عشق کرنے لگی تھی۔ یہ وہ محبت ہے جو اللہ نے میرے دل میں خاص الخاص ماہیر عالم کے لیے اتاری ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے ہماری جنوں خیزی کے قصے گلی گلی' بازار بازار مشہور ہوں گے۔" وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں تو بہت کچھ کہہ رہی تھی مگر آج پہلی مرتبہ یوں اس نے خود کو اور ماہیر کو سب کی نظروں میں نمایاں کر دیا تھا اور ماہیر تو ان سب کی معنی خیز نظروں سے نا صرف شرمندہ ہوا بلکہ غصے کے مارے اس کا فشار خون بلند ہوتا چلا گیا۔ نہ جانے کیسے اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور زوباریہ کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔

"مت تشہیر کرو بے حیائی کی اس داستان کی تمہیں تو عزت خریدو گی تب بھی مل جائے گی۔ ہیروں اور جواہرات کے بدلے کہیں سے بھی خرید لو گی تاہم میں تو اتنا قلاش ہوں اس عزت کو کسی دوکان سے خرید نہیں پاؤں گا۔ دو چار ماہ رہ گئے ہیں۔ عزت کے ساتھ اس سفر کو اختتام پذیر ہونے دو۔ میں نہیں چاہتا کہ دوبارہ کبھی زندگی میں ہماری ملاقات ہو تو مجھے تمہیں دیکھ کر شرمندگی ہو اور تم اپنے ماضی پر شرمسار نظر آؤ۔"

اس کے لبوں سے سلگتے لفظوں کا ایک طوفان برآمد ہوا تھا۔ پھر وہ وہاں رکا نہیں بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکلتا چلا گیا تھا۔ فیفا بھی ایک متنفر سی نظر اس کی طرف اچھال کر ماہیر کے پیچھے چلی گئی جبکہ زوباریہ بجائے غصہ کرنے کے کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اور اس کے اردگرد ایک ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا اور وہ سب کو خوشی خوشی بتا رہی تھی۔ اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ وہ اس اظہار محبت پر بہت مسرور تھی۔

"میں اور ماہیر بچپن کے دوست ہیں۔ سولہ سال کی رفاقت میں پہلا تحفہ' پہلا انعام مجھے اس تھپڑ کی صورت میں ملا ہے۔ اللہ کی قسم! میں اس تحفے کو بہت دل کے ساتھ خوشی خوشی قبول کرتی ہوں۔" ادھر دوحہ اور نوشی اس کے پاگل پن پر حیران ہو رہی تھیں۔ حیران تو اس ہجوم کا ایک ایک فرد بھی تھا جو زوباریہ درانی کے عشق کی داستان کو اب نوٹس بورڈ پر جگمگاتا دیکھ رہے تھے۔

کوریڈور میں' گیلری میں' لائبریری میں حتیٰ کہ کلاس روم کی دیواروں پر بڑے بڑے۔۔۔ حروف میں لکھا جا رہا تھا۔

"ماہی! آئی لو یو۔۔۔ یہ زندگی ختم ہو جائے گی مگر زوباریہ درانی! کی یہ محبت کبھی ختم نہیں ہو گی۔ وجود کو موت آئے گی' جسم مردہ ہو گا' روح ساتھ چھوڑ دے گی مگر یہ محبت بے جان دل سے بھی کبھی ختم نہ ہو پائے گی۔ یہ کون سے عشق کی چاٹ مجھے لگائی ہے؟ یہ کون سا دریا ہے جو مجھے عبور کرنا ہے؟ یہ کون سی منزل ہے جہاں میرے قدم ٹھہر گئے ہیں؟ کوئی آ کے مجھے بتلائے کہ عشق کا کوئی وجود بھی ہوتا ہے؟" اور یہ سچ ہی تھا کہ صدیوں تک محبت کے اس قصے پر گرد نہیں پڑ سکتی تھی اور سب سے بڑا سچ یہ تھا کہ دیواروں پر لکھے یہ کارڈ یونی ورسٹی انتظامیہ تک بھی پہنچ گئے تھے۔ پرنسپل نے زوباریہ کا فیملی بیک گراؤنڈ جاننے کے باوجود اسے کریکٹر لیس سرٹیفکیٹ دینے کی دھمکی صرف اسے سنبھل جانے کے لیے دی تھی۔ وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھکنے لگے تھے۔ وہ اسے بتا رہے تھے کہ اس کا کیریئر داؤ پر لگ جائے گا۔ وہ تباہ ہو جائے گی۔ انہوں نے نرمی سے سختی سے ہر طرح سے اسے سمجھایا تھا اور یہ گنجائش بھی صرف زوباریہ کے لیے تھی۔

"محبت کرنا گناہ ہے؟ جرم ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے سزا دے دیں۔" پرنسپل اس کے باپ کے دوست نہ ہوتا تو زوباریہ یوں بے خوف ہو کر ان کے سامنے تن کر کھڑی نہ ہوتی۔

"مجھے مجبور مت کرو کہ میڈم کو تمہاری حرکتوں کے بارے میں بتانا پڑے۔" اس دفعہ وہ غصے سے چلا اٹھے۔

"آپ میڈم کو فون کر کے یونیورسٹی میں بلوالیں۔" وہ لمحہ بھر تنگ آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور انہوں نے سچ مچ محترمہ فلک ناز کو بلوالیا تھا اور وہ صاف لفظوں میں بتا رہے تھے کہ زوبی کو سنبھلنے کے لیے وہ صرف ایک موقع دیں گے۔ محترمہ فلک ناز ابھی پرنسپل کے آفس میں بیٹھی تھیں۔ جب کسی نے بدحواسی کے عالم میں اطلاع دی۔

"زوباریہ درانی نے اپنے دونوں ہاتھوں کی نبضیں کاٹ لی ہیں۔" یہ اس کی خودکشی کی پہلی کوشش تھی جو ماہیر عالم کے کھاتے میں لکھ دی گئی۔

اس تماشے کے بعد ماہیر صرف ایک مرتبہ فائنل ایگزامز کے لیے یونی ورسٹی آیا تھا اور اس کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا نہیں تھا۔ وہ ان راہوں سے اپنے اور زوباریہ کے قدموں کے نشان مٹا دینا چاہتا تھا جن راستوں سے ماضی میں وہ اس کے ہمراہ چلتا رہا تھا۔ مگر بسم اللہ چوک میں اترنے والی سہ پہریں یونی ٹیل جھلاتی اس پاگل پاگل لڑکی کی محبت اور اس کے جنون کی آج بھی گواہ تھیں۔

وہ آج بھی آگ اگلتی سڑکوں کو روندنے کے لیے آجاتی تھی۔ وہ آج بھی بنفشی دریچے کو گھڑی بھر کے لیے ضرور دیکھا کرتی تھی۔ مگر اب اس دریچے میں سے کوئی چہرہ نہیں جھانکتا تھا۔ وہاں اب بھی کبھار زمیلہ کھڑی نظر آتی تھی اور زوباریہ نے زمیلہ کو ماہیر تک پہنچنے کے لیے سیڑھی بنا لیا تھا۔ اب وہ گیٹ کے باہر کھڑے رہنے کی بجائے بلا جھجک گھر کے اندر بھی چلی آتی تھی۔ اور زمیلہ اسے دیکھ کر گویا کھل اٹھتی۔

زوباریہ سے دوستی کے دوران زمیلہ کی بہت سے خواہشات بن کہے پوری ہو جاتی تھیں۔ جبکہ راحت بیگم کو یہ دوستانہ خاصا کھٹکتا تھا۔

زوباریہ اکثر اس اکیڈمی میں بھی پہنچ جاتی تھی جہاں ماہیر کچھ عرصے کے لیے پڑھاتا بھی رہا تھا۔ اور ماہیر کو لگتا تھا یا تو زوباریہ پاگل ہو جائے گی یا پھر اسے پاگل ضرور کر دے گی۔

وہ جوں ہی کلاس اٹینڈ کر کے باہر نکلتا تھا۔ زوباریہ کے قدم اس کے ہمراہ چلنے لگتے۔ حالانکہ ان دونوں کے درمیان بات چیت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ گھر میں بھی آتی تو ماہیر یا تو گھر سے باہر نکل جاتا تھا یا پھر کمرے میں بند ہو جاتا۔ مگر وہ بھی تو ڈھیٹوں کی ملکہ تھی۔ مجال ہے جو اس کی بے اعتنائی یا بے رخی سے ذرہ بھر دل برداشتہ ہو جاتی۔

"تمہارا دل تو آزاد ہے' میری محبت سے بری ہے' بے قید ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ میرے دل کو زیبائش ہی تمہارے نام سے ملتی ہے۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ ماہیر اس کی کسی بات کو سرے سے سن ہی نہیں رہا پھر بھی نہ جانے کس آس پر رازِ دل منکشف کرتی رہتی تھی۔

"کبھی گھٹا' ابر باراں' دل' بارش بن کر برسونا۔"

خواہش، التجائیں لبوں سے پھوٹ رہی تھی۔
"تمہاری محبت، میرے دل میں ہمیشگی، دائمی اور ابدی نیند کی اوڑھنی میں لپٹی ہے اور میرا دل اسی احساس کی وجہ سے ترو تازہ، شاداب اور سرسبز رہتا ہے۔"
"کبھی میرا دل جلتا ہوا دیا بن جاتا ہے اور کبھی روشن چراغ۔ دونوں صورتوں میں رات دن جلنا میرا نصیب ہے۔ کوئی ایسا اسم ہی پھونک دو جو ان دھڑکنوں کو ہی قرار آجائے۔ یا پھر دل کے آبلوں پر ٹھنڈی ٹھار پھوار ہی برس جائے۔" سنہری کرنیں اس کے اردگرد بکھر جاتیں۔
"محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ سر جھکا دیا ہے، محبت کو عبادت کی طرح سمجھا اور عشق کی نماز کے لیے رکعت باندھ لی۔" اس کی آنکھ میں بجے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے۔
"تمہاری محبت کی تسبیح میرے ہاتھ میں ہے اور میں پھولوں کی ایک چادر کے اوپر سے گزر رہی ہوں۔ اس بات سے بے خبر کہ یہ پھولوں کی ایک چادر نہیں انگاروں سے سجا فرش تھا۔" اس کی آواز میں عرب کے صحراؤں جیسی خشکی بھر جاتی۔ ماہیر اس کی طرف دیکھے بغیر اپنے کیبن کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کے پیچھے نہ آتی۔ ماہیر اس کے ڈھیٹ پن سے تنگ آجاتا تھا۔ اس کے ضبط کا پیمانہ گویا چھلک پڑتا۔
"زوبی! تم اچھا نہیں کر رہیں۔"
"کیا اچھا نہیں کر رہی۔" وہ گویا سرشار ہو گئی تھی کہ ماہیر کچھ بولا تو ہے۔
"یہ سب تمہیں زیب نہیں دیتا۔" وہ جھنجلاتا۔
"تم سمجھتی کیوں نہیں...... میں بہت مشکل دور سے گزر رہا ہوں۔ یہ سب میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ بہت ذمہ داریاں ہیں مجھ پر تم کیوں آسانیاں چھوڑ کر مشکلات کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔"
"میں تمہاری سب ذمہ داریاں بانٹ لوں گی۔ تم حیران رہ جاؤ گے اور تمہارے سب کام ایک فون کال کے محتاج ہوں گے صرف۔ میں تمہاری ہمراہی چاہتی ہوں ماہیر! میں تم سے محبت کرتی ہوں، اور یہ میرے اختیار میں نہیں۔" وہ گویا پھر سے رو دینے کو تھی۔
"اور تمہارے ساتھ چلنا میرے بھی اختیار میں نہیں۔ مجھے ایک بات تو آج سمجھ میں آہی گئی ہے کہ کیوں ہمارے مذہب میں مرد اور عورت کی دوستی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس لیے کہ نفس اور شیطان ہمیشہ ہمراہ ہوتے ہیں۔ کبھی بھی بھٹکا سکتے ہیں۔ گمراہ کر سکتے ہیں۔ مگر میں گمراہ نہیں ہونا چاہتا۔ بہتر یہی ہے اپنے راستے الگ کر لو۔ میرا اور تمہارا ایک ساتھ چلنا کبھی ممکن نہیں۔" وہ دو ٹوک زہر خند لہجے میں کہتا رہا۔
"کیوں ممکن نہیں۔" وہ سسک اٹھی۔
"ہم شادی کریں گے۔ آج سے تین سال پہلے اگر تم مان جاتے تو اس وقت تم لگژری لائف گزار رہے ہوتے۔ ہم امریکہ چلے جاتے۔ تمہارا فیوچر برائٹ ہوتا۔"
"میری لائف اب بھی بہت لگژری ہے۔ بات ساری دل کے اطمینان کی ہوتی ہے۔ میرا دل مطمئن ہے اور میں مانگے تانگے کی آسائشات کے حصول پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تم میرے مزاج کو اچھی طرح سے سمجھتی ہو۔" وہ سلگ کر بولا۔
"مزاج کو سمجھتی ہوں، تبھی تو ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ خود کو با نصیب سمجھا کرو ماہیر! محبت تمہارے قدموں میں بیٹھی خود کو بے مول کرتی ہے۔" آنسو اس کے گال بھگونے لگتے تھے۔
"مت مجھے گناہ گار کیا کرو...... میں ایک عام سا انسان ہوں۔ مجھے بہت عام ہی رہنے دو، اتنا خاص مت بناؤ اور خود کو اتنا ارزاں بھی نہ کرو۔ پلٹ جاؤ...... کہ تمہاری دنیا میں، تمہارے لیے بہت کچھ ہے اور میری دنیا میں حریم جمال کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔" وہ لب بھینچے سوچ کی گہرائی میں اتر رہا تھا۔
"زوبی! کیوں چل پڑی ہو ان راستوں پر، جس کی منزل کوئی نہیں۔ کوئی ایک وعدہ کوئی ایک قسم ہی یاد دلا دو مجھے۔ میں نے تو انجانے میں بھی تمہیں جھوٹی آس دلانے کی کوشش نہیں کی۔"
"کاش تم ایسا کر لیتے۔ کہ میں تمہیں اسی ایک قسم اور ایک وعدے کے بدلے میں جیت لیتی۔ تم قسم اور عہد کو نبھانے والے ہو۔"
"خوف آتا ہے مجھے تمہاری ان باتوں سے ڈر لگتا ہے کہ کبھی تمہاری یہ باتیں میرے لیے بد دعا نہ بن جائیں۔ تمہارے آنسو میرے لیے سمندر نہ ہو جائیں۔ طوفانی لہریں مجھے تباہ نہ کر دیں۔ یوں نہ کرو زوبی! اپنے دل کے گنبد کو اپنے ہاتھ سے مت توڑو۔ تمہارے دل کا منبر بہت بلند ہے زوبی! میں بہت معمولی انسان ہوں۔ اس منبر تک پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ مجھے میری ہی نظر سے مت گراؤ۔ میں عمر بھر نگاہ اٹھا نہیں پاؤں گا۔ مجھے اس کسک کے ہمراہ عمر بھر زندہ رہنا پڑے گا کہ میری وجہ سے کوئی دل بے آباد رہا۔ میری مجبوریوں کو سمجھو، میرا بھی اپنے دل پر کوئی اختیار نہیں۔"
"تو اپنے دل کے سارے اختیارات میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں تم سے بدلے میں محبت نہیں مانگوں گی۔ بس مجھے عزت دینا اور اپنے ساتھ کا مان بخش دو۔ میں عمر بھر تم سے شکوہ نہیں کروں گی۔ کچھ اور نہیں چاہوں گی۔ یہ میرا وعدہ رہا تم سے۔" وہ روشن قندیلیں سجائے کھڑی تھی۔
"ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ ہرگز بھی نہیں۔" ماہیر نے لمحہ بھر میں ساری قندیلوں کو ایک پھونک سے بجھا دیا تھا۔ یوں کہ زوباریہ درانی کی پوری ذات اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

زوباریہ درانی کون تھی! محترمہ تابندہ فلک ناز کے دوسرے شوہر...... سے اکلوتی اولاد...... اس اکلوتا پن نے زوباریہ کو کس قدر تنہا کر دیا تھا۔ یہ سچ تھا کہ فلک ناز نے اپنی اولاد کو بے تحاشا محبت سے نوازا تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ زوباریہ کے پاپا کی ناگہانی موت کے سبب وہ بزنس کے جھمیلوں میں بھی الجھ کر رہ گئی تھیں۔ انہیں اپنے باپ کے کاروبار کی طرف بھی دھیان دینا ہوتا تھا۔
وہ تین سال کی تھی جب درانی صاحب کی ڈیتھ ہو گئی۔ ممی اپنے بکھرے بچوں، کاروبار اور دو گھروں میں گویا گھن چکر بن گئیں۔ ان کی توجہ کیا تقسیم ہوئی تھی زوباریہ کی ذات بھی کئی حصوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔ اس کی سوچ اور مزاج بھی تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ نوکروں کے ہجوم کے درمیان بھی وہ اکیلی تھی اور اسی تنہائی نے بہت کم عمری میں اسے حساس بنا دیا تھا۔ وہ بیک وقت، بہت نرم خو بھی تھی۔ ہمدرد بھی تھی۔ احساس و خیال رکھنے کے طریقوں سے بھی آگاہ تھی اور دوسرے ہی پل وہ ایک جھگڑالو، غصیلی، مغرور اور نک چڑھی امیر زادی کی تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی تھی۔
اس کی شخصیت کے یہ دو رخ اس کی عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھ رہے تھے۔ وہ توجہ کے جن ادوار میں سے گزر رہی تھی۔ یہ اکیلا پن اس کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔
اس کی یہ تنہائیاں نئے اسکول میں ایڈمیشن کے ساتھ ہی خود بخود ختم ہو گئیں۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی مگر خوب صورتی بہت چھوٹی عمر میں اس کے ننھے سے ذہن میں سما گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب کلاس ٹیچر اسے ایک کالی بھدی لڑکی اور موٹے بدصورت لڑکے کے درمیان میں رکھی چیئر پر بٹھانا چاہ رہی تھیں تو زوبی گویا بدک کر دور ہٹ گئی۔
"بے بی! کہاں بیٹھنا چاہو گی؟" زوبی کو پسند ناپسند کا اختیار دے دیا گیا تھا۔ سو وہ پورے کلاس روم کو طائرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"یہاں......" اس نے پہلی رو کے آخر میں بیٹھے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ایک گوری چٹی لڑکی بھی بیٹھی تھی۔
"او کے۔" ٹیچر نے فوراً اس گوری چٹی لڑکی کو کرسی سے اٹھا دیا۔
"عفیفا! آپ یہاں آجاؤ۔" ٹیچر نے ماہیر کے

ساتھ ہی عفیفا کو بھی جگہ بنادی تھی یوں زوباریہ نے اس اسکول میں دوستی کی ابتدا ماہیر عالم سے کی تھی اور پھر عفیفا بھی اس کے دوستوں میں شامل ہو گئی۔ ان دونوں کے علاوہ یونی ورسٹی تک اور اس کے بعد بھی زوباریہ نے آج تک کوئی دوست نہیں بنایا تھا۔ دوستوں کا خانہ ماہیر اور فیفا کے تعلق توڑ دینے کے بعد بھی خالی رہا تھا۔ ہاں' امریکہ میں وقتی طور پر وہ شیری کے خلوص سے کچھ متاثر ضرور ہوئی تھی۔ مگر وہ بھی بلا کا فراڈیا نکلا۔ بغیر بتائے نہ جانے کہاں بھاگ گیا تھا۔ زوباریہ کو آج بھی وہ دن یاد تھا جب ممی نے ماہیر کے نام کی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں پہنائی تھی۔

"زوبی! یہ انگوٹھی تمہارے دل کی تسلی کے لیے ہے۔ اب تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"کون سا وعدہ۔" زوبی تو گویا ہفت اقلیم کی دولت پا کر اپنی سدھ بدھ بھول رہی تھی۔ بار بار اس پرانے ڈیزائن کی انگوٹھی کو دیکھتی' آنکھوں سے لگا کر چومتی۔

"تمہیں امریکہ جانا ہو گا۔ ہائیر اسٹڈیز کے لیے۔" وہ بہت تول تول کر بول رہی تھیں۔

"مجھے منظور ہے۔ مگر کیا ماہیر میرے ساتھ نہیں جا سکتا؟" وہ خوش رنگ خوابوں کے جزیرے میں رقص کر رہی تھی۔ اس کے پیروں میں گویا گھنگرو بندھ گئے تھے۔

"نہیں۔" ان کی آواز برف کی طرح سرد تھی۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔" وہ اس خوشی کی بدولت کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بس دل تھا کہ خوشی کے مارے دیوانہ ہو رہا تھا۔

"ماہیر کو دس سال کا وقت درکار ہے اور کم از کم اتنا ہی عرصہ تمہیں بھی فل اسٹیبلش ہونے اور بزنس کے اسرار سمجھنے میں لگ جائے گا۔ وطن واپسی پر تم دونوں کی دھوم دھام سے شادی کروں گی۔ بس' شرط صرف اتنی ہے کہ پیچھے رہ جانے والوں سے تم رابطہ نہیں رکھو گی۔"

"جی ممی۔" یہ کچھ مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں۔ اسے ماننا تو ہر صورت میں تھا۔ کیونکہ اس کے دل کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو رہی تھی۔

"میں ماہیر سے ہمیشہ رابطے میں رہوں گی مگر اس کے سامنے کبھی نہیں آؤں گی۔ وہ اپنی ترقی کی راہ میں کسی سیڑھی کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ ہمیں اس کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔" وہ لفظوں کی کہانیاں بن رہی تھیں۔ زوباریہ کی تیسری مرتبہ خودکشی کی کوشش نے ان کے سارے بل نکال دیے تھے اور وہ دل پر پتھر رکھ کر ماہیر عالم کے گھر گئی تھیں۔ ان کا دل تو پہلے بھی اس رشتے کے حق میں نہیں تھا مگر زوباریہ کے چلے جانے کے بعد ان پر مولی کے بارے میں انکشاف کیا ہوا وہ اس نام نہاد تعلق کو خود ہی ختم بھی کر آئیں۔ اور پھر انہوں نے لفظوں کی ایک اور کہانی بنی تھی۔ نہ جانے کیوں ان کے لاشعور میں یہ وہم زندہ تھا کہ کبھی نہ کبھی زوباریہ سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ کسی نہ کسی موڑ پر ضرور سامنے آجائیں گے اور اس کے لیے بہتر یہی تھا کہ زوباریہ کو ان لوگوں کے لیے مار دیا جاتا۔ سو انہوں نے سچ مچ زوباریہ کو مار دیا تھا اور زوباریہ واقعی مر بھی گئی تھی۔

جس محبت کی گرمی نے اسے اللہ سے اور بھی نزدیک کر دیا تھا۔ جس عشق کے حصول نے اسے نماز کی طرف متوجہ کیا تھا۔ جن دعاؤں کے یقین نے پردیس میں اس کی تنہائیوں کو بانٹا تھا اور جس محبت کی طلب نے اسے کبھی تھکایا تک نہیں تھا۔ آج وہ محبت اس کے لیے پرائی اور اجنبی تھی۔

"ماہیر عالم نے شادی کر لی۔ یعنی وہ کسی اور کا ہو گیا۔" یہ سوچ ہی اسے زہر زہر کر رہی تھی۔ وہ بھیگی آنکھوں کو پونچھ کر اٹھی۔ بہت عقیدت کے ساتھ جائے نماز کو لپیٹا تھا' وہ ماضی سے پیچھا چھڑا کر حال کی طرف لوٹی تھی۔ اور اب اسے ماضی میں زندہ نہیں رہنا تھا۔ اب اسے اپنے حال کو سنوارنا تھا اور اس نو سال کے طویل ترین انتظار کو' کرب اور اذیت کو کسی اور کی آنکھ میں بھر کے خود کو شاد کرنا تھا۔ وہ اپنے زخم زخم دل کے ساتھ مزید ظلم نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے ماہیر عالم کو حاصل کرنا تھا۔ اور اس جنگ کو بھلا کیسے جیتنا تھا؟ یہ بات تو وہ بہت پہلے فیفا سے ملاقات کے بعد ہی سوچ بھی چکی تھی۔ اب تو صرف عمل باقی تھا۔

☼ ☼ ☼

"صاحب! میڈم فلک ناز آپ سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔" ملازمہ نے مودب لہجے میں اسے مطلع کیا۔

"میڈم میرے گھر میں آئی ہیں۔" خواجہ اسجد تو حیران ہی رہ گیا تھا۔ آج سے پہلے ان کی جب بھی ملاقات ہوئی تھی۔ کسی نہ کسی ہوٹل میں یا پارٹی میں ہی ہوئی تھی۔ میڈم کا اس کے گھر آنا' اسے کافی الجھا گیا تھا۔ جب وہ انہی سوچوں میں گم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میڈم کو کچھ متوحش سا اپنا منتظر پا کر حیران ہی رہ گیا۔ انہوں نے باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے صاف اور سیدھی بات کی۔

"میں نے تم سے ایک کام کہا تھا۔" ان کی آواز میں بات کے رد کیے جانے کی وجہ سے کافی تلخی تھی۔

"مجھے یاد ہے مگر....." وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔

"اگر مگر کیا؟" ان کی آنکھوں سے غصہ چھلکنے لگا۔

"زرجان کی ماہیر سے خاصی انڈراسٹینڈنگ ہے۔ مجھے زرجان نے منع کر دیا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اپنی ڈیل بھی واپس لیتی ہوں۔" وہ ایک دم پھٹ پڑی تھیں۔

"میڈم' آپ تو خفا ہی ہو گئیں۔ مجھے کچھ سوچنے کے لیے وقت دیں۔" اسجد گھبرا اٹھا۔ میڈم کی خفگی کا تو تصور کرنا ہی نقصان سے خالی نہیں تھا۔

"میں تمہیں دو منٹ سوچنے کے لیے دیتی ہوں۔" وہ گویا بہت جلدی میں تھیں۔

"میڈم پلیز!" اسجد جھنجلا گیا۔

"میڈم! آپ تو جانتی ہیں۔ کسی ایک بھی ورکر کو ادھر ادھر کرنا باقاعدہ حکمت عملی کے تحت ہوتا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے ہاں یا ناں میں جواب دو۔" وہ ایک دم کھڑی ہو گئیں۔

"آپ پلیز بیٹھیے تو سہی۔" گھر آئی لکشمی کو لوٹانا کہاں کی عقلمندی تھی۔ اسجد کا لہجہ یکسر بدل گیا۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے۔" ان کی نظریں اپنی کلائی پر بجی گھڑی پر تھیں۔

"اوکے میڈم! آپ جو چاہیں گی وہ ہی ہو گا۔" اس نے فوراً" ہتھیار پھینک دیے۔

"ہوں۔" انہوں نے گویا ہنکارا بھر کے کچھ دیر کے لیے سوچا۔

"مجھے کیا کرنا ہو گا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ماہیر کو ٹرمینیٹ کر دو۔"

"اس کے علاوہ کچھ۔" خواجہ نے موبائل ہاتھ میں لے کر ایک میسج لکھ کر فوراً" سینڈ کر دیا۔

"ماہیر نے کمپنی سے کچھ لون وغیرہ لیا تھا؟"

"جی۔"

"اس کا فوری مطالبہ کر دو۔" وہ تول تول کر بول رہی تھیں۔

"اور کچھ؟" خواجہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"ماہیر پر تین کروڑ کی رقم غبن کرنے کا مقدمہ درج کروا دو۔" وہ آخری بات کہہ کر رکی نہیں تھیں۔ جاتے جاتے مزید انہوں نے کہا۔

"ماہیر کو ہر صورت جیل بھجوا دو۔ اس کا ہر صورت منظر سے ہٹنا ضروری ہے۔"

"اوکے میڈم!" خواجہ نے گہرا طویل سانس کھینچ کر اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ماہیر کے ساتھ زیادتی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر پھر بھی۔

❋

(آخری قسط آئندہ ماہ)

صائمہ احمد

من کی چھاؤں

ندی کے قریب بننے والے پل کا ٹھیکہ سکندر کی کمپنی کو ملا ہوا تھا چھوٹی سی بستی کے رہائشی بھی اس کام کی وجہ سے آج کل برسر روزگار تھے اور خوش تھے کہ ان کی اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو عزت کی روٹی کھلا رہے ہیں۔

سارا دن کی محنت کے بعد رات جب وہ گھر میں داخل ہوتے تو نا صرف وہ خود مطمئن ہوتے بلکہ گھر والے بھی خوشی سے ان کا استقبال کرتے۔

یہ چھوٹی سی بستی ان ہی غریب لوگوں پر مشتمل تھی جو محنت مزدوری کر کے گزارا کر رہے تھے۔ انہی لوگوں میں سکندر نام کا ایک خوب صورت نوجوان بھی تھا۔ عادت و اطوار اور انداز گفتگو دونوں سے معلوم ہوتا کہ اس کا تعلق شریف گھرانے سے ہے۔ ٹھیکیدار اس پر بے پناہ اعتماد کرتا تھا۔ اس کی ایمانداری کی وجہ سے زیادہ تر کام اس کے ہی ذمے تھا۔ حتیٰ کہ حساب کتاب، روپوں کا لین دین گاؤں کے لوگ بھی اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

کئی دنوں سے شہر میں ایک تھیٹر آیا ہوا تھا اور شازیہ نام کی ایک ایکٹرس کا بہت چرچا تھا۔ شازیہ کو حسن و نزاکت بھی کچھ سوا ہی ملا تھا۔ سرو قد، غزالی آنکھیں، نازک گلابی ہونٹ، ستواں ناک جہاں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے وہیں اس کی مسکراہٹ لوگوں کے دلوں پر بجلیاں گرا دیتی۔ اس پر اس کی قاتل ادائیں۔ جب اسٹیج پر آ کر وہ اپنے لمبے سیاہ بال ایک ادا سے جھٹکتی تو کتنے ہی مردوں کے دل اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو جاتے عورتیں خود دم بخود اس کے حسن سے مرعوب اپنے شوہروں سے نظریں چرانے لگتیں۔

شازیہ جب اسٹیج پہ آتی جو جانے کتنے دلوں پر بجلیاں گر جاتیں چھوٹے سے بانس کے ٹکڑوں سے بنے ہال میں سکوت ہو جاتا اور لوگ سانس روکے اس کا رقص دیکھتے، جب وہ کمر لچکاتے ہوئے اور سڈول بازو اور مرمریں کلائیوں کی جنبش سے ذرا مسکرا کر شرم آگیں چتونوں سے دلوں کو پامال کرتی، پاؤں کی ہلکی ہلکی ٹھوکروں سے گھنگھروؤں کو حرکت دیتی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر طاؤس کی طرح رقص کرتی تو پورا ہال دم بخود سا اس کی اداؤں پر فدا ہوتا پھر رقص ختم ہونے کے بعد تالیوں کی گونج سے ہی پتا چلتا کہ وہ جا چکی ہے۔

شازیہ نے چھوٹے سے کمرے میں آ کر بے دلی سے سارے زیورات اتارنے شروع کر دیے وہ جانتی تھی سب اس کے حسن کے پجاری ہیں۔ سب اس کا ظاہر دیکھتے ہیں کوئی ایسا نہیں جو اس کے اندر جھانک سکے اس کے دل کے زخم دیکھ سکے۔ تمام مرد اس کی ایک جنبش پر جان تو دے سکتے تھے مگر یہ نہیں جان سکتے تھے کہ اسے کسی غمگسار کی ضرورت ہے۔ جو اس سے پیار بھری باتیں کرے، اس کی سنے اور اس کے دکھ کا مداوا کرے۔ وہ مردوں کی گرمجوشی سے بالکل متاثر نہ ہوتی بلکہ وہ بھی ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتی اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی اور ان کے جنوں عشق کو ایک سودائے خام سمجھ کر وقت گزار دیتی۔

شازیہ کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی، جس کے پہلو میں جذبات سے لبریز ایک دل ہو، اسے ایک رفیق حیات کی تمنا تھی، جو اس کے ظاہر کو نہیں اس کے باطن کا عاشق ہو جو صرف اسے اس کے لیے چاہے اور یہ ناممکن سی خواہش تھی کیونکہ وہ اس دنیا کے لوگوں کو جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سکندر رقص ختم ہوتے ہی تالیوں کی گونج پر ہوش میں آیا اور سامنے اسٹیج پر دیکھا وہاں پردہ گر چکا تھا تمام تماشائی آہستہ آہستہ باہر نکل رہے تھے شازیہ کے حسن کے قصیدے پڑھتے، سکندر بھی باہر نکل آیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا بادلوں نے اور بھی اندھیرے کو گہرا کر دیا تھا۔ اپنی دھن میں چلتے چلتے اچانک ایک جانب سے اس نے کسی کو دبی آوازیں کہتے سنا۔

"پروگرام تو کب کا ختم ہو گیا پھر باہر کیوں نہیں آئی۔ اتنی دیر ہو گئی ہے۔"

"دوسرے راستے سے تو نہیں نکل گئی۔"

"نہیں یہیں سے آئے گی۔ وہ ڈائریکٹر جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے یہیں سے گزرتا ہے اس کا ڈرائیور گاڑی لے کر نہیں آیا ہو گا۔"

"بڑی خبر رکھتا ہے تو اس کی۔" دوسرے نے معنی خیزی سے کہا۔

"رکھنی پڑتی ہے مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ چیز بھی تو اتنی عمدہ ہے۔ انسان کو خود اپنی خبر نہیں رہتی اس کی موجودگی میں۔"

"ہا ہا لگتا ہے۔ کچھ زیادہ ہی محبت ہو گئی ہے؟"

"ہاں بہت زیادہ۔" پہلے نے کہا۔

"کب تک انتظار کرے گا تو اس کا اور اگر آج وہ اکیلی نہ ہوئی تو؟"

"تو کیا ہوا.... یہ ہے نا....." اندھیرے میں کوئی چیز چمکی۔

"یار تیرے ارادے تو بہت خطرناک ہیں۔ جان سے جائے گا۔"

"بزدل کیا تو نے اسے دیکھا نہیں۔ اس کے لیے تو کوئی بھی اپنی جان دے سکتا ہے اور کسی کی لے بھی سکتا ہے۔"

"ہاں واقعی ہے تو بے حد حسین۔"

"بس کچھ دیر کی بات ہے پھر آج رات وہ میری آغوش میں ہو گی اوہ کتنا خوب صورت تصور ہے۔"

"سوچ لے یار ایک بار پھر۔" دوسرے آدمی نے اسے سمجھایا۔

"تو ڈر مت یار۔" پہلا پھر بولا۔ اتنے میں سامنے سے گاڑی کی لائٹس روشن ہوئیں دونوں چوکنا ہو گئے اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

سکندر ایک جھاڑی کے پاس چھپا یہ سب باتیں سن رہا تھا اس نے تعجب سے ان دونوں کو جاتا دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔

"یہ کیسی محبت ہے ایک لڑکی کی رفاقت حاصل کرنے کے لیے اسے مارنے کے درپے ہیں۔ محبت صرف قرب کا نام ہے کیا؟ اچھا چلو مان لیا کہ محبوب کا قرب بہت حسین ہوتا ہے مگر کیا زبردستی کسی کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔" سکندر نے الجھ کر سوچا اور پھر قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

جہاں پل بن رہا تھا وہیں قریب ہی ایک رہائشی کالونی میں تمام مزدور رہائش پذیر تھے۔ کام ختم ہو جاتا تو وہ بھی شہر اپنے اپنے گھر۔ چلے جاتے جو دوسرے شہروں سے آئے ہوئے تھے۔

ڈائریکٹر رستم ایک بہت دولت مند شخص تھا۔ شروع شروع میں وہ صرف اسٹیج ڈرامے کرتا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ شازیہ لگ گئی شازیہ کے حسن و جمال کو اس نے کیش کروانا شروع کیا اور اب وہ دونوں ہاتھوں سے دولت کما رہا تھا۔ اسے شازیہ کے جذبات و احساسات کی کوئی پروا نہیں تھی بظاہر اس نے شازیہ پر کوئی پابندی نہیں لگوائی تھی مگر شازیہ جانتی تھی کہ وہ رستم کے چنگل سے نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ ہر شخص اس کے حسن کا، جسم کا طلب گار تھا اور نوٹوں کی طلب رستم کو تھی اسے نہیں تھی۔ ان ہی طلب گاروں میں عمر بھی تھا۔ اس نے بیش قیمت تحائف دے کر شازیہ کو رام کرنا چاہا مگر شازیہ نہیں مانی اور اس نے عمر سے اجتناب کرنا شروع کر دیا اب کچھ عرصے سے عمر کی

طرف سے خاموشی تھی اور شازیہ مطمئن تھی کہ وہ اسے بھول گیا ہے اور یہ شازیہ کی بھول تھی۔

☼ ☼ ☼

شو ختم ہونے کے بعد وہ ایک ادا کے ساتھ قدم اٹھاتی ——— اور مسکراتی ہوئی ہال سے نکل گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ اندر بیٹھ گئی اس کے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔

"مجھے لگ رہا ہے یہ اسی کی گاڑی ہے۔ چلو تم اپنی بائیک اسٹارٹ کرو اور ذرا فاصلے سے اس کا پیچھا شروع کرو۔" شازیہ کی گاڑی کے پیچھے ان دونوں کی بائیک تھی۔ سکندر پیدل چلتا ہوا اپنی رہائش گاہ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا ایک گاڑی رکی ہے اس کے عقب میں اس نے رک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک گاڑی کو دو موٹر سائیکل سواروں نے روک رکھا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس جو کچھ دیر پہلے جل رہی تھیں اچانک بجھ گئیں۔

اس وقت بازار بالکل سنسان پڑے تھے، بارش ہو رہی تھی اور ہوا بہت تیز تھی پھر بادل کی گرج اور چمک نے مل کر رات کی تاریکی کو اور بھی ہولناک کر دیا تھا۔ اس تاریکی میں گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے جو کچھ دیر کے لیے روشنی کی تھی۔ اس کے بند ہونے سے دوبارہ تاریکی پھیل گئی۔

شازیہ کار میں بیٹھی اپنے خیالوں میں محو تھی گاڑی کے اچانک رکنے پر اس نے حیرت سے ڈرائیور کو دیکھا ایک لڑکا جس کے ہاتھ میں خنجر تھا ڈرائیور کو اشارے سے باہر اترنے کا کہہ رہا تھا۔ ڈرائیور گاڑی سے اترتے ہی لڑکے کو دھکا دے کر تیزی سے بھاگ گیا۔ اور اس کے ساتھی نے دوسری طرف آ کے اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور بولا۔

"براہ مہربانی نیچے اتر آئیے۔"

"عمر!" شازیہ نے طنزاً کہا۔

"یہ تم ہو۔"

"جی ہاں آپ کا نیاز مند۔" عمر ہنس کر بولا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" شازیہ نے ناگواری سے کہا۔

"کیا آپ نہیں جانتیں؟" عمر بولا۔

"تو گویا اب تم زبردستی کرو گے۔" شازیہ نے دانت پیس کر کہا۔

"کیا کروں۔ آپ آمادہ ہی نہیں ہو رہی ہیں میری باتوں پر۔" عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اور نیچے اتارنے لگا۔

"دیکھو! دست درازی مت کرو۔" شازیہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اس کا نتیجہ اچھا نہ ہو گا۔"

"کیا ہو گا نتیجہ؟ میں نتائج کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے بس آپ کا ساتھ چاہیے۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تم اچھا نہیں کر رہے نہ اپنے ساتھ اور نہ ہی میرے ساتھ۔"

"میں جانتا ہوں۔" عمر نے ہنس کر کہا۔

"مگر میں اپنے ساتھ تو اچھا کر رہا ہوں یہ میرا دل کہہ رہا ہے۔"

"یہ تمہارا دل کیسا ہے، جو ایک عورت کی بے عزتی کو کہہ رہا ہے۔" شازیہ نے غصے سے کہا۔

"کیا کروں اس کمبخت نے ہی مجبور کر رکھا ہے مجھے اسی کی تو مان رہا ہوں۔" عمر اس کا ہاتھ اپنے دل پر رکھتے ہوئے بولا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو۔" شازیہ نے سختی سے کہا۔

"یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے تھوڑی پکڑا ہے۔" یہ کہتے ہوئے شازیہ کا دوسرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

"خبردار! جو مجھے ہاتھ بھی لگایا۔" اس دفعہ اس نے چیخ کر کہا لیکن اب دونوں نے کھینچ کر اسے نیچے اتار ہی لیا اور کھینچتے ہوئے درختوں کی طرف لے کر جانے لگے۔

"چھوڑ دو! ہٹ جاؤ۔" کی آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا یہ سکندر تھا' جو اب تک درختوں کی جھنڈ میں خاموشی سے کھڑا ان لوگوں کی تکرار سن رہا تھا۔

"لو آگیا ہیرو ایسے موقعوں پر اسی طرح ہیرو کی انٹری ہوتی ہے نا۔" عمر نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"ہاں اور اس ہیرو کی پٹائی بھی خوب ہوتی ہے، مجھ جیسے ولن کے ہاتھوں۔" کہتے ہوئے عمر کے ساتھی نے آگے بڑھ کر دو چار گھونسے سکندر کے منہ پر مارے سکندر ان کے حملوں سے لڑکھڑا گیا اور زمین بوس ہو گیا۔ اس دوران شازیہ نے بھی اپنا ہاتھ چھڑوا لیا تھا اور اب تیزی سے سکندر کی طرف بڑھی۔ سکندر تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور شازیہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے کی طرف دوڑنے لگا۔

"خبردار جو تم نے قدم آگے بڑھائے۔ میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔" اس سے پیشتر کہ وہ دونوں آگے بڑھتے عمر چاقو نکال کر سکندر پر جھپٹا۔ سکندر نے شازیہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور عمر سے گتھم گتھا ہو گیا اسی کشمکش میں سکندر کے ہاتھ کو زخمی کر گیا۔ تیزی سے نکلتے خون نے عمر اور اس کے ساتھی کو پریشان کر دیا۔ اس کا ساتھی اپنا آپ چھڑا کر بھاگا عمر کو سکندر نے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا اور ایک گھونسا اس زور سے اس کی کنپٹی پر مارا کہ عمر لڑکھڑا کر کار کے مڈگارڈ پر گرا اور پھر نہ اٹھا۔

شازیہ اس قدر خوف زدہ تھی کہ اسے اس دوران بھاگنے کی بھی جرات نہ ہوئی۔ وہ گلی میں ایک طرف کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ سکندر نے اپنا زخمی ہاتھ آستین کے اندر کر لیا اور شازیہ کو مخاطب کیا۔

"چلیے میں چھوڑ دیتا ہوں آپ کو کہاں جانا ہے۔ آپ کا تو ڈرائیور بھی موقع پا کر فرار ہو چکا ہے۔"

"آپ کو میری وجہ سے اتنی تکلیف اٹھانی پڑی آپ کو زیادہ تو نہیں لگی۔" شازیہ خوفزدہ آواز میں بولی۔

"آپ گھبرائیے نہیں۔" سکندر بولا۔

"چلیے! جہاں آپ کو چلنا ہے۔"

دونوں خاموش جا رہے تھے۔ سکندر کے ہاتھ میں سخت تکلیف تھی۔

شازیہ کی رہائش بستی کے اس حصے کی طرف تھی جہاں لوگوں کی آمدورفت کم رہتی تھی جب وہ اپنے گھر پر پہنچی تو رات اور گہری ہو گئی تھی وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی اور پیچھے مڑ کر سکندر کو دیکھا سکندر نے اسے اندر جاتے دیکھا اور واپس پلٹنے والا تھا کہ شازیہ نے اسے پکار لیا۔

"آئیے نا اندر آجائیں آپ کے زخم سے بہت خون نکل رہا ہے اس کی ڈریسنگ کر دوں میں۔"

"نہیں! اس وقت تو بہت رات ہو گئی ہے میں چلتا ہوں۔" سکندر نے کہا۔ لیکن شازیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"نہیں.... میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ پلیز اپ اندر آجائیں۔" شازیہ نے سکندر کا ہاتھ پکڑ کر اندر بلانا چاہا سکندر کے منہ سے سسکی نکلی اور شازیہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔

"دیکھوں تو!" شازیہ نے کلائی پکڑ کر سیدھی کی پھر ہتھیلی میں ایک گہرا زخم دیکھ کر ششدر سی رہ گئی۔

"اف توبہ! اتنا خون بہہ رہا ہے۔ آئیے اندر۔"

سکندر اندر داخل ہو گیا۔ شازیہ نے پانی گرم کر کے اس کا زخم دھویا اور فرسٹ ایڈ باکس نکال کر اس کے زخم کی بینڈیج کی اور فرسٹ ایڈ باکس رکھنے دوسرے کمرے میں چلی گئی سکندر نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اچھا خاصا کشادہ کمرہ تھا۔ اور خاصا ڈیکوریٹڈ بھی تھا اس نے توصیفی نظروں سے اردگرد دیکھا اس دوران شازیہ بھی چلی آئی اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔

"اب مجھے اجازت دیں بہت رات ہو گئی ہے۔" کہہ کر سکندر کھڑا ہو گیا۔

"جانے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے ذرا بیٹھیے تو سہی ایک کپ چائے پی لیں میں نے بنائی ہے۔ لے کر آئی ہوں۔" سکندر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ادھر نگاہ ڈال کر کہنے لگا۔

"یہ آپ کا گھر ہے؟ بہت خوب صورت ہے۔" شازیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"یہ گھر نہیں عارضی ٹھکانہ ہے آج یہاں ہوں کل نہ جانے کہاں ہوں گی؟" شازیہ کے انداز میں افسردگی تھی۔

"تو اپنا مستقل ایک گھر بنا لیں۔ آپ کے پاس تو روپے پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں۔"

"گھر کیا صرف روپے پیسے سے بنتا ہے۔" شازیہ نے سادگی سے سوال کیا۔

"نہیں' مگر پیسہ بھی ضروری ہے گھر بنانے کے لیے؟"

"چھوڑیں ان باتوں کو آپ شاید نہیں سمجھیں گے یا سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہ رہے۔" یہ سن کر سکندر نے شازیہ کی طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا' شازیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ یہ بتائیں اس مصیبت میں کیوں پڑے؟" اس کا اشارہ اس کی مدد کی طرف تھا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں آپ کی مدد کرنے کی میں اتفاق سے پاس سے گزر رہا تھا' آپ کی آواز سن کر میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ چپکے سے گزر جاؤں۔"

"شکریہ۔" شازیہ نے مسکرا کر کہا۔

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

"احسان کیسا؟ یہ تو میرا فرض تھا۔"

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟" شازیہ نے پوچھا۔

"مزدوری!"

"مزدور تو میں بھی ہوں۔" شازیہ بولی۔

"ہاں مگر آپ مجھ سے زیادہ سخت کام کرتی ہیں۔ میں آپ کی محنت کا معترف ہوں اب میں چلوں۔"

"لیکن آپ کا ہاتھ تو زخمی ہے اب کام کیسے کریں گے۔" شازیہ نے پوچھا۔

"دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا پریشان نہ ہوں آپ۔" شازیہ نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آپ.... ؟ یہ دوا پی لیجیے درد کم ہو جائے گا' پھر چلے جائیے گا۔"

"میرا نام سکندر ہے۔ اور آج پہلی مرتبہ آپ کا پروگرام دیکھ کر واپس گھر جا رہا تھا۔ کہ یہ واقعہ ہو گیا۔" سکندر نے اس کے انداز سے خود ہی اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"آپ مجھے کب سے جانتے ہیں؟"

"آج ہی دیکھا ہے۔"

"آپ ان لوگوں کو تو جانتے ہوں گے۔" شازیہ نے کہا۔

"نہیں۔" سکندر نے کہا "میں نے ان کی باتیں سنی تھیں۔"

"باتیں؟ کیسی باتیں؟" شازیہ کو تعجب ہوا۔

سکندر نے جو کچھ سنا تھا شازیہ سے کہہ دیا۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"آپ کے بیوی بچے تو ہوں گے؟" شازیہ نے پوچھا۔

"ابھی تو اس جنجال میں بھی نہیں پڑا۔" سکندر نے پہلی بار ہنس کر کہا۔

"تو شادی بیاہ کو آپ جنجال سمجھتے ہیں؟" شازیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"تو اور کیا؟ غریبوں کے لیے تو جنجال ہی ہے۔" سکندر بولا۔

"اور آپ غریب بھی ہیں۔" شازیہ مسکرا کر بولی۔

"جی ہاں۔" سکندر نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے اب مجھے اجازت دیں۔ بہت رات ہو گئی ہے آپ بھی آرام کریں۔" کہہ کر سکندر کھڑا ہو گیا شازیہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

"میں آپ کا شکریہ تو ادا نہیں کر پاؤں گی ہاں مگر اتنا ضرور کہوں گی آپ جیسے لوگ دنیا میں کم کم ہیں جو اپنی جان کی پروا کیے بغیر کسی کی عزت بچا لیں۔ اللہ اس کا اجر دے گا آپ کو۔" کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ سکندر مسکرا کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

اس دن کے بعد سے شازیہ گم سم رہنے لگی۔ ہر وقت سکندر کے بارے میں سوچتی رہتی۔
”کیا انسان ایسے بھی ہوتے ہیں اتنے اچھے دل کے مالک‘ کتنا پاکیزہ دل عطا کیا ہے اللہ نے اسے‘ کاش اس دل میں میرے لیے محبت بھی ہوتی۔
محبت! کتنا دلکش احساس ہے لیکن ہے کہاں؟ میں نے تو آج تک اس جذبے کو محسوس نہیں کیا روزانہ ہزاروں بار اس لفظ کی گردان سنتی ہوں مگر بے خیال الفاظ ـــ بے معنی باتیں ہیں پھر اب کیوں میرا دل چاہنے لگا ہے کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔
محبت! مجھ سے؟ ناممکن پھر اس نے میری جان کیوں بچائی ـــ؟ اسے کیا پڑی تھی جو میری خاطر اتنی تکلیف اٹھائی کیوں؟ کس لیے؟ کیا محبت! نہیں! انہیں محبت ہوتی تو مجھے اس طرح بھول کیسے جاتا ملنے آتا۔
لیکن میں بھی تو نہیں گئی۔ مجھے اس کی خیریت معلوم کرنے جانا چاہیے تھا میری خاطر وہ زخمی ہوا اور میں نے خبر تک نہ لی۔ مجھے جانا چاہیے اس کے پاس ـــ“ کہہ کر شازیہ نے پرس اٹھایا اور باہر نکل گئی دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر سیٹھ پر پڑی۔
”کہاں کی تیاری ہے؟“ رستم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور شازیہ کو مسلسل کھڑے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔
”کہیں جا رہی ہو؟“ اس نے دوبارہ پوچھا اور اندر داخل ہو کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔
جب سے شازیہ نے رستم کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تھا رستم نے کبھی تحائف اور روپوں کے معاملے میں شازیہ کو کسی تنگی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ شازیہ کی ہر خواہش کا احترام کرتا۔ اس کی زبان سے نکلتے ہی اس کی فرمائش پوری کر دیتا۔ لیکن شازیہ اس کی اس قدر محبت اور التفات پر کبھی مطمئن نہ ہوتی وہ جانتی تھی یہ سب کچھ وہ اس لیے کر رہا ہے کہ وہ اس کے لیے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ہے اس کا بے حد خیال وہ اسی وجہ سے رکھتا ہے کہ وہ خود بھی اس کی وجہ سے دونوں ہاتھ سے دولت کما رہا تھا۔ لیکن کل جب یہ حسن و شباب نہیں رہے گا تو شازیہ کی قدر و قیمت بھی وہ نہیں رہے گی جو آج ہے۔
شازیہ ان باتوں کو خوب سمجھتی تھی اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی‘ جو پھول کو محض اس کی رعنائی اور تروتازگی کے لیے نہ چاہے‘ بلکہ مرجھانے کے بعد بھی اسے پھول سمجھ کر اسے محبت سے اپنے پاس رکھے۔
رستم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کے خیالات سے چونکا دیا۔
”کہاں گم ہو؟ کیا سوچ رہی ہو؟“
”کہیں نہیں یہیں ہوں اور اپنے دل سے باتیں کر رہی ہوں۔“ شازیہ نے اپنے خاص انداز سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
”کہاں جانے کا ارادہ تھا؟“ رستم نے مسکرا کر پوچھا۔
”دل کے پاس ـــ“
”دل کے پاس‘ کیا مطلب؟“ رستم نے حیران ہو کر پوچھا۔
”میرا مطلب ہے میرا ایک دوست ہے اس کے پاس جا رہی تھی۔“ شازیہ رستم کی طرف دیکھ کر بولی۔
”اوہ اچھا‘ اچھا تو چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔“
”چلیں۔“
”گاڑی کہاں لے جاؤں؟“ رستم نے پوچھا۔
”اس بستی کے لیے جو پل بن رہا ہے وہاں۔“ رستم نے گاڑی پل کے پاس لے کر روک دی۔ وہاں مزدور کام کر رہے تھے۔
شازیہ نے اس سے پوچھا۔
”سکندر کہاں ہو گا؟“
”شہر کے چوک میں ایک ہوٹل ہے‘ سکندر عموماً رات کے وقت وہاں چلا جاتا ہے‘ آپ کو وہ وہیں ملے گا۔“ شازیہ نے شکریہ ادا کیا اور دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھی‘ رستم جو اس وقت خاموش بیٹھا تھا بولا۔

”یہ سکندر کون ہے؟“
”میرا محسن۔“ شازیہ نے کچھ روکھے پن سے کہا۔
”کب سے شناسائی ہے؟“
”بظاہر تو لمحہ بھر کی شناسائی ہے مگر دل کا رشتہ جنم جنم کا لگتا ہے۔“ رستم نے حیرت سے شازیہ کو دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
ہوٹل کے پاس پہنچ کر رستم نے گاڑی روکی اور شازیہ نے اتر کے ادھر ادھر دیکھا بہت سے آدمی میزوں پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک میز پر اسے سکندر بیٹھا نظر آ گیا۔ چائے کی پیالی سامنے رکھی تھی‘ بائیں ہاتھ میں ابھی تک پٹی بندھی تھی اور وہ اپنے خیالوں میں محو تھا‘ شازیہ کچھ دیر اس کے پاس خاموش کھڑی رہی تمام لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور حیران تھے کہ اتنی مشہور ایکٹرس اس جگہ کیوں آئی‘ لیکن سکندر اپنے خیالوں میں کچھ اس قدر محو تھا کہ اسے شازیہ کے ہوٹل میں آنے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔
سکندر نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر کھڑا ہو گیا۔
”ارے آپ‘ آپ یہاں کہاں ـــ“ اس نے ارد گرد دیکھا۔
”میں آپ کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔ اب آپ کا زخم کیسا ہے؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔
”زخم؟ ـــ میرا! اچھا ہے۔“ سکندر نے یہ الفاظ کچھ اٹک کر کہے۔
”اتنے دن کہاں رہے آپ؟“ شازیہ نے پھر پوچھا۔
”کہاں رہا؟“ سکندر نے اس کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور کہا۔
”کام پر۔“
”آپ کا اس کام میں بہت لگتا ہے؟“ شازیہ نے مسکرا کر پوچھا۔
”ہاں مزدور لوگ ہیں زندہ رہنے کے لیے کام ضروری ہے۔“
”آپ دوبارہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے۔“ شازیہ نے پھر مسکرا کر اپنے خاص انداز سے سر ہلا کر پوچھا۔ لیکن اس سوال کا جواب صرف ایک ٹھنڈی سانس تھی۔
”آپ کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔“ شازیہ نے آہستہ سے کہا۔
”آنا تو چاہتا تھا لیکن ـــ“ سکندر نے ذرا سا سر ہلا دیا۔
”لیکن ـــ کیا لیکن‘ ہاں میں جانتی ہوں آپ کیوں نہیں آئے۔“ اب شازیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
”آپ کی عزت پر حرف آتا اگر آپ دن کی روشنی میں رقاصہ کے گھر آتے۔“
”نہیں ـــ نہیں ایسی بات نہیں ـــ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ آپ نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچیں بس اسی لیے نہیں آیا۔“
”آپ آئیں گے تو مجھے خوشی ہو گی آپ کے آنے کی۔“ شازیہ نے پرس اٹھاتے ہوئے جانے کے ارادے سے اٹھتے ہوئے کہا۔
”سچ ـــ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔“ سکندر نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔
”ہاں میں وہ سچ کہہ رہی ہوں جو آپ نہیں کہہ سکے۔“
کہہ کر وہ باہر جانے لگی سکندر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
کچھ لوگ تو اٹھ کر چلے گئے اور کچھ ابھی بیٹھے دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور رستم کار میں بیٹھا جانے کن سوچوں میں گرفتار تھا۔
کچھ دیر بعد شازیہ‘ سکندر کو ساتھ لیے ہوئے ہوٹل سے باہر نکلی اور ـــ رستم کے پاس آ کر بولی۔
”ان سے ملیں یہ ہے میرا محسن سکندر۔“
رستم نے سکندر کی طرف ذرا حقارت سے دیکھا اور ہنس کر کہا۔

"اوہ آپ۔۔۔ آپ نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے جو شازیہ آپ کو محسن کہہ رہی ہیں۔"
"انہوں نے میری جان بچائی تھی غنڈوں سے۔"
"تو کیا انعام دیا تم نے؟" رستم بولا۔
"اچھا رکو میں انہیں انعام دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر رستم نے کوٹ کی جیب سے سرخ اور ہرے نوٹ بغیر گنے سکندر کی طرف بڑھا دیے۔
"سیٹھ صاحب یہ نوٹ آپ اپنے پاس رکھیں آپ کو زیادہ ضرورت ہے ان نوٹوں کی؟" اس وقت سکندر نے نہایت حقارت سے ۔۔۔ رستم کی طرف دیکھا' لیکن رستم پر اس کے طنز کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا پھر شازیہ سے کہا۔
"اب چلیں۔"
"سیٹھ صاحب آپ جائیں میں کچھ دیر سکندر کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سکندر کا ہاتھ تھام لیا۔۔۔ رستم نے ناگواری سے ان دونوں کو دیکھا اور تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا آگے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

رستم نے جیب سے ایک خوب صورت کنگن کا سیٹ نکالا اور شازیہ کے ہاتھ تھام کر اسے پہنانا چاہا شازیہ نے ہاتھ بھینچ لیا۔
"رہنے دیں سیٹھ صاحب یہ تکلف۔"
"کیا پسند نہیں آیا۔"
"بہت خوب صورت ہے مگر آپ اب اس قسم کا تکلف نہ کیا کریں۔"
"تکلف۔" رستم نے کہا۔ "شازیہ! جہاں محبت ہو وہاں تکلف کیسا؟"
"آپ کو مجھ سے محبت ہے۔" شازیہ نے ایک خاص انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"تمہیں شک ہے کیا اپنے دل سے پوچھو۔"
"میں اپنے دل سے تو پوچھ چکی ہوں' آپ اپنے دل کی کہیں۔" شازیہ نے پوچھا۔
"ذرا اپنے بدن پر نگاہ تو ڈالو۔"
"یہ زیورات؟" شازیہ نے اپنے زیورات پر نگاہ ڈال کر کہا۔
"جو کچھ بھی تم سمجھ لو۔"
"لیکن ان کے دام تو میں ادا کر چکی۔" شازیہ حقارت سے بولی۔ "بلکہ کچھ سوا ہی۔" رستم ہنسنے لگا۔
"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔۔۔۔ تم نے ابھی پوری طرح قیمت ادا ہی کہاں کی ہے۔"
"آپ کیا چاہتے ہیں۔"
"میں تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔"
"لیکن میں کھلونا بن کر نہیں رہنا چاہتی۔"
"تو اور؟" ۔۔۔ رستم نے مسکرا کر پوچھا۔
"آپ مجھ سے شادی کرلیں۔"
"شادی؟ تم جانتی ہو شادی کے بعد تمہاری کیا حیثیت رہ جائے گی۔" رستم نے ہنس کر کہا۔
"ہاں جانتی ہوں۔ مگر میں اب تھک گئی ہوں میں عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔" شازیہ نے تنک کر کہا۔
"پھر تم کیا چاہتی ہو؟"
"کہہ تو چکی ہوں شادی کرنا چاہتی ہوں' آپ مجھ سے شادی کرلیں۔"
"شازیہ!" رستم نے ہنس کر کہا۔
"تم بے وقوفی کر رہی ہو یہ وقت تمہارا ہے تم اس وقت سے جتنا فائدہ اٹھا سکتی ہو اٹھالو یہ وقت گزر جائے گا تو پھر تم کف افسوس ملتی رہ جاؤ گی تمہیں اپنی قدر و قیمت کا احساس نہیں۔"
"غلط کہتے ہیں آپ۔" شازیہ ایک دلکش ادا سے سرہلا کر بولی۔
"اس پھول کی قدر و قیمت ہی کیا جو کسی کے گلے کا ہار نہ ہو۔"
"چھوڑو بھی! آج کیا باتیں لے بیٹھیں تم؟" رستم نے ہنس کر کہا۔
"تو آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے۔" شازیہ نے اب سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں ایسا ظالم صیاد نہیں کہ تم جیسی خوشنما اور خوب صورت بلبل کو قفس میں ڈال دوں۔" رستم نے پھر مسکرا کے کہا۔ شازیہ نے بددلی سے رخ موڑ لیا۔

★ ★ ★

"آپ کہیں جا رہے ہیں۔" سامان پیک کرتے سکندر نے آواز پر سر اٹھایا۔ شازیہ کب اندر آئی تھی اسے پتا نہیں ہی چلا۔
"ہاں۔۔۔۔ میں اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔"
"کیوں کیا کام چھوڑ دیا؟"
"میرا اب اس جگہ دل نہیں لگتا۔"
"کیوں؟" شازیہ نے حیرت اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"وجہ جان کر آپ کیا کریں گی۔" سکندر نے ایک آہ بھر کر کہا۔
"لیکن اس طرح کام چھوڑ کے جانے سے تو بہت نقصان ہوگا۔"
"جتنا نقصان ہونا تھا ہو گیا اب اور کیا ہوگا۔" سکندر نے کہا۔
"کیسا نقصان؟ کوئی مالی نقصان ہو گیا ہے تو مجھے بتائیں میں کچھ مدد کردوں۔"
"آپ نہیں سمجھیں گی۔" سکندر نے بیگ کی زپ بند کر کے ایک طرف رکھی۔
"آپ واقعی جا رہے ہیں۔"
"ہاں۔"
"وجہ تو بتا دیں؟"
"کہہ تو چکا کہ اب یہاں دل نہیں لگتا۔"
"کام میں دل نہیں لگتا یا اس شہر میں دل نہیں لگتا۔"
"جو کچھ بھی آپ سمجھ لیں۔" شازیہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی اور پھر کہنے لگی۔
"میرے یہاں آنے سے آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟"
"نہیں!" سکندر نے اس کی طرف ذرا کی ذرا نظر کی

اور پھر نظریں پھیر لیں۔

"آپ خوش ہیں؟" شازیہ نے پوچھا۔ سکندر ایک آہ بھر کر بولا۔

"غریبوں کی زندگی میں خوشی کا کیا گزر۔"

"میں بھی تو غریب ہوں۔" شازیہ مسکرائی۔

"اللہ کا شکر کرو شازیہ!" سکندر نے کہا۔ "تم بہت سے لوگوں سے اچھی ہو۔"

"ہاں میں بہت خوش نصیب ہوں اور اللہ کی شکر گزار ہوں کہ مجھے ایک محسن مل گیا۔" شازیہ نے ہنس کر کہا۔ لیکن سکندر نے کچھ جواب نہ دیا۔

"یہ آپ کا گھر ہے؟" شازیہ نے پوچھا۔

"نہیں عارضی ٹھکانہ۔"

"آپ کا اپنا گھر کہاں ہے؟"

"گھر تو انسانوں سے بنتے ہیں اور محبت سے اور کوئی محبت کرے یہ میرے نصیب میں کہاں؟" شازیہ خاموشی سے کھڑی رہی پھر کچھ دیر کے بعد پوچھا۔

"آپ کب جائیں گے۔"

"کل!" سکندر نے مختصر جواب دیا۔

"صبح کی گاڑی سے۔" شازیہ نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

شازیہ کمرے سے نکل گئی۔ سکندر کچھ دیر خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر خود کلامی کی۔

"قسمت! دل لگا بھی تو کس سے..... ہاں ظاہر ہے صرف محبت سے پیٹ نہیں بھرتا زندگی گزارنے کے لیے پیسہ بھی چاہیے جو میرے پاس نہیں اور وہ کیوں کرنے لگی مجھ سے محبت۔ نہیں ہرگز نہیں تو شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ اب اس تمنا کو دل میں لیے یہاں سے چلا جاؤں۔" دماغ کہہ رہا تھا اور دل اسے سرزنش کر رہا تھا۔

"تم نے بھی تو محبت کا اظہار نہیں کیا۔"

"کیا کہتا؟ مجھے تم سے محبت ہے! اچھا اور اگر وہ میری بے عزتی کر دیتی کہ تمہارے پاس ہے ہی کیا تو۔"

اس نے سر جھٹکا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

چار تنکے اٹھا کے جنگل سے
ایک بالی اناج کی لے کر
چند قطرے ٹپکتے اشکوں کے
اور کچھ فاقے سوکھے ہونٹوں کے
مٹھی بھر اپنی قبر کی مٹی
جھولی بھر آرزوؤں کا گارا
ایک تعمیر کی لیے حسرت
تیرا خانہ بدوش بے چارہ
شہر میں در بدر بھٹکتا ہے
اک سہارے کی راہ تکتا ہے
تیرا کاندھا ملے تو سر ٹیکے

☼ ☼ ☼

ٹرین آچکی تھی۔ مسافر گاڑی میں سوار تھے۔ جو چھوڑنے آئے تھے وہ کھڑکیوں کے پاس کھڑے الوداعی کلمات کہہ رہے تھے۔ سکندر نے ایک نظر اسٹیشن پر ڈالی اور ٹھنڈی سانس بھر کے بینچ سے کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت وسل بجی اور مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سکندر نے آہستہ روی سے قدم آگے بڑھائے اس سے پہلے کہ وہ ٹرین میں قدم رکھتا کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا سکندر نے حیرت سے مڑ کے دیکھا شازیہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"مجھے اپنے ساتھ نہیں لے کے جائیں گے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"مگر......" سکندر نے کہا۔

"محبت بنا کچھ درکار نہیں۔" شازیہ نے حسرت سے کہا۔

"تو آؤ۔" سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹرین میں قدم رکھ دیا۔ خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

☼ ☼

نفیسہ سعید

عشق ہوتا نہیں

وہ جیسے ہی کالج گیٹ سے باہر نکلی سامنے کھڑی بلیک کرولا کو دیکھتے ہی اس کا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا۔

"منحوس' بے غیرت۔" غصے کی شدت سے الفاظ خود بخود اس کے حلق سے نکلے اور اس نے اپنے قدموں کی رفتار کو تیز کر دیا۔

"تم نے مجھ سے کچھ کہا۔" فاریشہ کے ساتھ چلتی

ناولٹ

ہوئی مریم نے اپنے قدموں کی رفتار کو تیز کر کے اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں میں اس کمینے کی بات کر رہی ہوں' دیکھا نہیں آج بھی کتنی ڈھٹائی سے سامنے کھڑا ہے مجال ہے جو ذرا بھی شرم ہو اس ڈھیٹ انسان میں۔" غصے سے اس کا رنگ مزید سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی چادر کو مضبوطی سے سر پر جمایا اور تیزی سے سڑک کراس کی اس کے سڑک کراس کرتے ہی بلیک کرولا بھی حرکت میں آچکی تھی اور وہ جانتی تھی یہ ڈھیٹ شخص بس اسٹاپ تک ان کے پیچھے آئے گا اور پھر وہاں اس وقت تک کھڑا رہے گا' جب تک وہ دونوں اپنی مطلوبہ بس میں سوار نہ ہو جائیں۔

"لعنت بھیجو یار ہمیں کیا کرنا ہے؟" مریم جو کہ غالباً" پچھلے دو ماہ سے چلنے والی اس روٹین کی عادی ہو چکی تھی' بے فکری سے چیونگم چباتے ہوئے بولی' جبکہ فاریشہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس شخص کو گولی ہی مار دے۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا تم اس سے اتنا کیوں ڈرتی ہو؟"

"ڈرتی ہے میری جوتی' میں تو صرف اس وقت سے ڈرتی ہوں جب زریاب کو اس معاملے کی ذرا سی بھی بھنک مل گئی اور پھر تم جانتی ہو وہ اس کا کیا حشر کرے گا۔"

"ویسے ایک بات تو ماننا پڑے گی زریاب بھائی کا دوست ہونے کے باوجود سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔" اور جواباً" فاریشہ کی تیز گھورتی ہوئی نظروں کو دیکھتے ہی مریم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"مذاق کر رہی ہوں یار' دل پر مت لے۔" اور اس کے ساتھ ہی دونوں سامنے سے آتی ہوئی بس میں سوار ہو گئیں۔

فاریشہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ تقریباً" دو ماہ قبل ہی کی بات تھی جب یہ دونوں اپنا پریکٹیکل ختم کر کے تقریباً" چار بجے کالج سے باہر نکلیں تو جانے کب اچھی بھلی تیز دھوپ بادلوں میں چھپ گئی' بس اسٹاپ کالج سے تقریباً" دس منٹ کے فاصلے پر تھا' اسٹاپ تک پہنچتے

پہنچتے ایک دم ہی چاروں طرف اندھیرا چھا گیا اور اچانک تیز بارش شروع ہو گئی' تیز تیز چلنے کے باوجود دونوں کے یونیفارم اچھے خاصے بھیگ چکے تھے' وہ تو غنیمت تھا کہ دونوں ہی چادر لیتی تھیں' ورنہ اچھا خاصا تماشا بن جاتیں' ستم بالائے ستم دور' دور تک مطلوبہ بس کا نام و نشان نہ تھا اور رکشا' ٹیکسی کا سفر کبھی ان دونوں نے اکیلے نہ کیا تھا' لامحالہ بس کا انتظار کرنے کے لیے اسٹاپ پر بنے شیڈ کے نیچے آگئیں' جہاں اکا دکا لوگ کھڑے تھے۔ مزید پندرہ منٹ گزر گئے' لیکن بس غائب' سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کریں کہ اتنے میں اچانک ہی ایک گہری رنگت والا شخص' جس کی جسامت سے زیادہ اس کی مونچھوں کا سائز تھا' ان کے قریب آکھڑا ہوا اور نہایت ادب سے بولا۔

"سلام بی بی جی' آجائیں ہم آپ کو چھوڑ دیں۔"

"ہیں یہ کون ہے؟" دونوں نے ایک ساتھ حیران ہو کر اس شخص کی جانب دیکھا۔

"میں جی داؤد صاحب کا ڈرائیور ہوں۔" اس شخص نے سامنے ہی کھڑی گاڑی کی جانب اشارہ کیا۔

"اور صاحب نے کہا ہے کہ بارش بہت طوفانی ہے' جانے بس آئے یا نہ آئے' اس لیے آپ آجائیں ہم آپ کو چھوڑ دیں۔"

"پہلے تم یہ تو بتاؤ یہ داؤد صاحب ہیں کون؟ اور ہمیں کس خوشی میں یہ آفر دے رہے ہیں۔" فاریشہ کا لہجہ نہایت ہی سخت تھا' وہ شخص ایک دم ہی خائف سا ہو گیا۔

"وہ جی۔" اس سے قبل کہ وہ مزید کوئی وضاحت دیتا ایک دم ہی سامنے کھڑی کالے رنگ کی گاڑی ان کے قریب آکھڑی ہوئی۔

"آجائیں' میں بھی گلشن ہی جا رہا ہوں' آپ کو بھی ڈراپ کر دوں گا۔" ایک نہایت ہی خوبرو نوجوان نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے آفر کی' جبکہ گاڑی کے وہاں آتے ہی ڈرائیور ذرا مؤدب سا ہو کر ان سے تھوڑا دور ہو گیا۔

"اسے کیسے پتا چلا کہ ہم گلشن جا رہے ہیں۔" مریم نے فاریشہ کے کان کے قریب منمناتے ہوئے کہا' جبکہ حیران تو وہ خود بھی تھی' لیکن قبل اس کے کہ وہ اس بارے میں کوئی سوال کرتی' وہ شخص خود ہی گویا ہوا۔

"حیران مت ہوں میں زریاب کا دوست ہوں' اکثر و بیشتر ہی اس سے ملنے گھر آتا رہتا ہوں۔ وہیں ایک' دو بار آپ دونوں کو دیکھا تھا اور آج اتفاق سے یہاں سے گزرتے ہوئے آپ پر نظر پڑ گئی تو سوچا اتنی بارش میں آپ گھر کیسے جائیں گی' اسی لیے رک گیا' اب اگر آپ کو مجھ پر اعتبار آگیا ہو تو آجائیں پلیز۔"

بارش بہت تیز ہو گئی تھی' ساتھ ہی تیز چلنے والی ہواؤں نے انہیں گھبرا دیا تھا' لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی فیصلہ کرتیں اچانک ہی ان کے روٹ کی بس آ کھڑی ہوئی' فاریشہ نے فوراً" سے بیشتر مریم کا ہاتھ تھاما۔

"شکریہ جی آپ کا بہت بہت' ہماری بس آگئی ہے' لہٰذا اللہ حافظ۔" یہ کہتے ہی وہ مریم کو تقریباً" گھسیٹتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی' جبکہ مریم جو غالباً" گاڑی میں بیٹھنے کا پروگرام بنا چکی تھی سخت جز بز ہوئی۔

"ایک تو فاری تم بھی نا' کیا تھا اگر وہ شخص ہمیں ڈراپ کر دیتا' اب اگر گھر جاتے جاتے بارش مزید تیز ہو گئی اور بس خراب ہو گئی تو پھر مت کہنا۔" وہ مسلسل جانے کیا کیا بول رہی تھی' لیکن فاریشہ بنا اس کی کسی بات کا جواب دیے خاموشی سے کھڑکی سے باہر برستی بارش کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ایسا کب اور کیسے ہوا کہ یہ شخص زریاب سے ملنے آیا ہو اور ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی دیکھا ہو' کیونکہ زریاب کے تو گنے چنے چند ہی دوست تھے' جن سے وہ واقف تھیں' اس کے علاوہ تو وہ بہت کم ہی کسی کو لے کر گھر آتا تھا' پھر یہ زریاب کا ایسا کون سا دوست تھا جو ان دونوں سے اس قدر واقف تھا کہ راہ چلتے انہیں کھڑا دیکھ کر رک گیا۔ اس بارے میں وہ جس قدر سوچتی گئی ویسے ویسے ہی الجھتی گئی اور ان ہی سوچوں میں گھرے

گھرے جانے کب ان کے گھر کا قریبی اسٹاپ آگیا اور پھر گھر پہنچ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ دونوں بحفاظت گھر آگئیں۔

☆ ☆ ☆

فراز اور شہباز صاحب دو ہی بھائی تھے۔ دونوں کے گھر برابر' برابر اور تقریباً" ایک ہی جیسے تھے اور گھر کے درمیان میں بنی ڈم ڈم کی باڑ سے دونوں گھروں کو علیحدہ کیا گیا تھا' فراز صاحب کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی مریم' سب سے بڑا زریاب جو سوفٹ ویئر انجینئر تھا۔ اس سے مریم چھوٹی تھی اور سب سے چھوٹا افراسیاب جو اے لیول کا طالب علم تھا' جبکہ شہباز صاحب کے دو بچے تھے' ایک بیٹا حیدر جو ایم بی اے کرنے ابروڈ گیا ہوا تھا اور پھر فاریشہ' فاریشہ اور مریم مقامی کالج میں بی ایس سی کی طالبات تھیں' جبکہ فاریشہ کا رشتہ بچپن سے ہی زریاب سے طے تھا' اسی طرح مریم' حیدر کی منگیتر تھی' جس کے واپس آتے ہی چاروں کی شادیاں متوقع تھیں۔

اس دن کسی کام سے وہ مریم کے پاس آئی تو زریاب گھر پر ہی تھا' عام طور پر وہ بہت کم ہی گھر پر ہوتا تھا۔ مریم کچن میں چائے بنا رہی تھی' جبکہ صولت بوا قریب ہی کھڑی کباب تل رہی تھیں۔

"خیریت ہے' کوئی آیا ہوا ہے کیا؟" فاریشہ نے کباب کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے سوال کیا' کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مریم ہمیشہ کسی ایمرجنسی میں ہی کچن میں پائی جاتی تھی۔

"پتا نہیں یار بھائی کے کوئی دوست ہیں۔" اس نے جلدی جلدی ٹرالی سیٹ کرتے ہوئے جواب دیا' اسی دم اچانک ہی اس کے سیل فون کی آواز سنائی دی۔

"افوہ اسے بھی ابھی ہی فون کرنا تھا۔" مریم نے بےزاری سے اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کون ہے؟"

"رمشا۔" اس نے اپنی خالہ کی بیٹی کا نام لیا اور فون کان سے لگا لیا۔

"یار پلیز' تم ذرا یہ ٹرالی بھائی کے کمرے تک پہنچا دو' دستک دے دینا بھائی باہر آکر لے جائیں گے۔" وہ تیز تیز کہتی باہر کی جانب چل دی' کیونکہ کچن میں عام طور پر سگنل کمزور آتے تھے۔

"صولت بوا اصغر کہاں ہے؟" ٹرالی کو مکمل طور پر سیٹ کر کے اس نے سوال کیا۔ اصغر' مریم کے گھر کام کرنے والے ملازم لڑکے کا نام تھا۔

"پتا نہیں بیٹا' شاید زریاب صاحب کے کسی کام سے باہر گیا ہے۔"

"اچھا۔" وہ تذبذب کا شکار تھی' سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کرے۔ صولت بوا کے پاؤں میں کچھ دن قبل ہی موچ آئی تھی' جس کے سبب انہیں چلنے میں تکلیف ہوتی تھی' جبکہ زریاب کا کمرہ سب سے آخر میں ہونے کی بنا پر تھوڑا دور تھا۔ بہرحال جو بھی تھا جانا تو اسے ہی تھا' کیونکہ صولت بوا یہ ٹرالی لے کر نہیں جا سکتی تھیں' اب مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ ٹرالی لے کر کمرے کی جانب چل دی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ دروازہ پر دستک دیتی اچانک ہی کوئی پردہ اٹھا کر باہر آگیا۔

"اوہ آپ! زہے نصیب بے امید نہ تھی کہ اتنی جلدی آپ سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہو گا۔" سامنے کھڑا شخص نظروں میں شوق کا ایک جہاں بسائے اس کی جانب تک رہا تھا اور فاریشہ تو مانو ایسے جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو' وہ جو زریاب کے باہر آنے کی امید میں مطمئن سی کھڑی تھی۔ ایک دم اس اجنبی شخص کو سامنے دیکھ کر گھبرا سی گئی' چاہا کہ تیزی سے واپس پلٹ جائے' مگر جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی ہو۔

"میں داؤد ہوں زریاب کا دوست اور یقیناً آپ بھی اس دن بارش میں ہونے والی ملاقات کو بھولی نہ ہوں گی۔" فاریشہ کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔

"دیکھ لیں میں آیا تو زریاب سے ملاقات کے لیے تھا' لیکن کون جانتا تھا کہ یہاں آپ کے دیدار کی چاہ

بھی پوری ہو جائے گی۔"

فاریشہ کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ تن تنہا ایک غیر مرد کے سامنے کھڑی ہے' اگر ایسے میں اچانک زریاب یا کوئی اور آ گیا تو کیا سوچے گا اس خیال کے آتے ہی وہ بنا کوئی جواب دیے واپس پلٹی۔

"یقین جانیے مس مجھے علم نہ تھا کہ باہر آپ ہیں' ورنہ شاید میں کبھی بھی اس طرح باہر نہ آتا' کیونکہ میں جانتا ہوں یہ ایک غلط حرکت ہے' ایکچوئیلی زریاب واش روم میں ہے اور مجھے کہہ گیا تھا کہ میں صولت بوا سے چائے لے لوں' یہی وجہ ہے کہ ان کی ضعیف العمری کا خیال کرتے ہوئے میں ٹرالی کی آواز سن کر باہر آ گیا۔ بہر حال سوری' اگر آپ کو برا لگا ہو تو۔" وہ شاید فاریشہ کے چہرے کے تاثرات بھانپ گیا تھا۔ اسی لیے معذرت خواہانہ انداز میں ٹرالی لے کر واپس پلٹ گیا۔

زریاب اندر کمرے میں ہی ہے' اس خیال کے آتے ہی وہ پوری جان سے لرز اٹھی جو کہیں وہ باتھ روم سے باہر آجاتا اگر اسے یہ پتا چل جائے کہ وہ نا صرف کمرے تک ٹرالی لے کر آئی ہے' بلکہ داؤد کے پاس کچھ دیر تک کھڑی بھی رہی ہے۔ تو کیا ہوتا؟ پھر اس سے آگے وہ سوچنا ہی نہ چاہتی تھی۔

"شکر ہے کسی نے داؤد کو مجھ سے بات کرتے دیکھا نہیں' ورنہ جانے کیا سمجھ جاتا۔" یہی خیال دل میں لیے وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

"دے آئیں چائے؟" مریم فون بند کر کے چھت پر جانے والی سیڑھی پر بیٹھی تھی' وہ بھی نہایت خاموشی سے اس کے پاس جا بیٹھی' داؤد اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا' اس خیال سے ابھی تک اس کا معصوم دل کانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا' کیوں اتنی خاموش ہو؟" اچانک ہی مریم کو احساس ہوا کہ کوئی خاص بات ہے۔

"مریم پتا ہے زریاب کے پاس اس کا کون سا دوست آیا ہے؟" اس نے تھوڑا سا رک کر مریم کی جانب دیکھا جو سوالیہ نظروں سے اسے ہی تک رہی تھی۔

"وہ ہی اس دن بلیک کرولا والا شخص' یاد آیا؟" اس نے تیزی سے بات مکمل کی۔

"وہ... پھر..." مریم کا دل تیزی سے دھڑکا۔

"پھر کیا کچھ نہیں میں نے تو ٹرالی باہر رکھ کر دروازہ بجا دیا تھا اور خود سائیڈ پر ہو گئی تھی۔ وہ تو جب وہ ٹرالی لینے باہر آیا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔" اس نے اپنی اور داؤد کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سرے سے غائب ہی کر دیا۔

"اس نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں۔"

"افوہ میں سامنے تھی ہی کب۔" اس نے اطمینان سے جھوٹ بولا' لیکن کیوں بولا اس کی وجہ وہ جان نہ پائی۔

"شکر ہے اس نے تمہیں دیکھا نہیں۔" مریم نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اب بھائی کو مت بتانا کہ ٹرالی دینے تم گئی تھیں' ایسا کرتے ہیں صولت بوا کو بھی سمجھا دیتے ہیں' ورنہ جانتی ہو ہماری خیر نہیں ہے۔" مریم نے اسے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا' جبکہ وہ زبان سے کچھ نہ بول پائی' صرف سر ہلا کر رہ گئی اور پھر جانے کیوں بار بار اس کے ذہن میں داؤد کا تصور آتا رہا' وہ یہ سوچ سوچ کر ہولتی رہی کہ اگر اس دوران زریاب کمرے سے باہر آجاتا تو کیا ہوتا' کس قدر ڈھٹائی سے میرے سامنے کھڑا مجھ سے بات کر رہا تھا۔ جبکہ جانتا تھا کہ زریاب اندر واش روم میں ہے اور کسی بھی وقت باہر آ سکتا ہے۔ عجیب سا شخص تھا کسی بھی احساس کے تحت ایک منفی سوچ کے ساتھ ہی سہی وہ شخص پوری رات اس کے حواس پر سوار رہا' ساری رات رہ رہ کر داؤد کا چہرہ اس کے سامنے آتا رہا' اسے رہ رہ کر یہ احساس ستاتا رہا کہ کیوں اس نے کھڑے ہو کر داؤد سے بات کی' کیوں اس کی بات سنی' وہاں سے ہٹ کیوں نہ گئی' وہ وہاں رکی ہی کیوں تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ داؤد کے بارے

میں اس قدر کیوں سوچ رہی ہے؟ وہ جیسے ہی آنکھیں بند کرتی داؤد کا ہیولہ اس کے سامنے آجاتا اور کانوں میں اس کی گمبھیر آواز گونجتی' گھبرا کر وہ آنکھیں کھول لیتی۔ وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ ایسا کیوں ہے؟ لیکن یہ ضرور جانتی تھی کہ جو بھی ہے غلط ہے۔ بالکل غلط ہے' ایک شریف خاندان کی لڑکی ہونے کے ناتے اسے کسی بھی غیر مرد کے بارے میں بالکل نہیں سوچنا چاہیے' وہ بھی اس صورت میں جب وہ زریاب سے منسوب تھی' لیکن جانے کیا بات تھی وہ زبردستی اس کے خیالوں پر چھا سا گیا۔ وہ جتنا اس کے خیال سے پیچھا چھڑاتی اتنا ہی وہ زبردستی اس کے خیالوں میں آتا رہا اور پھر جانے کب وہ اسے ہی سوچتے سو گئی۔

اور اگلے دن کالج گیٹ سے باہر نکلتے ہی روڈ کے اس طرف کالج گیٹ کے عین سامنے بلیک کرولا سے ٹیک لگائے کھڑے داؤد نیازی کو دیکھتے ہی اس کی جان ہی نکل گئی۔

"یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟" اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی عقب سے اسے مریم کی آواز سنائی دی۔

"کون؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

"داؤد وہ دیکھو سامنے کھڑا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اپنے کسی کام سے آیا ہو' بہر حال ہمیں کیا؟"

فاریشہ اسے یکسر نظر انداز کرتی تیزی سے روڈ کراس کرتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی' لیکن جلد ہی کچھ دیر قبل کا لگایا گیا اس کا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ کیونکہ اگلے ہی پل نہایت دھیمی رفتار سے چلتی بلیک کرولا ان کے تعاقب میں تھی اور پھر یہ روز کا معمول ہو گیا' پچھلے دو ماہ سے وہ نہایت خاموشی سے بنا کچھ کہے انہیں چھوڑنے بس اسٹاپ تک آتا اور پھر اسی خاموشی سے واپس پلٹ جاتا ہے۔ بے شک داؤد کی ذات سے انہیں ابھی تک کوئی تکلیف نہ پہنچی تھی' پھر بھی یہ صورت حال دونوں ہی کے لیے تشویش کا باعث تھی' ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ان سے

کیا چاہتا ہے؟ اور اس کی اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ یہ بات وہ گھر میں بھی کسی کو نہیں بتا سکتی تھیں، کیونکہ وہ زریاب کا دوست تھا۔ اگر داؤد کے بجائے کوئی دوسرا اجنبی شخص ہوتا تو بھی فاریشہ یا مریم، زریاب کو بتانے کا رسک نہیں لے سکتی تھیں، کیونکہ ان کے نزدیک بات گھر تک پہنچانا صرف معاملے کو بگاڑنا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں، یہی وجہ تھی کہ وہ داؤد کی اس حرکت کو نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ برداشت کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس دن فاریشہ کا ارادہ قریبی پارک تک جانے کا تھا۔ لہٰذا اس نے مریم کو ٹیکسٹ کیا کہ تیار ہو کر باہر آجائے اور خود جینز اور ریڈ ٹی شرٹ پر گلے میں اسکارف ڈالے باہر آگئی، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور موسم بڑا ہی خوشگوار تھا، اپنے اڑتے ہوئے بالوں کو سمیٹتی وہ اپنے ہی دھیان میں چلی جا رہی تھی، جب اچانک ہی اس کی نظر مریم کے گھر کے باہر کھڑے داؤد پر پڑی جو غالباً" زریاب کا انتظار کر رہا تھا پہلے تو اس نے سوچا واپس پلٹ جائے، پھر جانے کیا سوچ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

"جانے کیوں کبھی کبھی دل سے نکلنے والی خواہش اس قدر جلد پوری ہو جاتی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا۔" سینے پر دونوں بازو لپیٹے وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے دھیمے سے گنگنایا۔

"یقین کریں میں ابھی آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔" دل چاہا پلٹ کر کوئی سخت جواب دے، لیکن جانے کیوں الفاظ کہیں گم سے ہو گئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا بالکل اس کے مدمقابل آکر کھڑا ہو گیا۔

"ایک بات بتاؤں۔" اسے اپنی نظروں میں جذب کرتا ہوا اس کی جانب دیکھ کر بولا۔

"آپ پر ریڈ کلر بہت اچھا لگتا ہے۔" وہ ایک دم گھبرا اٹھی اور جلدی سے کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا، اس کی اس حرکت پر داؤد بے اختیار مسکرا دیا اور جس طرح اس کے قریب آیا تھا اسی آہستگی سے واپس پلٹ کر اپنی گاڑی کے پاس جا کھڑا ہوا، گیٹ کھل گیا، سامنے ہی اصغر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"بہرے ہو گیا، اتنی دیر سے بیل بجا رہی ہوں۔" غصہ سے اسے آگے سے ہٹاتی وہ اندر داخل ہوئی کہ یک دم ہی نگاہ سامنے کھڑے زریاب پر پڑی۔

"یہ تم کہاں سے آرہی ہو؟"

"گھر سے؟" وہ اٹک کر بولی۔

"وہ تو مجھے پتا ہے، لیکن گھر سے تو تم ہمیشہ اس راستے سے آتی ہو۔" اس نے لان میں لگی ڈم ڈم کی باڑ کی جانب اشارہ کیا۔

"وہ دراصل میں اور مریم پارک جا رہے تھے واک کرنے، اسی لیے باہر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی، لیکن جب وہ باہر نہیں آئی تو مجبوراً" مجھے اندر آنا پڑا۔" کوئی چارہ نہ دیکھ کر اسے تفصیل بتانی پڑی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے پارک جانے کی آرام سے گھر بیٹھو۔" زریاب نے اس پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا، وہ جانتی تھی کہ ایسا ہی ہو گا، پھر بھی ایک آخری کوشش کے طور پر بولی ضرور۔

"لیکن وہ۔۔۔"

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔" زریاب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"انیف اینڈ انیف اندر جاؤ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں، پھر تم دونوں کو آئس کریم کھلانے لے جاؤں گا ٹھیک ہے نا۔" اور وہ ایک دم ہی خوش ہو گئی، جلدی سے اثبات میں سر ہلا کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

حیدر اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آچکا تھا، اسے جلد ہی یہاں ایک موبائل کمپنی میں جاب مل گئی، اب دونوں گھروں میں حیدر اور مریم کے ساتھ ساتھ زریاب اور فاریشہ کی شادی کی بات بھی شروع ہو گئی۔

فراز صاحب چاہتے تھے کہ جلد ہی یہ فریضہ سرانجام دے دیا جائے، اسی سلسلے میں دونوں جانب تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں، مریم ان تیاریوں میں پیش پیش تھی، لیکن جانے کیا بات تھی فاریشہ کا دل بجھا بجھا سا تھا۔ اکثر ہی تنہائی میں داؤد کا تصور اس کے ذہن میں ابھر آتا اور پھر سارا دن وہ بے چین سی پھرا کرتی اپنی اس کیفیت کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ اسے لگتا وہ داؤد کے سحر میں جکڑتی جا رہی ہے، اس کے گرد داؤد کے لفظوں کا جال سا بننے لگا، جس میں وہ ایک مکڑی کی مانند پھنستی جا رہی تھی۔ داؤد کو سوچنا اس کا تصور کرنا اسے اچھا لگتا، لیکن جیسے ہی زریاب اس کے سامنے آتا اس کے احساسات یکایک تبدیل ہو جاتے، اسے اپنی سوچ پر شرمندگی محسوس ہونے لگتی۔

"میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، ایک راہ چلتے شخص کی محبت میں گرفتار ہونے لگی ہوں، تف ہے مجھ پر بھلا داؤد اور زریاب کا کیا مقابلہ، اللہ نہ کرے جو میرے دل میں کبھی داؤد کے لیے وہ احساس پیدا ہو جو زریاب کے لیے ہے۔" یہ سب سوچ کر وہ اپنے دل کو طفل تسلیاں دیا کرتی اور کوشش کرتی کہ داؤد کے خیال کو اپنے ذہن کے پردہ اسکرین سے کھرچ کر مٹا دے، کیونکہ یہی اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے بہتر تھا۔

زریاب کا دوست ہونے کے ناتے داؤد کی دوستی جلد ہی حیدر سے بھی ہو گئی، اب اکثر و بیشتر ہی وہ تینوں ایک ساتھ پائے جاتے، اکثر اوقات ہی حیدر، داؤد کو گھر بھی لے آتا، ایسے میں جانے کیوں فاریشہ عجیب سی کوفت کا شکار ہو جاتی، داؤد کا اپنے گھر آنا اسے بالکل بھی پسند نہ تھا یا شاید یہ اس کا راہ فرار تھا۔ بہرحال جو بھی تھا وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی کہ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور نہیں ہوئی، اسے محسوس ہوتا کہ طوفان اٹھا ضرور تھا لیکن جلد ہی قدرت نے اس پر بند باندھ دیا۔ زریاب ہر لحاظ سے اچھا تھا، ایک ذمہ دار اور محبت کرنے والا شخص اور ہر لڑکی ایسے ہی جیون ساتھی کی خواہش کرتی ہے اور یہی سوچ اسے ہمیشہ شانت رکھنے کی کوشش کرتی۔

☼ ☼ ☼

دو دن سے مریم کو بخار تھا۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی تیسرے دن اسے اکیلے ہی کالج جانے کی ہمت کرنا پڑی، کیونکہ امتحانات سر پر تھے اور ویسے بھی آج اس کا ہوم اکنامکس کا پریکٹیکل تھا، جسے اٹینڈ کرنا بے حد ضروری تھا۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق کالج جانے کے لیے تیار ہو گئی، جاتے ہوئے تو وہ وین سے چلی گئی، اصل مسئلہ واپسی کا تھا، پریکٹیکل کے سبب ان کی چھٹی تھوڑا لیٹ ہوتی تو وین والا چلا جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ان کی واپسی اکثر و بیشتر پبلک ٹرانسپورٹ سے ہوتی لہٰذا آج بھی پریکٹیکل سے فارغ ہوتے ہوئے تین بج گئے۔ اس کے ساتھ اس کی ایک کلاس فیلو بھی تھی۔ دونوں باتیں کرتیں، کالج گیٹ سے باہر آئیں تو سامنے بلیک کرولا کو نہ پا کر اسے یک گونہ اطمینان نصیب ہوا، لیکن جانے کیا بات تھی کہ وہ سارا دن بے چین سی رہی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ایسا کیوں ہے اپنی اس کیفیت کو وہ کوئی نام نہ دے پا رہی تھی، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید داؤد کو اپنے انتظار میں کالج کے باہر کھڑا دیکھنا اس کی عادت بن چکا تھا اور یقیناً" آج اس کی غیر موجودگی فاریشہ کی بے چینی کا سبب بنی ہے۔

☼ ☼ ☼

حیدر، زریاب کے مقابلے میں قطعی مختلف عادات کا مالک تھا۔ نہایت ہی براڈ مائنڈڈ اور ہر بات کو کھلے دل و ذہن سے قبول کرنے والا مریم شادی کی شاپنگ کے سلسلے میں دو، تین بار حیدر کے ساتھ بازار جا چکی تھی، لیکن فاریشہ اور زریاب نے ایک بار بھی اکیلے جانے کی ہمت نہ کی اور اس میں شاید دونوں ہی کی عادتوں کا عمل دخل شامل تھا۔ حیدر کی براڈ مائنڈڈ اور کھلے ذہن و دل کی عادات کے باعث داؤد جو کہ پہلے صرف زریاب کے کمرے تک ہی محدود تھا، اب اکثر و بیشتر باہر لان میں بھی بیٹھا نظر آتا، یہاں تک کہ اس کی دوستی شہباز صاحب سے بھی ہو چکی تھی۔ جس کی بدولت وہ بھی

داؤد کی گھر آمد پر اعتراض نہ کرتے' بلکہ داؤد کے ساتھ باہر بیٹھ کر خوب گپ شپ کرتے' لیکن ہر بار داؤد کی گھر آمد پر فاریشہ گھبراہٹ کا شکار ہوجاتی' حالانکہ اب کافی عرصہ سے وہ اس کے کالج کے باہر بھی نہ آیا تھا' کبھی کبھی تو ایسا لگتا جیسے داؤد فاریشہ والے چیپٹر کو بند کرچکا ہے' پھر بھی فاریشہ کوشش کرتی کہ جب بھی وہ لان میں موجود ہو اپنے کمرے سے ہی باہر نہ نکلے' یہاں تک کہ وہ انتہائی ضرورت کے تحت بھی گھر سے باہر نہ نکلتی' جب تک داؤد باہر رہتا اسی بے چینی کے سبب وہ ایک' دوبار کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر ضرور دیکھتی' لیکن اس نے جب بھی کبھی ایسی حرکت کی — ذرا سا پردہ سرکایا اور باہر جھانکا ہمیشہ داؤد کو کمرے کی کھڑکی کی جانب ہی "تکتا پایا" جانے یہ اس کا وہم تھا یا حقیقت' لیکن اسے لگتا کہ داؤد جان بوجھ کر اس رخ پر بیٹھتا ہے' جہاں سے فاریشہ کے کمرے کی کھڑکی نظر آسکے۔

"تو کیا وہ جانتا ہے کہ یہ میرا کمرہ ہے؟ اور میں اس کمرے کی کھڑکی کا پردہ سرکا کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔" اس خیال کے آتے ہی وہ پسینہ پسینہ ہوجاتی' لیکن پھر اگلی دفعہ جب بھی وہ آتا' وہ سب کچھ بھول کر' دوبارہ سے پردہ سرکا کر باہر دیکھنے ایک کوشش ضرور کرتی اور یہ سب اتنا غیر اختیاری طور پر ہوتا کہ باوجود کوشش کہ وہ خود کو روک نہ پاتی۔

☼ ☼ ☼

تائی امی آج دوپہر سے ہی ان کے گھر پر تھیں' جبکہ مریم کوکنگ سیکھنے کے جنون میں مبتلا بڑے انہماک سے ٹی وی پر آنے والا کوئی شو دیکھنے میں مصروف تھی' ایسے میں فاریشہ اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر برآمدے کی سیڑھی پر آبیٹھی۔

"تم اکیلی یہاں کیا کررہی ہو؟" زریاب غالباً" تائی امی کو بلانے آیا تھا۔ فاریشہ کو اکیلا بیٹھا دیکھ کر اس کی جانب چلا آیا۔

"کچھ بھی نہیں' بس ایسے ہی اکیلی بور ہورہی تھی۔" زریاب بنا کوئی جواب دیے وہیں برآمدے کی سیڑھی پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا' وہ غیر محسوس طور پر ذرا سا پرے سرک گئی' اس کے گریز کو محسوس کرتے ہی زریاب ہلکا سا مسکرایا۔

"جانتی ہو تمہارے اس گریز اور احتیاط نے ہی تو مجھے تمہارا دیوانہ بنا رکھا ہے۔" اس نے حیرت سے پلٹ کر زریاب کی جانب تکا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے۔" وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"اتنی حیران کیوں ہورہی ہو؟ یقین کرو میں سچ میں تمہارا دیوانہ ہوں اور یہ دیوانگی برسوں پرانی ہے' میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہمیشہ یہی چاہا کہ تمہیں میرے علاوہ کوئی نہ دیکھے' کوئی نہ چھوئے' یہاں تک کہ تمہاری خوب صورت آواز بھی صرف میرے ہی کان سنیں۔"

"یا خدا یہ میں کیا سن رہی ہوں؟" وہ دل ہی دل میں سخت حیرت زدہ تھی' لیکن اپنی حیرت کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

"جانتی ہو تمہیں دیکھ کر ہمیشہ میرے دل میں اس یقین نے ہی سر اٹھایا کہ جیسا میں نے چاہا تھا تم ویسی ہی ہو' صاف ستھری اور پاکیزہ' جانتی ہو....." اس نے یک دم ہی فاریشہ کے ٹھنڈے برف ہاتھ کو اپنے گرم ہاتھ میں تھام لیا' لیکن اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتا اچانک ہی باہر کا گیٹ کھول کر حیدر اور داؤد ایک ساتھ ہی اندر داخل ہوئے۔ داؤد پر نظر پڑتے ہی فاریشہ کے بے جان جسم میں جان سی آگئی' وہ اپنا ہاتھ چھڑوا کر یک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو! اچھا ہوا تم ہمیں یہاں ہی مل گئے۔ اب ذرا تم داؤد کو کمپنی دو' میں آتا ہوں۔" حیدر اندر جاچکا تھا۔ فاریشہ نے ایک نظر کچھ فاصلے پر کھڑے داؤد پر ڈالی' جس کی آنکھوں میں نظر آنے والی ناگواری کی لہر وہ ایک پل میں ہی اتنے فاصلے سے بھی محسوس کرچکی تھی۔

"چائے پئیں گے آپ؟" اس نے جان بوجھ کر بڑی لگاوٹ سے زریاب کو مخاطب کیا' جو سیڑھی سے اٹھ کر لان میں رکھی ہوئی کرسیوں کی جانب بڑھ چکا

تھا۔

"ہاں یار ذرا جلدی بھیجنا۔" زریاب کا جواب سنتے ہی وہ تیزی سے اندر کی جانب لپکی' لاؤنج کا دروازہ کھولنے سے قبل اس نے پلٹ کر دیکھا۔ داؤد نے بھی اسی پل اس کی جانب تکا۔ داؤد کی آنکھوں میں نظر آنے والا غصہ اس کے دل کو پرسکون کرگیا۔ داؤد کو یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ اس کے دل میں داؤد کی کوئی جگہ نہیں ہے اور اچھا ہوا یہ موقع آج قدرت نے اسے خود فراہم کردیا' اس خیال نے اس کے دل کو وقتی طور پر شانت کردیا۔

☼ ☼ ☼

امی' تائی' مریم اور حیدر بھائی کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں۔ اس کی طبیعت صبح سے ہی کچھ خراب تھی' اس لیے چاہتے بھی ان کے ساتھ نہ جاسکی اور اب اکیلی گھر میں دل گھبرانے کے سبب باہر لان میں رکھی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئی۔ حلیمہ سرونٹ کوارٹر میں جاچکی تھی۔ اپنی کرسی پر سر ڈالے وہ جانے کن خیالوں میں گم تھی' جب سامنے سے باڑ پھلانگ کر کوئی اس کی جانب آیا۔ یقیناً" زریاب ہی ہوگا" یہ سوچ کر وہ اپنی جگہ آرام سے بیٹھی رہی' سامنے سے آتا ہیولہ اس کے سامنے آکر رک گیا' نقوش واضح ہوگئے۔ یقیناً" وہ زریاب نہ تھا تو پھر..... غور سے دیکھتے ہی اسے کرنٹ لگا۔ وہ یک دم ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی' گھر کی تنہائی اور سامنے کھڑا داؤد اسے لگا شاید وہ ابھی زمین بوس ہوجائے گی۔ اس کی کانپتی ٹانگیں اس کا بوجھ نہ سہار سکیں گی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ چلا کر پوچھنا چاہتی تھی' لیکن اس کے حلق سے کسی قسم کی کوئی بھی آواز برآمد نہ ہوئی' شاید خوف نے اسے گونگا کردیا تھا۔

"میں آج بہت مشکل سے تم سے بات کرنے آیا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم بنا کوئی شور شرابا کیے نہایت خاموشی سے میری بات سنو گی۔" ایک نظر فاریشہ کے خوف زدہ چہرے پر ڈال کر وہ پھر سے گویا ہوا۔

"گھبراؤ مت' میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا' صرف تم سے چند باتیں کرکے جس راستے سے آیا ہوں وہیں سے واپس پلٹ جاؤں گا۔" وہ باڑ کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

"اور ہاں زریاب بھی گھر نہیں ہے' میں نے اسے فون کیا تھا' اس نے کہا کہ پندرہ منٹ تک پہنچ جائے گا اور تمہیں یہاں تنہا بیٹھا دیکھ کر میں نے سوچا کہ شاید آج کے بعد یہ موقع دوبارہ نہ ملے' اس لیے آج ہی تم سے اپنے دل کی ہر بات کہنے چلا آیا' دیکھو فاریشہ تم میرے تمام احساسات سے اچھی طرح واقف ہو' میں تو صرف تم سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ تم نے میرے بارے میں فیصلہ کیا؟"

"کس بات کا فیصلہ۔" اس کی حیرت دیدنی تھی۔

"اس بات کا فیصلہ کہ تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟" وہ آہستہ آہستہ کہتا ہوا اس کے قدرے قریب آگیا' اتنا قریب کہ اس کے جسم سے اٹھنے والے قیمتی کلون کی خوشبو نے اسے مدہوش سا کردیا' وہ یک ٹک اس کی جانب دیکھتی رہی۔

"تم نہیں جانتیں فاریشہ! تم نے میرا سکون و قرار سب لوٹ لیا ہے' تمہارے بغیر میری زندگی عذاب ہوگئی ہے' اب تمہیں آخری فیصلہ کرنا ہوگا' میری محبت کو سرخروئی عطا کرنی ہوگی' تمہیں اس شادی سے انکار کرنا ہوگا۔" بات کرتے کرتے اچانک ہی اس نے فاریشہ کا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔

"دیکھو فاریشہ اپنے آپ کو دھوکا نہ دو' اپنے دل کو مجبور نہ کرو کہ وہ اپنی چاہت کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہوجائے۔ یاد رکھنا اس چھوٹی سی زندگی میں سچا پیار کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے اور تمہارا شمار بھی ان ہی چند خوش نصیبوں میں ہے جنہیں پیار نے اپنے لیے چن لیا ہے۔" وہ بے جان مجسمہ کی مانند کھڑی تھی' اس کی قوت گویائی سلب ہوچکی تھی' لیکن اس کے دل کی ہر دھڑکن پکار پکار کر شور کررہی تھی کہ سامنے کھڑا شخص جو کچھ اس سے کہہ رہا ہے' وہ ہی سچ ہے' مان جاؤ اس

حقیقت کو جانے وہ کب تک اس بے خودی کے عالم میں کھڑی رہتی کہ اچانک ہی باہر سے آنے والی کسی گاڑی کے تیز ہارن نے اس کے سوئے ہوئے حواسوں کو بے دار کردیا اور گویا اس کے مردہ تن میں جان سی پڑ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ داؤد سے چھڑوایا۔

"جاؤ داؤد خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ' مجھ پر رحم کھاؤ۔" وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی رو رہی تھی۔

"جارہا ہوں' لیکن یاد رکھنا اگر تم نے زریاب سے شادی سے انکار نہ کیا تو ہم دونوں میں سے کسی ایک کا خون ہوگا' میرا یا زریاب کا' کیونکہ میں تمہیں کبھی بھی اپنے سوا کسی اور کی ہونے نہیں دوں گا۔" کہتے کہتے اس نے آہستگی سے اس کے بالوں کی لٹ کو چھوا اور اس کے گال کو تھپتھپاتا تیزی سے باڑ پھلانگ کر اسی طرح واپس چلا گیا جس طرح آیا تھا۔ اسے جاتا دیکھ کر فاریشہ کے دل میں ایک تیز درد کی لہر اٹھی جو اس کے پورے جسم پر چھا گئی۔ وہ سب کچھ بھول گئی' اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ زریاب کی امانت ہے' وہ بھول گئی کہ اس کے تن و من پر پہلا حق زریاب کا ہے' لیکن شاید عورت تو اس ہی کی ہوجاتی ہے جو اس کے سوئے ہوئے احساسات کو جگادے اور یقیناً" داؤد ایسا کرکے جاچکا تھا۔ اس نے فاریشہ سے صرف اپنی محبت کا اظہار کیا تھا' اس کی پاکیزگی کی گواہی اور ثبوت نہیں مانگا تھا۔ شاید یہ ایک پہلا فرق تھا۔ داؤد اور زریاب میں جو فاریشہ کو محسوس ہوا۔

داؤد جسے اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ فاریشہ کے دل پر کسی اور کا سایہ ہے یا نہیں' وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ اپنی محبت فاریشہ کے دل میں جگانی ہے اور اسی کوشش نے اسے آج اتنا رسک لے کر فاریشہ سے بات کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ فاریشہ کی سیکنڈ چوائس بننے پر بھی راضی تھا۔ عجیب شخص تھا فاریشہ اس کے بارے میں جتنا سوچتی الجھ جاتی۔

☆ ☆ ☆

دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں' زریاب بہت خوش تھا کہ فاریشہ بچپن سے ہی پسند تھی اور یہ پسند کب محبت میں ڈھلی اسے احساس ہی نہ ہوا اور اب فاریشہ جلد ہی اس کی ہونے والی تھی' یہ خوشی اتنی زیادہ تھی کہ اسے چاروں طرف بہار ہی بہار نظر آرہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ فاریشہ کے کورے دل پر اس کا نام نقش ہے اور اسی ایک احساس نے اس کے فخر و غرور کو سوا کردیا تھا۔ وہ ایک عام سا روایتی مرد تھا جو اپنی ہونے والی بیوی کو بالکل کورے کاغذ جیسا دیکھنا چاہتا تھا۔ جس پر کوئی نام درج نہ ہو' جانے کیوں زریاب کے دل کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی کہ بیوی اتنی پاک باز ہو کہ اس پر کبھی کسی غیر مرد کی نگاہ بھی نہ پڑی ہو اور اب اس کی یہ خواہش فاریشہ کی شکل میں پوری ہونے والی تھی' کیونکہ فاریشہ کا دل ایسا ہی کورا کاغذ تھا صاف شفاف اور بالکل خالی۔

داؤد کی اس دن کی گفتگو نے فاریشہ کے دل میں ایک انجانا سا خوف سا بھر دیا' وہ جب بھی داؤد کے الفاظ یاد کرتی اسے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوتا اور اس کا دل ڈوبنے لگتا' اسے محسوس ہوتا کہ داؤد ضرور زریاب کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا اور یہ خوف اتنی شدت اختیار کر گیا کہ ہر وقت اس کا دل ہولتا رہتا۔ زریاب کو باہر سے آنے میں ذرا سی بھی دیر ہوجاتی تو وہ جلے پیر کی بلی کی طرح پورے گھر میں پھرتی' داؤد کے الفاظ کے خوف نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی' اس نے کئی بار سوچا کہ شادی سے انکار کردے' لیکن کیا جواز بنا کر' کس بات کو بنیاد بنا کر انکار کرے' کیونکہ وہ جانتی تھی کہ انکار کرنا اتنا آسان نہ تھا' یہ دونوں خاندانوں میں بھونچال لانے کا سبب تھا' جبکہ اس کی ہونے والی بھابھی اس کی نند بھی تھی' اس صورت میں اس کا انکار چار زندگیوں کی بربادی کا سبب تھا' پھر وہ کیا کرے' اسے کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔

وہ آج صبح سے ہی تائی امی کے گھر پر تھی' کیونکہ آج مریم کی طرف سے اسے خاص لنچ کی دعوت تھی اور یقیناً" یہ لنچ مریم نے ہی تیار کرنا تھا۔ جو اس وقت

کچن میں مصروف تھی' جبکہ فاریشہ اور تائی امی لاؤنج میں بیٹھی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر آنے والا کوئی ٹاک شو بھی دیکھ رہی تھیں' جب اصغر تیزی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اس کے پیچھے ہی داؤد بھی تھا۔ جو زریاب کو تھامے ہوئے تھا' بلکہ زریاب کے ماتھے پر بندھی پٹی اور پاؤں کی لنگراہٹ ثابت کررہی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے' تائی امی زریاب کو اس حالت میں دیکھ کر بے قراری سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کیا ہوا اسے؟" وہ تیزی سے زریاب کی طرف بڑھیں۔ جبکہ فاریشہ یک دم داؤد کے اندر آنے پر کچھ ہڑبڑا سی گئی اور فوراً" ہی اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کچھ نہیں ہوا آنٹی' آپ گھبرائیں مت۔" داؤد نے زریاب کو قریبی رکھے کاؤچ پر لٹادیا' اصغر نے کاؤچ پر رکھے کشن زریاب کے سر کے نیچے کردیے۔ زریاب کی آنکھیں بند تھیں' غالباً" کسی انجکشن کے زیر اثر وہ غنودگی میں تھا۔

"پتا نہیں کیسے سیڑھیوں سے سلپ ہوگیا' ایکچوئیلی ہم دونوں لنچ کرنے آفس سے نکل رہے تھے کہ جانے کیا ہوا اسے چکر آیا یا شاید سیڑھیوں پر کچھ گرا تھا' سمجھ نہیں آیا' بس یہ یک دم لڑکھڑایا اور نیچے آگیا' زیادہ چوٹ نہیں آئی' بس ذرا سر سیڑھیوں سے ٹکرا گیا ہے۔ بہرحال آپ پریشان نہ ہوں' اب یہ ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہے۔" داؤد نے بڑے دھیمے انداز سے تائی کو تمام تفصیل بتائی۔ اپنی گفتگو کے دوران وہ لاؤنج میں موجود فاریشہ کے وجود سے یکسر بے نیاز دکھ رہا تھا' پھر بھی جانے فاریشہ کو کیا ہوا بڑے دھیان سے حادثہ کی تفصیل سنتے سنتے یک دم ہی طیش میں آگئی۔

"سیڑھیوں سے گرا تھا یا تم نے دھکا دیا تھا۔" بغیر کسی کی موجودگی کا خیال کیے وہ ایک دم ہی داؤد کے سامنے جا کھڑی ہوئی' غصہ کی شدت سے اس کے چہرے کا رنگ سرخ پڑ گیا تھا۔

"میں۔۔۔ میں کیوں دھکا دوں گا اسے۔" داؤد نے ایک نگاہ فاریشہ کے چہرے پر ڈالی اور پھر زریاب کی طرف پلٹتے ہوئے حیرت سے دریافت کیا جو خود بھی نہایت ہی پریشانی کے عالم میں فاریشہ کی جانب تک رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی مزید جواب دیتی مریم تیزی سے لاؤنج میں داخل ہوئی۔

"فاری اندر چلو۔" اس نے فاریشہ کو بازو سے تھام کر اندر کی جانب گھسیٹا' جبکہ فاریشہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"چھوڑ دو مجھے' آج سب کچھ کہہ لینے دو' تاکہ سب کو پتا چلے کہ یہ شخص زریاب کا دوست نہیں ہے۔"

"فار گاڈ سیک فاریشہ خاموش ہوجاؤ۔" زریاب نے تکلیف کے سبب ہلکا سا کراہتے ہوئے کہا' جبکہ تائی اماں نہایت ہی پریشانی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھیں' اب وہ مزید کچھ کہے بنا روتی ہوئی لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی' مریم تیزی سے اس کے پیچھے لپکی' اس کے باہر نکلتے ہی تائی امی ایک دم ہوش میں آگئیں۔

"معاف کرنا بیٹا اس کی کسی بات کا برا نہ ماننا' دراصل یہ زریاب سے بے حد محبت کرتی ہے' یہی وجہ ہے کہ اس کی تکلیف برداشت نہ کرسکی اور تمہیں غلط سلط سنا گئی۔ بہرحال اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔"

"اوہ آنٹی آپ کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہیں' کوئی بات نہیں' میں اس کی فیلنگ سمجھ سکتا ہوں' اٹس اوکے' بہرحال میں اب چلتا ہوں' آپ یہ تمام میڈیسن اسے ٹائم سے دیتی رہیے گا' ان شاء اللہ یہ جلد ہی ٹھیک ہوجائے گا۔"

اپنے ہاتھ میں تھاما چھوٹا سا پلاسٹک بیگ تائی امی کے حوالے کرکے وہ باہر نکل گیا۔ جبکہ تائی امی افسوس ہی کرتی رہ گئیں کہ فاریشہ کے جذباتی پن کے سبب وہ اس کی کوئی خاطر مدارات بھی نہ کرسکیں اور وہ ساری رات فاریشہ نے ایک بے چینی کے عالم میں گزاری' اسے رہ' رہ کر احساس ہورہا تھا کہ کچھ غلط ہونے والا ہے' اس کا دل آج کے اس واقعہ کو حادثہ ماننے پر تیار

ہی نہ تھا' اسے یہ سب داؤد کی سوچی سمجھی سازش لگ رہی تھی۔

"اف میرے خدا' میں کیا کروں؟" اپنے سر کو دونوں ہاتھوں پر گرائے وہ سخت ٹینشن کے عالم میں تھی' جب ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔

"کیوں نہ میں ایک مرتبہ داؤد سے بات کروں' ہوسکتا ہے کہ میں اسے قائل کرسکوں' اسے بتانا ضروری ہے کہ میں صرف اور صرف زریاب سے محبت کرتی ہوں اور میرے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے' شاید بات اس کی سمجھ میں آجائے۔" یہ سوچ کر وہ کس قدر مطمئن ہوگئی' لیکن اتفاق کی بات تھی کہ اس دن کے بعد سے اس کا دوبارہ داؤد سے سامنا ہی نہ ہوا اور ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کے حق میں وہ نہ تھی' کیونکہ ٹیلی فونک گفتگو قریب بیٹھا کون کون شخص سن رہا ہے' اس کا اندازہ دوسری طرف سے نہیں لگایا جاسکتا تھا اور اس سلسلے میں وہ کسی بھی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتی تھی' اسی لیے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی جو اتفاق سے اسے ایک روز مل ہی گیا' ایک شام داؤد' حیدر کے ساتھ گھر آیا تو وہ باہر لان میں ہی ٹہلنے لگی' اس نے سوچا ہوا تھا کہ اگر واپسی میں داؤد اکیلا باہر آیا تو وہ ضرور اس سے بات کرنے کی کوشش کرے گی' کیونکہ اس کے سوا اب کوئی اور چارہ نہ تھا۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا چاروں طرف ملگجا سا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ باہر کا بلب بھی کسی نے نہ جلایا تھا' اسی لیے یہ اندھیرا کچھ زیادہ ہی محسوس ہورہا تھا۔ وہ خاموشی سے بادام کے پیڑ کی آڑ میں کھڑی تھی' جب وہ اسے لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آتا دکھائی دیا وہ یک دم ہوشیار ہوگئی۔

"داؤد..." جانے کیسے اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی جس نے داؤد کو چونکا دیا اور وہ بنا پیچھے دیکھے اپنی جگہ پر رک گیا فاریشہ تیزی سے اس کے قریب آئی وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی اسی لیے بنا کسی تمہید کے بولی۔

"میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس وقت..." داؤد نے حیرت سے پہلے اسے اور پھر لاؤنج کے دروازے کی جانب تکتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں آپ کل کالج گیٹ پر آجائیں میں نے ایڈمٹ کارڈ لینے جانا ہے تقریباً" گیارہ بجے میں وہیں آپ سے بات کروں گی۔" گھبراہٹ میں اس نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔

"گیارہ بجے! تو ناممکن ہے۔"

"ناممکن کیوں ہے؟ آپ جانتے ہیں میں ابھی یہاں زیادہ بات نہیں کرسکتی میں کل آپ کا انتظار کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ رکی نہیں اور تیزی سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی' داؤد اپنی جگہ پر مبہوت کھڑا رہ گیا یہ بالکل غیر متوقع تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فاریشہ نا صرف اسے مخاطب کرے گی بلکہ ملنا بھی چاہے گی وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ فاریشہ کوئی فیصلہ کرچکی ہے. جو صرف سنانا باقی ہے اور اس کا فیصلہ جاننے کے لیے بیچ میں ایک پوری رات کا سفر باقی تھا وہ خاموشی سے گیٹ عبور کرکے باہر نکل گیا۔

اگلے دن گیارہ بجے وہ عین کالج گیٹ کے سامنے تھا لیکن آج وہ باہر نہیں آیا بلکہ گاڑی میں ہی بیٹھا فاریشہ کا انتظار کررہا تھا جب وہ اسے گیٹ سے باہر آتی دکھائی دی سفید دوپٹہ اور فیروزی قمیص میں اس کی رنگت خوب دمک رہی تھی اس کے بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے پر آرہے تھے جسے وہ دونوں ہاتھوں سے پیچھے کرتی گاڑی کے پاس آکھڑی ہوئی داؤد نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ روڈ پر کھڑے ہوکر بات کرنا مناسب نہیں ہے فاریشہ تذبذب کے عالم میں دروازہ ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ اعتبار کرو مجھ پر کہیں نہیں لے کر جاؤں گا بلیو می۔" ایک سیکنڈ لگا فاریشہ کو فیصلہ کرنے میں اگلے ہی پل وہ گاڑی کے اندر تھی اور داؤد تو مانو پوری جان سے مہک اٹھا اسے لگا۔ اس کی گاڑی کی قدر و قیمت کئی گنا بڑھ گئی ہو۔

"کہاں چلیں؟" وہ اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتا ہوا بولا۔

"کہیں نہیں بس ذرا فاصلے پر لے جاکر گاڑی روک دیں میں یہیں آپ سے بات کروں گی۔" اس کے لہجہ کی بے زاری عروج پر تھی جسے محسوس کرکے داؤد کا جوش و خروش بھی ماند پڑگیا۔

"خیریت ہے تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا تھا۔"

"یہ بتانے کے لیے کہ میں زریاب سے محبت کرتی ہوں اور میری زندگی میں آپ کی گنجائش نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"بس یا کچھ اور..." ایسے جیسے اس کی بات کا داؤد نے مزا لیا ہو۔

"اور یہ کہ خدا کے لیے تم میری اور زریاب کی زندگی سے کہیں دور چلے جاؤ اگر تمہیں مجھ سے ذرا سی بھی محبت ہے تو اسی محبت کا واسطہ مجھے اس عذاب سے نجات دلادو' جس میں' میں پچھلے کئی دنوں سے مبتلا ہوں پلیز داؤد میرے حال پر رحم کرو۔" وہ یک دم ہی آپ سے تم پر آگئی۔

"مجھ سے وعدہ کرو تم زریاب کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ گے۔" وہ یک ٹک اس کی جانب دیکھتا رہا۔

"پلیز داؤد میری بات کا جواب دو۔"

"ٹھیک ہے میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا لیکن میری جان تو میری اپنی چیز ہے اس پر تمہارا کوئی حق نہیں یاد رکھنا میری موت کی ذمہ دار تم ہوگی صرف تم۔"

"داؤد پلیز..." اس کی رنگت یک دم ہی پیلی پڑگئی اور آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

"اب تم جاسکتی ہو۔" لب بھینچے وہ سامنے دیکھ رہا تھا اس کے لہجے کی سختی گواہ تھی کہ اب وہ مزید کوئی بات نہیں سنے گا کچھ دیر وہ بے بسی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی اور پھر چپ چاپ خاموشی سے نیچے اتر گئی اور وہ تیزی سے گاڑی بھگا کر لے گیا پھر وہ کس طرح گھر پہنچی اسے نہیں پتا چلا لیکن گھر آتے ہی وہ شدید بخار کا شکار ہوگئی یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ بخار کی شدت سے وہ بے ہوش ہوگئی اور جب اسے ہسپتال لے جایا گیا ڈاکٹر نے کہا کہ وہ شدید دباؤ کا شکار ہے. جس کی وجہ سے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوچکا ہے اور یہ بات دونوں گھروں کے لیے حیرت انگیز تھی فاریشہ کس ذہنی دباؤ کا شکار تھی؟ ہر شخص یہ ہی جاننے کی جستجو میں تھا۔

☼ ☼ ☼

زریاب اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے جانے کب سے یوں ہی بیٹھا تھا رہ رہ کر اس کے کانوں میں فاریشہ کا ملتجی لہجہ گونجتا۔

"پلیز! زریاب میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی خدا کے لیے کسی بھی طرح اس شادی کو کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کروا دو میں تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی۔" فاریشہ نے ایسا کیوں کہا؟ کیوں وہ شادی نہیں کرنا چاہتی؟ کیا وجہ ہے؟ اسے سوچ سوچ کر الجھن ہونے لگتی اسے لگا شاید فاریشہ کسی اور کو پسند کرتی ہے کوئی اور کون؟ کہیں داؤد تو نہیں یک دم ہی اس کے ذہن میں فلش ہوا' اسے گزری ہوئی کچھ باتیں یاد آنے لگیں جنہیں اس نے فوراً" ہی اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔

"ناممکن ایسا نہیں ہوسکتا وہ میرا بہت اچھا دوست ہے وہ کبھی بھی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا امپاسبل وہ جانتا ہے کہ میں فاریشہ سے کتنی محبت کرتا ہوں کبھی نہیں وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس نے اپنے دل کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کی اور پھر شادی کچھ عرصہ کے لیے التوا کا شکار ہوگئی زریاب کا اچانک ہی ٹرانسفر ہوگیا۔

اسے فوری طور پر پشاور جانا تھا ورنہ اس کی نوکری ختم ہوسکتی تھی انتہائی ایمرجنسی میں پشاور روانہ ہوا جہاں داؤد کا آبائی گاؤں تھا زریاب گاؤں میں داؤد کے دادا اور دادی "بی جان" سے مل کر بہت خوش ہوا یہاں آکر اسے علم ہوا کہ داؤد کا بچپن اپنے دادا اور دادی کے ساتھ گزرا ہے کیونکہ شادی کے تقریباً" دو سال بعد اس کی والدہ اور والد اعلا تعلیم کے حصول کے لیے

انگلینڈ چلے گئے تھے ایسے میں ایک سالہ داؤد کی پرورش بی جان نے ماں بن کر کی داؤد کے والدین جب اعلا ڈگری لے کر وطن واپس لوٹے تو اس کی اعلا تعلیم کے خیال سے اسے بورڈنگ شفٹ کردیا گیا اس طرح داؤد شروع سے ہی گھریلو ماحول سے دور رہا تھا داؤد کی والدہ اسلام آباد کی ایک اعلا یونیورسٹی سے منسلک تھیں جبکہ اس کے والد ایک اعلا حکومتی عہدیدار تھے دوبار اپنے علاقہ سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن بھی جیت چکے تھے اور آج کل سینٹ کے ممبر تھے داؤد سے چار سال چھوٹی اس کی ایک بہن بھی تھی جس کی شادی بی بی اے کی فوراً" بعد ہی ہوگئی تھی اور آج کل وہ سعودیہ میں اپنے ڈاکٹر شوہر کے ساتھ قیام پذیر تھی کئی سال رہائش کے دوران زریاب کی ملاقات داؤد کے والدین سے بھی ہوئی جن سے مل کر وہ قدرے حیران ہوا اسے حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ داؤد کی عادات و اطوار اپنے گھر والوں سے قطعی مختلف تھے۔

اس کی گردن میں ویسا کلف نہ تھا جو اس کے ماں اور باپ کی گردنوں میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا اور یقیناً" داؤد کی شخصیت کا یہ تضاد بی جان کی ترتیب کا نتیجہ تھا جو داؤد غلط انداز و اطوار کا شکار نہیں ہوا اس کے علاوہ اگر اس کی شخصیت میں کوئی کمی یا خرابی تھی تو ظاہر ہے کہ اس کی وجہ دولت کی ریل پیل ماں باپ کا۔ لاڈ پیار اور بورڈنگ میں حاصل کی گئی تعلیم ہی ہوسکتی ہے ویسے بھی اتنے بڑے بیوروکریٹ کی اولاد ہونے کے ناتے اس میں کچھ نہ کچھ تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا جو اسے دوسروں سے نمایاں کرے اور شاید یہ ہی وہ واحد خوبی تھی جو اسے والدین سے ورثے میں ملی تھی۔

☼ ☼ ☼

مریم اور حیدر کی شادی طے پا گئی تھی کیونکہ حیدر کو انگلینڈ میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی اس کا ارادہ مریم کو بھی ساتھ لے کر جانے کا تھا زریاب ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر گیا اس سارے عرصہ میں وہ فاریشہ سے قطعی طور پر لاتعلق رہا جب کہ اسے فاریشہ بھی پہلے سے زیادہ چپ چپ دکھائی دی واپس آنے کے دو ماہ بعد ہی اسے اطلاع ملی کہ مریم بھی انگلینڈ چلی گئی ہے جانے کیوں گھر جانے کو اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا اس نے خود کو نوکری اور پشاور تک ہی محدود کردیا تھا اکثر و بیشتر داؤد اس سے ملنے چلا آتا تھا اور یہ وقت اس کا بہت اچھا گزرتا اس دن بھی داؤد آیا ہوا تھا اور وہ دونوں دوست گھر سے باہر نکلے ہوئے تھے باہر کا موسم بہت ہی خوش گوار تھا دونوں نے خوب تفریح کی کھانا کھایا سینما پر لگی ایک پرانی فلم دیکھی اور پھر رات گئے گھر واپس آئے گھر آکر فلم کی کہانی دوہراتے دوہراتے باتوں ہی باتوں میں "محبت" اور "عشق" پر بحث شروع ہوگئی اور ایسے میں داؤد کے خیالات نے زریاب کو چونکا دیا داؤد کا یہ کہنا کہ

"وہ عورت کے پیار کا قائل نہیں ہے۔" زریاب کو حیرت کے سمندر میں غرق کر گیا۔

"عجیب بات ہے بھلا عورت کے بغیر بھی پیار کیا جاسکتا ہے۔"

"نہیں پیار محبت عورت کے بغیر ممکن نہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ عورت بھی پیار کرے کیونکہ وہ تو محبوب ہی ہوتی ہے اس کا وجود بنا ہی اسی لیے ہے کہ اسے چاہا جائے پھر بھلا وہ خود کسی کو کیسے چاہ سکتی ہے۔"

"یار تمہارا فلسفہ میری سمجھ سے باہر ہے۔" زریاب نے بستر جھاڑ کر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ فلسفہ نہیں سچ ہے عورت ایک عجیب ہستی ہے جہاں کسی کے ساتھ منسوب ہوئی تمام آرزوؤں کو اسی کے ساتھ وابستہ کرکے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس ہستی میں کھو دیتی ہے مگر اس کے لیے شادی شرط ہے بہرحال چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ تم شادی کیوں نہیں کرلیتے۔"

"اور اگر یہ ہی میں تم سے پوچھوں۔"

"تو پھر میرا جواب یہ ہوگا کہ جو میری چاہت تھی وہ کسی اور کا نصیب بن گئی۔" وہ دھیما سے ہنسا اور تکیہ

سیدھا کرکے لیٹ گیا لیکن اس کے لہجہ کا کرب زریاب کے دماغ کی کئی گرہیں کھول گیا۔

"میری مانو زریاب تم شادی کرلو جانے تم کیوں جوگ لے رہے ہو؟" اس نے بات کرتے کرتے پلٹ کر زریاب کی سمت دیکھا جو آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

"زریاب..." جانے کیا سوچ کر اس نے دھیرے سے پھر پکارا۔

"ہوں..."

"تم شادی کیوں نہیں کرلیتے جب کہ تمہیں فاریشہ سے محبت بھی ہے۔"

"مجھے محبت ہے صرف مجھے لیکن جانتے ہو وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔" زریاب نے اپنی آنکھوں سے بازو ہٹایا جو شدت جذبات سے سرخ ہوچکی تھیں۔

"میری چاہت شدید ہے لیکن مجھے یقین ہے وہ کسی اور کو چاہتی ہے اس کے دل میں کوئی اور بسا ہے۔"

"بے کار کی سوچیں ہیں زریاب وہ تمہیں چاہتی ہے صرف تمہیں میری بات کا یقین کرو اس کے دل میں صرف تم ہو۔"

"تمہیں کیسے معلوم۔" زریاب اٹھ کر بیٹھ گیا اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی داؤد یک دم گھبرا گیا۔

"دراصل تمہاری ہی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے۔" اس نے فوراً" بات سنبھالی۔

"اوہ... اچھا۔" یہ کہہ کر زریاب دوبارہ لیٹ گیا اور اس نے آنکھیں موند لیں۔

"تم نہیں جانتے داؤد! وہ بہت بے قرار ہے اس کی دن بدن گرتی صحت مجھے احساس دلا رہی ہے کہ اس کے دل میں کوئی اور بسا ہے وہ اپنے دل کے درد کو چھپا کر بے حال ہے کاش وہ مجھ پر اعتبار کرلیتی تو یہ ساری اذیت ہی ختم ہوجاتی۔" وہ آہستہ آہستہ کہتے کہتے بالکل خاموش ہوگیا ایسے جیسے وہاں ہو ہی نا۔

"زریاب..." اس نے کوئی جواب نہ دیا غالباً" وہ سوچکا تھا یا سونے کی اداکاری کررہا تھا بہرحال داؤد کا دل یک دم ہی اپنے دوست کی محبت سے بھر گیا اسے لگا اس کی بربادی کا ذمہ دار وہ خود ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ فاریشہ اس کے دوست کی محبت تھی کیوں اس کی چاہت کی تمنا کی اور اگر کرہی لی تھی تو یہ کیوں نہ سوچا کہ وہ کس طرح زریاب کو ٹھکرا کر مجھ سے شادی کرلے گی؟ یہ سب خیالات اس سے پہلے مجھے کیوں نہ آئے یہ سب میں نے پہلے کیوں نہ سوچا؟ اب جو سوچا تو پشیمان ہوگیا اس کی نگاہوں میں فاریشہ کا چہرہ آگیا اس نے ایک نظر آنکھوں پر بازو رکھے زریاب پر ڈالی۔

"یہ شخص مجھے اپنا پرخلوص اور سچا دوست سمجھتا ہے جب کہ میں کتنا کمینہ ہوں اسے پتا ہی نہیں ہے۔" یکایک اس کا دل پگھل گیا گلا بھر آیا اور اس کے جسم کے روئیں روئیں نے پکار کر کہا کہ وہ زریاب کو دھوکہ نہیں دے سکتا وہ زریاب کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے اپنی آرزو اپنی خواہش اور اپنی محبت کو قربان کرسکتا ہے۔ اور یقیناً" اسے ایسا ہی کرنا ہوگا کیونکہ اسی میں ہی سب کی بھلائی ہے اور یہ سوچتے ہی اس کا دل مطمئن ہوگیا اس نے شانت ہوکر اپنی آنکھیں بند کرلیں اس کا دل فاریشہ فاریشہ پکار رہا تھا لیکن آج پہلی بار اس نے اپنے دل کی پکار کو یکسر نظرانداز کردیا اور اس سلسلے میں اس نے زریاب سے بات کرنے کا فیصلہ بھی کرلیا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر اگلے دن زریاب نے کچھ عجیب ہی بات کی ایسی بات جسے سن کر داؤد کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا زریاب خوب تیار ہوکر پرفیوم میں مہکتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا تو داؤد نے ازراہ مذاق پوچھ لیا۔

"کہیں ڈیٹ پر جارہے ہو۔"

"ہاں..." اس نے ٹی وی لاؤنج میں لگے قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا بھرپور جائزہ لیا اس کے جواب نے چینل سرچنگ کرتے ہوئے داؤد کے ہاتھوں کو ساکت کردیا۔

"کیا مطلب... یقیناً" زریاب مذاق کررہا تھا۔

"کوئی مطلب نہیں یار میری ایک کولیگ ہے فلک بلوچ مجھے اچھی لگتی ہے۔ آج ہم نے ایک ساتھ ڈنر کرنا ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں اسے آج ہی پرپوز ہی کردوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ تم صحیح کہہ رہے ہو مجھے اب شادی کرلینی چاہیے۔"

"واٹ ربش زریاب کیا مذاق ہے یہ۔"

"مذاق نہیں میرے دوست سچ ہے ایک خوب صورت سچ جو جلد ہی ساری دنیا کے سامنے آجائے گا۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے تم شاید بھول گئے ہو فاریشہ تمہاری منگیتر ہے اور نا صرف تمہاری کزن بلکہ تمہاری بہن کی نند بھی ہے۔"

"میں یہ سب جانتا ہوں تم خوامخواہ کی ٹینشن مت لو۔" اس نے صوفے کی بیک پر پڑا اپنا کوٹ اٹھایا اور ایک شوخ سی دھن سیٹی پر بجاتا باہر نکل گیا جب کہ اس کے یہ اطوار داؤد کے لیے بالکل نئے تھے وہ حیران تھا کہ یہ یک دم زریاب کو کیا ہو گیا وہ تو ایسا نہ تھا اور پھر جب تک داؤد پشاور رہا زریاب کو سمجھاتا رہا لیکن جانے زریاب کو کیا ہو گیا تھا وہ یک دم ہی بدل گیا تھا لگتا ہی نہ تھا کہ وہ کبھی فاریشہ کا دیوانہ ہو گا وہ تو صرف اور صرف فلک بلوچ کا ہو کر رہ گیا تھا جو نا صرف خوب صورت بلکہ ایک طرح دار اور ماڈرن لڑکی بھی تھی گھر سے دور نوکری کر رہی تھی جس کا فائدہ وہ زریاب کو کمپنی دے کر خوب اٹھا رہی تھی زریاب کا نقطہ نظر بالکل تبدیل ہو گیا تھا وہ کہتا تھا کہ اگر زندگی بہترین گزارنی ہے تو اس کے ساتھ گزارو جو تم سے محبت کرتا ہے اور فلک صرف اور صرف مجھ سے محبت کرتی ہے۔

"فاریشہ بھی صرف اور صرف تم سے ہی محبت کرتی ہے۔" داؤد نے ایک آخری کوشش کے طور پر سمجھانا چاہا جواباً وہ کچھ نہ بولا صرف مسکرایا ایک تلخ مسکراہٹ جو اس کے لبوں کو چھو کر گزر گئی اسے لگا زریاب نے اپنا سب کچھ لٹانے کا فیصلہ کرلیا ہے یقیناً" اس کا دل رو رہا تھا لیکن چہرہ مسکرا رہا تھا شاید وہ جان چکا تھا کہ داؤد اور فاریشہ کے بیچ میں کچھ ہے شاید وہ دوستی کے لیے قربانی دے رہا تھا یا شاید محبت کے لیے اور اس خیال نے داؤد کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر دیں زریاب نے شادی سے انکار کردیا جس نے سنا ہکا بکا رہ گیا فاریشہ کو تو یقین ہی نہ آیا وہ سن کر کچھ دیر تک کچھ بول نہ سکی اسے لگا اس سب کا ذمہ دار داؤد ہے یقیناً" اس نے ہی زریاب کے کان بھرے ہوں گے ورنہ زریاب تو ایسا نہ تھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ زریاب کو فون کر بیٹھی۔

"آپ نے شادی سے انکار کیوں کیا ہے؟"

"وجہ تم جانتی ہو۔"

"زریاب آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔" وہ یک دم ہی روہانسی سی ہو گئی۔

"اپنے دل کو ٹٹولو کیا تم واقعی۔۔۔ مجھ سے محبت کرتی ہو ایک بات یاد رکھنا فاریشہ خود کو دھوکہ نہ دینا جسم کسی اور کا اور دل کسی اور کا۔"

"اس کا مطلب ہے میرا خیال درست نکلا" آپ کو ضرور داؤد نے بھڑکایا ہے۔" داؤد کا نام فاریشہ سے سنتے ہی زریاب کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

"تو میرا شبہ درست نکلا۔" اسے اپنے اندازے کی درستگی کا یقین آگیا۔

"اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا یہ میرا اپنا فیصلہ ہے اور میرے خیال سے ہر شخص کو اپنی زندگی اپنی پسند اور مرضی سے گزارنے کا پورا پورا اختیار ہے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" زریاب نے تصدیق چاہی۔

"نہیں۔۔۔" اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"گڈ گرل! میرا مشورہ مانو تو تم بھی اسی سے شادی کرو جس سے تمہارا دل آمادہ ہو خواہ وہ داؤد ہی کیوں نہ ہو۔"

زریاب نے فون بند کردیا کیونکہ اس سے زیادہ برداشت اس میں نہ تھی اپنی محبت کو کھونے کے لیے بڑے ظرف اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور زریاب اپنے اس حوصلے کو کمزور نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اور پھر جلد ہی اس نے فلک سے شادی کرلی اور اپنا ہنی مون منانے دبئی چلا گیا' سب کا خیال تھا کہ یہ خبر سنتے ہی فاریشہ اپنے ہوش و حواس کھو دے گی' لیکن اس کا اطمینان حیرت انگیز تھا' شاید وہ دل سے ہی زریاب سے شادی پر آمادہ نہ تھی" اس کا ادراک اس پر ہو چکا تھا' لیکن جانے اس سارے عرصہ میں داؤد کہاں غائب تھا' بظاہر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ زریاب اور فاریشہ کے درمیان موجود رشتے کو ختم کروانے کے علاوہ داؤد کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

فاریشہ نے ایم ایس سی میں داخلہ لے لیا' مریم ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی' بچی بے حد خوب صورت تھی' فاریشہ کے کہنے پر ہی اس کا نام حرمت رکھا گیا' فاریشہ تقریباً" روزانہ ہی رات میں مریم سے نیٹ کے ذریعے بات کرتی' اسکائپ پر ان دونوں کی گھنٹوں گفتگو ہوتی' ایسے میں اکثر ہی مریم داؤد کے حوالے سے کوئی گزری بات کرتی تو فاریشہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کردیتی' وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دل میں موجود داؤد کی محبت کسی پر عیاں ہو' زریاب بھی اکثر و بیشتر فون کرتا رہتا تھا' فلک سے بھی اس کی رسمی سی بات چیت تھی' حیرت انگیز بات یہ تھی کہ فلک سے بات کرتے ہوئے زریاب کے حوالے سے فاریشہ کے دل میں کبھی بھی حسد یا جلن جیسے جذبات پیدا نہ ہوئے' وہ دلی طور پر مطمئن تھی اور فلک کو زریاب کے حوالے سے مکمل طور پر قبول کر چکی تھی۔ زریاب کا بیٹا پیدا ہوا تو عائشہ بیگم اور نازیہ دونوں افراسیاب کے ساتھ ایک ہفتہ پشاور رہ کر آئیں" اب تو گھر کے ہر فرد کی خواہش تھی کہ فراز صاحب بھی زریاب کو معاف کردیں' لیکن جانے کیوں انہوں نے اس معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کر رکھی تھی' یہاں تک کہ زریاب کے بیٹے کا سن کر بھی کسی خاص رد عمل کا اظہار نہ کیا' یہی وجہ تھی کہ زریاب گھر آنے سے کتراتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فاریشہ یہاں آؤ بیٹا۔" وہ جیسے ہی یونیورسٹی سے گھر آئی' اسے عائشہ بیگم کی آواز سنائی دی جو لاؤنج میں رکھے صوفہ پر بیٹھی جانے کس سے فون پر گفتگو کر رہی تھیں۔

"جی امی بولیں۔۔۔" وہ کمرے میں جاتی ہوئی واپس لاؤنج کی طرف پلٹ آئی۔

"لو بات کرو۔" انہوں نے جلدی سے ریسیور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"کون ہے؟"

"مریم۔۔۔" جواب دے کر وہ کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

"خیریت یہ آج آپ جناب نے فون کرنے کی زحمت کیسے کرلی۔" فاریشہ نے ریسیور تھامتے ہی خوشدلی سے کہا' کیونکہ اس کی روزانہ ہی رات میں نیٹ کے ذریعے محترمہ سے بات ہوتی تھی' بس ایک کل ہی مریم آن لائن نہ ہوئی تھی۔

"یار خبر ہی ایسی زبردست تھی کہ میں رات تک آن لائن ہونے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔" خوشی مریم کے لہجہ سے چھلک رہی تھی جو کسی انہونی کی اطلاع دے رہی تھی۔

"ایسی کیا بات ہو گئی جو تم اس قدر خوش ہو؟" تجسس خود بخود اس کے لہجہ میں در آیا۔

"فاری تم جانتی ہو رات ہمارے گھر کون آیا تھا؟" ہمیشہ جذبات کی رو میں وہ اسے فاری ہی پکارتی تھی۔

"فاری رات ہمارے گھر داؤد کے ممی' پاپا آئے تھے حیدر سے ملنے اور جانتی ہو وہ تمہارے لیے داؤد کا پرپوزل بھی لائے ہیں۔ داؤد کے پاپا کا بائی پاس تھا' جس کے سبب یہ فیملی پچھلے چار ماہ سے لندن میں مقیم ہے۔ داؤد دو دن قبل ہی پاکستان گیا ہے۔ اب اگر تم ہاں میں جواب دو تو وہ کل ہی پشاور سے بابا جان اور بی بی جان کو

لے کر چاچاجی کے پاس آجائے گا۔" مریم ایک ہی سانس میں جلدی جلدی سب کچھ بتاتی چلی گئی اور فاریشہ حیرت کے عالم میں منہ کھولے یہ ساری رام کہانی سنتی گئی۔

"بولو نا فاری! تمہیں اس رشتہ پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" فاریشہ کی خاموشی کو محسوس کرکے مریم نے پکارا اور اپنی بات کو پھر سے دہرایا' اسے خدشہ تھا کہ کہیں فاریشہ انکار ہی نہ کردے۔

"یہ آج داؤد کو ایک سال بعد میں کیسے یاد آگئی؟" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ خود بخود زبان پر آگیا۔

"فاری یار اس کے ماں' باپ اس رشتہ پر راضی نہ تھے اور وہ ان کی رضامندی کے بغیر تم تک آنا نہیں چاہتا تھا' اس پورے سال وہ مسلسل مجھ سے رابطہ میں رہا ہے' بہرحال یہ سب جانے دو' اب جو میں پوچھ رہی ہوں مجھے اس کا جواب دو' ذرا جلدی سے کہ تمہیں داؤد سے رشتہ پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا۔"

"نہیں۔۔۔" یہ یقینی طور پر اس کے دل کی آواز تھی۔

"تھینک گاڈ یار میں نے پہلے ہی حیدر سے کہا تھا کہ تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا' پھر بھی ان کا کہنا تھا کہ تم سے پوچھنا ضروری ہے' چلو اب اللہ حافظ' میں ذرا جلدی سے داؤد بھائی تک تمہارا اقرار پہنچاؤں اور ہاں" فون رکھتے رکھتے جیسے اچانک ہی اسے کچھ یاد آگیا۔

"ہوسکے تو زریاب بھائی کو بھی معاف کردینا۔"

"کس بات کی معافی۔" وہ حیران تھی۔

"تمہیں ریجیکٹ کرکے انہوں نے نا صرف تمہارا دل توڑا بلکہ۔۔۔"

"بس مریم اس نے جو بھی کیا بہت اچھا کیا۔" اس نے مریم کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔

"یقین جانو زریاب کے اس فیصلہ نے کئی زندگیاں تباہ ہونے سے بچالیں' وہ تو بہت عظیم شخص ہے' تمام الزام اپنی ذات پر لے کر مجھے سرخرو کرگیا۔" فاریشہ نے دل کی گہرائیوں سے زریاب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

"فاری تم خود بھی بہت اچھی ہو' میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی عطا کرے۔"

"آمین۔" اس کے دل سے یہ لفظ نکلا' اس نے خاموشی سے ریسیور رکھ دیا اور پھر حیدر کی کوششوں کے طفیل جلد ہی فاریشہ اور داؤد کا رشتہ طے پاگیا۔ داؤد اپنے بابا جان اور بی جان کے ساتھ آکر فاریشہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنا گیا' یہ سادہ اور پروقار سی رسم گھر میں ہی ادا کی گئی۔ اس موقع پر زریاب نے بھی فراز صاحب کو منالیا جو شاید اپنے پوتے کی محبت سے مجبور ہوکر زریاب کو معاف کربیٹھے۔ بی بی جان پشاور سے فاریشہ کے لیے ڈھیروں ڈھیر تحفے تحائف لے کر آئی تھیں۔ ان کے ساتھ داؤد کی چھوٹی بہن در شہوار بھی تھی جو خاص طور پر منگنی کی تقریب میں شرکت کے لیے سعودیہ سے آئی تھی' اسی شام فاریشہ سے فون پر ناصرف مریم اور حیدر نے بات کی بلکہ داؤد کے بابا اور مما نے بھی فون کرکے اسے مبارک دی' شادی کی تاریخ عید کے بعد رکھی گئی' جس میں تقریباً" دو ماہ باقی تھے۔

دونوں طرف سے زور و شور سے تیاریاں شروع تھیں' لیکن کبھی کبھی فاریشہ کو یہ سب بہت عجیب سا لگتا' داؤد کی وہ محبت اور وارفتگی جو اس کی شخصیت کا حصہ تھی' اب کہیں نظر نہیں آرہی تھی' یہاں تک کہ منگنی کے بعد سے اس نے فاریشہ کو کبھی ایک فون کرکے اس کی خیریت بھی دریافت نہ کی تھی' جانے کیا وجہ تھی فاریشہ کو اس کی بے رخی عجیب سی محسوس ہورہی تھی' لیکن وہ اس سلسلے میں مریم سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے خود کو حالات کے سپرد کردیا تھا۔

رمضان شروع ہوچکا تھا۔ زریاب اور فلک کراچی آگئے تھے۔ زریاب کے بیٹے نے گھر میں رونق بڑھا دی تھی' اس کا دل بھی کافی بدل چکا تھا۔ داؤد زریاب سے ملنے بھی نہ آیا تھا۔ اس کی بہن اکثر و بیشتر فاریشہ کو فون کرکے اس کی پسند و ناپسند کے بابت جان لیتی' تاکہ

شاپنگ اس کی مرضی کے مطابق ہوسکے' کیونکہ فاریشہ نے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔ مریم نے عید کے فوراً" بعد آجانا تھا اور مریم ہی تھی جس کی آمد کا اسے بے صبری سے انتظار تھا۔ آخری روزہ تھا وہ افطاری سے فارغ ہوکر اوپر چھت پر آگئی جہاں آس پاس کی چھتوں پر موجود لوگ بھی عید کا چاند دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ وہ نہایت محویت سے آسمان کی جانب تکتے ہوئے داؤد ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی' جب آس پاس کی چھتوں سے ابھرنے والے شور سے اندازہ ہوا کہ چاند نظر آگیا ہے۔ وہ سر پر دوپٹہ اوڑھے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگنے میں مشغول تھی' جب سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھری۔

"یقیناً" فلک ہی ہوگی' مجھے نیچے موجود نہ پاکر اوپر آگئی۔" اسی خیال کے تحت وہ آنکھیں موندے دعا کرنے میں مصروف رہی۔

"چاند مبارک ہو۔" کان کے قریب ابھرنے والی آواز یقیناً" داؤد کی تھی' اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں' وہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ سفید شلوار پر براؤن کرتا پہنے ہلکی ہلکی شیو میں اس کا سرخ و سفید چہرہ بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔

"ماشاء اللہ۔" دل ہی دل میں کہتے ہوئے فاریشہ نے فوراً" نظر اس کے چہرے سے ہٹالی۔

"دیکھ لو' دیکھ لو' دیکھنا منع نہیں ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسا' جبکہ فاریشہ رخ موڑے ناراض کھڑی رہی۔

"فاریشہ۔۔۔ ناراض ہو۔" کوئی جواب نہ پاکر وہ اس کے سامنے آگیا۔

"آپ کو کیا؟ میں ناراض ہوں یا نہیں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"آج دو ماہ بعد میں آپ کو کیسے یاد آگئی۔"

"ارے یار میں تو تمہیں ایک پل بھی نہ بھولا تھا اور ان دو ماہ میں تو میں نے تمہیں اتنا یاد کیا ہے جتنا پچھلے دو سال میں نہ کیا تھا۔"

"یاد کیا ہوتا تو کبھی فون نہ کرتے' میری خیریت نہ دریافت کرتے۔"

"بس اتنی سی بات پر خفا ہوا۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھتا ہوا بولا۔

"اصل میں یار میں تم سے شادی والے دن ہی ملنا اور بات کرنا چاہتا تھا' اس سے پہلے اپنے دل کی حالت تم سے بیان کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا' میں نے سب کچھ اس وقت کے لیے سنبھال رکھا تھا جب تم مکمل طور پر میری ہوجاتیں۔" وہ دھیرے دھیرے گمبھیر لہجے میں کہتا اس کے دل کے اندر اترتا گیا اور فاریشہ اس کے لہجے کی گرمی سے ہی پگھل گئی۔

"میں تو آج بھی تم سے کوئی بات نہ کرنا چاہتا تھا' وہ تو زبردستی تمہیں چاند کی مبارک دینے فلک اور در شہوار نے اوپر بھیج دیا۔" وہ شرارتی لہجے میں اس کی طرف جھکتا ہوا بولا۔

"در شہوار کیا مطلب۔۔۔ کہاں ہے وہ؟"

"نیچے آنٹی کے پاس محترمہ' ہم آپ کی عیدی لے کر آئے ہیں اور آپ ہیں کہ سرے سے غائب۔"

"او میرے خدا آپ مجھے پہلے نہیں بتاسکتے تھے' کیا سوچ رہے ہوں گے سب میرے بارے میں۔" جلدی جلدی کہتی وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب لپکی' پیچھے سے آنے والے داؤد کے قہقہے نے اسے اندر تک شانت کردیا' سچ ہے سمجھوتہ اور چاہت کے ملن میں بہت فرق ہوتا ہے یہ بات آج اچھی طرح اس کی سمجھ میں آگئی اور اس کے دل سے ایک بار پھر زریاب کے لیے دعا نکلی' جس کی بدولت یہ سب کچھ ممکن ہوا ورنہ شاید وہ زندگی بھر اپنی محبت کو پانے کا حوصلہ نہ کرسکتی تھی۔ سامنے کھڑے زریاب اور فلک کے سرگوشیاں کرتے وجود نے اسے بتادیا کہ زریاب کا یہ فیصلہ خود اس کے حق میں بھی بہتر ثابت ہوا ہے۔

فرحانہ ناز ملک

"زکی بھائی۔۔۔ آپ کی اس بائیک سے تیز تو میں چل لیتی۔" جب راستے میں آنے والے دسویں بریکر کے سامنے بھی زکی بھائی کی موٹر سائیکل روایت نہ توڑتے ہوئے رک گئی اسے جلے دل کے ساتھ پھپھولا پھوڑنا ہی پڑا۔

"اب اتنے بریکر آرہے ہیں تو میرا کیا قصور؟" برا منائے زکی بھائی نے ایک بار پھر کک ماری تھی وہ کہہ نہیں سکی۔ ان بریکرز کا ایسا صحیح استعمال اس نے ان سے زیادہ کسی کو کرتے نہیں دیکھا دور سے دیکھتے ہی زکی بھائی اپنی بائیک کی رفتار آہستہ کرتے جاتے اتنی کہ بریکر تک آتے آتے موٹر سائیکل کا دم نکل جاتا۔ وہ تو اس لمحے کو کوستے نہیں تھک رہی تھی جب زکی بھائی کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھی۔ جو رستہ موبی کے طفیل پندرہ، بیس منٹ میں کٹتا۔۔۔۔ وہ اب زکی بھائی کی مہربانی سے گھنٹہ ہوا طے ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"زکی بھائی تھوڑا تیز چلائیں نا۔" نو بج چکے تھے۔ یعنی پہلا پیریڈ شروع ہو چکا ہو گا۔ اس کی ہوائیاں اڑاتی شکل نظر آتی تو شاید زکی بھائی موٹر سائیکل میں تھوڑی جان ڈال لیتے مگر ابھی تو ایسے محو سفر تھے جیسے ہمسفر وہ نہیں ان کی کوئی محبوبہ ہو، جس کی سنگت میں سفر لمبا کیے جا رہے ہوں۔

"اب اور کتنی تیز چلاؤں؟ موبی کی طرح راکٹ بنا کر اڑاتا تو ٹھیک تھا۔ ایسے چلاتا ہے جیسے موت کے کنویں میں چلا رہا ہو۔" دوہری مصیبت اب زکی بھائی کے بھاشن بھی شروع ہو گئے تھے۔ جو موٹر سائیکل کی کم رفتاری کے باعث باآسانی اس تک پہنچ رہے تھے۔

"آپ کی طرح بھی کوئی نہ چلائے، چہل قدمی کرا رہے ہیں موٹر بائیک کو۔" وہ رونے کو آ گئی۔

"ایک تو تمہارا کالج شہر کے آخری کونے میں۔" چلو جی یہ بھی اس کا قصور آج سے پہلے یہ آخری کونا اسے اتنا نہیں کھٹکتا تھا جتنا آج تاؤ دلا رہا تھا۔

"تاں تمہیں مشورہ کس نے دیا تھا ایم اے ایجوکیشن میں داخلہ لینے کا اور سبجیکٹ ختم ہو گئے تھے کیا، یا اس کی ویلیو زیادہ ہے۔" اب کی بار زکی بھائی نے اس کی دکھتی رگ پکڑ لی یہ غم تو اس کا پہلا سمسٹر دے چکنے کے بعد بھی تازہ تھا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ایک سال تک وہ خوش باش پرسکون و مطمئن کہ اتنا بہت ہے تعلیم یافتہ ہونے کے لیے مزید پڑھائی کی ضرورت نہیں۔ جب تایا ابا نے زبردستی اس کا اڈمشن ایم اے ایجوکیشن میں کرا دیا۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ اسے ایجوکیشن تو کیا کسی بھی مضمون میں ایم اے نہیں کرنا وہ قناعت پسند ہے اونچی ڈگری کی ہوس نہیں پال رکھی۔ مگر تایا ابا ایک سال سے اسے فارغ

دیکھ کر نہ جانے کیسے خاموش تھے؟ اس کے موٹے موٹے آنسوؤں سے بھی نہ پسیجے اور داخلہ کرا کر دم لیا۔ (ہٹلر نہ ہوں تو)۔

ایم اے ایجوکیشن کی کلاسز اس کے اس چھوٹے سے شہر میں پہلی مرتبہ شروع ہو رہی تھیں یہ پہلا بیچ تھا ایم اے ایجوکیشن کا اس شہر میں سو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہاں مخلوط کلاسز تھیں ۔ آس پاس کی تحصیلوں اور قصبوں کے بھی لڑکے لڑکیاں یوں ایم اے ایجوکیشن پر جھپٹے جیسے کہ کوئی بزنس کی ڈگری ہو۔ بور مضمون 'ایم اے کلاسز کو پڑھانے کو ترستے پروفیسرز کے خشک اور طویل لیکچرز اور شاید پہلی مرتبہ مخلوط تعلیم کا مزا چکھتے یہ نکمے حلیے کے پینڈو لڑکے ۔۔۔ وہ پہلے سمسٹر میں ہی اوب گئی۔ شکر تھا کہ راشدہ 'نصرت اور رخشی کا گروپ مل گیا' ورنہ وہ تایا ابا کے حکم پر بلڈوزر پھیر کر چھوڑ چکی ہوتی۔

☼ ☼ ☼

پورے نو بجیں پہ زکی بھائی نے اسے کالج گیٹ پہ اتارا۔ وہ برق رفتاری سے بیگ فائل سنبھالتی خود بھی اڑتی' عبایا کو بھی اڑاتی بی ایڈ سیکشن عبور کر کے اپنے سیکشن میں داخل ہوئی دائیں ہاتھ پہ پہلے کمرے میں اس کی کلاس تھی۔ پیریڈ شروع ہو چکا تھا ۔ آج دوسرے سمسٹر کی کلاسز تھیں۔ جنہیں شروع ہوئے ہفتہ ہو چکا تھا۔ مگر وہ آج آئی تھی کانپتی ٹانگوں کے ساتھ وہ دروازے پہ آئی اور سامنے روسٹرم کے قریب پرنسپل کے ہمراہ کھڑی دوسری ہستی کو دیکھ کر حقیقتاً اچھل پڑی۔

"مے آئی کم ان سر۔" پرنسپل نے تو اسے دیکھا ہی تھا۔ ساری کلاس سمیت اس نئی ہستی کی نظریں بھی اس پر اٹھ گئیں۔ آدھے نقاب میں ہونے کے باوجود محض اپنی آنکھوں سے وہ پہچان لی گئی کہ "رول نمبر دس" ہے۔

"آجائیے۔" پرنسپل کی اجازت پر وہ دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ سب سے آخری رو میں بیٹھے اپنے گروپ کی طرف بڑھنے لگی۔

"رول نمبر تین۔ آگئیں۔"

"چلو جی' نفری پوری ہو گئی۔" دبی دبی آوازیں تب تک گونجتی رہیں جب تک وہ بیٹھ نہیں گئی۔ پرنسپل روانہ ہو گئے تھے۔

"اتنے دن بعد کیوں آئیں؟" نصرت نے سرگوشی کی۔

"گھر میں انڈے دے رہی تھیں کیا؟" راشدہ سے کچھ ایسا نازیبا نشنے کی ہی امید کی جا سکتی تھی بس۔

جواب دینے کے بجائے وہ گردن گھما کر دیکھنے لگی۔ آنکھوں کی الجھن واضح تھی۔

"یہ۔۔۔" بے طرح الجھن کا شکار ہوئی وہ پوچھنے ہی لگی کہ نصرت شروع ہو گئی۔

"نئے سر ہیں۔ کمپیوٹر پڑھائیں گے۔ آج ہی آئے ہیں۔ پروفیسر وغیرہ کچھ نہیں' پرنسپل نے کہیں سے برآمد کیے ہیں ہمیں اور ایم ایڈ کو پڑھانے کے لیے کیونکہ یہاں کمپیوٹر کے کوئی سر نہیں۔"

"آپ۔" دفعتاً "بھاری آواز گونجی اور نصرت کی بولتی بند ہوئی۔ حوریہ نے سبز آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ بول نصرت رہی تھی اور وہ بندہ گھورا سے رہا تھا۔

"کھڑی ہو جائیں۔" نہایت سنجیدگی سے کہا گیا۔ وہ ناچار کھڑی ہوئی۔

"ایک تو آپ آئیں اتنی لیٹ اوپر سے بول کر کلاس کا ڈسپلن بھی خراب کر رہی ہیں۔" یوں کھڑا کر کے کسی پروفیسر نے کلاس نہیں لی تھی۔ جواب میں اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

"بیٹھ جائیے۔۔۔ مگر پلیز چپ کر کے۔" شاید اسے ترس آگیا تھا۔ جبھی مزید کچھ سنانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ خاصے خراب موڈ کے ساتھ دھپ سے بیٹھ گئی۔

"بہتر یہ ہے کہ آج کے دن صرف انٹروڈکشن ہو جائے۔ اگرچہ میں لیکچر تیار کر کے آیا ہوں۔" کہنے کے ساتھ مسکرا کر اس نے اپنی سامنے کی جیب تھپتھپائی جس میں یقیناً "لکھا ہوا لیکچر موجود ہوگا۔

"لیکن ۔۔۔۔ چونکہ میں بھی آپ لوگوں کے لیے نیا ہوں اور آپ لوگ بھی میرے لیے تو تھوڑا سا تعارف ہو جائے۔"

"ضرور ضرور سر۔۔۔ پہلے آپ بسم اللہ کریں۔" کرم حسین کے سامنے کے دانت کچھ زیادہ چھب دکھا رہے تھے۔ گویا یہ نوجوان بلکہ ان لڑکوں کا ہم عمر سر سب کو پسند آرہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ پہلے میں بسم اللہ کرتا ہوں۔۔۔۔ میں عمر جہانگیر ہوں۔" کہتے ہوئے وہ سرسری سا سبز جھیل سی آنکھوں کی جانب بھی متوجہ ہوا تھا۔ حوریہ کو محسوس ہوا اس کی آنکھیں شریر ہو رہی ہیں۔

"میں نے ابھی ایم سی ایس کمپلیٹ کیا ہے اور اسی شہر میں میں نے اپنے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کھول رکھا ہے ۔۔۔ پرنسپل صاحب میرے فادر کے جاننے والے ہیں۔ ان کے کہنے پر میں آپ کو یہاں پڑھانے آیا ہوں۔" تھا تو بالکل ہی عام سا تعارف مگر حوریہ نے محسوس کیا لڑکیوں نے یوں دم سادھے ہوئے تھے جیسے سانس بھی لیں گی تو ایک آدھ لفظ مس ہو جائے گا۔ اس کے بعد اسٹوڈنٹس کی باری آئی۔ لڑکیوں نے ایسے شرما شرما کر نام اور خالی رول نمبر بتائے جیسے "عمر جہانگیر" نے مستقبل کا دلہا بننا ہو اان کا۔ عمر کے پیریڈ کے بعد بھی لڑکے لڑکیوں کے موڈ خوشگوار رہے۔ نہ تو طویل لیکچرز نے بور کیا نہ میڈم ذکیہ کی ڈانٹ بری لگی چھٹی ٹائم حوریہ نے دیکھا لڑکیوں کے غول پرنسپل آفس اور اسٹاف روم کے باہر جمع ہو رہے تھے۔ مگر عمر جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

تائی جان کی طرف میلہ لگا ہوا تھا۔ ان کی ساری بیٹیاں آئی ہوئی تھیں۔ ایسے شک ہوا جیسے مبارک باد دینے آئی ہوں۔ ایسے ہی تھیں۔ بھائی چھوٹا بڑا جو تیر مارتا بیاہی بہنیں مبارک باد مع تحائف کے دینے آ پہنچتیں۔

"اور آج تو جیسے چاند فتح کر آیا ہو۔ سب یوں خوش ہوئی بیٹھی ہیں۔" وہ ان کے بیچ سے گزرتی سوچتی گئی۔

"اے حور۔۔۔۔ ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔" اسے اپنے پیچھے مینا باجی کی کنمناہٹ شکوے میں چھپی سنائی دی۔

"پتا ہے ابھی آکر ملتی ہوں۔ پہلے مجھے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔" اس کا رخ جس طرف تھا سب بخوبی سمجھ گئیں کس سے دو دو ہاتھ کرنے جا رہی ہے۔ نہ دروازہ بجانے کی زحمت کی اور نہ اجازت طلب کرنے کا سلیقہ دکھایا۔ دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر گھسی اور وہ جو آٹھ بہنوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد تھوڑا آرام کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ اس بدتہذیبی پر آپے سے باہر ضرور ہوتا اگر مقابل وہ نہیں کوئی اور ہوتی۔

"زہے نصیب۔۔۔۔" سبز جھیلوں سے پھنکارتے قہر کو نظر انداز کیے وہ دلفریبی سے مسکرایا۔

"تم کالج کیوں آئے تھے؟" بس نہیں چل رہا تھا اس کا مسکراتا چہرہ نوچ ڈالے۔

"پڑھانے۔" عمر جہانگیر کا اطمینان قابل دید تھا۔

"اتنے اہل تم کب سے ہو گئے۔"

"جب سے پیدا ہوا۔"

"تم میری جاسوسی کے لیے آئے تھے؟" عمر کو ہنسی آگئی۔

"اتنا فالتو نہیں ہوں۔"

"ہوتو پڑھانے کے لیے آگئے۔"
"تم جیلس ہو رہی ہو؟" عمر کو مزا آتا تھا اسے چھیڑنے میں۔
"مائی فٹ۔۔۔ اور آج کے بعد کبھی کلاس میں میری بے عزتی کی تو انجام بہت برا ہو گا۔"
"روزلیٹ آئیں تو ضرور سناؤں گا۔"
"میں روزلیٹ نہیں ہوتی۔ آج بھی اس لیے ہوئی کہ موبی جاگ نہیں رہا تھا زکی بھائی آئے بیٹھے تھے مجھے مجبوراً" ان کے ساتھ آنا پڑا جنہوں نے مجھ سے کوئی پرانی دشمنی نبھائی۔" ناچار اسے وضاحت دینی پڑی۔
"میں بھی تو تھا۔۔۔ میرے پاس آجاتیں میں وہیں تو جارہا تھا۔"
"تمہارا احسان لیتی ہے میری جوتی۔" حوریہ نے باقاعدہ جوتی پٹخی۔ جیسے جوتی تلے عمر جہانگیر کو مسلا ہو۔ عمر کی مسکراہٹ جلتی پہ تیل ثابت ہوئی۔
"اور یاد رکھو۔" عین اس کے سامنے جا کر باقاعدہ انگلی ہلا ہلا کر غرائی۔
"اگر کسی کو بھی بتایا کہ تم میرے کون ہو تو انجام کے ذمے دار تم خود ہو گے۔"
"کزن ہوں' شوہر نہیں کہ میرے بتانے پر سارا کالج تمہیں چھیڑنے لگے۔ اور شرم کے مارے تم کالج نہ جاسکو۔"
"شٹ اپ' اس سے زیادہ نہیں۔" وہ گرجی تھی۔
"مجھے تمہاری کزن ہونے پر کوئی فخر نہیں کہ میں اس کے اشتہار لگاتی پھروں۔" اس بار عمر نے محض مسکرا کر اسے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ وہ جو اپنی بات کے بعد اس کے جواب کی منتظر تھی۔ یوں دیکھنے سے خاصی جزبز ہوتی واپسی کے لیے پلٹی۔
"بس۔۔۔ اتنا۔" عمر نے پیچھے سے کہا۔
"کوئی دفعہ' کوئی سزا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ پھر اس کی طرف مڑی۔
"کسی ایک کو بھی پتا چلا کہ تم میرے کزن ہو تو پھر دیکھنا۔۔۔ دفعہ بھی لگے گی اور سزا بھی ہو گی۔" ایک لفظ پر زور دے کر بولنے کے بعد آخر میں اسٹار پلس کی ہیروئن کی طرح اسے گھورا اور جھٹکے سے مڑ کر چلی گئی۔ عمر خوامخواہ ہنستا چلا گیا۔
"او۔۔۔" بیڈ پر چت لیٹ کر وہ اس کی تیکھی اداؤں کو یاد کر کر کے لطف لیتا رہا۔
"مائی ڈیئر کزن۔" ادھر یا ہر وہ ہال کمرے میں موجود عمر کی آٹھ بیاہی اور ایک کنواری بہن کے نرغے میں تھی۔
"عمر کے خلاف کھاتہ بند ہو گیا۔" بڑی آپا پیار سے پوچھ رہی تھیں۔
"فی الحال۔" وہ لاپروا سی بولتی زویا کے ساتھ صوفے میں دھنس گئی۔
"اور بھائی صاحب ایک دن کالج کیا پڑھا آیا آپ مبارک دینے دوڑی چلی آئیں؟" اس کا انداز مذاق اڑاتا ہوا تھا۔
"لو۔۔۔ یہ کوئی بات ہے مبارک دینے کی۔" ربیعہ آپی مصنوعی خفا ہوئیں۔
"اس سے بھی گئی گزری باتوں پر آپ آتی ہیں۔"
"یہ تو محبت ہے ہماری۔" چھوٹی آپا مسکرائیں۔
"ہائے داوے تم کو کیوں لگ رہی ہے؟" زویا نے ابرو چڑھا کر دیکھا۔
"مجھ کو کیوں لگے گی۔ میں تو بتا رہی ہوں۔"
"تمہیں عمر بھائی کے بچپن کا کیسے پتا؟" زویا بھائی کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ ابھی بھی فارم میں آگئی۔
"میرے موکلوں نے بتایا۔"
"اچھا اپنے موکلوں سے پوچھو۔۔۔ ہماری آج کی آمد کیا کہتی ہے؟" صائمہ باجی بڑی پراسرار مسکراہٹ سجا کر بولیں۔
"کیا۔۔۔ کیوں' مطلب کوئی خاص درشن ہے۔" اس نے الجھ کر آٹھوں تایا زاد بہنوں کو گھورا سب کی سب شرارت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ زویا البتہ بے نیازی بیٹھی تھی۔
"مشن نہیں میٹنگ۔۔۔ مشن اسٹارٹ ہو گا میٹنگ کے بعد۔" مینا آپی کا لہجہ ذو معنی تھا۔ وہ کچھ دیر ہونٹ لٹکائے ایک ایک کو دیکھتی رہی سب کے تاثرات کچھ بول رہے تھے۔ کیا۔۔۔ یہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔
"اچھا۔۔۔" تنگ آکر جمائی لیتی وہ کھڑی ہو گئی۔
"ابھی میں تھکی ہوئی ہوں۔ کالج سے آتے ہی یہاں آگئی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔"
"کھانا نہیں کھانا۔۔۔ بہت کچھ مزے کا پکا ہے نہ کھایا تو پچھتاؤ گی۔" کچن کی طرف جاتی زویا کی پیشکش قطعی رد کر دینے والی نہیں تھی۔ وہ پھر سے بیٹھ گئی۔ عمر کی بڑی دونوں آپاؤں سے اس کی خوب بنتی تھی۔ ایک اپنی ساس تو دوسری اپنی بہو کے جو جو قصے سناتیں۔ وہ بڑی دلچسپی سے نا صرف سنتی بلکہ اپنے مشورے بھی دیتی۔

☼ ☼ ☼

وسیع و عریض رقبہ کو گھیرے اس چار دیواری کے صرف ایک نہیں تینوں پورشنز تھے جس میں "عمر جہانگیر" کی اہمیت ایسی تھی جیسی سلطنت برطانیہ میں "شہزادہ ولیم" کی۔ وہ تایا ابا کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ آٹھ بہنوں کے بعد انتہائی منتوں' مرادوں دعاؤں کے بعد ان کے آنگن کی بہار میں کیا کھلا۔۔۔ سب کی توجہ و محبت کا حق دار بلا شرکت غیرے بن گیا۔ اس کے بعد زویا کا نمبر تھا۔ یوں نو بہنوں کے بھائی کو جو اہمیت و محبت ملنی چاہیے۔۔۔ وہ اسے آج تک مل رہی تھی اور اسی بات کا "حوریہ عالمگیر" کو گلہ و غصہ تھا۔
شعور کی منزل کو پہنچنے سے بھی بہت پہلے اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ جو عمر کی حیثیت ہے وہ کسی اور کی نہیں۔ حتیٰ کہ ان دونوں بہنوں یعنی مونا اور حوریہ کے بعد پیدا ہونے والے محرب عرف موبی کی بھی نہیں ۔۔۔ اگر دستگیر چچا کے بے چارے تینوں بیٹے نہ تو تین میں تھے نہ تیرہ میں' یاسمین چچی کو یہی تو غصہ تھا۔۔۔ انہیں وہ عزت و مرتبہ اس گھر میں دیا ہی نہ گیا جو تین بیٹوں کی ماں ہونے کی وجہ سے انہیں ملنا چاہیے تھا

۔۔۔ سونے پہ سہاگہ اس سے دگنی عزت و مرتبہ ایک صرف "عمر جہانگیر" کو پیدا کر کے تائی اماں کے حصے میں آیا تو یاسمین چچی نے اندر کی بھڑاس الگ ہو کر نکالی۔ دادی جان کی لاکھ ہائے ہائے اور دادا جان کی ہوں ہوں کے باوجود وہ دستگیر چچا کو لے کر الگ گھر جا بسیں اور ایسا دلیرانہ کام صرف وہ ہی کر سکتی تھیں۔ کیونکہ وہ دستگیر چچا کی خالصتاً" اپنی پسند کا نتیجہ تھیں اور امی اور تائی امی سے زیادہ پڑھی لکھی، ماڈ اور صاف گو (بقول دادی کے زبان دراز اور بدلحاظ) بھی تھیں۔

یاسمین چچی کو شدید اعتراض تھا تائی کے مقابلے میں انہیں یا حوریہ کی امی یعنی عشرت کو بالکل بھی گھاس نہیں ڈالی جاتی۔ بالکل یہی اعتراض حوریہ کو تھا۔ مگر نقار خانے میں طوطی والا کردار اس کا تھا۔ وہ یاسمین چچی کی طرح اس گھر سے دور نہیں جا سکتی تھی۔ اسے بھی شکوہ تھا تائی تایا اور ان کے بچوں کو غیر ضروری اہمیت ملنے کا اس کا حل تو فی الحال کوئی نہیں تھا بول بول کر، عمر جہانگیر کو نیچا دکھانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دے کر۔۔۔ وہ اپنا غم ہلکا کرتی رہتی۔ اسے عمر کسی ولن کی طرح لگتا۔ جو موبی اور دستگیر چچا کے بیٹوں کا حق اور ان کے حصے کی محبت مار رہا تھا۔ اس کے برعکس خود موبی، عمر کا چیلا تھا۔ یہی نہیں امی ابو اور مونا بھی عمر پہ فدا رہے۔

☼ ☼ ☼

"اوئے۔۔۔ سر عمر آ گئے۔" کسی نے اطلاع دی اور کلاس میں ہلچل مچ گئی۔ حوریہ نے دیکھا بغیر نقاب کی لڑکیاں تو میک اپ کا ڈھکا چھپا استعمال کر کے آنے ہی لگی تھیں۔ آدھی نقاب پوشوں کے بھی نین کٹارہ بننا شروع ہو گئے تھے۔ ابھی ابھی کچھ نے منہ پر نزاکت سے ہاتھ اور ٹشو پھیر پھیر کر نادیدہ گرد جھاڑی تو کچھ نے عبایا اور چادریں درست کرنا شروع کر دیں۔ حوریہ کے لیے مقام حیرت ثابت ہوا۔۔۔ اس کی سہیلی راشدہ بھی تک سک سے تیار ہونے لگی تھی اور تو اور اس کے گروپ کی رخشی کے بھی گال تمتمانے لگے تھے۔

"سب کی سب پاگل ہو گئی ہیں۔" حوریہ کا دل برا ہونے لگا۔

"بات سنو۔۔۔ میری آئی بروز ٹھیک بنی ہوئی ہیں۔" نصرت نے اس کا کندھا ہلا کر اپنی طرف موڑا۔

"تم بھی؟" حوریہ کو غش آ گیا۔ اپنے گروپ میں ایک وہ اور ایک نصرت نقاب کرتی تھیں۔ رخشی اور راشدہ صرف بڑی چادریں لے کر آتی تھیں۔ اس کی طرح نصرت بھی سادہ اور فیشن کے معاملے میں کم علم سی تھی اور آج اس کو بھی فکریں ہو رہی تھیں۔

"ہاں ٹھیک لگ رہی ہیں۔ بالکل سعدیہ امام جیسی۔" اس نے جل کر کہا اور سامنے متوجہ ہوئی جہاں عمر جہانگیر تشریف لا چکے تھے۔ آج اس نے سفید کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ کرتے پہ ہاتھ کی کڑھائی مینا باجی نے خود کی تھی۔ وقت وقت کی بات ہے بچپن میں ایسے کپڑے پہننے پر وہ زمین آسمان ایک کر دیا کرتا تھا اور اب فرمائش کر کر کے بنواتا۔

"تم اپنی بھنوؤں کا جنگل بھی کاٹ آتیں۔۔۔ بالکل سلطان راہی مرحوم جیسی لگ رہی ہیں۔"

"لگنے دو۔۔۔ میں نے کس کو دکھانا ہے۔" راشدہ کے کہنے پر اس نے بے طرح برا مان کر جواب دیا۔

"ہم نے تو دیکھنی ہیں۔۔۔ شک سا ہونے لگتا ہے حوریہ کے بجائے نقاب میں کرم حسین نہ ہو۔" راشدہ نے کچھ یوں خوف کھا کر کہا کہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی اور عین اسی لمحے عمر نے اسے دیکھا تھا۔

"آپ رول نمبر ٹین ۔۔۔" ساری کلاس نے گردنیں موڑ کر پیچھے دیکھا۔ حوریہ کا بس نہیں چلا جا کر تین کرارے سے تھپڑ تو عمر کو ضرور ہی جڑ آئے۔

"سر میں نہیں بول رہی تھی۔" وہ منمنائی۔

"آپ یہاں آ کر بیٹھیں۔" عمر نے سختی سے حکم دیتے ہوئے اپنے عین سامنے بیٹھی رول نمبر سیون کی چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

"سر اب نہیں بولیں گے۔" راشدہ نے اس کے برعکس خاصے اعتماد کے ساتھ باچھیں چیر کر زور سے کہا۔

"ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ آپ چاروں کا الگ الگ بیٹھنا ہی ٹھیک ہے۔"

"سر آپ کو صرف ہم کیوں نظر آتے ہیں۔ کلاس میں باقی بھی باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔" رخشی نے حسب عادت جارحانہ لہجہ اپنایا۔

"اور آپ بھی پلیز لیکچر شروع کریں۔ آدھا پیریڈ باتوں میں گزارتے ہیں۔" عمر کے ماتھے پر واضح تیوری بنی تھی۔

رخشی ان کے گروپ کی منہ پھٹ اور تیز مزاج لڑکی تھی۔ رخشی اور راشدہ کسی زمانے ایک ساتھ اسکول و کالج میں پڑھتی تھیں۔ پھر راشدہ کی شادی ہو گئی تو اس نے تعلیمی سلسلہ پرائیویٹ جاری رکھا اور رخشی پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی فزکس کے بعد اب ایم اے ایجوکیشن میں بھی آ کودی رخشی اور راشدہ اچھی خاصی عمر کی تھیں۔ 26 سال سے بھی زیادہ کی اور یہ عمر راشدہ سے زیادہ رخشی کے منہ پر لکھی تھی۔ مگر وہ خود کو بتاتی چوبیس کا تھی۔ اس کلاس میں اکثریت بڑی عمر کے لڑکے لڑکیوں کی تھی جنہیں بی اے، بی ایڈ کیے بھی کچھ سال گزر چکے تھے۔ یا پھر ایک کے بعد دوسرا ایم اے کرنے آئے تھے۔ حوریہ اور نصرت کے بعد اکا دکا اور تھے جنہیں بی اے کیے ایک سال ہو چکا تھا۔ کچھ تھے جو فریش گریجویٹ تھے اور یہ صرف لڑکیاں تھیں۔ بہر حال۔۔۔ حوریہ پر انکشاف ہوا عمر جہانگیر اگر بہت سی لڑکیوں کا فیورٹ ہے تو رخشی کے لیے بالکل ناپسندیدہ ہے۔

☼ ☼ ☼

دو بجے کے قریب زمانے بھر کی تھکاوٹ سوار کیے وہ کالج سے واپس آئی تو لاؤنج میں ہی عمر سے ٹاکرا ہو گیا۔ وہ فلور کشن پہ بیٹھا تھا اور دادی صوفے پر بیٹھی اس کے بالوں میں مساج کر رہی تھیں۔ یکایک تھکاوٹ پر جھنجھلاہٹ غالب ہو گئی۔

"میں نے سوچا۔" عمر نے اس کے تاثرات سے حظ اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"آج میں نے کالج میں تمہاری کلاس لی۔۔۔ واپس آ کر تم میری لو گی۔ بجائے میرے پورشن میں آنے کی زحمت کرو میں خود یہاں آ کر بیٹھ گیا۔۔۔ تمہارے حضور پیش ہونے کے لیے۔" حوریہ نے اس کے آخری جملے پر غور ہی نہیں کیا۔ اس کی آنکھیں تو عمر کی گود میں رکھی پلیٹ پر تھیں۔ جس میں موجود تین کباب میں سے ایک وہ کھا چکا تھا، ایک کھا رہا تھا اور باقی ایک بچا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"لو یہ کوئی بات ہوئی بھلا عمر بھی اسی کالج جاتا ہے۔ جہاں تم پڑھتی ہو۔ پھر موبی کے ساتھ آنے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بچہ اس آخری کونے میں تمہاری خاطر آتا جاتا ہے۔ نہ جانے کتنے روڈوں سے گزرتا ہو گا۔۔۔ ایسی اللہ ماری سواری ہے سارا دن ہولتی رہتی ہوں جب تک آ نہیں جاتا۔ بس میں کہہ رہی ہوں آئندہ عمر کے ساتھ آیا جایا کر۔"

"امی۔۔۔" عمر کی پلیٹ میں آخری کباب کسی بھی وقت اس کے پیٹ میں جا سکتا تھا۔ دادی کیا کہہ رہی تھیں اس نے کہاں سنا تھا۔ اس کے تو کان سائیں سائیں کر رہے تھے اپنی چیز کسی اور کے پیٹ میں جاتا دیکھ کر۔

"کیا ہوا۔۔۔ کیا ہوا۔" اتنی زور سے وہ چیخی تھی امی بدحواس سی بھاگی آئیں۔ اس کی آنکھیں لبالب بھری تھیں۔

"میرے کباب۔۔۔" اس نے ایک سسکاری کے ساتھ کہا۔ عمر نے فی الفور تیسرے کباب کو پلیٹ میں رکھا تھا۔

"آ۔۔۔ وہ۔" امی بے چاری بری طرح سے شرمندہ ہوئیں۔ تین کبابوں کی خاطر ناک کٹنے لگی تھی۔

"عمر تم کھاؤ۔۔۔ کھاؤ نا بیٹا۔" اسے تگڑی سی گھوری دے کر امی نے ساکت بیٹھے عمر کو پکار کر کہا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ کچھ بھی نہیں کھاؤں گی۔" ناانصافی سی ناانصافی تھی۔ اس کے موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے۔

"نہ کھانا کبھی نہ کھانا اور جاؤ اب یہاں سے۔" امی کو اس کی بچکانہ ضد ہمیشہ غصہ دلادیا کرتی تھی۔

"عمر بھائی۔" موبی نے ہونق بنے عمر کے آگے ہاتھ لہرا کر قہقہہ لگایا۔

"پریشان مت ہوں یہ ہمارے گھر کے روز کے سین ہیں۔"

"ہاں یار یہ میں تو بے قصور ہوں۔"

"نہیں نا۔۔۔ یہ جو تین کباب آپ کو آج پیش کیے گئے یہ ان محترمہ کے تھے انہوں نے باقاعدہ اپنے نام کی چٹ بنا کر اس پلیٹ میں رکھی ہوئی تھی کہ جب بھی تلے جائیں۔ انہی کے لیے تلے جائیں۔۔۔ مگر یہ آج آپ کا نصیب بن گئے۔" موبی کی بتائی گئی تفصیل پر دل تو چاہ رہا تھا زوردار قہقہہ لگا کر رد عمل دکھائے مگر سامنے بن بادل برسات ہو رہی تھی۔ سو اس نے حوریہ کو دیکھ کر۔۔۔ بے چارگی سے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

"عمر بیٹا تم چھوڑو اس کو کباب کھاؤ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس کے تو روز کے تماشے ہیں۔"

"چاچی آپ نے الاٹ شدہ کباب مجھے کھلا دیے۔۔۔ یہ تو سراسر ظلم بلکہ گناہ ہوا۔"

"ہمارے گھر میں یہ گناہ چلتے رہتے ہیں۔" موبی نے پھر انٹری ماری۔

"اور بجو تو اپنی عادتوں میں ایک ہیں پھلوں پر بھی اپنا نام لکھ کر رکھیں گی۔ فریج کھول کر دیکھیں۔۔۔ آپ کو اکثر آئیٹمز پہ حوریہ لکھا نظر آئے گا۔" اس بار عمر اپنے قہقہے کو نہیں روک پایا۔

"حیرت ہے مجھے پہلے کیوں نہیں پتا چلا۔" اس نے باقاعدہ سر کھجا کر گویا اپنی کم علمی پہ افسوس کیا۔ برسات چھاجوں چھاج برسنے لگی۔

"اور زیادہ مزے کی بات ہمیشہ ان کے نام والی چیز امی اور مونا آپی اٹھائیں گی۔۔۔ اور الزام لگتا ہے میرے سر۔"

"موبی تم بند کرو اپنی راگنی عمر کو کھانے دو۔" چچی نے لگتا تھا آج کبابوں پر دم کر رکھا تھا۔ سارے کباب عمر کو کھلانے کے در پے تھیں۔

"آ۔۔۔" عمر نے کن انکھیوں سے حوریہ کو دیکھا وہ کھانے کو آرہی تھی۔

"بس چچی۔۔۔ آپ کی بیٹی اتنی بری بری نظروں سے گھور رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے جو کھایا اس سے بھی پیٹ میں درد نہ ہو جائے۔ ویسے بھی آپ گواہ ہو میں نے لا علمی میں یہ کھائے مجھے پتا ہوتا ان پر مہر لگی ہوئی ہے میں کبھی نہ کھاتا۔" وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ بڑی مسکین و معصوم نظروں سے حوریہ کو دیکھنے کے بعد قدم آگے بڑھا دیے۔ یہ حوریہ کا دل جانتا تھا عمر کی نظروں میں شوخی و شرارت کا جہاں آباد تھا۔

"یہ کباب اسپیشلی تمہارے لیے بچایا۔ ورنہ یہ بھی کھا جاتا۔ اچھا ہے ناں ہم مل بانٹ کر کھائیں۔ محبت بڑھتی ہے۔" اس کے بالکل قریب سے گزرتے ہوئے رک کر عمر نے سرگوشی میں کہا۔ حوریہ سرتاپا جھلس گئی۔ جھپٹ کر کباب کی پلیٹ اٹھائی، کباب اٹھا کر باقاعدہ مسل کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ امی اور دادی ہائے ہائے کرتی رہ گئیں۔ وہ خونخوار نظروں سے عمر کو گھورتی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ عمر دل ہی دل میں محبوب کی ان سرکش اداؤں پر قربان ہوتا دادی اور امی کو ٹھنڈا کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کوئی تک ہے بھلا۔" وہ چاروں بی ایڈ کی بلڈنگ میں چاول چھولے کھانے میں مصروف تھیں جب رخشی نے حسب عادت نکتہ اعتراض اٹھایا۔ بی ایڈ اور ایم اے، ایم ایڈ کی عمارت کے بیچ ایک دروازہ تھا۔ بی ایڈ کی لڑکیوں اور لڑکوں کی الگ الگ کلاسز ہوتی تھیں۔ بریک ٹائم ایم اے سائیڈ کی لڑکیاں یہاں آجاتیں۔ جہاں کینٹین بھی تھی اور اگر کینٹین کا کھانے کو دل نہ کر رہا ہوتو۔۔۔ بیرونی گیٹ کراس کرکے واک کا مزا لیتے ہوئے گنے کا جوس، ملک شیک جیسی عیاشی سے بھی دل بہلا لیا جاتا۔ اس معاملے میں وہ چاروں زیادہ لوفر تھیں۔ بلا ناغہ باہر جاتیں اور اگلے روڈ کھڑے ریڑھی والے سے چاول چھولے لے کر کالج آکر کھاتیں۔

"خیر کی بات نہیں ہوگی لکھ لو۔" رخشی کے نکتہ اعتراض کے بعد راشدہ نے حوریہ کے کان میں منہ گھسیڑا۔ وہ مسکرادی۔

"ایم اے کے اسٹوڈنٹس کو پڑھانے کے لیے "بلونگڑا" لے آئے۔ جسے خود ایم اے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ بلکہ پتا نہیں ایم اے ہے بھی یا نہیں۔" رخشی کی توپ آج عمر جہانگیر کی طرف تھی۔ حوریہ چپ چاپ کھاتی رہی۔

"اب تم اس کے مقابلے میں بہت بڑی نظر آؤ تو اس کا کیا قصور؟" راشدہ مذاق مذاق میں بھی دم پر پاؤں رکھ لیتی۔

"بکواس نہ کرو۔" رخشی کو آگ لگ گئی۔

"خود کو تو دیکھو۔ اماں لگتی ہو۔"

"لگتی ہوں کیا مطلب۔۔۔ میں ہوں اماں بڑی بیٹی سات سال کی چھوٹی چار کی ہے۔ کیوں چھپاؤں۔"

"اچھا بس۔۔۔ اب بال نہ کھینچ لینا ایک دوسرے کے۔" حوریہ کو امن کا سفیر بننا پڑا۔

"تم کیوں سر عمر کے پیچھے پڑی ہو؟ اتنا تو اچھا لیکچر دیتے ہیں۔" نصرت بھی "متاثرین عمر" میں سے تھی مگر ایک حد تک۔

"بہت برا لگتا ہے مجھے۔" یہ حوریہ کے بھی دل کی آواز تھی۔ مگر اس وقت نہ جانے کیوں رخشی کے یوں کہنے پر دل کڑھا۔

"کیوں تمہیں چھیڑا ہے اس نے؟" راشدہ کے سنجیدگی سے کہنے پر رخشی پھر بلبلائی۔

"مجھے لگتا ہے جیسے وہ پڑھاتا کم ہے مذاق زیادہ اڑاتا ہے۔ ہماری کالج کی بلڈنگ سے لے کر۔۔۔ ہر چیز پر ہنستا نظر آتا ہے۔"

"ہمارے سامنے تو کبھی نہیں ہنسا۔" نصرت نے ناک پونچھی، مرچ مسالوں کی تعداد چاولوں سے زیادہ تھی۔ ناک اور آنکھوں کا کام تمام ہو رہا تھا۔

"جیسے خود آکسفورڈ سے پڑھ کر آیا ہو۔ مجھے تو لگتا ہے پنجاب یونیورسٹی کا بھی جھوٹ بولتا ہے۔ ہوگا کسی عام سی یونیورسٹی کا فارغ شدہ۔"

"نہیں پنجاب یونیورسٹی سے ہی پڑھا ہے۔" حوریہ نے بے ساختہ یہ کہا اور فوراً زبان دانتوں میں دبا لی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" رخشی نے تیز نظروں کے ساتھ اسے دیکھا۔

"وہ۔۔۔" وہ بری طرح سے پریشان ہوئی۔

"ایک بار خود کلاس میں بتا رہا۔۔۔ رہے تھے سر۔"

"ہاں بتا رہے تھے میں بھی آئی تھی اس دن۔" اس کی مشکل نصرت کی تائید نے حل کردی۔ ورنہ آج رخشی نے بال کی کھال اتارنی تھی۔

"خیر جو بھی ہو۔ میں پرنسپل سے کہتی ہوں۔ ہمیں بلونگڑے سے نہیں پڑھنا۔" اس بار صحیح معنوں میں حوریہ کو رخشی کا بلونگڑا کہنا کھلا۔۔۔ وکالت میں راشدہ یا نصرت ضرور بولتیں اگر بیل نہ بج جاتی۔

"چلو۔۔۔ سر چنگیز خان کا پیریڈ ہے بریک کے بعد ٹائم پہ نہ گئے تو کلاس میں داخل بھی نہیں ہونے دیں گے۔" راشدہ، نصرت اور رخشی کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ نہ جانے کس بات کے زیر اثر چپ چپ سی بیٹھی رہی۔

☼ ☼ ☼

اتوار کی شام یاسمین چچی کی آمد ہو گئی۔ حسب معمول وہ خالی ہاتھ نہیں تھیں۔ حوریہ کا پسندیدہ کیک اور دادی کے لیے موسمی پھلوں کے علاوہ مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبا بھی تھا۔ حوریہ اور دادی دونوں ہی کھلی پڑی تھیں۔ البتہ امی کا وہی لیا دیا سا انداز جو خاص صرف یاسمین چچی کے لیے ہی ہوتا۔

"اتنا دل کر رہا تھا تم لوگوں سے ملنے کا۔" چچی نزاکت و نفاست سے الفاظ کا استعمال کرتی تھیں۔

"تو آ کیوں نہیں گئیں؟" حوریہ امی کی نظروں سے

بے پروا لاڈ جتاتے تھک نہیں رہی تھی۔

"ہر بار میں ہی آؤں..... تم لوگ خود نہیں آسکتے؟" یہاں حوریہ کو گڑبڑانا پڑا۔

"اسی سے پتا چلتا ہے خلوص و محبت کا میرے لیے، میرے بچوں کے لیے ذرا سا بھی پیار ہوتا تو....."

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے بھابھی..... آپ جانتی تو ہیں گھر کے سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ کہیں جانے کے لیے سو سو بار سوچنا پڑتا ہے۔"

"بس بھی کرو عشرت تم اور تمہارے بکھیڑے۔" چچی سے بحث فضول ہوتی۔ انہوں نے اپنی بات پر قائم رہنا تھا۔ امی ہی چپ ہو گئیں۔

"حورا..... تم آؤ ذرا۔" کچن میں جانے کے لیے انھیں تو حوریہ کو..... آنکھیں دکھا کر اٹھنے کا سگنل دیا۔

"آتی ہوں امی، دو منٹ۔" اور یہ تو امی جانتی تھیں اس کے یہ دو منٹ چچی کی واپسی تک ختم نہیں ہوتے تھے۔ دانت کچکچاتی وہ کچن میں آگئیں۔ چچی کی سیوا کا اہتمام انہیں اکیلے ہی کرنا تھا۔

"عشرت میرے لیے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، میں رات کا کھانا چھوڑ چکی ہوں آج کل صرف دودھ لیتی ہوں۔" حوریہ نے رشک سے ان کے سانچے میں ڈھلے سراپے کو دیکھا۔ اس کی امی سے وہ اچھی خاصی بڑی تھیں۔ مگر کہیں سے بھی نہیں لگتی تھیں۔ حوریہ اچھی خاصی فدا تھی ان پر۔

"میں جانتی ہوں ایک میری یہ پیاری سی چھوٹی سی گڑیا ہے حورا جس کا دل اپنی چچی کی محبت سے بھرا ہے۔ ورنہ سب کا رویہ بتاتا ہے کون کتنا مخلص ہے۔ سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ میں غیر تھی آج تک غیر ہی رہی نہ کسی نے اپنا سمجھا نہ اپنا بنایا۔"

"تو آپ خود کب بنیں اپنی۔" اندر کچن میں امی کا دل جل رہا تھا۔ گویا یاسمین چچی نے چولھے پہ رکھ دیا ہو۔

"یہی رویہ میرے بچوں کے ساتھ بھی ہے۔ ارے میں غیر ہوں وہ تو اپنا خون ہیں۔"

"یاسمین ایسا کیوں سوچتی ہو..... بھلا اپنے۔" دادی کی منمناہٹ چچی کہاں سننے والی تھیں۔

"رہنے دیں اماں جان، آپ تو چپ ہی رہیں۔ آپ ہی ہیں اصل استاد، عمر..... عمر..... عمر بس عمر کر کر کے بس عمر کو ہی دے جائیے گا مال اسباب، میں نے تو اپنے بیٹوں کو سڑک سے اٹھایا تھا نا۔"

"اللہ نہ کرے یاسمین۔" دادی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"آپ کے لیے تو جو ہیں جہانگیر بھائی ہیں، ان کی آل اولاد ہے۔ باقی دونوں بیٹے لگے رہیں دیوار سے۔ عشرت کا جگر ہے برداشت کر رہی ہے۔ میں تو اس ناانصافی پہ چپ نہیں رہنے والی جب تک زندہ ہوں بولوں گی۔"

"آپ بھی بھابھی کمال کرتی ہیں۔" یہ سوچ کر کہ دادی وارمبہ نہیں پا ئیں گی۔ امی کچن سے باہر آگئیں مددگار بنی۔

"بھلا اولاد میں بھی فرق کرتا ہے کوئی..... دونوں آنکھیں پیاری ہوتی ہیں دونوں ضروری ہوتی ہیں۔"

"کم سے کم ہمارے یہاں یہ معاملہ نہیں۔" یاسمین چچی نخوت سے بولیں۔

"بھلا گڑ بھی کہیں سے کڑوا لگتا ہے؟" دادی آزردہ سی ہو گئیں۔

"ہونہہ۔" چچی نے استہزائیہ ہنکارا بھرا۔

"وہ سب کہتی کیوں ہیں آپ..... جن پر عمل نہیں کرتیں۔" ماحول ویسا ہی بن گیا تھا جیسا یاسمین چچی یا ان کے گھر کے کسی فرد کی آمد پر بن جایا کرتا تھا۔ کشیدہ اور کبیدہ، حوریہ چپکے سے کھسک آئی۔ کچن میں جھانکا وہاں مولی مٹھائی کے ڈبے پر اپنے نام کی چٹ لگا کر فریج میں رکھ رہا تھا۔

"ہوں..... ہماری گولی ہم ہی پر۔" حوریہ خوب بدمزا ہوئی۔

"یہ صرف میرا ہے۔" مولی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"ایک گلاب جامن دے نا۔"

"اس صورت میں جب آپ کیک دیں گی۔" مولی فریج میں کیک کے ڈبے پر لکھا لفظ حوریہ دیکھ کر بولا۔ بڑی کوئیک سروس دکھائی تھی حوریہ نے اس ڈبے کو اپنی کسٹڈی میں لینے کے لیے۔

"بدتمیز، گستاخ، بڑی بہن سے لین دین کرتا ہے۔" اس نے نتھنے پھلا کر غیرت دلانی چاہی۔

"جہاں فائدہ ملتا ہو۔ وہاں کیا بڑا کیا چھوٹا؟" مولی نے کندھے اچکائے۔ وہ ہونٹ بھینچے اسے گھورتی رہی۔

"جائیے..... آپ کی فیورٹ چچی کی گاڑی لینے آگئی انہیں، ہارن بج رہا ہے۔"

"تم اکیلے گلاب جامن نہیں کھاؤ گے۔" جانے سے پہلے اس نے تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا۔

"اکیلا کہاں میں عمر بھائی کے ساتھ کھاؤں گا۔" عمر چکا وہ الٹے پاؤں پلٹی۔

"یہ مٹھائی چچی ہمارے لیے لائی ہیں۔ اس نواب زادے کے لیے نہیں، ایسے پچاس ڈبے ہمارے پیٹ پر لات مار کے وہ ہر مہینہ کھا سکتا ہے۔ ہمیں یہ کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ خبردار جو تم نے اس مٹھائی کا ایک پیس بھی اسے کھلایا تو..... میں تمہارے نام کا لحاظ کیے بغیر اسے فریج سے اٹھا لوں گی۔" وہ بلبلا رہی تھی۔

"یہی حال میں آپ کے کیک کے ساتھ کروں گا۔"

"تم..... میں۔" مارے غصے کے اس سے اور کچھ بولا ہی نہ گیا۔ تبھی امی کی پکاریں شروع ہو گئیں۔

"حور..... آؤ..... تمہاری چچی جا رہی ہیں۔"

"تم..... تم جہنم میں بھی عمر کے ساتھ جانا۔" دانت پیس کر کہتی وہ جلتی بھنتی وہاں سے گئی۔ مولی دیر تک ہنستا رہا۔

چچی لوگوں کے پاس پہنچی تو وہاں انوکھی بحث چھڑی تھی۔ چچی اسے ایک دن کے لیے ساتھ لے جانے پر بضد تھیں اور امی نہ نہ کیے جا رہی تھیں۔ وہ پہلے تو ہونق سی دونوں کو دیکھتی رہی۔ پھر جب چچی کا والہانہ پیار، دوستانہ لہجہ اور ان کے لمبے چوڑے بنگلے نے دماغ میں چھب دکھائی تو چھوٹتے ہی بولی۔

"امی میں چلی جاتی ہوں۔"

"میں صدقے۔" چچی نے فوراً گلے سے لگا لیا۔ امی کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔

"پاگل ہو گئی ہو۔" حسب عادت آنکھوں کی زبانی حوریہ کو باز رہنے کی تلقین کی مگر وہ انجان بنی چچی سے اور زیادہ چمٹ گئی۔

"حال دیکھو اپنی ماں کا سگے چچا کے گھر جانے پر بیٹی کو آنکھیں دکھا رہی ہے۔ جیسے وہ کوئی گناہ کرنے جا رہی ہو۔" ذرا بھی لحاظ کیے بنا چچی نے امی کی چوری پکڑ کر واشگاف کہا تو ان پر منوں پانی پڑ گیا۔

"نہیں نہیں بھابھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ میں تو اس کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔ پڑھائی اور پھر اس کے ابو جی گھر پہ نہیں۔"

"پڑھائی کی فکر نہ کریں۔ وہ ہو جائے گی اور ابو سے تو میں ابھی پوچھ لیتی ہوں۔" امی اچھی خاصی مصیبت میں پڑ گئیں..... بے شک چچا کا گھر تھا مگر یوں حوریہ کا جا کر رہنا۔

ان کا دل نہیں مان رہا تھا۔ ان کے ایک نہ دو پورے تین بیٹے تھے۔ وہ بے بسی سے کبھی حوریہ کو تو کبھی دادی کو دیکھنے لگیں۔ دل تو کر رہا تھا یاسمین چچی کا لحاظ کیے بنا چٹیا سے پکڑ کر حوریہ کو گھما ڈالیں۔ جو اس وقت ننھی بچی بنی چچی کے گلے سے لگتی جا رہی تھی اور دانستہ ماں کو دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ دوسری طرف دادی بھی امی کی پریشانی سے آگاہ تھیں۔ ایک سال قبل خود سے کیا عہد کہ دستگیر کے گھر جا کر کبھی رہوں گی نہیں بھلا کر حوریہ کے ساتھ خود بھی چلی جاتیں۔ مگر ایک تو یاسمین چچی کو مزید موقع مل جاتا خود کو مظلوم اور ان کو غیریت کا طعنہ دینے کا۔ دوسرے یاسمین چچی دادی کو کبھی روکھے منہ بھی پیشکش نہیں کرتی تھیں اپنے گھر آ کر رہنے کے لیے جیسے کہ ابھی بھی وہ کہہ سکتی تھیں کہ حوریہ کے ساتھ آپ بھی چلی چلیں۔ لیکن ان کا اصرار صرف اور صرف حوریہ کو لے جانے پر تھا سو دادی چپکی رہیں۔ ایک سال قبل تک ایسے حالات نہیں تھے۔ گو کہ تب بھی دستگیر چچا اور یاسمین چچی کے

دلوں میں دادی کے لیے محبت کے سوتے نہیں پھوٹتے تھے لیکن دادی بیٹے کی محبت میں ایسی ڈوبیں کہ ان کے سرد و بے نیاز رویوں و لہجوں کی پروا کیے بغیر جب دل چاہتا ڈھیٹ بنی نا صرف دستگیر چچا کے گھر چلی جاتیں بلکہ کئی کئی دن رہ بھی آتیں۔ حالانکہ چچا بھی خالصتاً" زنانہ شکایتوں سے انہیں ہر چکر پہ زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ جانے دیتے تھے جہانگیر بھائی اور عالمگیر سے وہ زیادہ محبت کرتی ہیں۔ انہیں کسی کھاتے میں نہیں سمجھتیں۔ سوتیلوں سے بڑھ کر ان سے سلوک کرتی ہیں۔ دادی اولاد کی محبت کے ہاتھوں مجبور یہ باتیں سہہ جاتیں۔ مگر آخری چکر پہ چچا چچی نے حد ہی کردی۔ رشتوں کے معاملے پر بات ہوئی کہ جہانگیر تایا اپنی چھوٹی زویا کا رشتہ چچا کے رافع کو کیوں نہیں دے رہے اور دادی اس سلسلے میں کیوں نہیں ان کی سائیڈ لے رہیں۔ بات بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ دادی رونے تک آگئیں۔ چچا اور چچی کو پھر بھی ترس نہیں آیا برابر سناتے رہے۔ یہاں تک کہ روتی ہوئی دادی نے خود فون کر کے عمر کو بلوایا اور بڑے بھاری دل کے ساتھ واپس حوریہ لوگوں کے گھر آگئیں۔ جو تین' چار دن دستگیر چچا کے گھر رہنے کے لیے جاتی تھیں۔ وہ بھی چھوڑ دیا اور اس کے بعد چچی تو دور کی بات خود چچا نے کبھی کہا نہیں کہ ہمارے گھر آکر رہیں۔ ایسے میں دادی کیسے کہہ دیتیں کہ وہ حوریہ کے ساتھ چلتی ہیں۔ اس شام یاسمین چچی حوریہ کو لے کر ہی ٹلیں۔

☼ ☼ ☼

رات کے گیارہ بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے جب اسے موبی کا میسج موصول ہوا۔

"عمر بھائی..... میں آؤں یا آپ آتے ہیں؟" عمر بے ساختہ کراہ کر رہ گیا۔ دو دن سے وہ بابا اور چچا عالمگیر کے ہمراہ اپنی زمینوں پر تھا۔ ابھی ایک گھنٹے پہلے تینوں کی واپسی ہوئی تھی اور تھکن اس قدر حاوی کہ وہ بس سونا ہی چاہتا تھا۔ مگر موبی کے میسج کے بعد ارادہ بدلنا پڑا۔

"میں آتا ہوں۔" موبی کو جواب میں لکھا اور بالوں میں انگلیاں چلانے کے بعد آئینے میں حلیہ دیکھا۔ آنکھیں لال اور کسی حد تک سوجی ہوئی اور شکل پہ ایک عالم کی تھکن طاری..... یوں لگ رہا تھا جیسے زمینوں کا جائزہ لینے اور حد بندی کرنے کے بجائے وہ ان میں ہل چلا کر آیا ہو۔

"بابا مجھے کسان بنا کر ہی چھوڑیں گے۔ انہیں میں بزنس کرتا اچھا نہیں لگتا۔" شکل پہ مسکینیت سجا' اپنے آپ سے الجھتا وہ کمرے سے باہر نکل کر چچا کے پورشن کی طرف رواں ہوا۔ جس کے بیچ میں ایک باڑ حائل تھی۔

"عمر بھائی..... آپ بے وفا ہوتے جا رہے ہیں۔" چچا کے پورشن میں خاموشی حکمران بنی ہوئی تھی۔ موبی اس کے استقبال کے لیے لاؤنج کے بیرونی دروازے پہ منہ بسورے کھڑا تھا۔

"یار جھوٹ مت بولو۔" موبی کی معیت میں اس کے کمرے کی طرف جاتے جاتے اس نے سماعتوں کو کچن اور اس دشمن جان کے کمرے کی طرف لگائے رکھا۔ مگر دونوں علاقوں میں خاموشی کا راج محسوس ہوا۔

"آج اتنی جلدی سو گئی؟" ہونٹ سکوڑتے ہوئے وہ دل ہی دل میں مایوس ہوا۔ سچ تو یہ تھا وہ اس وقت موبی کے بلاوے پر ہر تھکن پس پشت ڈالے صرف اس لیے دوڑا چلا آیا کہ حوریہ نظر آجائے گی..... کچھ الجھے گی' کچھ جھگڑے گی اور اس بے وجہ کے ٹاکرے میں وہ ضرور بشاش ہو جائے گا۔ ایسا عموماً" ہوتا تھا۔ کبھی موبی اس کے یہاں تو کبھی وہ موبی کے یہاں اس وقت موجود ہوتا' کیرم' تاش اور نہیں تو کوئی مووی ہی دیکھ لی جاتی حوریہ اس دوران جلے پیر کی بلی بنی موبی کے کمرے کے باہر اور لاؤنج میں چکرائی رہتی۔ اسے فیل ہونے کے ڈراوے دیتی' ابو کو بتانے کی دھمکیاں الاپتی اور انت میں نزلہ عمر پر گرتا کہ وہ موبی کو خراب کرتا ہے۔ اس میں اس کی تو جو توانائی ضائع ہوتی سو ہوتی۔ عمر کو نا محسوس انداز میں اپنا آپ ہلکا پھلکا اور دنیا رنگین

محسوس ہونے لگتی۔ اس رنگینی کا لطف اٹھانے وہ ابھی بھی کشاں کشاں آیا تھا۔

"یہ کس خوشی میں؟" موبی نے مٹھائی کا ڈبا سامنے رکھا تو عمر مشکوک ہوا۔

"تمہارا رشتہ طے ہو گیا؟" رس گلا اٹھاتے ہوئے عمر نے پھلجھڑی بھی چھوڑی۔

"عمر بھائی۔" موبی اس سے زیادہ شرمایا۔ جتنی اس کو شرم آئی تھی۔ عمر خاموشی سے رس گلا کھاتا رہا۔

"عمر بھائی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" بغور عمر کا جائزہ لینے کے بعد موبی پہ انکشاف ہوا تو اسے تشویش لاحق ہوئی۔

"ٹھیک ہوں یار..... دو دن سے نیند نہیں نصیب ہوئی۔" عمر نے کسلمندی سے کہا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔

"یہ جو دو اولڈ مین میرے ساتھ تھے۔" عمر کا اشارہ اپنے بابا اور موبی کے ابا کی طرف تھا۔

"دن کو تو بے سکون رکھتے ہی تھے۔ رات کو بھی سونے کے دشمن بن جاتے۔ ساری ساری رات قسم قسم کے لوگوں کے بیچ وڈیرے بنے خود تو بیٹھتے مجھے بھی بٹھائے رکھتے۔"

"تھینک گاڈ' میں اس بروڈن سے آزاد ہوں۔" موبی نے باقاعدہ شکر پڑھا تھا۔

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس دفعہ ہم زمینوں کا حصہ کرنے کے خیال سے گئے تھے۔ اپنے حصے کی زمین تم خود سنبھالنا اور چچا ______ بھی خود اگائیں خود کاشت کریں۔" عمر کا اشارہ اب کے دستگیر چچا کی طرف تھا۔

"میرے بابا کی جان بخشی ہو۔ سارے خاندان میں غاصب بحق تلف مشہور کر رکھا ہے۔"

"عمر بھائی ہم نے تو نہیں کر رکھا..... آپ جانتے تو ہیں۔" موبی منمنایا۔

"تمہاری اس ہٹلر بجو کے ارشادات یاسمین چچی اور چچا بھتیجے خالی جیسے ہی ہیں۔"

"اوں..... یاسمین چچی سے یاد آیا یہ مٹھائی کا ڈبا آپ انہیں کی مہربانی سے کھا رہے ہیں۔ وہ لائی تھیں آج۔"

"ارے..... "عمر جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا۔ یہ تو خطرناک مٹھائی ہوئی۔ یاسمین چچی اپنا بخار..... کسی کو نہیں دیتیں۔ تم لوگوں پر یہ مہربانی کیوں؟ یقیناً" کچھ پڑھ پھونک کر آئی ہوں گی یہ۔"

"واقعی..... "موبی کو نئی پریشانی چمٹ گئی۔

"عمر بھائی وہ تو کیک اور بہت سارا پھل بھی لائی تھیں۔"

"ارادے کیا ہیں ان کے؟" عمر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"کیک پر تو بجو نے قبضہ جما لیا۔"

"چٹ لگا کر..... فریج میں؟" عمر نے تصدیق کرانی چاہی جو موبی نے اثبات میں سر ہلا کر دی۔

"فوراً" ڈسٹ بن میں پھینک آؤ۔"

"لل..... لیکن عمر بھائی بجو۔" موبی کو اپنی جان زیادہ پیاری تھی۔

"میں کہہ رہا ہوں نا..... ابھی اٹھو اور پھینک آؤ..... تمہیں اپنی بجو کی زندگی عزیز نہیں۔ یاسمین چچی سوچ سمجھ کر مہربان ہوتی ہیں۔ ان کی سوچ کیا ہے یہ پتا لگانا میرا کام ہے۔ تم اپنا کام کر آؤ۔ ہری اپ۔" موبی تو اٹھتے ہی کیک کو کوڑے دان کی نذر کر آیا تو چہرے پر حوریہ کا رد عمل سوچ کر نئی پریشانی لکھی تھی۔

"یار منہ مت بناؤ..... میں ہوں نا ویسے ہے کہاں تمہاری بجو۔" یہاں وہاں دیکھتے عمر نے سرسری انداز اختیار کیا۔

"یاسمین چچی کے گھر۔" موبی کا منہ لٹکا ہی رہا۔ حوریہ نے اسے حقیقتاً" چیر پھاڑ دینا تھا۔ ادھر عمر نا سمجھی سے پہلے اسے دیکھتا رہا۔ پھر حیرت و الجھن کا شکار ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"کہاں' کہاں' کہاں پھر سے بتاؤ۔" بے حد آہستگی سے وہ یوں پوچھنے لگا جیسے سننے میں دھوکا ہوا ہو۔

"یاسمین چچی کے گھر۔"

"کیوں' کب؟" عمر کی آنکھوں میں شدید ترین

ناگواری اتر آئی۔

"آج شام میں آئی تھیں چچی تو لے گئیں اپنے ساتھ۔" موبی کو بھی اندازہ ہو گیا عمر کے یکدم ہوئے خراب موڈ کا وہ جھجک کر بتا پایا۔

"اور چچی نے جانے دیا؟" عمر کی حیرت میں دبی دبی ناگواری اور غصہ تھا۔

"امی نہیں جانے دے رہی تھیں۔ بجو خود ضد کر کے گئیں۔" موبی سٹپٹا رہا تھا۔ عمر ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا۔

"امی تو اس بات پر بھی غصہ ہوتی ہیں کہ بجو یاسمین چچی سے اتنا فری کیوں ہوتی ہیں۔ بجو کو آج بھی آنکھیں دکھا دکھا کر منع کرتی رہیں پر بجو کو ــــ شوق ہو رہا تھا جانے کا پھر یاسمین چچی بھی بہت اصرار کر رہی تھیں۔" عمر کی شکن آلود پیشانی کو کن انکھیوں سے دیکھتا موبی آہستگی سے بتا تا گیا۔ عمر ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا۔ بے حد خفا اور مضطرب سا۔

"دادی کہتی ہیں بجو کے ستارے ملتے ہیں یاسمین چچی سے۔" موبی نے اپنے تئیں مذاق کرنا چاہا مگر عمر نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ موبی کو مذاق بھاری لگنے لگا۔

"ٹائم کیا ہوا ہے؟" عمر نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"سوا گیارہ۔" موبی نے جھٹ سے بتایا۔ عمر کھڑا ہو گیا تھا۔

"کہاں عمر بھائی۔" موبی کو عمر کے ارادے ــــ کچھ خطرناک لگے۔ عمر بغیر بتائے اسے کمرے سے نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ مراسم ایک حد تک برداشت ہوتے ہیں۔ بڑھ جائیں تو خوبیاں غائب اور خامیاں سامنے آجاتی ہیں۔ اسے یہ بات ابھی ابھی سمجھ آئی۔ یاسمین چچی دو مہینوں میں ایک بار آتیں تو بہت پیاری لگتیں۔ مگر اب اتنے گھنٹوں سے ساتھ تھیں اور حوریہ کو صحیح معنوں میں ناک تک بے زار کر چکی تھیں۔ ان کا یہ عظیم الشان بنگلہ، گیراج میں کھڑی دو گاڑیاں، گھر کی آرائش کے لیے استعمال ہوا سامان سب کچھ ان کے مظلوم لیکچر سے ہٹ کر کہانیاں سنا رہے تھے۔ وہ کتنی مظلوم، کتنی ارزاں، کتنی سوتیلی سی زندگی گزار رہی ہیں۔

حوریہ جب جب ان کی زبانی سختی ان کے ساتھ مل کر آنسو بہاتی اور تایا ابا کے گھر والوں اور خود ان کے زبانی بخیے ادھیڑ کر اپنے نامہ اعمال کو بھاری کرتی۔ یہ نہیں تھا کہ آج وہ پہلی بار چچا دستگیر کے گھر آئی تھی۔ سال کے سال کبھی نہ کبھی حاضری لگ جایا کرتی اور ہر حاضری پہ چچا کے گھر کی مالی حالت سنورتی ہی نظر آتی۔ ان کے بیانات کے مترادف تو اسے کچھ بھی دیکھنے کو نہ ملتا۔ آج تو آنکھوں ہی چندھیا رہی تھیں۔ گھر کی شان و شوکت نے پہلے ہی زبان گنگ کر دی۔ اوپر سے چچی کا تایا اور تائی نامہ فارغ بھی ہضم کر گیا۔

وہ چھ بجے کی آئی تھیں۔ بلا مبالغہ چچی اس وقت سے رات کے کھانے تک تایا لوگوں کے خلاف زہر اگلتی رہیں۔ کھانے کے وقت وہ دونوں تھیں میز پر، چچا شہر سے باہر رافع، واسع اور شافع گھر سے باہر حوریہ چچی کی باتوں سے ناک تک بھر چکی تھی۔ اتنی زیادہ کہ کھانے کی بھی حاجت نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ کھاؤ نا ــــ ایسا مر مر کے کیوں نوالے لے رہی ہو، مانا کہ ہم غریبوں کے کھانے کی شان تمہارے تایا کے گھر کے کھانوں جیسی نہیں مگر اتنی بھی گئی گزری نہیں کہ تم سونگھنے پر آجاؤ۔" چچی کا کہا کھانے کو حقیقتاً" زہر کر گیا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ چچی یہ پوری بھری ہوئی میز اس کے تو کیا عمر کے بھی گھر میں نہیں ہوتی۔ جو دو کھانے اسے گھر پکتے ہیں وہی عمر کے یہاں بھی، ایسی بھری ہوئی انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی میز تو عید کے عید بھی اسے تایا یا اپنے گھر دیکھنے کو نہیں ملتی۔ مگر اس وقت دل ہی نہیں آنکھیں بھی بھر گئی تھیں ــــ وہ کسی اندر دھکیلتی، یہاں آنے کے فیصلے پر پچھتاتی کھانا زہر مار کرنے لگی امید تھی کھانے کے بعد جان خلاصی ہو گی اور وہ چچی کے نرغے سے آزاد ہو جائے گی مگر امتحان اور بھی باقی تھا چچی نے سبز چائے بنوالی اور اسی "تایا نامہ، عمر نامہ" کے فرد کے ساتھ خود بھی پی اسے بھی پلائی۔ دس بجے تک وہ خود کو دل ہی دل میں ہر موٹی گالی سے نواز چکی تھی۔

"مر جاتی یہاں نہ آتی تو؟ دماغ چل گیا تھا جو آگئی؟ کاش نہ آتی۔ اللہ پاک ابو جی آجائیں گھر اور مجھے نہ دیکھ کر امی اور دادی کو خوب ڈانٹیں اور مجھے واپس لے جانے کے لیے کسی کو بھیج دیں پلیز اللہ پاک پلیز۔" چچی کو بالآخر محسوس ہو گیا وہ اب کمرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ کیونکہ حوریہ مکمل طور پر غائب دماغ ہوئی بیٹھی تھی۔

"لگتا ہے تمہیں نیند آرہی ہے۔ دیکھو بھلا میں سوچ رہی تھی ساری رات باتیں کریں گے۔ تم اتنی جلدی تھک گئیں۔" چچی یوں شکوہ کرنے لگیں جیسے اب تک کچھ بولنا نصیب ہوا ہی نہ ہو اس کے ساتھ اور ساری رات کا سوچ کر اس کا دل حلق میں آگیا۔

"چلو خیر ــــ تین دن سے پہلے تو میں نے تمہیں نہیں جانے دینا ــــ جی بھر کر باتیں کریں گے۔" چچی اسے اس کے کمرے میں لے گئیں اور وہ "تین دن" میں ان کی فی الحال "رات کیسے گزرے گی" کا غم بھی بھول گئی۔ چچی اس کے ماتھے پر نرم گرم سا بوسہ دے کر گڈ نائیٹ کہتی چلی گئیں تو اس نے آزادی کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ اس وقت اسے اپنا بستر، اپنا کمرہ، گھر حتیٰ کہ امی کی چیختی چنگھاڑتی پکاریں۔

"حوریہ رات بہت ہو گئی سو جاؤ۔ بند کرو ٹی وی، میں کہتی ہوں موبائل کی جان چھوڑو نہیں تو پٹو گی۔" سب بے تحاشا یاد آرہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان سب سے جدا ہو گئی ہو۔

"نہیں نہیں اللہ پاک پلیز نہیں۔" اس نے بے ساختہ جھرجھری سی لی۔

"ہائے کوئی معجزہ ہو جائے ــــ کوئی آجائے مجھے لینے۔" جیسے کیا ہونا تھا۔ اسے نیند ضرور آگئی۔

☼ ☼ ☼

"شش، شش، ہیلو بیوٹی کوئین ــــ سوئی ہوئی شہزادی آنکھیں کھولو۔" دور، بہت دور سے آوازیں آتی محسوس ہو ئیں ــــ لاشعوری طور پر نیند میں ہی اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کوئی اس کے اوپر جھکا ہوا تھا ساری نیند ہرن ہو گئی پاگلوں کی طرح چیخ مارنے کی کوشش میں اس نے جیسے ہی منہ کھولا اس کے اوپر جھکے ہوئے وجود نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا کر رہی ہو؟ زیادہ فلمی ہیروئن نہ بنو۔ میں رافع ہوں۔" ساتھ ہی اس نے لائیٹ آن کر دی۔ کمرہ روشن ہو گیا تھا اور رافع کا ہیولہ بھی مگر اس کی سدھ بدھ ابھی بھی سوئی رہی۔ وہ پھٹی آنکھوں میں خوف و دہشت سجائے اسے دیکھتی رہی۔

"اے ــــ ہیلو، ہوش میں آؤ ڈونٹ بی آفریڈ یار رافع ہوں تمہارا کزن۔" وہ پہچان گئی تھی وہ رافع ہے مگر جس انداز سے اس نے رات کے اس وقت آکر جگایا تھا۔ وہ ہضم ہو تا تو وہ مزید کچھ سوچتی۔

"میں ابھی ابھی آیا ہوں ایکچوئیلی آج ولیمہ پہ گیا ہوا تھا۔" ولیمہ کا کیا مینیو ہو گا یہ اس کے منہ سے آتے ناگوار بدبو کے بھبھوکے خود بتا رہے تھے۔ مگر بہرحال وہ ہوش و حواس میں تھا۔

"مما نے بتایا تم آئی ہوئی ہو تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔" اپنی حرکت پہ وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔ حوریہ کو خود پہ غصہ آنے لگا۔

"اور یہ کیا تم اتنی جلدی سو گئیں؟ ہمارا ویٹ تو کیا ہوتا؟ فرسٹ ٹائم تم ہمارے گھر رہ رہی ہو اور ہم ایک ساتھ انجوائے بھی نہ کریں۔ چلو چلو گیٹ اپ ــــ باہر چلتے ہیں ٹیرس یا لان میں باتیں کرتے ہیں۔" وہ اسے باقاعدہ ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کر چکا تھا۔ حوریہ کی حالت مزید غیر ہونے لگی۔

"نہیں رافع بھائی ــــ میں ایکچوئیلی۔"

"کوئی ایکسکیوز نہیں چلے گا۔ چلو آئسکریم بھی کھاتے ہیں اور ڈھیر ساری باتیں بھی کرتے ہیں۔" رافع ضد میں اپنی ماں پر گیا تھا صرف اپنی کہنا اور مرضی کا سننا اس گھر کے مکینوں کی گھٹی میں تھا شاید ــــ

"رافع بھائی ــــ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔

آپ پلیز مائینڈ مت کریں۔ میں آج تو یہیں ہوں نا صبح باتیں کریں گے آپ۔"

"صبح بھی کریں گے تم ابھی بھی چلو تو۔" رافع ہٹ دھرمی کا ثبوت دیتا اسے ہاتھ سے پکڑ کر جونہی آگے بڑھنے لگا۔ چہرے پر زمانے بھر کا غصہ، جھنجلاہٹ بے بسی اور جانے کیا کیا چسپاں کیے یاسمین چچی اندر داخل ہوئیں۔

"مما دیکھیں نا حور کو کتنی بور ہے۔ میں اس کو کہہ رہا ہوں۔"

"تم فی الحال اس کو کچھ مت کہو۔" یاسمین چچی نے تیز لہجے میں رافع کی بات کاٹی۔ حوریہ پہلے شکر گزاری اور پھر ناسمجھی سے یاسمین چچی کو دیکھنے لگی۔

"اس کے سگے آگئے ہیں اس کو لینے۔" ان کے لہجے ہی نہیں آنکھوں میں بھی کاٹ تھی۔

"کون؟" اس سے پہلے رافع نے پوچھا۔

"عمر۔" چچی نے زہر خند لہجے میں بتایا۔ حوریہ نے بے ساختہ وال کلاک پر نظر دوڑائی۔ پونے بارہ تھے۔

"چمتکار۔" اس کا دل اچھلنے لگا، قہقہے لگانے لگا۔

"واٹ ازدس نان سینس۔ آپ کہیں اس سے یہ کوئی ٹائم ہے؟ حوریہ اپنے چچا کے گھر رہنے کے لیے آئی ہے۔ کوئی مذاق ہے؟" نئی بحث چھڑنے لگی تھی۔ حوریہ کو اپنا جانا پھر خطرے میں لگنے لگا۔ عمر۔ یہاں تک بھی آجاتا۔ جیسے بازو سے پکڑ کر رافع اسے لے جا رہا تھا۔ ایسے وہ بھی لے جاتا تو کیا جاتا اس کا (شکر ہے عمر سوچ نہیں پڑھ سکتا) سوچ کر پھر دل میں سٹپٹائی بھی۔

"کہا ہے۔ مگر وہ خان صاحب بضد ہے کہ چچا نے بھیجا ہے لازمی لے جانا ہے۔"

"چچی آپ ناراض نہ ہوں۔ واقعی ابو نے ہی بھیجا ہو گا۔ آپ جانتی تو ہیں ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ اپنے ہر کام کے لیے مجھے آواز لگاتے ہیں۔ تہجد کے لیے بھی میں ساتھ جاگتی ہوں ان کے انھیں مشکل ہو گی میں۔"

"آتے وقت یہ سوچ نہیں آئی تھی تمہیں؟" چچی سرد لہجے میں طنز کرنے سے نہ چوکیں حوریہ نے مزید الفاظ ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا ویسے بھی عمر کی گاڑی کا ہارن بج رہا تھا۔ وہ رافع اور چچی سے نظریں چراتی بھاگتی ہوئی باہر گاڑی تک پہنچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ وزٹ کس خوشی میں تھا؟" وہ جو اس خوش فہمی میں مطمئن ہو چکی تھی کہ عمر خاموش ہے تو گھر تک کا سفر سکون سے کٹے گا۔ مگر یہ ناممکنات میں سے تھا۔ عمر بظاہر ونڈ اسکرین کی جانب متوجہ چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔

"آج سے پہلے ہمارے گھر کی کوئی بیٹی کہیں جا کر رہی ہے؟"

"وہ ہمارے چچا کا گھر ہے۔" وہ بے ساختہ تڑپ کر بولی۔

"چچا کی محبت آج کیوں جاگی؟" وہ ہونٹ بھینچے شیشے سے باہر دیکھنے لگی کہ اس وقت منہ لگنے کی ہمت نہ تھی۔

"نہ کسی بڑے سے اجازت لی۔ نہ پوچھا اور چل دیں منہ اٹھا کر یاسمین چچی کے ساتھ جن کی سارے زمانے سے نہیں بنتی ان کی تم سے کیوں بنتی ہے؟ کبھی سوچا اس بارے میں؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھے یہ سب کہنے والے۔ اور میں جب تمہارے گھر میں رہ سکتی ہوں تو ان کے گھر کیوں نہیں۔"

"میرے گھر کی اور بات ہے؟" عمر کا لہجہ عجیب ہو گیا۔ پراسرار وہ سر جھٹک کر پھر باہر دیکھنے لگی۔ چھوٹا سا شہر جس کی گلیاں ہی نہیں بازار بھی سو چکا تھا اور وہ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے عمر کے ساتھ سڑکیں ناپ رہی تھی۔

"چچا اور چچی کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو۔ مگر ایسی کوئی امید مجھ سے مت رکھنا۔ میں برداشت کرنے اور معاف کرنے والوں میں سے نہیں جو غلطی کرتا ہے

اسے سزا دے کر رہتا ہوں۔"

"تم۔" اس تو سارے فیوز اڑ گئے۔

"حد میں رہو۔ میرے باپ مت بنو۔"

"میں بننا بھی نہیں چاہتا۔" عمر کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

"کہوں گی میں ابو سے۔ تمہیں کیوں بھیجا مجھے لینے کے لیے۔ سارا راستہ مجھ سے بدتمیزی کرتا رہا۔" وہ دھمکی دے رہی تھی۔

"واٹ۔" عمر کا پاؤں بریک پر جا پڑا۔ جیسے حوریہ کے فیوز اڑے تھے بالکل ویسے اس کے چودہ طبق روشن ہوئے تھے۔

"مطلب جانتی ہو اس جملے کا؟" وہ اس کی طرف منہ کر کے غرایا۔ حوریہ ایک دم سہم گئی۔

"کر کے بتاؤں بدتمیزی کیا ہوتی ہے؟" یہاں پر حوریہ کی روح فنا ہو گئی صورت حال کی نزاکت کا احساس اب جا کے ہوا۔ اندھیری رات، سنسان جگہ، سڑک پر کھڑی اکلوتی کار میں وہ اور عمر۔ اس کی آنکھیں جھلملا گئیں اپنی بے بسی پر۔

"اور تمہیں میں خود لینے آیا ہوں۔ چچا یا کسی نے نہیں بھیجا مجھے۔" اس کی سبز جھیلوں سے نظریں چراتا آرام سے کہتا وہ دوبارہ گاڑی چلانے لگا۔ حوریہ کے آنسو دیکھ کر اندازہ ہوا کچھ زیادہ کہہ گیا تھا وہ۔

"تم بھی نا بنا سوچے سمجھے چلی گئیں صبح کالج ہے۔ میرا پیریڈ ویسے بھی دو دنوں سے نہیں ہوا۔ کل بھی تم مس کر دیتیں تو سوچو نقصان ہوتا یا نہیں" وہ ابھی کافی تمیز سے نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مگر حوریہ کو پروا نہیں تھی۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پیتی رہی۔

"حور۔ آئس کریم کھائیں۔" شہر کا مشہور آئسکریم بار رستے میں آیا تو محض اس کا موڈ بدلنے کے لیے وہ بولا۔ حوریہ نے غصے سے منہ پھیرے رکھا۔ گویا وہ بات کرنے کے موڈ میں بھی نہیں تھی۔

"میں صبح نہیں آؤں گی۔" پھر اچانک وہ تڑی دے کر بولی تھی۔

"کیوں؟"

"میری مرضی۔" عمر نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اپنی جون میں واپس آرہی تھی۔

"ٹھیک ہے نہ آؤ۔ میں نوٹس بورڈ پہ لگوا دوں گا کہ حوریہ عالمگیر نا صرف میری فرسٹ کزن ہے بلکہ میری۔" اتنا کہہ وہ اچانک چپ ہو گیا۔

"کیا میری۔ ہیں آگے بولو۔" وہ آنکھوں میں شرارے بھرے اسے کاٹ کھانے کو دوڑی۔ عمر پہلے تو اسے عام سی نظروں سے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر نفی میں سر ہلاتا بولا۔

"کچھ نہیں۔" کزن کے علاوہ وہ اس کی کیا تھی؟ یہ وہ تو جانتا تھا۔ حوریہ بھی جان جائے اس کے لیے ابی اور تایاؤں کو ہوشیار کرنا ضروری تھا۔ یعنی مشن امپاسبل اسٹارٹ۔

☼ ☼ ☼

رول نمبر 7 اور 32 عمر کے "یس کم ان" کہنے کے بعد اپنی نشستوں کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ حوریہ کی نظریں لاشعوری طور پر عمر کی طرف تھیں۔ اسے لگا رو نمبر سیون اور تھرٹی ٹو یعنی فاریہ اور خدیجہ پر ٹکی عمر کی نگاہوں کا تاثر بڑا گہرا اور بھرپور ہے۔

"چیپ انسان۔" اسے خوامخواہ تاؤ آیا۔ فاریہ اور خدیجہ ہوسٹل میں ہونے کے باوجود بڑے آرام و اطمینان سے کالج آتیں حوریہ نے محسوس کیا عمر نے انہیں دیر سے آنے پر کچھ بھی نہیں کہا تھا اور وہ دو چار بار لیٹ ہوئی تو بنا رعایت دیے اس کی خوب لفظی کھنچائی کر ڈالی تھی۔ فاریہ اور خدیجہ نزدیکی تحصیل کے گاؤں سے تھیں۔ فاریہ کا تعلق بھی اونچے زمیندار گھرانے سے تھا اور خدیجہ اس کی بہترین دوست تھی۔ اگرچہ کوئی اتنی خاص حسین تھیں نہیں۔ لیکن دونوں کا رکھ رکھاؤ اور دلکش شخصیت سامنے والے کو متاثر ضرور کرتی۔ جیسے کہ ابھی ابھی حوریہ کو یقین ہو رہا تھا کہ عمر بھی ان کے متاثرین میں آ کھڑا ہوا ہے۔

"مجھے کیا۔۔۔ جدھر منہ مارے، جس کو چاہے تاڑے۔" پھر یہ احساس ہونے پر کہ وہ کیوں اپنا آپ جلا رہی ہے اس نے عمر اور فاریہ، خدیجہ پر ایک ساتھ مٹی ڈالی اور رخشی کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو عمر سے کوئی سوال کر چکی تھی۔ جس کے جواب میں عمر کہہ رہا تھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں۔۔۔ میں آپ کو اپنی ڈگری اور یونیورسٹی کی سند لا کر دکھاؤں؟"

"دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ آپ کا way of talking بتا رہا ہے آپ کتنے ایجوکیٹڈ ہیں۔" پوری کلاس کو سانپ سونگھ چکا تھا۔ رخشی کی کڑک، کراری آواز خاموش کمرے میں اور زیادہ ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اس نے جس لب و لہجہ میں جو ـــــ جملہ کہا اس کے بعد عمر کی تیوری لازمی چڑھنی تھی۔ اس کا حوریہ کو یقین تھا۔

"سیم میری فیلنگز بھی یہی کہتی ہیں آپ کے بارے میں۔" عمر نے اظہار تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

"مجھے آپ کے Opinion کی ضرورت نہیں۔ یہاں موجود سب پروفیسرز میری قابلیت جاننے کے لیے موجود ہیں۔ مجھے آپ کی Judgement نہیں چاہیے۔"

"میں بھی یہاں منہ اٹھا کر نہیں آ گیا ہوں۔۔۔ باقاعدہ آپ کے پرنسپل اور پروفیسرز کی فرمائش پہ آیا ہوں اور کچھ جانتا ہوں۔ تبھی ہی بلایا گیا ہوں۔۔۔ ورنہ مجھے بھی شوق نہیں اپنی قابلیت کے جھنڈے آپ جیسوں کے سامنے گاڑنے کا۔" عمر کے ماتھے کی رگ پھولی ہوئی تھی۔ حوریہ جانتی تھی وہ جب غصے میں ہوتا تو یہ رگ واضح ہو جاتی ہے۔ پھر بھی عمر ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اپنے لفظوں سے ہٹ کر اس کا لہجہ سخت نہیں تھا۔

"مجھ جیسوں سے آپ کا کیا مطلب؟" اس کے برعکس رخشی تہذیب و تمیز کے دائرے سے نکل کر بھڑکی تھی۔

"چپ ہو جاؤ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ خود کو دیکھ آئی تھیں شیشے میں کیا؟" راشدہ نے دبی آواز میں اس کا میٹر ٹھیک کرنا چاہا مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی کھڑی ہو گئی۔

"میں خود آپ جیسوں سے نہ پڑھوں۔۔۔ جنہیں لڑکیوں سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ یہاں سے پتا لگتا ہے تھرڈ کلاس ٹیچر کیا ہوتی ہے۔" کہنے کے بعد رخشی بیگ فائل اٹھائی اپنی میلے رنگ کی چادر اڑاتی کلاس سے باہر چلی گئی۔ عمر ہونٹ بھینچے آنکھوں میں شدید ناگواری و ناراضی بھرے وہیں دیکھتا رہا جہاں سے وہ اٹھ گئی تھی۔ سب کلاس کے چہرے مجرمانہ ہو رہے تھے۔

"سر آپ محسوس نہ کریں۔۔۔ یہ پوری کریک ہے۔ بعد میں خود ہی آپ سے معافی مانگنے آ جائے گی۔" راشدہ نے ہی ہمت کی عمر کو کلاس میں واپس حاضر کرنے کی۔ وہ گہری سانس کھینچتا بنا کوئی رد عمل دکھائے لیکچر دینے لگا۔

اس دوران حوریہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ صبح عمر کا فاریہ اور خدیجہ کو دیکھنا اسے برا لگا یا پھر بھری کلاس میں رخشی نے نہایت بدتمیزی سے عمر کی بے عزتی کی وہ حوریہ کے دل پر جا لگی اور اب عمر کا غیر معمولی سنجیدہ ہونا اور آنکھوں سے جھانکتی دکھ کی کیفیت بھی اسے کھٹک رہی تھی۔ یہی نہیں پیریڈ ختم ہونے کے بعد جب وہ چاروں باہر کاریڈور میں کھڑی تھیں۔ اس کا رخشی سے بات کرنے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ رخشی نے جتنی بار اس سے مخاطب ہونے کی کوشش کی اس نے اتنی بار اسے نظر انداز کیا

☼ ☼ ☼

کتاب سے رٹنے میں اسے کوئی مسئلہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر جب آئینے کے سامنے کل کی پریزنٹیشن کے لیے پریکٹس کرنے کھڑی ہوتی یاد کیا سب بھول جاتا۔

"کیا مصیبت ہے۔" بالآخر ہمت جواب دے گئی۔ سچ مچ کا رونا آنے لگا۔ پہلے سمسٹر میں اس کو پریزنٹیشن دینے کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ پوری کلاس میں سے صرف ایک رخشی اور دوسرے جنید نے ایک ہی مضمون پر دی تھی اور اب دوسرے سمسٹر میں جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ کے مصداق سب سے پہلے کا نعرہ لگا کر عمر نے پریزنٹیشن لینے کا نا صرف شوشا چھوڑا بلکہ اعلانیہ چند اور اسٹوڈنٹس کے ساتھ اس کا نام بھی سلیکٹ کر لیا۔

"میں نے تمہیں دینی کوئی پریزنٹیشن آیا بڑا کہیں کا استاد ابھی تک کسی اور نے لی ہے جو اس کو شوق چڑھ گیا۔" خود سے عہد باندھنے کے بعد اس نے وال کلاک پر سرسری نظر دوڑائی۔ ابھی صرف دس بجے تھے۔ یعنی وہ جاگ رہا ہو گا۔

"بتا آتی ہوں۔۔۔ میں نے نہیں دینی جو چاہو کر لو۔" مصمم ارادہ کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے سے نکل کر موبی کے کمرے تک آئی۔ دروازہ کھول کر جھانکا۔ موبی کتابوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔

"چوکیداری کر رہی ہیں میری؟" اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"تمہارے گرو کہاں ہیں؟" اس کا اشارہ سمجھ کر موبی مسکرایا۔

"اپنے کمرے میں ہوں گے۔" وہ دروازہ بند کر کے پلٹ آئی۔

"بے چارہ۔۔۔ لگتا ہے رخشی کے زبانی وار بڑی زور کے لگے ہیں۔ سوگ منا رہا ہو گا۔" عمر کے پورشن تک وہ یہی سوچتی گئی۔ وہاں لائٹس آن تھیں۔۔۔ تایا، تائی یقیناً سو چکے تھے۔ دونوں کو پھر تہجد کے لیے جاگنا ہوتا تھا۔ اس نے پہلے زویا کے کمرے میں جھانکی ماری۔ وہ بیڈ پر دراز کوئی انگلش ناول ہمراہ ڈکشنری کے پڑھ رہی تھی۔

"اب آئی ہو۔۔۔ مہندی اتر گئی تمہاری؟" دروازے میں سے جھانکتے اس کے سر کو دیکھ کر وہ بھنائی۔

"میں نے لگائی ہی نہیں تھی۔" وہ دانت نکوس کر بولی۔

"اب الٹے پیروں واپس جاؤ۔ میرا نہیں موڈ فلم دیکھنے کا۔" اس نے رنبیر کپور کی نئی فلم منگوائی تھی آج اور بلا مبالغہ حوریہ کو بلانے کے لیے ساتھ تو میسج کیے تھے اکٹھے دیکھنے کے لیے اور اس کا ایک جواب wait تن من جلا گیا تھا۔ پرنس ویم کی لگتی سلگتی نہ ہو تو اب آئی تھی جب اس کے موڈ کا ستیاناس ہو چکا تھا۔

"میں عمر سے ملنے آئی ہوں۔۔۔ مل لوں۔ واپس آ کر تمہارا علاج کرتی ہوں۔"

"تم میرے بھائی سے رات کے اندھیرے میں ہی ملنے کیوں آتی ہو۔" زویا کے ابرو اچکا کر پوچھنے کی دیر تھی۔ وہ ملتے پلٹتے رک گئی۔

"کیونکہ دن میں ڈورے ڈالنے کے لیے وہ ملتا نہیں۔" دانت پیس کر وہ طنزیہ بولی تھی۔ زویا مزے سے ہنسنے لگی۔

"مجھے اپنے امی، بابا کو بتانا پڑے گا۔ لڑکی بے حیا ہوتی جا رہی ہے۔"

"سنبھال کر رکھو اپنے اس تگینے کو۔ میں ایسوں کو منہ بھی نہ لگاؤں۔" زویا کا مذاق اڑاتا انداز اس کی شان پہ حملہ تھا۔

"پتا ہے۔۔۔ پتا ہے منہ لگانے کے لیے تمہیں کرم حسین جیسے ملتے ہیں۔" زویا کو اس کے سبھی کلاس فیلوز کی بابت خبر تھی۔ کیونکہ گھر میں ایک زویا ہی تھی جسے کالج کے قصے سناتی تھی۔

"میں آکر تمہارا علاج کرتی ہوں۔" منہ پر ہاتھ پھیرتی دھاڑ سے دروازہ بند کرتی وہ وہاں سے ہٹی۔

"تم جاگ رہے ہو؟" دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ عمر لیپ ٹاپ پہ مصروف تھا۔ یعنی واقعی جاگ رہا تھا۔ لیکن مدعا بیان کرنے کے لیے کوئی ابتدائیہ تو چاہیے تھا۔ سو وہ خوامخواہ بولی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے تسلی چاہ رہی ہو' عمر نے چونک کر پہلے حیرانی سے اسے دیکھا پھر "تم جاگ رہے ہو؟" پہ دھیان گیا تو کھل کر مسکرایا۔ آنکھوں میں شوخی ہی نہیں چمک بھی آبسی تھی۔

"سویا یا جاگا۔۔۔ جو تم سمجھو۔" وہ اندر آگئی تھی۔ عمر کی پوری توجہ اب اس پر تھی۔

"میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں۔۔۔ میں بالکل بھی پریزنٹیشن نہیں دوں گی۔۔۔ سن لو۔" لہجے کو خاصا دبنگ بنا کر اپنے تئیں اس نے پہلے ہی وار میں عمر کو چت کرنا چاہا۔

"سن لیا۔۔۔ اور؟"

"اور یہ کہ تمہارا میرے تایا کا بیٹا اور ایک ہی گھر میں رہنے کا کیا فائدہ ہوا بھلا؟" عمر کی مسکراہٹ اور اس کی نظروں کے دلچسپ ارتکاز سے دل ہی دل میں' پیچ و تاب کھاتی وہ مزید کڑے لہجے میں استفسار کرنے لگی۔

"ہمارے بیچ فائدے نقصان کی بات ہی نہیں ہوئی کبھی۔"

"میں کر رہی ہوں نا۔" کھٹ سے اس نے کہا تھا۔

"اب۔۔" یہ لفظ ناچار کہنا پڑا۔ عمر نے مسکراہٹ چھپانے کی خاطر سر جھکا لیا۔

"جب ہم دونوں کالج میں غیر ہیں تو فائدہ نقصان بھی بے کار۔"

"دیکھو۔" دل تو چاہا نرخرہ دبا دے اس گدھے کا مگر مجبوری کے ہاتھوں برداشت کر گئی کہ اسے باپ بنانا پڑ رہا تھا۔

"اخلاقیات کا تقاضا ہے۔ تم پھر سے رشتہ دار ہونے کی فیور دو مجھے۔"

"یہ تو غیر اخلاقی سبق ہوا۔" عمر اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔ بظاہر سنجیدگی دکھائی مگر آنکھوں میں شرارت رقصاں تھی۔

"آج تم اپنا فائدہ مانگنے آئی ہو۔ کل کھو گی تمہاری فرینڈز کے بھی کام آؤں تو سویٹ ہارٹ۔۔۔ یہ میری پروفیشنل ذمہ داری کے خلاف ہے۔"

"میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں تم۔۔۔" بے بسی کا مقام تھا وہ اس کے سامنے ضرورت مند بنی کھڑی تھی۔

"ایک شرط پہ۔۔۔ مجھے سب کو بتانے دو تم میری کیا ہو۔" عمر حظ اٹھا رہا تھا۔ مگر اس کی برداشت حد پار کر چکی تھی۔

"تم' تم ایک نمبر کے گھٹیا اور خبیث ہو۔ رخشی نے ٹھیک تمہاری دھنائی کی۔" اس کی زبان کے جوہر کھلنے لگے۔

"دھنائی۔" عمر کو اچنبھا ہوا۔

"تم ہو ہی اس قابل' تمہیں میں شریف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔" غصے کی انتہا تھی کہ جملے کچھ کے کچھ بن رہے تھے۔ عمر نے پورے منہ پر ہاتھ پھیر کر گویا قہقہہ دبایا۔

"تم جیسے کے لیے رخشی جیسی زبان ہی ٹھیک رہتی ہے۔ اللہ کرے وہ روز تمہارا غرور ٹھکانے لگائے اور اللہ کرے تمہاری بیوی بھی بنے۔" کہہ کر وہ جیسے ہی جانے کے لیے پلٹی عمر نے اس کا بازو پکڑ کر واپس اپنے سامنے کیا۔

"تھوڑا سا مجھے بھی سنتی جاؤ۔" وہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ مگر غصے نے ایسے حواس سلب کیے

ہوئے تھے کہ اس پر یہ نزدیکیاں بھی کچھ اچھا کچھ سچا منکشف کرنے میں ناکام رہیں۔

"تم اس رنگ میں پتا ہے کیسی لگ رہی ہو۔" حوریہ کو اب جا کے عمر کی ذہنی حالت کے ساتھ ساتھ فضا بھی ناسازگار محسوس ہوئی۔

اس نے سانس روک لی۔ عمر نہ جانے کیا کہنے والا تھا۔ یا پتا نہیں کیا کرنے والا تھا۔۔۔ فلموں میں تو ایسی صورتحال کے وقت ہیروئن کے ہاتھ کوئی گلدان' کوئی گلاس آجاتا ہے۔ مگر یہاں دونوں چیزیں پہنچ سے دور تھیں۔

"کوئی بات نہیں ناخن بڑے ہیں۔ نوچ لوں گی یا گردن دبا دوں گی۔ بھلے اکلوتا ہو۔ میری عزت سے بڑھ کر نہیں۔"

"فانٹا کی بوتل۔" اس کی تخریبی سوچ کو عمر نے یہ کہہ کر بریک لگایا۔ اسے ایک دم سے جھٹکا لگا۔ یہ سننے کی بھی امید نہیں تھی۔

"اور پتا ہے میرا دل کیا کر رہا ہے؟" عمر کی آنکھوں میں ناچتی شرارت بتا رہی تھی وہ آگے بھی کچھ جھٹکا لگانے والا ہے۔

"پی لوں۔" آنکھیں بند کر کے بڑے جذب سے اس نے کہہ کر۔۔۔ دوسرا جھٹکا بھی دے ڈالا۔ واپنی کلائی چھڑواتی عمر سے'

یوں ہی اڑتی ہوئی اپنے پورشن میں جانے سے پہلے زویا کے کمرے میں جھانک کر غرانا نہ بھولی۔

"تمہارا بھائی ایک نمبر کا غنڈہ ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ اس کے کمرے میں رات کو جانا اپنی مصیبت بلانا ہے۔" اور یہ جا وہ جا۔

"ارے سلامت تو جا رہی ہو۔" زویا نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح پریزنٹیشن سے بچنے کا طریقہ اس نے یہ نکالا کہ چھٹی کر لی اور کر کے پچھتائی کام وام کوئی خاص ہوتے نہیں تھے۔ شادو جھاڑو پونچھے کا کام دونوں پورشنز میں کرتی تھی۔ بعد ازاں امی اور شادو دونوں کی سواری ایک ساتھ عمر لوگوں کے پورشن کی طرف روانہ ہوئی۔ زویا یقیناً "کیمپس گئی ہوئی تھی' ورنہ حوریہ کی سواری بھی وہاں روانہ ہوتی۔ موبی اپنے کالج عموریت کی بوریت تھی۔

"خوامخواہ چھٹی ماری۔" رہ رہ کر پچھتاوے نے ستایا۔ دادی ٹی وی پر کوئی مارننگ شو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی کمپنی میں ٹی وی دیکھنا اپنے آپ میں ایک سردرد تھا۔ اس وقت یہ سردرد گوارہ لگا۔

"دیکھو تو منحوس کے کپڑے بادبان پہن کر آگئی۔" سردرد کا پہلا حملہ ہوا' حوریہ نے گہری سانس لے کر خود میں توانائی بھرنا چاہی۔ یہ مارننگ شوز پورے خشوع کے ساتھ دادی دیکھتیں۔۔۔ اور میزبان خواتین کے کپڑے دیکھ دیکھ کر جان بھی جلاتیں۔ کبھی میزبان "چھتری" لیٹے نظر آتی تو کبھی اس کے کپڑے ٹینٹ جتنے نظر آتے کبھی پیرا شوٹ تو کبھی اسے کسی لباس میں بدروح بنا ڈالتیں۔

"اچھا بھلا تو ہے۔" حوریہ کو کپڑوں میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔ کیا کرتی دادی والی عینک اس کے پاس تھی ہی نہیں۔

"اب ایسا سلوانے نہ چلی جانا۔۔۔ نیو کے پاس۔" دادی نے جیسے اس کا ارادہ جانچ کر حکم دیا۔ وہ بدمزا ہو کر جوں ہی اٹھی ٹیلی فون گنگنانے لگا۔ دادی نے فی الفور ٹی وی کا والیوم کم کیا کہ فون کالز کسی کی بھی ہوتیں' کوئی بھی اٹینڈ کرتا۔ دادی کان ضرور کھڑے کر لیتیں۔

"ہیلو۔۔۔" اس نے نہایت بددلی سے ریسیور کان سے لگایا تھا۔

"کمال قسمت ہے میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کاش تمہاری آواز سننے کو ملے۔" دوسری طرف رافع کی بھاری آواز گونجی تھی۔

"السلام علیکم رافع بھائی۔" اس رات بارہ بجے عمر کے ہمراہ واپس آنے کی شرمندگی تھی کہ ادب آداب

بجالائی۔

"رافع ہے۔۔۔ میری بھی بات کرانا۔" دادی کے کان ہر خاص و عام کال پر ضرور لگے ہوتے۔ ابھی بھی اس کے منہ سے رافع کا نام سن کر کھل سی گئیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ بہت شکریہ اس سلامتی بھیجنے کا ۔۔۔ ویسے میں تم سے بہت ناراض ہوں۔"

"کیوں۔۔۔" اندازہ تو تھا وہ کس بات پر ناراض ہو گا۔ پھر بھی استفسار کیا۔ ہلکی ہلکی گھبراہٹ نے بھی آلیا تھا۔

"تمہیں میرے ساتھ دو باتیں کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اور عمر کے ساتھ آدھی رات کو چلی گئیں۔۔۔ سچ ہے ان کا بڑا نام 'بڑا گھر' ہم کیا ہیں؟" وہ یقیناً "شرمندہ کر رہا تھا اور وہ واقعی شرمندہ ہوئی۔

"سوری رافع بھائی میرا یقین کریں مجھے اپنے گھر کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی میں بہت بے سکون ہو جاتی ہوں۔ یقین کریں۔"

"اپنا سمجھتیں تو ایسا کچھ فیل نہ ہوتا۔"

"اچھا۔۔۔۔ پھر کبھی آئی تو ضرور رہوں گی، سچی۔" وہ خلوص دل سے بولی۔ رافع اسے حق بجانب محسوس ہوا۔

"آئی کیا۔۔۔ ہم خود آپ کو لے جائیں گے۔۔۔ اپنی خواہش سے۔" اب کے رافع کی ٹون یکسر بدلی۔ حوریہ نے بھنویں سکوڑ کر غور کرنا چاہا کہ دادی ۔۔۔ آکھڑی ہوئیں۔

"میری بات کراؤ۔ تمہاری کتھا جانے کب ختم ہو۔"

"رافع بھائی۔۔۔ آپ دادی سے بات کر لیں۔" وہ کافی دیر سے کہہ رہی ہیں۔"

"یار میں نے۔۔۔" رافع پتا نہیں کیا کہنے لگا تھا۔ اس نے دھیان دیے بغیر ریسیور دادی کو تھمایا۔ دادی نے حسب عادت تار کو اپنی سہولت کے مطابق یہاں وہاں کر کے بڑے اہتمام سے ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا اور کئی بار کہا مگر رافع فون بند کر چکا تھا۔ ریسیور رکھ کر انہوں نے کال کٹنے کا جرم حوریہ پر عائد کر کے ایک گھنٹے تک وکھڑا رویا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج "بڑے گھر" میں خوب چہل پہل تھی۔ (تایا لوگوں کے لیے وہ بھی طنزاً "بڑے" کی اصطلاح استعمال کرتی تھی۔ بڑے لوگ، بڑا گھر، بڑا نام) اپنے لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے جی مچلنے لگا۔

"دیکھوں تو سہی کیا قصہ ہے؟" امی اور دادی کسی دھواں دھار بحث میں الجھی تھیں۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ وہ انہیں ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑتی، چپل اڑستی بڑے گھر کی طرف بھاگی۔ وہاں واقعی الگ سماں تھا۔

"ہائے۔۔۔ میں صدقے۔" بڑی آپا اس پر نظر پڑتے ہی چہکیں۔ اس نے آنکھیں سکوڑ لیں۔ یوں تو آٹھ بہنوں پر مشتمل یہ شادی شدہ پلٹن جب جب میکے آتی رونق ہو جاتی۔ شادی کے فنکشن کا گمان ہونے لگتا۔ مگر اس وقت کی خاص بات سب نے تیاری بھی یوں کر رکھی تھی گویا شادی پر آئی ہوں یا جا رہی ہوں اور سب کے بچے بھی ساتھ تھے۔۔۔۔ بڑی آپا کی شادی شدہ بیٹی اپنی نومولود بچی کے ساتھ تو چھوٹی آپا کا شادی شدہ بیٹا اپنی نوخیز دلہن کے ساتھ موجود تھا۔ عمر کی بڑی آپاؤں کے بچے عمر سے بڑے یا اس جتنے تھے۔

"کیا ہوا۔۔۔ پہچانے نہیں جا رہے؟" چھوٹی آپا بالکل دلہن لگ رہی تھیں۔ پہلے کہا پھر آکر اسے بھینچ بھی لیا، وہ کہاں تیار تھی اس التفات کے لیے بری طرح سے بوکھلا گئی۔ پھر تو جیسے دوڑ لگ گئی کسی نے چوما کسی نے گلے لگایا۔۔۔ کسی نے بلائیں لیں۔ محبت کی اس افراط نے حوریہ کو بدحواس کر دیا۔ آخر میں تائی اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں۔ سجی سنوری اور خوامخواہ کھلکھلاتی۔

"ارے میری حورا آئی ہے۔" اس پر نظر پڑنے کی دیر تھی۔ بڑی آپا سے بھی زیادہ زوردار نعرہ لگایا۔ اور آ کر اس سے لپٹ گئیں تائی امی ہمیشہ بہت پیار سے ہی ملتی تھیں۔ مگر آج کا اظہار شفقت کسی اور نوعیت کا

تھا۔ حوریہ کی سراسیمگی دوچند ہو گئی۔ تائی نے تا دیر اسے لپٹائے رکھا۔ پھر الگ ہوئیں تو چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر نم آنکھوں کے ساتھ اس پیار و محبت سے دیکھتی رہیں کہ کیا ہی کبھی امی نے اسے دیکھا ہو گا۔ آخری مظاہرہ تائی نے اس کے ماتھے پر بہت لمبا چوڑا بوسہ لینے کا کیا۔ وہ بے ساختہ جھینپی کہ سب کی توجہ اس پر تھی۔ تائی کی لپ اسٹک اس کی پیشانی سے عمر کی بھانجی وریا نے صاف کی۔

"بس۔۔۔؟" عمر کے ہم عمر بھانجے شازیہ نے شریر سوالیہ نظریں حاضرین پر ڈالیں۔

"پوری نفری نے اس پریڈ میں حصہ لیا یا کوئی باقی ہے؟"

"زویا۔" ماہا بجو نے اعلانیہ بتایا۔

"عمر بھی۔" شادی شدہ بھانجے معید نے شارب کو دیکھ کر نا صرف آنکھ ماری بلکہ حوریہ کو دیکھ کر قہقہہ بھی لگایا حوریہ کو بات کی تفصیل تو کیا خلاصہ بھی نہیں پتا تھا۔ مگر پھر بھی معید کو آنکھ مارتے دیکھ کر وہ بری طرح سے سرخ پڑ گئی۔

"میں زویا سے مل لوں۔" بہتر سمجھا یہاں سے غائب ہوا جائے۔ کچن میں جانے لگی بڑی آپا نے پیار سے مطلع کیا وہ بھی ہنستے ہوئے۔

"زویا اپنے کمرے میں ہے۔" وہ جی ہی جی میں سب کے کریک ہو جانے پر دہلتی زویا کے کمرے میں آئی۔ وہاں وہ بھی اپنا نیا جدید تراش خراش کا سوٹ پہنے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

"اخاہ۔۔۔ آپ آگئیں۔" زویا نے بھی باقی نفری کی پیروی کی۔ یعنی فرط جوش سے اس کو گلے لگا لیا۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ بے طرح جھنجلائی۔ زویا قہقہہ لگاتی پھر سے آئینے میں گم ہوئی۔

"سب کے سب پاگل ہو گئے ہیں۔" یہاں تک حوریہ ناگواری سے بڑبڑائی۔

"کہیں جا رہے ہو؟ شادی وادی پہ؟"

"نہیں ہم تو آ رہے ہیں۔" زویا نے ترت کہا اور گڑبڑائی بھی۔

"آ رہے ہیں کیا مطلب؟" حوریہ کو لگا ابھی وہ بھی پاگل ہو جائے گی۔

"مطلب۔۔۔ ہم اپنے اکلوتے لاڈلے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں۔" زویا نے جیسے سب کے پاگل پن کی وجہ بتا دی جو حوریہ کو کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا کے مصداق لگی۔ سب کے تیور اور پیار دیکھ کر لگ تو ایسے رہا تھا جیسے کارنامہ اس سے سرزد ہوا ہو اور یہاں اصل ہیرو عمر صاحب نکلے۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ کاکا جوان ہو گیا۔ ویسے کس کی قسمت پھوٹ رہی ہے۔"

"ساتھ آکر دیکھ لو۔ ہم بس روانہ ہونے والے ہیں۔" زویا بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

"کیوں۔۔۔ لڑکی ڈھونڈتے وقت ساتھ لے گئی تھیں جو اب شہیدوں میں نام لکھوا رہی ہو؟" نا چاہتے ہوئے بھی شکوہ کو ہوئی زویا جی کھول کر ہنسی تھی۔

"میری جان لڑکی بھی بھائی نے خود ڈھونڈی، خود پسند کی۔۔۔ ہمیں مارچ پاسٹ نہیں کرنا پڑا۔"

"ہا۔۔۔" اس کا منہ کھل گیا۔

"تو بہنوں کے اکلوتے بھائی نے خود سے لڑکی پسند کر لی؟ تم لوگوں کو اہمیت ہی نہیں دی؟ بہنوں کے کئی ارمان، کوئی خواب ہوتے ہیں۔ میں تو موبی کو ایسا کبھی نہ کرنے دوں۔"

"بھائی کی زندگی کا فیصلہ ہے۔ ہم کیوں روڑے اٹکائیں اور شکر ہے انہیں وہ لڑکی پسند آئی۔ جسے ہم سب بھابھی کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔۔۔۔ یعنی ہمارے ارمانوں اور خوابوں کا جنازہ نہیں نکلا۔" حوریہ منہ بنا کر سنتی رہی۔ اس کے دماغ میں عمر کی راشدہ سے ہوئی باتیں گونج رہی تھیں۔

"پتا نہیں کس بے چاری پہ برا وقت آیا ہے۔" زویا کے دانت پھر سے نکلنے لگے۔

"ویسے تمہارے بھائی کے ساتھ جچتی رخشی ہے۔"

"تمہارے منہ میں خاک۔ دفع دور۔" زویا نے کس کے حوریہ کو جھانپڑ لگایا۔

"میرے بھائی نے ـــــ ایسے بھی گناہ نہیں کیے وہ جبکہ تم موبی کے لیے مانگ لیتا۔ تین چار سال بعد موبی اس کے جتنا لگنے لگے گا۔" اور قبل اس کے کہ وہ زویا کو منہ توڑ جواب دیتی باہر سے آوازیں پڑنے لگیں۔

"زونی۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔ باہر نکلو دونوں۔"

"میں جاتی ہوں۔ تم لوگوں کو دیر ہو رہی ہے۔" زویا کے باہر نکلنے سے پہلے وہ تیز قدم اٹھاتی باہر چلی گئی۔ زویا رکنے پر اصرار کرتی پیچھے پیچھے تھی۔ باتوں نے بھی بہت روکا وہ قطعیت سے انکار کرتی اپنے پورشن کی طرف آگئی۔

☼ ☼ ☼

اور اس وقت اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب یہی تجی سنوری پلٹن اس کے فوراً" بعد ان کے پورشن میں پہنچی بالکل گھر والی کر مجوشی کا مظاہرہ یہاں بھی کیا گیا۔ حوریہ سے تائی اور ـــــــــــ نواسیاں یوں بھنچ بھنچ کر گلے ملیں کہ اسے ہڈیوں کے چٹخنے کا یقین آگیا۔ بڑا سا رالاؤنج اس فوج کے آجانے سے چھوٹا پڑ رہا تھا۔ بڑی فرصت سے تائی ' بیٹیاں ' نواسے نواسیاں جہاں جگہ ملی بیٹھ گئیں۔ جیسے یہیں تو آنا ہو۔

"کہیں یہ۔۔۔!" حوریہ کی سوچ کا دائرہ قدرے وسیع ہوا اور اتنا ہوا کہ اسے چکر سے آنے لگے۔

"عمر کے لیے مجھے 'عمر نے مجھے 'عمر کی پسند۔" ایک دم سے دماغ پر ہتھوڑے برسے۔ وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا ' شرم آرہی ہے۔" زویا ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ شوخی سے پوچھا تو ہنسی کے فوارے گونج اٹھے۔

"ہا اپنوں سے کیسی شرم بیٹھو بیٹھو 'نئی بات نہیں کرنے آئے ہم۔" صائمہ باجی نے مصنوعی منہ پھلا کر کہا اور زویا نے بازو سے کھینچ کر دوبارہ بٹھا بھی دیا۔

"ارے پہیلیاں ہی بوجھواؤ گے یا بتاؤ گے بھی ـــــ یہ منہ کیوں لٹکے ہوئے تم لوگوں نے ؟" دادی کو اشارے سمجھ تو آرہے تھے پھر بھی سنوالیا کہ رشتہ مانگنے کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔

"بڑھاپے میں چونچلے سوجھ گئے۔" بڑی بہو سرخ لپ اسٹک میں پیاری بھی بہت لگ رہی تھیں۔ دل میں نظر اتاری پر اوپر سے منہ بگاڑا تائی خوشی سے بے حال ان کے گلے آلگیں۔

اماں اکلوتے بیٹے کا رشتہ طے کرنے آئی ہوں۔ مت پوچھیے کتنی خوش ہوں۔" جواب میں دادی نے بھی جاندار قہقہہ لگا کر خوشی میں حصہ ڈالا اور حوریہ کا تو جیسے دل دماغ سب شل ہو گیا۔ کیا ہونے جا رہا تھا اس کے ساتھ یہ سوچ بھی دھڑام ہوئی کہ فی الحال دماغ پر وائرس حملہ کر چکا تھا وہ بھی عمر نام کا۔

"نہ تو میں دامن پھیلاؤں گی نہ کوئی تمہید باندھوں گی۔" تائی دادی کے پاس سے اٹھ کر بولتی ہوئی حوریہ کے قریب جانے لگیں۔ زویا اور ویرا ایک طرف ہو گئیں۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ میرے عمر کے لیے بنی ہے۔۔۔ اس لیے میرے ہی گھر آئے گی۔۔۔ کسی نے اعتراض نہیں کرنا۔" تائی نے زرتار سرخ دوپٹہ کھول کر حوریہ کے اوپر ڈال دیا۔ وہ بے حس و حرکت جیسے بیٹھی تھی بیٹھی رہی۔ گویا بے جان ہو۔

"ارے عالمگیر کو تو آنے دو۔" دادی چیخیں۔

"ابو آئے بیٹھے ہیں۔ میں ابھی لے آتا ہوں انہیں۔" موبی کی خوشی کا عالم ہی اور تھا۔ قلانچ مار کے ابو کے اسٹڈی روم تک پہنچا کچھ دیر کے بعد ان کی وہیل چیئر گھسیٹ لا رہا تھا ابو کی ٹانگیں گزشتہ تین سالوں سے بے جان تھیں۔ انہیں فالج کے بعد آدھے دھڑ سے معذوری ملی تھی۔

"ہو کیا رہا ہے یہاں ؟" حوریہ نے باپ کی خوشگوار آواز پر بھی سر نہیں اٹھایا۔

"ابو لگ تو یوں رہا ہے جیسے فلم کا سین ہو۔ تائی رشتہ مانگنے نہیں اغوا کرنے آئی ہیں۔" خود موبی بے یقین ہو رہا تھا۔

"کیونکہ مجھے یقین تھا مجھے انکار نہیں ہو گا۔" تائی

نے بڑا سا لڈو ابو کے منہ میں ڈال دیا۔

"عالمگیر کیا تم میرا مان توڑ سکتے ہو؟"

"بالکل بھی نہیں بھابھی ـــــ حوریہ آپ کی بیٹی ہے۔ میری تو خوش قسمتی کہ میری بیٹی کے نصیب اتنے اچھے ہیں۔ عمر سے بڑھ کر پیارا اور کون ہو گا۔" فرط مسرت سے ابو کی آواز رندھ گئی۔ موبی بے ساختہ ان سے لپٹ گیا۔

"بس تو پھر بے فکر رہیے 'حوریہ میرے لیے میری بیٹیوں سے بڑھ کر ہے۔"

"اصل بیٹی ہی یہی ہے۔ اپنی تو پرائی تھیں۔" ایک بالکل غیر روایتی طریقے سے رشتہ طے کر لینے کے بعد روایتی باتیں دلاسے دیے جانے لگے۔ حوریہ نے سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ ان چمکتے چہروں میں اس کے امی ابو ' موبی اور دادی کے چہروں کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ سب یوں خوش تھے جیسے اس رشتے کے انتظار میں ہی بیٹھے ہوں۔

"عمر بھائی خود کیوں نہیں آئے ؟" موبی کو اس کی غیر حاضری شدت سے محسوس ہوئی۔

"شرما رہا تھا مشرقی بیٹا ہے نا۔" شارب کے کہنے پر ابو بھی مسکرا دیے۔

"بدتمیز۔" بڑی آپا نے بیٹے کو چپت رسید کی۔

"کہیں جانا تھا اس نے ہمیں البتہ آج کے دن کے لیے پابند کر گیا تھا کہ لازمی جانا حوریہ کو مانگنے۔" بڑی آپا خوشی خوشی بتا رہی تھیں۔ امی کی بھی بات بے بات ہنسی پھوٹ رہی تھی۔ حوریہ کا اچانک سے دم گھٹنے لگا کسی فلم کے سین کی طرح طے ہونے والا یہ رشتہ اس کا دماغ بند کر گیا تھا۔ کچھ دیر اور وہاں بیٹھتی تو یا زور زور سے رونے لگتی یا سب پر چیختی اور چونکہ فی الحال ایسا ٹھیک نہیں تھا۔ سو وہ سرخ دوپٹہ اتارتی سب کے بیچ سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی۔

"شرما گئی۔" دادی نے وہی کہا جو کسی فلم کے سین میں ہیروئن کے اٹھ جانے پہ کہا جاتا۔ اس کے دل کی حالت سے بے خبر یہ محفل کافی دیر تک جمی رہی۔

☼ ☼ ☼

پہلے اس ڈر سے کہ باہر کوئی سن نہ لے۔ وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔ پھر جب زویا اور ویرا جانے سے پہلے اس کا دروازہ بجا کر ملنے آئیں اور جواب نہ پا کر واپس چلی گئیں۔ تب اس نے مچل مچل کر رونا شروع کر دیا۔ رہ رہ کر اپنی بے بسی اور امی ابو کی جلد بازی پر تاؤ آرہا تھا۔ کیا وہ اتنی غیر اہم تھی یا عمر اتنا اعلا درجے پر فائز کہ سوچنا سمجھنا بھی ضروری نہ سمجھا گیا۔ جیسا تائی نے چاہا ویسا ہونے دیا گیا۔ بھلے عمر کتنا بھی اعلا ہو۔۔۔ اس سے پوچھ کر فیصلہ کرنا والدین کا فرض بنتا تھا۔ ساری زندگی لاڈ اٹھانے والے زندگی کے اس موڑ پر آکر کیوں دھوکا دہی کے مرتکب ہوئے۔ کیوں عمر کو غیبی رشتہ سمجھ کر اہمیت دی گئی کہ بیٹی بھی بھول گئی۔ اس کی کوئی مرضی 'کوئی پسند کوئی خواہش نہیں تھی ؟ یا وہ بھی عمر پر فدا تھی کہ ماں باپ نے پوچھنا بھی گوارا نہ کیا باقاعدہ زور زور سے روتی ایک طرح سے وہ ماتم کرتی رہی۔ عمر اس کے نزدیک کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر وہ عمر کو اتنا قریبی رشتہ کیسے بنا لیتی ؟ یہی سوچتے' روتے اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔ اور تب کھلی جب امی دروازہ بجا کر کھانے کے لیے بلا رہی تھیں۔

"حورا باہر آؤ۔ سب نے کھانا کھا لیا تم نے آج فاقہ کرنا ہے ؟" وہ کسلمندی سے اٹھی کچھ دیر دماغ کو حاضر کرنے میں لگی۔

"میں کھالوں گی۔" دل تو نہیں چاہ رہا تھا جواب دے لیکن دے دیا۔ امی وہاں سے چلی گئی تھیں کہ پھر ان کی پکار نہیں ابھری سر اور آنکھیں حد سے زیادہ بھاری ہو رہے تھے۔

"اتنی آسانی سے تو نہیں ہونے دوں گی یہ سب۔" دونوں کنپٹیاں سہلاتے وہ سوچ گئی کیا کرنا ہے۔ پھر ایک خیال آنے کی دیر تھی۔ فوراً" بستر سے نیچے اتری چپل پہنی اور باہر نکل آئی حلیہ ایسا ہو رہا تھا جیسے دنگل لڑ آئی ہو بکھرے بال جنہیں اس نے ابھی سمیٹا اور لال سوجی آنکھیں غیر ارادتاً" کچن میں جھانکا جہاں مٹھائی کے ٹوکرے اور ڈبے موجود تھے اور موبی ان کو حفاظتی زون میں رکھ رہا تھا۔

"آئیں بجو۔۔۔ آج تو آپ کو ان پہ اپنے نام کا ٹیگ لگانے کی ضرورت نہیں۔ سب کے سب آپ کے ہیں۔" وہ بہت خوش تھا یقیناً۔ عمر اس کے لیے کزن سے زیادہ بڑے بھائی جیسا تھا اور اب یہ رشتہ مزید مستحکم ہونے لگا تھا۔

"مجھے نہیں چاہیے۔" اس کی آنکھوں میں پھر سے آنسو چھلکنے لگے تھے۔ جنہیں اندر دھکیلتی وہ بڑے گھر یعنی تایا کے پورشن کی طرف روانہ ہوئی۔

☼ ☼ ☼

تائی کے یہاں ابھی بھی خوشی کا ماحول جوبن پر تھا۔ بڑی پلٹن شاید اندر کسی کے کمرے میں محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ لاؤنج میں زویا 'ویرا' مناہل وغیرہ کو دیکھ کر وہ قدرے سٹپٹا سی گئی۔

اس کو دیکھ کر ان کی چہچہاہٹ میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ آئی جس عزم سے تھی۔ وہ زویا کی زبان سے "حوریہ بھابھی" تو باقیوں کی زبانی ماہی کا لفظ سن کر بری طرح سے ڈگمگا گیا۔

"ہم یہی کہہ رہے تھے۔ حوریہ بھابھی سے اکیلا نہیں بیٹھا جائے گا وہاں۔" حوریہ کی سٹی چند سیکنڈز تک تو بالکل گم رہی۔

"نہیں۔۔۔ وہ میں۔" پھر یہ سوچ کر کہ ابھی آر یا پار کر کے لازمی جانا ہے۔ اس نے کہنے کی ٹھانی۔

"عمر ہے؟"

"او۔۔۔ و۔۔۔ و۔" سب کی سب مزے سے گنگنائیں حوریہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ اندازہ ہوا اب پہلے کی طرح عمر عمر کرتی اس کے کمرے میں جانے والی بات ختم ہو گئی تھی۔ بھلے اس کا دل اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھا پر باقی سب کے لیے نئی بات ہو گئی تھی۔

"ماموں بالکل ابھی ابھی آئے ہیں۔ جا کر دیکھو سو نہ گئے ہوں۔" مناہل کے تاثرات معنی خیز ہو رہے تھے۔ وہ نظر انداز کرتی عمر کے کمرے تک آئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ بغیر دستک دیے حسب عادت اندر داخل ہوئی۔ عمر کپڑے بدلے سونے کے چکروں میں تھا۔ اس پر نظر پڑی تو بے ساختہ ٹھٹک گیا۔ حلیے دونوں کے مختلف نہیں تھے۔ بس یہ تھا عمر کی تھکن پر سکون و اطمینان غالب تھا۔ اور وہ بے سکون و اجڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ عمر کو اندازہ تھا رد عمل کچھ ایسا دیکھنے کو ملے گا۔ سو نہایت اطمینان سے اس کو دیکھے گیا۔ جس کی آنکھیں کچھ زیادہ جان لیوا ہو رہی تھیں عمر کو خود پہ قابو رکھنا مشکل لگنے لگا۔

"تم نے کس کی اجازت سے تائی لوگوں کو ہمارے گھر بھیجا؟" طیش و صدمے کا یہ عالم تھا کہ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آنکھیں الگ نم ہو گئیں۔

"اپنے دل کی۔" عمر نے بہت دھیمی نرم آواز میں جواب دیا وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پینے کی کوشش میں ہلکان ہو گئی۔

"کیوں۔۔۔ تم جانتے ہو میں تمہیں سخت ناپسند کرتی ہوں۔" وہ ہلکا سا چیخی عمر کا اطمینان جان جلا گیا تھا۔

"مگر میں جو تمہیں پسند کرتا ہوں۔"

"بھاڑ میں گئی تمہاری پسند۔" وہ چیخی۔

"جب تم جانتے ہو میں تمہیں ایز آ کزن برداشت نہیں کر سکتی تو شوہر کیسے مانوں گی تم نے کیوں کی یہ جرات؟"

"تم مجھے خود غرض سمجھ لو۔" عمر کا بس نہیں چلا اس کے گالوں پر پھیلتے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لے۔ مگر کیا کرتا کہ فی الحال یہی بس اپنے بس میں نہیں تھا۔

"تم اس رشتے سے انکار کر دو۔ تائی کو منع کر دو۔" وہ آنسو پونچھتی انگلی اٹھا کر قطعی لہجے میں بولی۔

"میں کیوں کروں؟" عمر نے آنکھیں سکوڑ لیں۔

"میں نے اپنی پسند سے رشتہ بھیجا ہے۔ میں کیوں انکار کروں؟"

"تمہارے نزدیک صرف اپنی پسند اہم ہے۔ یہ نہیں کہ میں تم کو ناپسند کرتی ہوں۔" وہ دبی دبی آواز میں چیخی تھی۔

"کہا نا۔۔۔ تم مجھے خود غرض سمجھ لو۔" عمر نے ان جالیوا آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا۔ جن میں یہ سننے کے بعد شعلے سے لپکنے لگے تھے۔

"وہ تو تم ہو۔۔۔ تم ہو خود غرض 'غاصب' منافق' اپنے فائدے کے لیے اپنوں کا خون چوسنے والے۔" ایک دم سے وہ بھڑکی تھی۔

"تم نے خود کیوں نہیں انکار کر دیا؟ کوئی جبر کر رہا تھا تم پر؟ کر دیتیں انکار حق تھا تمہارا۔"

"تمہاری ماں نے ایسی مہلت دی ہوتی تو کرتی نا۔ ہو نا سب کے سب ایک جیسے۔۔۔ اپنی منوانے والے' کم تر کو روندنے والے۔۔۔ dominated' جان بوجھ کر ہم سے رشتہ جوڑا۔ ساری زندگی دبا کر رکھنے کے لیے۔۔۔ حکم چلانے کے لیے۔" عمر نے روکا نہیں۔ وہ بولنے پہ آئی تو کیا کچھ نہیں بول گئی۔ عمر ہونٹ بھینچے بغور اسے دیکھتا اور سنتا رہا۔ نہ نظروں میں تاسف ابھرا' نہ خشونت نہ رعونت۔ بلکہ محبت بھرا نرم تاثر مزید بڑھ گیا۔ دل کر رہا تھا خود سے لگا کر اس کے سارے گلے' شکوے' طعنے' وہم اپنے اندر سمو لے اور اس کو سکون و محبت سے مالا مال کر دے۔ مگر ضبط کیے کھڑا رہا کہ یہ چنگاری کو مزید ہوا دینے کا باعث ہوتا۔

"مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔۔۔ میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔" کچھ توقف کے بعد لمبی لمبی سانس لے کر خود پر قابو پاتے ہوئے یہ کہا اور جانے کے لیے مڑی۔

"اپنے انکار کی کوئی سولڈ وجہ بھی بتانا سننے والوں کو مجھے لولا' لنگڑا' اندھا کانا کچھ بھی ثابت ضرور کرنا۔" عمر نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"تم چاہے آب زم زم سے بھی دھل آؤ۔ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔" چبا چبا کر کہتی وہ زور سے دروازہ بند کرتی چلی گئی۔ عمر کو یہ اشارہ دے کر اسے ناپسند کرنے کی کوئی وجہ ہونا لازمی نہیں تھا۔ وہ اسے خوبیوں سمیت ریجیکٹ کر رہی تھی۔

"چلو۔۔۔" اس کے جانے کے کافی دیر بعد عمر نے جنبش کی۔

"تم اپنی نفرت کے ہتھیار تیز کرو میں اپنی محبت کے۔۔۔ دیکھتے ہیں جیت کس کی ہوتی ہے؟" وہ پر اعتماد تھا۔ سو بے فکر سا بیڈ پر گر گیا۔ جو خواب دیکھتے تھے ان کا تو ابھی ابھی حوریہ بھر کس نکال گئی تھی۔ فی الحال نیند آ جاتی غنیمت تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن عمر کے منع کرنے کے باوجود وہ کالج میں تھی۔ عمر نے موبی کے ذریعے کہلوایا تھا کہ کالج جانے کی ضرورت نہیں۔ ایگزام قریب ہے تو پڑھائی نہیں ہو رہی۔ وہ خود سارے مضامین کے سلیبس اور ڈیٹ شیٹ اس کے لیے لے لے گا۔ مگر وہ عمر کی بات پر کان دھر لے ممکن ہی نہیں تھا۔ عمر کو اچھی خاصی جھنجھلاہٹ ہوئی تھی اسے کالج دیکھ کر گنے چنے اسٹوڈنٹس آئے تھے۔ گویا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا آنے کا بلکہ اپنی ضد سے عمر کو نیچا دکھانے کا منصوبہ بھی چوپٹ ہو کر رہ گیا۔ جب اکثر اسٹوڈنٹس واپس جاتے نظر آئے۔

"یار ہم بھی چلتے ہیں۔ دیکھو سب جا رہے ہیں۔" وہ چاروں بی بلاک کی عمارت میں موجود تھیں۔

"ہاں واقعی چلتے ہیں۔" نصرت نے بھی ہاں میں ہاں ملائی مگر راشدہ متامل تھی۔

"ہم تو چلے جائیں۔ مگر یہ ایشوریا کی آنکھوں والی کس کے ساتھ جائے گی۔" ایشوریا کی آنکھوں والی حوریہ کالج میں مشہور کی جا چکی تھی۔ راشدہ کی بات پہ اسے بھی پریشانی لاحق ہو گئی۔

"میں نے تو موبی کو ایک بجے کا ٹائم دیا تھا۔" وہ اچھی خاصی روہانسی ہوئی۔

"بس تو ڈھائی گھنٹے بابو کا لیکچر سننا۔" رخشی کالج کے ملازموں کا کہہ رہی تھی۔ حوریہ کی شکل پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ تینوں ایک ساتھ رکشا میں آتی جاتی تھیں۔ اس کا گھر مخالف سمت میں تھا۔

"ایسا کیا مسئلہ ہے۔ تم بھی رکشا کرو اور چلی جاؤ۔"

رخشی نے چٹکی میں حل بتایا۔
"اکیلی؟" حوریہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔
"تو کھا نہیں جائے گا رکشے والا تمہیں۔ اکیلی لڑکیاں کہاں کہاں کا سفر نہیں کرتیں اور یہ کالج سے گھر تک نہیں جا سکتی۔" رخشی منٹوں میں طبیعت صاف کر دیتی تھی۔
"ہر کوئی تمہاری طرح سورما نہیں ہوتا۔" راشدہ نے بھی حساب برابر کر دیا۔
"بس تو پھر انتظار کرے بھائی کا۔" رخشی برا مان گئی

"میں اکیلی کیسے...؟" حوریہ کی جان پر بن گئی۔
"اچھا ایسا کرتے ہیں کسی سر سے کہتے ہیں۔ فون کرنے کا تم موبی کو بلوالو۔" نصرت کا مشورہ برا نہیں تھا۔ وہ فوراً" مان گئی۔ اس نے اور نصرت نے نقاب ٹھیک کیا اور چاروں اپنی عمارت کی طرف واپس آ گئیں۔
"پرنسپل روم تو لاک ہے۔" حوریہ کی فکر میں اضافہ ہو گیا۔
"اسٹاف روم تو کھلا ہے۔" چاروں تیز قدم اٹھاتی ادھر چل دیں اور قبل اس کے کہ خود اندر جاتیں۔ عمر اچانک ہی باہر آگیا۔ اچٹتی نظر حوریہ پر ڈال کر وہ جانے ہی لگا تھا کہ راشدہ نے پکارا۔
"سر... سر پلیز۔" حوریہ سرتاپا سلگ گئی۔ گمان بھی نہیں تھا عمر بیٹھا ہوگا اور راشدہ مدد بھی اس سے مانگے گی۔ وہ خوامخواہ نیچے دیکھنے لگی۔
"سر آپ کے پاس سیل فون ہے؟"
"جی ہے۔" عمر کچھ کچھ سمجھ رہا تھا کیا معاملہ ہے۔
"سر یہ Ten مسئلہ بنی ہوئی ہے۔" راشدہ نے حسب عادت اپنے رنگ سے بات شروع کی۔
"Ten" واقعی مسئلہ بنی ہوئی ہے۔" عمر کے دل نے چپکے سے راشدہ کے کہے کی تائید کی۔
"سر اس نے بھائی کو بلوانا ہے۔ تو آپ اس کے بھائی کو فون کر دیں کہ وہ آجائے ابھی کیونکہ ہم سب بھی جا رہے ہیں۔" عمر نے بے ساختہ کچھ جھلاتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی بھی نیچے کہیں دیکھ رہی تھی۔ آج یہی حال ہونا ہے عمر کو یقین تھا۔ اس وقت وہ شخص اس کی خاطر رکا ہوا تھا کہ سہیلیوں کے چلے جانے کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کر لے گا۔ یہ موبی کو فون کرنے کی بیچ کی راہ دماغ میں نہیں آئی تھی۔
عمر سے بات کر لینے کے بعد وہ چاروں اپنے کلاس روم میں آکر بیٹھ گئیں۔ جب تک موبی آنہ جاتا ان تینوں نے بھی نہیں جانا تھا۔
"ارے۔" دفعتاً" رخشی بولی۔
"تم نے سر عمر کو موبی کا نمبر تو بتایا ہی نہیں۔" رخشی نے وہ سرا پکڑا تھا جس کی طرف حوریہ تو کیا نصرت اور راشدہ کا بھی دھیان نہیں گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو حوریہ چپ سی رہ گئی۔
"نہیں... میں نے بتایا۔" پھر تھوک نگل کر کمزور لہجے میں کہنا چاہا۔ پر وہ رخشی ہی کیا جو مان جائے۔
"تم نے نہیں بتایا پاگل۔" رخشی بال کی کھال نکالنے میں ماہر تھی۔
"ہے نا نصرت۔" ساتھ ہی اس نے نصرت سے بھی تائید چاہی۔ جو اثبات میں سر ہلانے لگی تھی۔
"چلو جلدی... پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ سارا کالج خالی ہو گیا۔ ایک ہم بیٹھے ہیں۔" رخشی کے پیچھے وہ سب بھی کلاس سے باہر نکلیں۔ حور مرے مرے قدم اٹھا رہی تھی۔ موبی کا نمبر اسے تو کیا اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا۔ چاروں اسٹاف روم کے دروازے پہ آکھڑی ہوئیں۔ اندر عمر بالکل "ویلا" بیٹھا تھا۔
"سر۔" راشدہ کے پکارنے میں بھی اک ادا تھی۔ عمر مسکراہٹ چھپاتا ان کے پاس آیا۔
"سر یہ ٹین مسئلہ بنی ہوئی ہے۔" پہلے چکروالا جملہ راشدہ نے کراہ کر دوہرایا۔ عمر نے بے ساختہ مسکرا کر نظریں "ٹین" پر اٹھائیں۔ وہ حسب سابق جوتے دیکھنے میں لگی تھی۔
"کیا ہوا؟" وہ دانستہ اسے دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ گہری سانس لیتا وہ راشدہ سے مخاطب ہوا۔
"سر اس نے بھائی کا نمبر تو آپ کو بتایا ہی نہیں تھا۔" عمر کی مسکراہٹ ایک بار پھر عود آئی۔
"اب جلدی لکھواؤ بھی۔" راشدہ نے اسے ٹہوکا مارا اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ دزدیدہ نظروں سے عمر کو دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں کہ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"ایسا کریں... آپ خود اپنے بھائی کو فون کر لیں۔" عمر نے سیل نکال کر حوریہ کی طرف بڑھایا۔ ایک بڑی پریشانی ٹلی تھی۔ اس نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے موبائل پکڑا محب کا نمبر Save تھا۔ اسے آنے کا کہہ کر اس نے موبائل عمر کو تھمایا اور رخ موڑ کر جانے کا قصد کیا ہی تھا کہ راشدہ نے ہاتھ سے پکڑ کر روکا۔
"شکریہ تو کہو۔" عمر کی آنکھوں کا نرم تاثر گہرا ہو گیا۔ اس کی طرف بنا دیکھے حوریہ نے تھینکس کہا تھا۔ عمر کوئی بات نہیں کہتا ان کے سامنے سے ہٹ گیا۔ مگر موبی کے آنے تک اسے یہیں ٹھہرنا تھا اس کا یقین حوریہ کو بھی تھا۔
"ویسے حور... سر عمر کی شکل تمہارے بھائی سے بہت ملتی ہے۔" موبی جب پہنچا رخشی نے عجیب سے انداز میں یہ کہہ کر اس کی سانس اٹکا دی۔ وہ جلدی جلدی اللہ حافظ کہتی موبی کے پیچھے بائیک پہ جا بیٹھی۔ رخشی نے بڑے غور سے دیکھا عمر کی گاڑی ان کی بائیک کے پیچھے اسٹارٹ ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بس۔" یوں تو دستگیر چچا جب سے آئے بیٹھے تھے مسلسل زبانی تیر چلا رہے تھے۔ مگر اب کے اس یک لفظی دھاڑ میں ایسا شعلہ اگلا کہ ابو، امی اور دادی تو اس کی لپیٹ میں آئے ہی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ سین ملاحظہ کرتی وہ بھی جل کر بھسم ہو گئی۔
"بس کر دیں اپنا دو غلاپن چھوڑ دیں یہ اداکاریاں۔ بہت بہل گیا میں آپ کے ان چکنے چپڑے ہتھکنڈوں سے اب ختم ہو گئی ہے میرے ضبط کی حد... سامنے سے وار کریں، پیٹھ پیچھے چھرا گھونپنے کی عادت ختم کر دیں۔" دستگیر چچا کا لب و لہجہ اس قدر گستاخانہ تھا کہ وہاں موجود سبھی نفوس کے دلوں کو ٹھیس پہنچی۔
"تم کیا کہہ رہے ہو دستگیر۔" دادی کا گلا رندھ گیا۔ نامعلوم وہ کیسے برداشت کیے بیٹھی تھیں۔ حوریہ کو توپکا یقین تھا اب کے تب ان کے حواس ساتھ ضرور چھوڑیں گے۔
"میں کیا کہہ رہا ہوں یا کیا کہتا رہا ہوں۔ آپ نے سچے دل سے سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو اس وقت یہ نوبت نہ آتی۔ میں آپ کے سامنے بیٹھا آپ کی زیادتیوں کے قصے نہ سنا رہا ہوتا۔" دستگیر چچا کی زبان یوں بھی خیر کے کلمے کم ہی پڑھا کرتی تھی۔ مگر آج تو حد عبور ہو رہی تھی۔ سرشام جب وہ یاسمین چچی کو سنگ لیے گھر میں داخل ہوئے... دادی سے سر کی مالش کرواتی حوریہ ان کے دیکھتے ہی کھٹک گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک چچا ایک ہی پہاڑہ پڑھے جا رہے تھے۔ چچی اپنی زبان شاید ان کو گھر سے دے کر آئی تھیں۔ نا صرف چپ تھیں بلکہ سارا زور آنکھیں میچ میچ کر آنسو نکالنے پر لگ رہا تھا۔
"گھر سے تو مجھے پہلے ہی دفعان کر چکے تھے... اب رشتوں سے بھی دور کر لیا؟"
"آپ کو کسی نے گھر سے نہیں نکالا تھا دستگیر بھائی۔ آپ اپنی مرضی و خوشی سے الگ ہوئے تھے۔" یقیناً" ابو نے نہایت کوشش کے بعد تلخی چھپا کر احتراماً" جو سچ تھا وہ کہا... مگر سچ بھی کبھی برداشت ہوا ہے۔
"مجبور ہو کر الگ ہوئے تھے۔ ماں باپ کی توجہ نہ بھائیوں بھابھیوں کا پیار... اپنا ہوتے ہوئے بھی غیروں جیسا، سوتیلوں جیسا رویہ رکھا گیا۔ میں اور میری بیوی علیحدہ رہ سکتے تھے مگر بچے نہیں صرف ان کی وجہ سے یہ انتہائی قدم اٹھایا کہ چلو دوری اہمیت بڑھا دے گی پر یہاں پر تو شکرانے پڑھے گئے... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں دودھ کی مکھی سمجھ کر نکال دیا گیا۔" دستگیر چچا کے الفاظ نہیں چنگاریاں تھیں۔ جو آنکھوں

میں پڑ رہی تھیں۔
"ایسا کچھ بھی نہیں ہے میرے چاند..... کیوں تم نے اپنے اندر یہ زہر بھر لیا ہے۔ کیوں تمہیں میں اور بھائی اپنے دشمن نظر آتے ہیں۔"
"اس لیے کہ آپ ہیں۔ آپ ہیں ذمے دار۔ آپ ہیں فساد کی جڑ اولاد میں فرق رکھنے کی گناہ گار۔" بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ دادی چکوں پھکوں رونے لگیں۔ خنجر کے جیسے الفاظ ان کے دل میں کھب کر لہولہان کرتے جا رہے تھے وہ کیونکر نہ تکلیف محسوس کرتیں۔
"آپ کو کیوں یہ وہم ہو گیا ہے ہم آپ کو غیر سمجھتے ہیں؟ کیوں آپ اتنے زہریلے ہو رہے ہیں؟ آپ کو آپ کا حق جو بھی ہے نفع کے ساتھ ملتا ہے پھر کیا بات آپ کو اکساتی ہے۔"
"میرا حق....." دستگیر چچا نے استہزائیہ چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔
"میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو لولی پاپ سے بہل جاؤں اور دکان تم دونوں کے حوالے کر دوں۔" دکان سے مطلب زمین جائیداد تھا۔ ابو بری طرح سے جز بز ہوئے۔
"چلو وہ ایک طرف، مجھے بتاؤ میرے بچے کیا اتنے نالائق، نااہل ہیں کہ نہ بڑے صاحب نے بیٹی مجھے دینا گوارہ کی اور نہ تم نے 'ہوا بھی نہیں لگنے دی اور رشتہ کر دیا اس عمر سے۔" دستگیر چچا کو آج یہ غم یہاں لے آیا تھا۔ بڑے صاحب وہ تایا کو کہہ رہے تھے۔
"حالانکہ کتنی بار میں سنوا چکی تھی کہ حوریہ کو میں اپنے رافع کے لیے....." یہاں تک کہہ کر چچی نے با آواز بلند رونا شروع کر دیا۔ امی اور دادی ہی نہیں حوریہ کے بھی حواس ڈھیلے پڑنے لگے۔
"میرے لیے تو رافع اور عمر ایک برابر ہیں۔ تم نے کبھی اشارہ بھی نہیں دیا۔ کہتیں تو کیا میں نہ سوچتی؟"
"بس کریں..... مت جھوٹ بولیں، مت گناہ گار ہوں اتنی کہ آخری سفر بھی نہ کر سکیں۔" چچا نے باقاعدہ زوردار آواز کے ساتھ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رنج سے چور لہجے میں کہا کہ دادی کے پیروں تلے سے زمین ہل گئی۔ حوریہ کا بس نہیں چلا دادی کو وہاں سے لے جا کر کہیں غائب کر دے۔
"آپ حد کر رہے ہیں دستگیر بھائی۔" اس دفعہ ابو نے اپنے لہجے کی تلخی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔
"جو تفریق آپ نے میرے اور میرے بھائیوں کے بیچ رکھی۔ وہی آپ عمر اور میرے بچوں کے بیچ رکھتی ہیں۔ دونوں بھائیوں کی بیٹیوں میں سے کسی کا رشتہ رافع کو نہ دینا اس بات کا ثبوت ہے۔"
"زویا کا ہاتھ جب تم نے مانگا تب اس کا رشتہ طے ہو چکا تھا اور حوریہ کے لیے بھی تم نے کبھی خواہش ظاہر نہیں کی۔ مجھے الہام ہوئے تھے جو میں عمر کو نہ کرتی اور تم کو ہاں۔" رونے کی وجہ سے دادی سے بولنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ امی کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ تیز لہجے میں بولتی گئیں کہ غلط سنتے سنتے سماعتیں ورد کرنے لگی تھیں۔
"یوں کہیں نا عمر آسمان اور میرا بیٹا زمین۔" بالآخر چچی کا جذباتی سین اختتام کو پہنچا۔ دادی کا تیز لہجے میں سنوانا انہیں رونا بھلا گیا۔
"تم جو چاہو کہو۔" دادی کو شاید اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں معاملہ بھینس کے آگے بین بجانے والا ہے۔ سو تھک کر اتنا کہا اور ہونٹ سی کر بیٹھ گئیں۔
یاسمین چچی کو لازمی ہتک محسوس ہوئی تھی۔ بلا تاخیر کھڑی ہو گئیں۔
"گھر چلیں..... دیوار سے سر ٹکرانے کا کیا فائدہ! جب ہمدرد کوئی نہ ہو۔" دستگیر چچا بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔
"جا رہے ہیں۔ آج سے مجھے مرا ہوا سمجھیں۔ تب تک جب تک رافع کے لیے حوریہ کا رشتہ نہ دے دیں۔" بڑی بے رحمی سے الفاظ کی مار مارتے دونوں میاں بیوی چلے بھی گئے۔ کب سے خود کو سنبھالے بیٹھی دادی کے اب ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے..... معمولی بھی نہیں تھا۔ حوریہ نے بنا سوچے سمجھے بڑے گھر

کی طرف دوڑ لگائی کہ شاید عمر موجود ہو دادی بے ہوش ہو چکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بے حد اچنبھے کے ساتھ اس نے پہلے دیوار گیر گھڑی کو دیکھا اور پھر موبائل کان سے ہٹا کر اس کو..... رات کے پونے گیارہ بجے اور یہ غیر متوقع کال۔ یقین تو کیا ہی آتا پہلے صدمہ ہوا۔ دادی کی طبیعت ٹھیک ٹھاک خراب ہوئی تھی اور جس وجہ کو لے کر ہوئی تھی وہ اس وقت فون پر ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔
"جی....." اس نے بے حد کھٹے دل سے فون کان پہ لگایا۔
"تھینک گاڈ موبائل تمہارے پاس تھا۔" اور وہ راشدہ کو کوستے تھک نہیں رہی تھی جس کی اس وقت کال آئی تو امی موبائل اسے تھما گئیں۔ گھر بھر کے لیے یہ اکلوتا موبائل عمر کی دین تھا۔ جو اسے کہیں بھی لے جانے پر منع تھا مگر گھر میں وہ ضرور اس پر اجارہ داری قائم رکھتی اس پر بھی امی سے سخت سست سننا پڑتا۔
"کیا بات ہے..... تمہیں نیند آ رہی ہے۔" رافع نے اس کی خاموشی محسوس کر لی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر خود کو بولنے پر آمادہ کیا۔
"جی..... مجھے نیند آ رہی تھی۔" سفید جھوٹ بولتے ہوئے ذرا جو زبان لڑکھڑائی ہو۔ شام میں چچی، چچا جو حال دادی اور امی ابو کا کر گئے تھے اس کے بعد اتنا تو بنتا تھا۔
"تم شاید ناراض ہو؟" دوسری طرف وہ بھی یاسمین چچی کا بیٹا تھا۔ اڑتی چڑیا کے پر گننے والا حوریہ نے چپ بہتر جانی۔
"تمہیں نہیں لگتا ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے؟" وہ الٹا مظلوم بن کر پوچھنے لگا۔ حوریہ نے بے ساختہ دانت پیسے۔
"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ لوگ جس کی چاہیں پگڑی اتار دیں۔" وہ شدید برہم تھی۔
"جس کی نہیں صرف دادی اور تایا کی۔" رافع کو ندامت نہیں تھی۔ جان کر برہمی مزید بڑھی۔
"دادی ہم سب کی بزرگ اور اس خاندان کی سربراہ ہیں۔ چچا چچی نے غلط کیا جو کیا..... اپنا درد رونے کے اور بھی طریقے ہوتے ہیں۔"
"جب چوٹ لگتی ہے تو تکلیف بھی ہوتی ہے اور چیخنا بھی پڑتا ہے۔" رافع ایک دم سے پٹڑی سے اترا۔
"تمہیں اتنا بتا دوں ہم اپنوں کے ڈسے ہوئے ہیں۔ اتنے زیادہ کہ اب جو اور جتنا بولیں وہ کم ہے۔"
"ایسا کیسا ڈسا ہے آپ کو اپنوں نے..... کہ آپ دنیا والوں کے لیے اشتہار بن گئے ہیں؟" اس کی جرح کے جواب میں وہاں..... خاموشی چھا گئی تھی۔ اسے جب شرمندگی ہونے لگی کہ کچھ زیادہ بول گئی تب وہ بولا۔
"وہ مختلف لوگوں کے لیے کوئی ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ تمہارے لیے تایا کچھ تو میرے لیے کچھ اور ہیں۔ وہ مجھے کسی ایناکونڈا سے کم نہیں لگتے۔ جو ساری جائیداد پہ کنڈلی مار کر بیٹھے ہیں۔"
"مگر میں نے تو سنا ہے وہ سب کے حصے کی زمین دے رہے ہیں۔"
"اپنا فائدہ وصول کر کے۔" رافع تلخی سے ہنسا۔
"سب سے زیادہ زمین اپنے نام کروا رہے ہیں۔"
"آپ کو کیسے پتا؟" اسے الجھن سی ہوئی۔
"بتا دیتے ہیں کچھ خیر خواہ..... اور تمہیں یہ بھی بتا دوں بھلے وہ تم لوگوں کو تمہارا حصہ دینے کا ڈرامہ کر رہے ہیں مگر بہت ہوشیاری سے واپس بھی لے رہے ہیں۔"
"وہ کیسے؟" حوریہ کا دماغ جھنجھنانے لگا۔ اس نے الجھ کر پوچھا۔
"تمہیں اپنی بہو بنا کر لازمی بات ہے تمہارا حصہ آٹومیٹکلی ان کے قبضے میں رہے گا۔ ورنہ تم خود سوچو جس عمر کے مشرق مغرب میں فینز ہیں۔ وہ تمہیں کیوں پسند کرے گا؟" بڑی آسانی سے وہ اس نہج پر دماغ کو لگانے پہ تیار ہو گئی جس پہ لگانے کے لیے یہ باتیں کی جا رہی تھیں۔
"اور تم اتنی بے وقوف کہ تمہیں میری محبت اور

میرے ماں باپ کا خلوص نظر نہیں آیا اور اس عمر کے ساتھ شادی کی صورت میں وہ فائدے نظر آگئے جو کبھی ملیں گے ہی نہیں۔" رافع کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا وہ بہت کم وقت میں عمر اور تایا کے کچے چٹھے پر ایمان لے آئی تھی۔ در حقیقت رافع نے اس کی اسی سوچ کو پختگی عطا کی جو وہ تایا لوگوں کے لیے رکھتی تھی۔

"میرے ماں باپ اگر آج تمہارے گھر آکر چھنے ـــ برے بنے تو صرف اس لیے کہ وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ شدید صدمے نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا کہ وہ تمہیں اپنے علاوہ کسی اور کی بہو بنا نہیں دیکھ سکتے۔۔۔ اس سے تمہیں یہ اندازہ ہونا چاہیے کہ ان کی محبت بہروپی نہیں، کھوٹ زدہ نہیں، وہ تم سے سچی محبت کرتے ہیں۔" اتنا کہہ کر رافع نے اچھا خاصا توقف کیا۔

"اور میں بھی۔" بعد ازاں بھاری سی آواز میں یہ کہہ کر فون کاٹ دیا۔ وہ ساکت وصامت موبائل پکڑے بیٹھی کی بیٹھی رہی۔

☼ ☼ ☼

کوئی لمحہ ہو تیرے ساتھ کا میری عمر بھر کو سمیٹ لے
میں فنا بقا کے سفر بھی اسی ایک پل میں گزار دوں

اپنے والٹ میں سجی حوریہ کی وہ تصویر۔۔۔ جو اس نے خود حوریہ کی لاعلمی میں۔۔۔ خود سے بڑی لبنی باجی کی شادی پہ کیمرے میں مقید کی تھی۔۔۔ فارغ وقت کے مشغلے کی طرح مبہم مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے انہی لمحوں کے سحر میں گرفتار تھا۔ ذہن کے پردے پر کوشش کے باوجود بھی کوئی ایسا خصوصی واقعہ نمودار نہیں ہوتا تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ حوریہ اسے تب سے اچھی لگنے لگی تھی۔ حوریہ جیسی آج تھی۔ ویسی بچپن میں تھی۔ جھنجلائی، چڑچڑی، غصیلی، تنک چڑی اور ضدی ۔۔۔ شکل پر ہمہ وقت بارہ کا گھنٹا بجاتی۔ بہت بچپن سے ہی وہ اس کا مزاج آشنا ہو گیا تھا۔ وہ منہ سے کہیں کہتی تھی۔ مگر اس کا ہر ہر عمل بتاتا کہ وہ عمر سے اور اس کو ملنے والی اہمیت سے بد کتی ہے۔ کچھ اس میں امی کے اس رویے کا بھی عمل دخل تھا جو وہ اس کے ساتھ روا رکھتی تھیں۔ مونا کے بعد بیٹے کی شدید خواہش کے باوجود بھی حوریہ کی غیر متوقع پیدائش نے ان کے ارمانوں پر اوس گرا دی تھی۔ سو بیٹی ہوتے ہوئے مونا کو پہلی اولاد ہونے کا جو اعزاز و درجہ ملا تھا۔ وہ اس سے محروم رہی۔ یہ الگ بات تھی کہ ابو اور باقی گھر والوں کی وہ چہیتی تھی۔ مگر ہاتھ کا چھالہ والی بات جو عمر کا نصیب تھی۔

وہ اس کے حصے میں نہیں آئی۔ نتیجتاً ہر گزرتے دن کے ساتھ عمر اسے کھٹکنے لگا۔ عمر کا رتبہ وہ چھیننے کے قابل نہیں تھی۔۔۔ مگر دوسری حرکتوں سے اس نے اپنے آپ کو نمایاں ضرور کر دیا۔ تب گھر کا ایک چولہا ہوتا تھا گھر میں رافع بھی تھا اولاد نرینہ مگر عمر آٹھ بہنوں کے بعد آیا تھا اور خدا کی کرنی اس کے بعد زویا پیدا ہوئی۔ یوں نو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے جس گدی پر وہ بیٹھا اس پر رافع بھی نہ بیٹھ سکا۔ عمر صرف اپنے ماں باپ کا نہیں حوریہ کے امی ابو کی بھی آنکھ کا تارا تھا۔ نہیں تھا تو حوریہ کا یا پھر یاسمین چچی کا جو گلے اس کو عمر کے حوالے سے ہوتے وہی یاسمین چچی واشگاف سنوایا کرتیں۔ یاسمین چچی تب سے اس کی پسندیدہ ہو گئیں۔ اسے عمر کی ہر شے پر قبضہ جمانے کی خواہش ہوتی۔ محض اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک دیکھنے کی آس میں عمر کیا کچھ نہیں خود بخود اس پر قربان کر دیتا تھا۔ مگر وہ عمر سے ہتھیانے کے بعد اس کھلونے یا کھانے کی چیز کا حشر نشر کر دیتی اپنے پاس نہیں رکھتی تھی۔ اس کی انہی دل جلانے والی حرکتوں اور اس غصیلی شکل کی وجہ سے وہ بھی ضد میں آنے لگا۔ جان بوجھ کر اسے تنگ کرتا اپنی اہمیت کو کیش کراتا اسے خود بھی نہیں پتا چلا کہ اس کا دل آیا بھی تو کہاں حوریہ کے ماتھے کی تیوریوں، سکڑی ہوئی بھنوؤں اور ہمہ وقت ناراضی میں ڈوبی سبز زمرد آنکھوں میں، جو ہمدردی بچپن میں اسے چیختے چلاتے، روتے دیکھ کر امڈتی تھی۔ وہ محبت میں بدلی تو اسے وہ پیاری ہی اسی روپ میں لگنے لگی۔ کاٹ کھانے کو لپکتی، پنجے جھاڑتی

بچپن میں وہ خود کو دی جانے والی اہمیت کا مداوا کرتا تھا جبکہ اب جان بوجھ کر ایسے موقعے تلاش کرتا جس سے وہ زچ ہو کر قتل کرنے تک آجائے۔ یہ یقیناً "محبت کا نرالا انداز تھا اور اب وہ الٹا کھڑا ہو کر بھی اس کو اپنی محبت کا یقین دلاتا ـــ اسے کبھی نہیں آنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں کہہ رہی ہوں آپ رافع بھائی کو ہاں کہہ دیں۔ میں عمر سے شادی نہیں کروں گی۔" اس کے فرمودات یوں بھی سکون کا باعث نہیں بنتے تھے۔ مگر اس وقت کا ارشاد حقیقتاً "زلزلہ لے آیا۔ سب سے پہلا کام مونا نے لاؤنج کا داخلی دروازہ بند کرنے کا کیا۔ کم از کم بڑے گھر والے تو اس زلزلے سے محفوظ رہیں۔

"تم ہوش میں تو ہو؟" امی نے نا صرف دانت پیس کر غراہٹ نکالی۔ بلکہ آگے بڑھ کر زناٹے دار تھپڑ بھی دے مارا۔ دادی پر کپکپی طاری ہونے لگی تھی۔ پیاری پوتی کے یہ تیور ناقابل برداشت ہو رہے تھے۔

"ارے خالہ جان کیا غضب کرتی ہیں۔ ایسے معاملات یوں تھوڑی سنبھالے جاتے ہیں؟" زکی بھائی نے آگے بڑھ کر امی کو مزید حملے سے باز رکھا۔ ورنہ وہ جب بپھری ہوتیں۔ قابو میں آنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔

"مجھے مت روکو زکی! مجھے پوچھنے تو دو یہ خناس اس کے دماغ میں کس نے بھرا ہے؟ ایسی کون سی گولی یاسمین بھابھی اور رافع نے اس کو کھلائی کہ یہ ان پر ایمان لے آئی؟"

"آپ لوگوں نے یہ خناس بھرا ہے۔" بنا ڈرے گھبرائے وہ نڈر بن کر یوں بولی کہ دادی اور امی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے کر گئی۔

"جانور سمجھ لیا تھا جو بنا پوچھے جس کھونٹے سے دل چاہا مجھے باندھنے پر آگئیں۔ بیٹی نہ سہی انسان ہی سمجھ لیتیں۔"

"حوریہ۔" دادی بے جان ہونے لگیں۔

"حوریہ۔" جبکہ مونا نے بولنے کے ساتھ ہی ایک تنبیہی چپت بھی رسید کی تھی۔ مہلی بھی "متاثرین زلزلہ" میں شامل منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ابو تھے جو اس وقت باہر اپنے اور تایا ابو کے مشترکہ مردان خانے میں بیٹھے تھے۔

"اندھی تھی گونگی بہری تھی کیا؟ یا عمر میں ہیرے لگے ہوئے ہیں۔ جو آپ کی طرح مجھے بھی لبھا جاتے ـــ نہیں کبھی بھی نہیں میں بھی انسان ہوں میری بھی زبان ہے ایک بار مجھ سے پوچھ تو لیتے۔"

"مجھے چھوڑو زکی! مجھے جانے دو میں جانتی ہوں اس کی زبان، میں دیکھتی ہوں اس کو، نکالتی ہوں اس کی بے حیائی۔"

"کیوں؟" شدت غم سے وہ پھٹ پڑی۔

"ایسا کیا کہا ہے میں نے، اپنا حق استعمال کرنا بے حیائی ہوتی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے گڑیا۔ تم صرف یہ بتاؤ عمر میں کون سی برائی ہے۔ گھر کا لڑکا ہے۔ آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا ہے سب سے بڑھ کر اپنے بیٹے جیسا ہے اس سے زیادہ اور کیا ڈیمانڈ ہوتی ہے۔" زکی بھائی کے منہ سے عمر کی سال خوردہ جملہ خوبیاں سن کر وہ پہلے سے زیادہ تلملائی۔

"میں صرف ٹوٹے ہوئے خاندان کو جوڑنا چاہ رہی ہوں۔ رافع بھائی سے شادی کے بعد سارا خاندان ایک ہو جائے گا۔"

"ٹھہر تو۔۔۔" امی نے چپل اٹھالی تھی۔

"کہیں کی دردمند میں ابھی تیرے جگر سے یاسمین بھابھی اور رافع کا درد نکالتی ہوں۔" زکی بھائی نے امی کے ہاتھ سے چپل لے کر واپس اپنی جگہ پر رکھا۔ وہ فوں فوں کرتی اپنے کمرے میں جا گھسی پیچھے مونا، دادی کے تو مہا امی کے ہاتھ پیر سہلاتا رہا۔ جبکہ مونا مارچ پاسٹ کرنے لگی۔ سارا سکون تلپٹ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات میں زکی بھائی اور مونا دیر تک اسے کمرے

میں سمجھانے کی غرض سے رکے رہے۔ اس کی ایک ہی رٹ "عمر نہیں۔۔۔ رافع۔" یہاں تک کہ زکی بھائی اور موناکے سر سے بھی دھواں نکلنے لگا۔

"ٹھیک ہے میری بہن جیسا تم چاہو مگر جس بہادری یا بے حیائی سے تم نے یہ انکار ہمارے سامنے کیا ہے۔ ایسے ہی ابو کے سامنے بھی کر دو۔ ہماری تو ہمت نہیں ان کی خوشی ملیا میٹ کرنے کی تم چونکہ اس معاملے میں ایکسپرٹ ہو تو تم کرو۔" مونا تن فن کرتی چلی گئی۔ وہ نم آنکھوں میں بے بسی، بے چارگی سموئے زکی بھائی کو دیکھنے لگی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ضد میں آ کر نہیں۔۔۔ ہوش میں رہ کر فیصلہ کرو۔ کوئی تمہاری مرضی کے خلاف نہیں جانے والا۔" وہ کمزور سی تسلی دیتے کمرے سے نکلے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کوئی سمجھ ہی نہیں رہا تھا اس کی بات۔۔۔ وہ کیسے کسی ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے پر راضی ہو جاتی۔ جس کی دلی تمنا ہی اس کو نیچا دکھانے کی تھی۔ اور واقعی اس کی تمنا پوری ہو جاتی۔ اگر وہ گھر والوں کے سامنے گونگی بہری بنی رہتی۔ مگر زندگی بھر کا سوال تھا۔ اسے بھی اپنی انا عزیز تھی۔ اپنا وقار پیارا تھا۔ وہ تمام عمر کے لیے۔۔۔ ان کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔ سو انکار تو کرنا ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

"معاملہ گڑبڑ ہے۔" اس کا پہلا اشارہ عمر کو اس شام ملا جب وہ دوسرے سمسٹر کے پرچوں کے لیے کمپیوٹر سمیت تمام مضامین کے گیس لے کر اس کے سامنے آیا اور اس کی توقع کے برعکس حوریہ نے وہ کاغذ پڑھے بنا پرزے پرزے کر دیے۔ ایک لمحے کو تو وہ سکتے میں آ گیا۔ اپنے فائدے کے لیے وہ گدھے کو باپ بنانے والوں میں سے تھی۔ پھر آج جب وہ اس کا اتنا بڑا مسئلہ بن کے حل کر رہا تھا اس نے کسی لائق ہی نہیں جانا۔ کاغذ پرزے پرزے کرنے کے بعد اپنی دلکش آنکھوں میں غرور بھرے جتاتے انداز سے اسے یوں دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو۔

"اب بولو۔" عمر نے فی الفور حیرت و الجھن پہ پردہ ڈالا اور بے حد شوخ و شریر نظروں اور مبہم و دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اسے یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

"یوں ہے تو یوں ہی سہی۔" اور اس وقت تک لطف لینے کے انداز میں دیکھتا رہا جب تک کہ وہ خود زچ نہ ہو گئی۔

"اپنی عنایتیں اپنے پاس رکھو کسی اور کے لیے کام آئیں گی۔" جھنجلاہٹ چھپاتے ہوئے۔۔۔ دانت پیس پیس کر یہ کہا۔ عمر نے ہنوز مسکراتے ہوئے ہلکا سا سر خم کر کے گویا مشورہ قبول کیا۔ اس کے تو سر تا پا آگ لگ گئی۔ تن فن کرتی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ ابھی اس اشارے کی چبھن باقی تھی کہ اس نے کالج ٹرپ کے ساتھ جانے کا شوشا چھوڑ دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کون سا مری کاغان لے کر جا رہے ہیں اور جیسے بڑا اسٹینڈرڈ کا ٹرپ ہو گا نا۔" عمر نے کھل کر اعتراض کیا تھا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے منع کرنے والے؟" اس کے گھر میں اس کی امی کے سامنے یوں استحقاق سے منع کرتا عمر اسے زہر لگا۔

"حورا تمیز سے رہو۔" امی کو اس کی بدتمیزی تاؤ دلا گئی۔

"کیوں۔۔۔ میں کہہ رہی ہوں نا میں جاؤں گی۔ یہ کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا، خود اپنی یونیورسٹی ٹپس کے مشورے ہم سے لیتا تھا کیا۔" وہ واقعی بدلحاظ ہو رہی تھی۔ عمر کو بہت شدت سے محسوس ہوا۔

"اس یونیورسٹی اور اس کالج میں بہت فرق ہے۔ نام اور معیار اور اسٹوڈنٹس کا بھی۔"

"مت بھولو اس کالج میں میرا داخلہ تایا ابو نے کروایا ہے۔ اس کا اسٹینڈرڈ تم سے بہتر ان کو معلوم ہے اور اچھی دھونس ہے۔ ساری کلاس جا رہی ہے۔ مجھے روکا جا رہا ہے میں کیوں رکوں؟" عمر ہونٹ بھینچ کر اس کا یہ جارحانہ رویہ دیکھتا رہا۔

"کوئی وجہ ہو گی تو عمر منع کر رہا ہے۔" امی بہت ضبط

سے کام لے کر بولی تھیں۔

"کوئی وجہ نہیں سوائے اپنی اہمیت جتانے کے اور میں کہہ رہی ہوں میں تایا کے پاس چلی جاؤں گی۔" اور اس بات کا تو عمر کو بھی یقین تھا تایا اسے منع کرنے والے نہیں۔ یوں اس نے عمر کی ضد میں (کم از کم عمر کو ایسا لگا) آ کر۔۔۔ ٹرپ کی فیس بھی جمع کرا دی۔ یہ دکھ ابھی ہلکا نہیں ہوا تھا کہ اس دن چھٹی ٹائم کالج گیٹ پر رافع کو دیکھ کر عمر کھٹک سا گیا۔ اصل دھچکا تب لگا جب حوریہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ کے یہ جا وہ جا بھی ہو گئی۔ پہلی بار صحیح معنوں میں اسے حوریہ کا یہ عمل غصہ اور تکلیف بیک وقت دے گیا۔ تادیر وہ اس منظر کی جلن محسوس کرتا رہا۔

حوریہ شام میں گھر واپس آئی تھی۔ اس دوران وہ کئی چکر تو اس کے پورشن کے لگا آیا تھا۔ پہلے کی طرح دستگیر کے گھر جا کر اسے واپس لانے کا بھی سوچا مگر نہ جانے کیوں کچھ نیا انوکھا لگ رہا تھا حوریہ کے جس قسم کے تیور ہو رہے تھے اس نے لازمی ساتھ آنے سے انکار کر دینا تھا۔ سو یہ ہتک سہنے سے بہتر اس نے انتظار کرنا سمجھا اور ابھی وہ اس کے پورشن میں بازپرس کی غرض سے جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود آ گئی۔

"زویا کہاں ہے؟" لاؤنج میں موجود نوفل اور عمر پہ اچٹتی نظر ڈال کر وہ یہاں وہاں یوں دیکھنے لگی جیسے دیواروں سے پوچھ رہی ہو۔ عمر نے بے ساختہ مٹھیاں کھولیں اور بھینچیں۔ وہ بڑی لاپروا اور بے نیاز نظر آ رہی تھی۔

"ہم یہاں ہیں؟" زویا کچن سے چائے اور اسنیکس لیے برآمد ہوئی۔

"آپ فارغ ہو گئیں سنا ہے بڑی سیریں کرنے گئی تھیں؟"

"ہاں۔۔۔۔ میں یاسمین چچی کے گھر گئی تھی۔" وہ جیسے جان بوجھ کر عمر کو جلانے کے موڈ میں تھی اور وہ واقعی جل گیا۔

"تم رافع کے ساتھ کیوں گئی تھیں؟" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ حوریہ نے حسب عادت بھنویں سکیڑ لیں۔

"تم سے مطلب؟" وہی بدلحاظ اور چابک مارتا لہجہ۔

"مجھے تم کالج میں انٹروڈیوس نہیں کرا سکتیں اور رافع کے ساتھ بیٹھ کر چلی گئیں۔ آج تمہاری پارسائی پر حرف نہیں آیا تھا۔" دانت بھینچ کر اس نے یہ سب کہا تھا۔ نوفل اور زویا ہونقوں کی طرح بیٹھے تھے۔ نوفل چھوٹی آپا کا بیٹا تھا۔

"شٹ اپ۔" وہ پھنکاری تھی۔

"یو شٹ اپ۔" وہ اس سے بھی زیادہ زور سے گرجا۔

"تم میرے ساتھ کالج آنا جانا گوارا نہیں کرتیں۔ وہاں مجھے اپنا کزن بتانے پر تمہیں تکلیف ہوتی ہے اور رافع۔"

"بس۔۔۔ چپ۔" ہاتھ اٹھا کر وہ اس زور سے چیخی کہ نوفل اور زویا بھی کانپ گئے۔ عمر بدستور شدید ترین ناگواری و ناراضی کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

"رافع، رافع، رافع ایسا کون سا گناہ کر دیا میں نے اس کے ساتھ جا کر تم ہوتے کون ہو مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والے۔ کزن ہے وہ میرا، چچی کے گھر گئی تھی میں۔"

"کزن تو میں بھی ہوں۔" بے حد سپاٹ گمبھیر آواز میں عمر نے جیسے یاد دلایا۔

"بلکہ کزن سے بڑھ کر ہوں۔" حوریہ کی دکھتی رگ پہ ہاتھ پڑا تھا۔ وہ بلبلا اٹھی۔

"جس رشتے کا ابھی کوئی نام ہی نہیں میں اسے کیوں خاطر میں لاؤں۔" عمر کو تو برا لگا ہی تھا۔ زویا کو بھی تیر کی طرح جا چبھا۔

"اور جس کی ریپوٹیشن کالج میں اتنی خراب ہو میں اسے اپنا کزن بتا کر دوسروں کو باتیں بنانے کا موقع کیوں دوں؟" اب کے زویا کی ہمت جواب دے گئی۔

"تم حد سے بڑھ رہی ہو۔" بھائی جوان بہنوں کے لیے اول، آخر تھا۔ اس کی بے عزتی کوئی یوں بلاوجہ کر دے کہاں برداشت ہوتا تھا۔ نوفل تک سن ہوا بیٹھا

تھا۔

"کیا کیا ہے میں نے ۔۔۔؟" زویا کے غصہ کو نظر انداز کر کے عمر سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔ ایک لمحے کو تو وہ گڑبڑائی مگر پھر شروع ہو گئی۔

"جان بوجھ کر لڑکیوں سے فری ہوتے ہو۔ ان سے باتیں کرنے کے موقع ڈھونڈتے ہو۔ ان کے پرنسلز تک جاتے ہو اسی لیے تو اس جاب سے چمٹے ہوئے ہو۔ کسی تھرڈ کلاس کی طرح لڑکیوں کی کمپنی میں رہنے کے شوقین۔ فاریہ اور نگہت کو جن نظروں سے دیکھتے ہو پوری کلاس واقف ہے۔ سبق دیتے ہو مجھے پارسائی کے اپنا کردار چاہے جتنا کیچڑ میں خراب ہو۔"

"چپ ہو جاؤ ورنہ میں مار دوں گا۔" ایسی سرد' برفیلی آواز ۔۔۔ اور غضبناک ہوئی آنکھیں۔ حوریہ فورا" چپ ہوئی تھی۔ عمر کی آنکھوں سے غصہ' ناراضی ایک ساتھ عیاں تھا۔ وہ کچھ گڑبڑا کر یہاں وہاں دیکھنے لگی۔

"الس ٹو مچ حوریہ یار۔" کب سے چپ بیٹھے نوفل نے آہستگی سے کہا اسے ایک دم سے لگا ماحول گمبھیر ہو گیا ہے۔ عمر کی نظروں کا غصہ' تاسف اور پھر دکھ میں بدل گیا۔ وہ اسے انہی دکھ بھری نظروں سے دیکھتا لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا کتنی دیر تک وہ ہل بھی نہ سکی ۔ پھر خیال آنے پر کہ زویا سے کام تھا۔ وہ قدرے نادم سے اس کی جانب مڑی۔

"وہ ۔۔۔ زویا۔" زویا کی ناراضی اس کے پورے وجود سے ظاہر تھی۔ وہ اس سے ہاتھ چھڑواتی بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ نوفل کی موجودگی میں اپنے کیے کا یہ رد عمل ۔۔۔! وہ بری طرح سے پشیمان ہوئی۔

"یار اتنا تو بنتا ہے نا۔" نوفل نے جیسے اسے آئینہ دکھانا چاہا وہ بھاری دل و قدموں کے ساتھ لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر۔۔۔ عمر نے وہ کیا جو اسے آج یا کل کرنا ہی تھا۔ حوریہ کے لیے "اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے" والی بات ہوئی۔ کیا ضروری تھا وہ پنجابی فلموں کے ولنوں جیسے کرتوت دکھا کر عمر کو اتنا طیش دلاتی کہ انجام کار آج کا دن ہوتا؟ جب کہیں امان ہی نہیں مل رہی تھی۔ حالت یوں تھی کہ منہ سے نہ آہ نکل رہی تھی اور نہ ساہ (سانس)

جو واویلا ذرا سی سن گن ملنے پر کیا تھا۔۔۔ اب وہ تو کیا خالی چوں کی آواز نکالتے ہوئے بھی دل سہم رہا تھا کہ اسے واویلے کے نتیجے میں موبی بلا جھجک عمر کو پکڑ کر اس کے سامنے لے آیا تھا۔

"اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی دم خم باقی ہے؟" اس نے آتے ہی نہایت سنجیدگی سے طنز کا گولا پھینکا۔

"اس سے زیادہ کچھ کیا تو یاد رکھو' جب بیٹھے بٹھائے نکاح کرنے پر آسکتا ہوں تو رخصتی کی ڈیمانڈ کیوں نہیں کر سکتا۔" یہ برف جیسے الفاظ اور غیرت میں ڈوبا انداز ۔۔۔ حوریہ کا دم خم بھربھری مٹی کی طرح بیٹھ گیا۔

تب سے اب تک وہ ڈمی بنی بیٹھی تھی۔ آنکھیں تھیں کہ بار بار پانی پانی ہو رہی تھیں۔ بھیگی پلکیں صاف کرتے ہاتھ کسی سے پوشیدہ نہیں تھے مگر لگتا تھا کسی کو اس کی پروا تھی ہی نہیں۔ قسم قسم کے قہقہے' بھانت بھانت کی بولیاں' شور' ہنگامہ' ہلا گلا ۔۔۔ اتنا کہ کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس اچانک طے پانے والے نکاح میں باہر کے لوگ بالکل تھے ہی نہیں ۔ پھر بھی عمر کی بہنوں اور ان کے بچوں' موبا کے سسرالیوں کی وجہ سے گھر بھر گیا تھا۔ عمر کا نکاح معمولی بات نہیں تھی۔ سو خوشی کی حد بھی کوئی نہیں تھی۔ کیا بڑے کیا چھوٹے سب کو پکڑ پکڑ کر نچوایا جا رہا تھا۔ تائی تو تائی دادی تک تو نہیں بخشا گیا۔ جب بڑی آپا کھڑی ہوئیں تب سعید چلایا۔

"اچھا۔۔۔ بھائی کی شادی پہ ڈانس ہو رہا ہے۔ بیٹے کی شادی یوں بھگتائی ۔۔۔ جیسے بیٹی رخصت کر رہی ہوں۔"

"ارے ایک ہی بھائی ہے میرا روز روز تھوڑی یہ دن آتا ہے۔" آپا بے حد نہال تھیں۔ غرض کوئی تھک ہی نہیں رہا تھا۔ ایک بیٹھ رہا تھا دوسرا اٹھ رہا تھا۔ اسی دوران آنسو پونچھتی حوریہ کو دیکھ کر کوئی چلایا۔

"دلہن کیوں رو رہی ہے۔"

"ارے نو نو نندوں اور ۔۔۔ ساس کے شکنجے میں جا رہی ہے۔ روئے نہ تو کیا کرے بے چاری۔"

"نام کی نندیں ہوں گی ۔۔۔ پیار بہنوں والا دیں گی۔" زویا نے لپک کر اسے بھینچ لیا تھا۔ ناراضی و راضی سب اسی رات ڈھل گئے تھے۔

"ارے میری بیٹی تو یہی ایک ہو گی۔ گھر کی مالکن باقی سب تو اس کی مہمان ہوں گی۔ کسی کو جرات نہیں ہو گی کڑوی آنکھ سے بھی دیکھنے کی۔" تائی کتنی ہی بار تو اس کا ماتھا چوم چکی تھیں۔

"ماشاء اللہ پھر ٹھیک ہے۔ ایسا جنجال پورہ ہر لڑکی کا نصیب بنے۔" موبا نے طنزیہ پھلجھڑی چھوڑی کیا باتیں ہو رہی تھیں' کون سے ارادے بنے جا رہے تھے وہ دم سادھے' کان لپیٹے جیسی بیٹھی تھی بیٹھی رہی کب وہ حوریہ عالمگیر سے "حوریہ عمر" بنی ابو' امی کی آنکھیں خوشی کے احساس سے نم ہوئیں تو موبی اور دادی کے بلند آہنگ قہقہے کیوں چھت پھاڑ رہے ہیں۔ وہ بے جان مورت بنی سب سے لاعلم رہی محض اپنی بے وجہ کی انا کے ہاتھوں۔

☼ ☼ ☼

"بات سنو۔۔۔" رات کے نہ جانے کس پہر اپنی قسمت پر ماتم کناں ہوتے اس کی آنکھ لگی تو ضرور مگر دماغ میں ابھی تک نکاح کے وقت والی بے ہنگم آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس قطعی اجنبی' بے ڈھب آواز کو بھی اس نے انہیں آوازوں پر محمول کیا۔

"اے ۔۔۔ اٹھو۔" کوئی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"ایسے تو ساری رات نہیں اٹھے گی۔ اٹھا کر لے جاؤ ٹائم ضائع ہو رہا ہے۔" ایک اور ناگوار دبی دبی آواز قریب سے سنائی دی۔ خمار آلود آنکھوں کو بمشکل دیکھنے کے قابل بنایا۔ دو اجنبی چہرے بالکل پاس تھے۔ شاید تھکاوٹ اور گریہ زاری کا اثر تھا کہ اس کے حواس ابھی بھی نہ جاگے۔

ایک نے اسے پکڑ کر جھٹکے سے کھڑا کیا تب نیند ہی نہیں ہوش بھی اڑ گئے۔ دوسرے نے اسے منہ پر ہاتھ رکھ کر زبردستی گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اس گینڈے جیسے کے سامنے وہ کچھ بھی نہیں۔ با آسانی ۔۔۔ چلی گئی۔ باہر صحن کا منظر رہے سہے اوسان خطا کر گیا۔ رافع ابو پر بندوق تانے ہوئے تھا۔ اس کی جسمانی حرکت سے واضح لگ رہا تھا وہ ہوش میں نہیں۔ اجنبیوں نے اسے بس اتنا ہی دیکھنے دیا۔ پھر گھسیٹتے ہوئے بیرونی گیٹ پار کر گئے۔ باہر کار ڈرائیور سمیت موجود تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج گیٹ کو تالے شالے نہ لگاؤ۔ آج میرے بچے کا نکاح ہوا ہے۔ میرے گھر خوشیاں آرہی ہیں۔" نکاح کی رسم کے بعد جب واپسی ہوئی۔ تائی اماں نے کھنکتی آواز میں حکم جاری کیا۔

"ہائیں۔" مہندی لگواتی زویا نے آنکھیں پھاڑ کر عروبہ کو دیکھا۔

"یہ کیا لوجک ہوئی ۔۔۔ خوشیاں تو آئیں ۔۔۔ چور ڈاکو بھی ساتھ آئیں۔ بیٹے کا نکاح ہوا ہے۔ وہ بھی دعوت کھائیں۔" سن کر تائی تو دہل گئیں۔ مینا آپا نے دور سے چپل پھینکا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی نشانے پر جا لگا یعنی زویا کے مہندی لگے ہاتھ پر اس کی شکل دیکھنے کے لائق ہو گئی۔

"زبان کو سنبھال کر بات کیا کرتے ہیں۔" "افسوس تو آپی کو بھی ہوا مہندی خراب کرنے پر مگر ظاہر کیوں کرتیں۔ تبھی عمر بھی آگیا۔

"تمہارا نکاح تھا۔ اور شکل یوں بنا رکھی ہے جیسے قید کی سزا ملی ہو۔ ادھر تمہاری دلہن بھی روتی رہی تھی۔" وہ آتے ہی نیچے کارپٹ پر لمبا ہو گیا۔

"اس کو کس چیز کی سزا مل رہی تھی؟ مجھے تو ان کے ہزبینڈ نے اپنی زمینوں میں پھنسا لیا۔" اس کا اشارہ تائی کی طرف تھا۔ جن کی ممتا اس کے تھکے' ستے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر اڈنے لگی۔

"کہا بھی تھا اگلے ہفتے نکاح کا پروگرام رکھتے ہیں۔

پورے دھوم دھام سے کریں گے۔ پر تم ہی کو شوق تھا آج کے آج ہونا چاہیے۔ سارا دن گاؤں رہے عین ٹائم پہ پہنچے، نہ دو لہا نے منہ دھویا نہ دلہن نے، موویمیں دیکھنا اپنی شکلیں۔"

"اچھا بس۔۔۔ اب بند کرو یہ سب سونے کی کرو۔ میرا بچہ اتنا تھک گیا ہے۔ باپ کو پتا بھی تھا آج نکاح ہے پھر بھی اس کو گاؤں بھیج دیا۔" کچھ امی کی جھاڑ کچھ بچوں کی ریں ریں سب تتر بتر ہو گئے۔ لمحوں میں سب کے سب کمروں میں جا چکے تھے۔ عمر صوفے پر نیم دراز ٹی وی کے چینل گھما رہا تھا۔ گرم دودھ اور فوراً"سونے کی ہدایت دینے کے بعد تائی بھی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ وہ خالی الذہن سا ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے رہا۔ حوریہ کا رویہ ٹھیک طرح سے خوش بھی نہیں ہونے دے رہا تھا۔ اطمینان اور سکون تو دور کی بات تھی۔

یوں ہی ٹی وی پر نظریں جمائے اسے نیند آنے لگی تھی۔ ٹی وی بند کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اس کی آنکھیں پہلے بند ہونے لگیں۔ معاً" عجیب قسم کی آوازوں نے فوراً" نیند کا زور توڑا تھا۔ یوں ہی لیٹے لیٹے عمر نے محسوس کیا۔ آوازیں چچا کے پورشن سے آرہی تھیں۔ جیسے دھکم پیل کی ہوتی ہیں۔ ہاتھاپائی قسم کی ٹی وی آف کرتا وہ تیزی سے وہاں بھاگا۔ صحن میں مولی اور رافع گتھم گتھا تھے۔ بندوق نیچے گری پڑی تھی۔ چچا قریب ہی وہیل چیئر پر بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ عمر نے بھاگ کر رافع کی گردن دبوچی تھی۔ ساتھ ہی مولی کو اپنے پورشن میں موجود تایا اور اپنے بھانجوں کو بلانے کے لیے دوڑایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اس کو اٹھوایا ہے۔ میری منگیتر ہے وہ۔ اس کا نکاح کسی اور سے کیوں ہو؟" عمر نے کس کر ایک گھونسا رافع کے جبڑے پر مارا یہ کچھ زیادہ زور سے لگا کہ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ تابڑ توڑ مکوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ کے باوجود بھی وہ نہیں بتا رہا تھا کہ حوریہ کہاں ہے۔ تایا، تائی کے ساتھ دستگیر چچا بھی آ گئے تھے۔ ان کے سامنے بیٹے کی پٹائی ہو رہی تھی۔ جو نشے میں غرق حوریہ کو اغوا کرنے آیا اور ابو کو جگا کر بڑھکیں مارنے لگا کہ "تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری بیٹی لے کر جا رہا ہوں۔ کر لو جو کر سکتے ہو۔" امی مولی کو جگا چکی تھیں۔ جس کے دبلے پتلے جسم میں جانے کیسی طاقت سمٹ آئی تھی کہ اس نے اپنے دگنے رافع کو ایسا قابو کیا کہ عمر کے آنے تک نہ چھوڑا امی اور دادی کی سدھ بدھ ایسی ختم ہوئی کہ نہ خود بھاگ کر بڑے گھر کسی کو بلانے گئیں نہ موبائل سے بات کرنے کا خیال آیا۔ بس کھڑی روتی رہیں۔ یہ تو عمر کی ساعتوں نے کمال کیا اور وہ مولی کا مددگار بن کر آ گیا۔

اب رافع کی کسی روئی کی طرح دھنائی ہو رہی تھی۔ انت میں عمر نے باقاعدہ ڈنڈا اٹھا لیا کہ یہ نہیں بتا رہا تو وہ اس کی ٹانگیں توڑ دے گا تب وہ چلایا۔

"بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔ مجھے چھوڑ دو، مت مارو، میں بتاتا ہوں۔" اس کے منہ سے خون اور رال ٹپک رہی تھی۔ عمر نے برآمدے کے پلر سے بندھے اس کے ہاتھ کھول دیے۔

"مجھے ساتھ لے کر چلو۔" اس پر پانی سے بھری بالٹی پھینکنے کے بعد عمر غرایا تھا۔ اس کے سب سے بڑے بہنوئی یوسف ڈی ایس پی تھے۔ عمر اور وہ چند سپاہیوں کے ہمراہ رافع کو ساتھ لیے حوریہ کا اتا پتا کرنے چل دیے۔ پیچھے تایا نے دستگیر چچا کی کلاس لینی شروع کر دی۔

☼ ☼ ☼

رو رو کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ نہ دوپٹہ، نہ پیروں میں کچھ۔۔۔ وہ ننگے سر اور ننگے پیر آئی تھی۔

"مجھے جانے دو۔ پلیز مجھے جانے دو اللہ کا واسطہ، رحم کرو۔ میں نے کیا کیا ہے۔" منتیں، ترلے، التجائیں کچھ بھی ان دونوں پر اثر انگیز۔۔۔ نہ ہوئیں۔ اسے کمرے میں بند کیے وہ آپس میں نیچی آواز میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ رات شاید جلد ہی صبح کے اجالے

میں بدلنے والی تھی۔ یعنی اس کی قسمت کی سیاہی خود رات بننے والی تھی۔ وہ اتنا روئی کہ اب آنسو بھی نہیں نکل رہے تھے۔

"بھائی پلیز مجھے جانے دو۔ پلیز اللہ کا واسطہ۔" اور جب اسے یقین آ گیا کہ اب سب ختم جو بیس سالہ زندگی میں دیکھا جیا۔ وہ پیچھے رہ گیا۔ اب زندگی نیا اور تکلیف دہ موڑ مڑنے لگی ہے۔ تب بیرونی دروازہ ٹوٹنے اور بہت سے قدموں کی آواز ابھری۔ پولیس اللہ کی مدد کی شکل میں آن پہنچی تھی۔ ساتھ عمر اور رافع بھی تھے

☼ ☼ ☼

"جو زہر اپنی ماں، بھائیوں کے خلاف تمہارے دل میں تھا۔ وہی تم نے اپنی اولاد کے اندر بھی بھر دیا۔ تبھی تو اس نے آج ہمیں ڈسا تم جیسے شیطان کی اولاد شیطان ہی ہو سکتی تھی۔"

"آرام سے۔۔۔ آہستہ۔" تائی نے بے ساختہ تایا کا بازو ہلا کر ٹھنڈا کرنا چاہا۔ جن کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔

حوریہ کی بخیر و عافیت واپسی کے بعد بھی سبھی ان کے پورشن میں موجود تھے۔ یاسمین چچی بھی آ چکی تھیں۔ اور صورت حال کی نزاکت کو سمجھے بنا بہت بری ناگوار شکل بنائے ہوئے تھیں۔ رافع۔۔۔ اتنا لہولہان تھا کہ دیکھ کر ان کا خون کھولنا ہی تھا۔ دادی بے آواز روئے جا رہی تھیں۔ امی، زوبا، مینا آپی اور لبنیٰ باجی اندر حوریہ کے پاس تھیں۔ جسے کچھ دیر پہلے لگ رہا تھا کہ آنسو ختم ہو گئے۔ مگر گھر واپس آ کر اپنوں کی شکل دیکھ کر اتنا چیخ چیخ کر روئی کہ ابو اور تایا تک رو دیے۔ مسلسل بے آرامی اور رونے کی وجہ سے اسے بے حد تیز بخار ہو گیا تھا۔ یہاں بھی ارجنٹ ڈاکٹر دستیاب ہو گئے۔ لبنیٰ باجی کے خاوند کی شکل میں جن کی تجویز کردہ دوائیں عمر اسی وقت لینے گیا ہوا تھا۔

"جتنا ہم نے اچھا بننے کی کوشش کی، جتنی نیکیاں کرنے کی کوشش کی۔ تم نے اتنا ہمارے منہ پر تھوکا۔ اتنا ہی ہمیں بدنام کیا۔ ہمیں سوتیلا نہ جانے کیا کیا نہیں مشہور کیا۔ ہم نے پھر بھی برداشت کیا۔ چپ رہے مگر یہ حد۔۔۔ کہ تمہارا بیٹا اپنے ہی خاندان کی عزت کو زک پہنچانے تک آ جائے۔۔۔ بہت زیادہ ہے۔" تایا بہت بارعب تھے مگر یوں غصے کا اظہار کم کم کرتے تھے۔ دستگیر چچا سے نظریں ملانا دشوار ہو رہا تھا۔ یاسمین چچی کی تیوریاں ضرور گنی جا سکتی تھیں۔ واضح عیاں تھا کہ انہیں اپنے بیٹے کی درگت کا ملال کھائے جا رہا تھا حوریہ پر کیا بیتی۔ اس کی انہیں فکر نہیں تھی۔

"اب یہی ٹھیک ہے۔ تم نے سوتیلا، غیر بننا چاہا۔ میں تمہیں سوتیلا اور غیر بناتا ہوں۔ آج کے بعد تمہاری ہماری ختم۔۔۔ نہ تمہارے گھر میں سے ہمارے گھروں میں آنے کی کوئی جرات کرے گا۔ نہ ہمارے گھر کا کوئی تمہارے گھر جائے گا۔ ہم مر گئے ایک دوسرے کے لیے۔۔۔ میں نے بہت نیک نیتی سے کوشش کی تمہیں ساتھ لے کر چلنے کی، تمہارے شکوے شکایتیں دور کرنے کی، ضرورت سے زیادہ تمہارا پیٹ بھرنے کی۔ اس باوجود بھی تم عورت کے اشاروں پر چلتے رہے۔ ہم پر کیچڑ اچھالتے رہے اور اب جب ہماری عزت کے درپے ہو گئے ہو تو بس ختم۔" تایا کی بھاری آواز میں کہے گئے الفاظ نے دستگیر چچا کو سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ جس وقت وہ اور چچی رافع کو سنبھالے گھر کی دہلیز پار کر رہے تھے۔

دادی کی دبی دبی سسکیاں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ماں تھیں۔۔۔ بیٹا پہلے بھی انہیں کم عزیز نہیں تھا۔ آج بھی اتنا ہی پیارا تھا۔ مگر دل پہ پتھر رکھ کر انہیں ناراضی دکھانی ہی تھی۔

☼ ☼ ☼

روشن، چمکتی ہوئی، ٹھنڈی دھوپ۔۔۔ کالج کے وہ جانے پہچانے کاریڈورز اور دور پروفیسرز کے ساتھ کھڑا عمر اسے سب کچھ بالکل نیا، اجلا اور اچھا محسوس ہوا۔ عمر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور وہ جانتی تھی ایسا وہ دانستہ کر رہا تھا۔ اس کے اغوا کے بعد سے دونوں کے بیچ بول چال بند تھی۔ وہ تایا کے گھر کئی کئی گھنٹے گزار آتی۔ اول تو عمر ہوتا ہی نہ۔۔۔ یا آ بھی جاتا تو مکمل طور پر نظر

انداز کر دیتا۔ آج کالج میں بھی یہی ہو رہا تھا۔ رزلٹ کے بعد نئی کلاسز کے آغاز سے پہلے آج ان کا ٹرپ جا رہا تھا۔ اسے بالکل بھی خواہش نہیں تھی جانے کی مگر سب نے اصرار کر کے بھیجا کہ اس سے اس کا ذہن تھوڑا بٹ جائے گا۔

"اوئے۔۔۔ سر عمر بھی جا رہے ہیں۔" رخشی ہانپتی ہوئی اپنے ساتھ گویا خوشخبری بھی لائی۔ وہ چونک کر حواسوں میں لوٹی۔ اسے خود کو بھی نہیں پتا تھا اور وہ اتنی دیر سے ٹکٹکی باندھے عمر کو دیکھے جا رہی تھی۔

"خوش تو یوں ہو رہی ہو جیسے سر عمر تمہاری خاطر جا رہے ہوں۔" راشدہ کو رخشی کی خوشی کچھ خاص نہیں بھائی۔

"سوچنے میں کیا جاتا ہے۔" رخشی نے گردن اکڑائی یوں بھی کمپیوٹر کے پیپر میں عمر نے سب سے زیادہ اسے نمبر دیے تھے۔ وہ اگر ایسا سوچ لیتی تو یقین کرنے والی بات بھی تھی۔

"بو تھی دھوئی تھی صبح؟" راشدہ نے بھنویں چڑھا کر بالکل دشمنوں کی طرح رخشی کو دیکھا۔

"دھلی ہوئی بھی لگ رہی ہے اور میک اپ زدہ بھی۔" نصرت نے ہنستے ہوئے اپنا ٹھیک اندازہ بتایا۔ واقعی رخشی نے میک اپ کر رکھا تھا۔ حوریہ چپ چاپ ان کی سنے گئی۔ عمر صرف اس کے لیے جا رہا ہے یہ بات وہ ان کو کہاں بتا سکتی تھی۔ پیپرز کے بعد عمر یہاں سے فارغ ہو چکا تھا۔ آج وہ ان کے ساتھ جا تو ٹرپ پہ رہا تھا مگر اپنی گاڑی پر۔ ایک دو پروفیسرز بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ کالج بس کے پیچھے اس کی گاڑی روانہ ہوئی تھی۔ سارا رستہ راشدہ رخشی پر چوٹ کرتے نہ تھکی۔

"سر عمر کی گاڑی دیکھ کر تمہاری باچھیں کھل گئیں ۔۔۔ کوئی تمہیں بٹھانے کے لیے لائے تھے؟"

"جلنے والے کا منہ کالا۔" آج رخشی کو کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔

"اللہ کی شان۔" اسی نوک جھونک میں سفر کٹنے کا پتا بھی نہ چلا۔ ✵ ✵ ✵

مگر واپسی کا سفر کسی سزا جیسا ہو گیا۔ یوں تو دونوں شہروں کا فاصلہ تین گھنٹوں سے زیادہ کا نہیں تھا۔ مگر ایک تو انہیں واپسی آتے آتے دیر ہو گئی۔ پھر یہ مشہور زمانہ روڈ حسب معمول بلاک تھا۔ نتیجتاً ساری بسیں قطار در قطار ٹریفک کے پیچھے رکتی گئیں۔ اور اب رات کے گیارہ بھی بج چکے تھے۔

"اب کیا ہو گا؟" لڑکے سارے نیچے اتر چکے تھے۔ لڑکیاں بھی ایڈونچر کے شوق میں زیادہ پریشان نہیں تھیں مگر حوریہ سراسیمہ ہو گئی۔

"انتظار۔" راشدہ کو اپنی بیٹیوں کی فکر تھی۔ جنہیں وہ ساس کے حوالے کر آئی تھی۔ یقیناً اتنی دیر کی واپسی پر ساس نے گنجا تو ضرور کرنا تھا کہ اس عمر جی چونچلے ۔۔۔ حوریہ نے شیشے کے پار نظر دوڑائی۔ اس کی کلاس کے لڑکوں کے علاوہ باقی لوگ بھی ٹھہرے تھے۔ مگر عمر نظر نہیں آ رہا تھا۔

حوریہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں جب گھڑی نے ایک بجایا۔

"یار کوئی کوشش بھی نہیں کر رہا یہاں سے نکلنے کی۔" وہ حقیقتاً پچھتا رہی تھی۔

"کیسے کوشش کرے۔ آگے دور تک قطار ہے۔" مگر کسی تک اس کے دل کی بات پہنچ چکی تھی۔ وہ بس تھی، ٹرک تھا یا کوئی ویگن۔ اندازہ لگانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ جیسے ہی گزری اس کی بس کے کھڑکیوں کے شیشے تڑاتڑ ٹوٹ گئے۔ بلند آہنگ چیخوں کی ایک سیریز تھی جس نے سڑک پر موجود ساری ٹریفک کو ہلا ڈالا۔

"عمر۔۔۔ عمر۔" اور لڑکیاں صرف چیخ رہی تھیں۔ وہ نا صرف چیخی بلکہ زور زور سے روتے ہوئے پکارنے بھی لگی۔ پروفیسرز اور چند اسٹوڈنٹس پہلے ہی بس پر چڑھ آئے تھے۔ اس زوردار پکار کے بعد عمر جہاں کہیں بھی تھا۔ دوڑتا ہوا بس میں چڑھ آیا۔ وہ ابھی تک کانوں پہ ہاتھ رکھے "عمر عمر" کیے جا رہی تھی۔

"حورا۔۔۔" اس کے بالکل نزدیک آ کر عمر نے دھیمی آواز میں پکارا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑتی فوراً کھڑی ہوئی تھی۔

"میں نے نہیں رکنا یہاں مجھے گھر لے چلو۔" وہ زور زور سے روئے جا رہی تھی۔ ساری بس کو سانپ سونگھ گیا۔

"سب ٹھیک ہے۔ میں ہوں یہاں اوکے۔" عمر اس کے برعکس حواسوں میں بھی تھا۔ اور سب کی موجودگی کی وجہ سے قدرے جھجکا ہوا بھی۔ لڑکیاں، لڑکے حیرت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ راشدہ، رخشی، نصرت بالکل شاکڈ کہ کیا ماجرا ہے۔

"نہیں مجھے ابھی گھر جانا ہے ابھی۔" اس نے ابھی بھی نقاب کر رکھا تھا۔ موٹے موٹے آنسو نقاب بھگو رہے تھے۔ عمر کو اس کے خوف کا بخوبی ادراک تھا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے ہی تو بھیانک ترین حادثے سے گزری تھی۔

"اوکے، اوکے میں کرتا ہوں کچھ تم آرام سے بیٹھو۔" عمر کے ساتھ نے اتنا حوصلہ دیا کہ اس کے آنسو تھم گئے جبکہ اپنا ہاتھ عمر نے خود نامحسوس انداز میں چھڑوا لیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی بیٹھی نہیں کھڑی رہی۔

"سر میں حورا کو اپنی گاڑی میں بٹھاؤں تو کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا۔" وہ سر گورمانی سے پوچھ رہا تھا اور مسئلہ ہی نہیں سر کی آنکھوں میں استعجاب، تشویش اور شک ایک ساتھ پھن پھیلائے کھڑے تھے۔

"سر یہ میری کزن ہیں۔ میرے سگے چچا کی بیٹی اور۔۔۔" اتنا کہہ کر عمر نے اسے دیکھا، قدرے ہچکچایا اور پھر بولا۔

"ہمارا حال ہی میں نکاح ہوا ہے۔ آپ پرنسپل صاحب سے بھی کنفرم کر سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اس بارے میں۔" اس بار صرف راشدہ، رخشی اور نصرت کے نہیں اکثر لڑکیوں کے منہ کھل گئے اور سر نے کیا کنفرم کرنا تھا۔ دو بجے کون سا پرنسپل جاگ رہے ہوتے۔ البتہ انہوں نے سر ہلا کر ٹھیک ہے ضرور کہا تھا اور معاملہ الٹ ہو گیا۔ عمر جھجکا، شرمایا سا آگے آگے اور وہ ادھر ادھر یا اپنی کسی سہیلی کی طرف دیکھے بغیر مطمئن و پرسکون سی اس کے پیچھے بس سے نیچے اتر آئی۔ لڑکیوں نے شیشوں سے گردنیں نکال نکال کر انہیں دیکھا کہ خبر ہی نہیں یہ جوڑی بھی انہیں اچھی لگ رہی تھی اور واپسی کے دوران دل ہی دل میں جھومتا عمر سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا۔

"کیا گلہ دور کیا ہے حوریہ بیگم نے ۔۔۔ کالج تو کیا سارے جگ کو بتا دیا کہ ہم آپ کے ہیں کون؟" اور وہ اس کے دل کی حالت سے بے خبر شیشے سے سر ٹکائے محو خواب رہی۔ ✵ ✵ ✵

"آپ۔۔۔ ابھی تک؟" تین بجے عمر کو گھر بلایا گیا۔ وہ دوستوں کے جمگھٹے سے نکل کر جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ پہلی نظر لان میں موجود نصرت، راشدہ پر پڑی۔ وہ تینوں آج شادی کی مناسبت سے تیار ہوئی تھیں۔ اور اچھی خاصی لگ رہی تھیں۔

"سر آپ ہمیں گھر سے نکال رہے ہیں؟" لال لپ اسٹک سے رنگے ہونٹ لٹکا کر راشدہ نے بڑی بے تکلفی سے ناراضی جتائی تو عمر ہنس پڑا۔

"میرا یہ مطلب بالکل نہیں تھا۔ آپ بے شک کل ولیمہ تک یہیں رک جائیں۔"

"نہیں خیر وہ تو ہم پھر آ جائیں گے۔" مزید بے تکلفی پر اس بار رخشی نے زور سے کہنی ماری تھی۔

"کیا ہے بھائیوں جیسے ہیں۔" راشدہ نے آنکھیں دکھائیں۔ ہتھیلی سہلانے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

"جی بالکل بہن ہیں یہ میری ۔۔۔ ماشاءاللہ سے دسویں۔"

"جی سر۔۔۔ ٹین کہیں ۔۔۔ ویسے آپ کو Ten مل گئی ۔۔۔ شادی مبارک ہو۔" عمر نے گہری سانس لے کر دسویں بہن کی باتیں سننے کے لیے خود میں مزید توانائی بھری۔ راشدہ کی زبان کا اعتبار نہیں تھا۔ کتنا اور کہاں تک کھلنی تھی۔

"شکریہ۔۔۔ آپ نے کھانا کھایا۔"

"جی سر۔۔۔ اس لیے تو رکے ہوئے تھے۔" رخشی کی کہنی ایک بار پھر اس کی پسلی سہلا گئی۔ عمر نے ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبائی۔

"ویسے آپ کی بہن نے نہیں کھایا۔"

"آپ نے کھلانا تھانا۔"

"آپ خود کھلا دیجیے گا۔" وہ ٹھنکی۔ عمر کان کھجانے لگا۔ برا پھنسا تھا۔

"اب چلو بھی۔" اب کے نصرت نے دوسری پسلی کو مشق ستم بنایا۔ راشدہ کو یہ بے تکلفی مہنگی پڑ رہی تھی۔

"ویسے سر آپ نے اچھا نہیں کیا ہمیں نہیں بتایا تھا؟" وہ دسویں بہن والا پورا پورا حق وصول رہی تھی۔

"کیا؟" عمر واقعی نہیں سمجھا۔

"یہ کہ Ten آپ کی کزن ہے اور......"

"میں کیسے بتاتا حوریہ نے بہت سی دھمکیاں دی تھیں۔"

"اچھا تو آپ ڈر گئے......؟"

"محبت میں۔" راشدہ کا قہقہہ اتنا اونچا پڑا کہ عمر بھی گھبرا کر ادر گرد دیکھنے لگا۔ بہنیں ساری دلہن کے چاؤ اٹھانے میں مصروف تھیں۔

"سر آپ...... آپ نے تا وہ ہونے کا پروف ابھی سے دے دیا۔"

"وہ کیا؟" عمر کے کان پھر سے کھڑے ہوئے راشدہ سے کچھ بعید نہیں تھا کیا کہہ دے۔

"جورو کا غلام۔" راشدہ نے "وہ" کا خلاصہ کیا۔ نصرت کی کہنی پھر سے پسلی پر پڑی۔

"آپ دنیا کے ہر شوہر کو اپنے شوہر سے مت میچ کیجیے۔" عمر نے مسکراتے ہوئے بچی سی چوٹ کی تھی۔ راشدہ نے ہنستے ہوئے سہی۔

"سر اب ہم چلتے ہیں۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ یہ تو ویلی (فارغ) ہے۔" بالآخر رخشی نے زبان کھولی شادی والے گھر میں پتا نہیں چل رہا تھا۔ مگر رات واقعی بہت ہو گئی تھی۔ کچھ دیر اور رکتیں تو فجر کی اذان ہونے لگتی۔

"او کے۔ کیسے جائیں گی آپ؟" عمر نے اصرار مناسب نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"سر میں اپنے بھائی کو فون کرتی ہوں وہ لے جائے گا۔"

"آپ ایسا کریں۔" عمر کو رخشی کی اس تجویز سے کچھ اختلاف ہوا۔

"بھائی کو تنگ مت کریں معید...... یار۔" ساتھ ہی اس نے دور کرسیاں اٹھواتے معید کو آواز بھی دے ڈالی۔

"معید آپ کو چھوڑ دے گا۔" معید قریب آ گیا تھا۔

"سر آپ...... بس وہ ہم بھائی کو بلا لیتے۔" رخشی اس خیال سے کہ معید خوامخواہ زحمت کرے گا۔ کچھ ہچکچائی۔

"کیوں بھئی۔" عمر حیران ہوا۔

"معید نہیں تو میں خود چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں نہیں سر۔" راشدہ جلدی سے بولی ساتھ ہی رخشی کو گھور کر "پاگل" بھی کہا۔

"ہم معید کے ساتھ چلے جائیں گے۔"

"دیٹس رائیٹ میں لبنیٰ باجی سے بھی کہتا ہوں۔ آپ کے ساتھ چلی جائیں ٹھیک رہے گا۔" لبنیٰ باجی لان میں ہی آ رہی تھیں۔ عمر نے ان کو رخشی لوگوں کا مسئلہ بتایا۔ وہ بلا حجت معید کی ہمراہی میں انہیں ڈراپ کرنے پر تیار ہو گئیں۔

"سر آپ کا شکریہ' آپ نے اپنی شادی پر انوائیٹ کر کے وعدہ نبھایا۔" جاتے جاتے بھی راشدہ زبان کے جوہر دکھاتی گئی۔ عمر نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ چلی گئیں تو ہلکا پھلکا سا ہو کر پہلے چہار اطراف اور پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ گھر ہی نہیں آسمان بھی تاروں کی چادر سے دمک رہا تھا۔ بالآخر حوریہ اس کی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

خوشبوؤں سے معطر ہوئے اپنے کمرے میں جیسے ہی قدم رکھا نظریں بے ساختہ بیڈ پر گئیں۔ اگلے ہی پل وہ بھونچکا رہ گیا۔ بیڈ خالی تھا۔ دلہن کہاں تھی؟ اس نے نظریں گھمائیں۔ اور قدرے مطمئن ہوا دلہن بیڈ روم فریج میں منہ دیے کھڑی تھی۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور دھیمی آواز میں کھنکار کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔

حوریہ بوکھلا کر سیدھی ہوئی۔ عمر اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ بے حس و حرکت' ساکت و صامت' یک ٹک' اسے دیکھتا' بے خود ہوتا' بے بس سا بالکل مبہوت وہ یقیناً" دنیا کی حسین ترین دلہن لگ رہی تھی۔ یا صرف اسے ہی لگ رہی تھی۔ نظروں کے اس وارفتہ اور استحقاق بھرے ارتکاز نے حوریہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔ گھبراہٹ پر شرم...... اور شرم پر جھنجلاہٹ بہت غالب ہوئی جب عمر ٹس سے مس ہونے کے موڈ میں نظر نہ آیا۔ وہ خاصی فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حوریہ نے انگلیاں مروڑنا ترک کر کے بھنویں سکیڑ لیں۔

"وہ......" بات کرنے کی ابتدا دلہن کی طرف سے ہوئی اور عمر جاگ گیا۔

"مجھے بھوک لگ رہی تھی۔" گویا یہ ایک غلطی تھی۔ جس کا اعتراف اسے کرنا پڑ رہا تھا۔ عمر کے لبوں مسکراہٹ رینگ گئی۔

"پھر کچھ لیا کیوں نہیں فریج میں جوس' فروٹ سلائس' ہٹو سب کچھ موجود ہے۔" عمر اسے بغور دیکھ کر بولا اس نے منہ بنا لیا تھا۔

"ہاں پر...... یہی سب کچھ میں چار دنوں سے کھا رہی ہوں۔" نہ اپنے دلہن ہونے کے اعزاز کا مان...... نہ سامنے کھڑے دولہا کے جذبات کی فکر...... نہ اس نئے بندھن کی نزاکت کا احساس۔ وہ بڑی معصوم سی شکل میں اپنی پریشانی بتاتی عمر کے دل میں اتر گئی۔

"اچھا......" عمر نے یوں سوچنے میں ٹائم لیا جیسے بڑا مسئلہ آن پڑا ہو...... پھر مبہم مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اگر تم مجھ سے دوستی کر لو تو میں تمہیں ابھی باہر لے جا کر تمہاری مرضی کا ڈنر کروا سکتا ہوں۔" حوریہ نے قدرے مشکوک ہو کر اسے دیکھا۔ اپنے لفظوں کی طرح اس کی شکل پہ بھی نرماہٹیں تھیں۔ آنکھوں میں محبت کے علاوہ کوئی پیغام نہیں تھا۔ حوریہ نے نظریں جھکا کر بری طرح سے انگلیاں چٹخانا شروع کر دیا۔ عمر ایک بار پھر فرحت و محبت سے دیکھے گیا۔

"ابھی......" وہ بے یقین تھی۔

"ہاں ابھی۔" عمر کا انداز قطعی تھا۔

"سب باہر؟" یہ پریشانی بھی بجا تھی۔

"کچھ سو چکے تھے کچھ سونے کی تیاریوں میں تھے۔" عمر نے نظروں کی گرفت برقرار رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس کی انہی نظروں سے خائف یہاں وہاں اوپر نیچے دیکھ رہی تھی۔ صرف اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔

"اچھا......" بالآخر دل آمادہ ہوا کہ بھوک بہت حاوی ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔" ابھی بھی اسے دیکھے بنا مثبت عندیہ دیا۔ عمر مزے سے ہنسا۔ نظریں چرانے کی یہ مشق بھی خوب تھی۔ وہ اس پہ بھی ظلم کر رہی تھی اور خود پر بھی وہ اسے دیکھتے دیکھتے سیر نہیں ہو رہا تھا اور وہ اسے دیکھنے سے ہی گریزاں۔

"ہاں تو ملاؤ ہاتھ۔" عمر ابھی تک منتظر تھا۔ حوریہ نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد' مہندی' چوڑیوں' انگوٹھیوں سے سجا ہاتھ' اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جسے بڑے دل سے عمر نے تھاما وہ قدرے سرخ پڑی۔

"لیکن......" اچانک ہی وہ بولی۔

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔" بڑا غیر متوقع جملہ تھا۔ عمر نے سنا' غور کیا' اور پھر زور سے ہنس دیا۔ محاذ عجلت میں جیت کس کا نصیب بنی تھی۔ یہ تو حوریہ کو خود نظریں چرا کر چھپانا پڑ رہا تھا۔

"میں ایسا نہیں سمجھ رہا ہوں لیکن......" ہنسی روک کر وہ دھیمے سے کہنے لگا۔

"میری محبت میں دم ہوا تو تمہیں اچھا بھی لگنے لگوں گا اور تمہیں مجھ سے محبت بھی ہو جائے گی۔ ہے نا۔" حوریہ سے کیا جواب بنتا تھا۔ پہلے نظریں چرا رہی تھی۔ اب ہاتھ چھڑا کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ بھی چھپا لیا۔ گویا اعتراف محبت پر پردہ گرا دیا۔ عمر اس ادائے خاص پر سرشار سا ہو تا ہنسنے لگا تھا۔

☼ ☼

شاہدہ ملک

دل سدا روشن رہے

روشنی کی معمولی سی کرن اندھیرے کی دبیز چادر کو کاٹنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان اندھیرے کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہوتا ہے اور کسی درز سے آنے والی روشنی کی معمولی سی کرن اس کی راہنما بن کر اس کی منزل کا راستہ دکھا جاتی ہے۔

کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا تھا اور اب وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے کمرے میں بند اپنی ذات کا محاسبہ کر رہی تھی۔ ننھے یامین کا کہا گیا جملہ ایک تکرار کی صورت اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ تسمیہ منصور جو اپنے آگے ہر کسی کو ہیچ سمجھتی تھی۔ ایک جملے کے سحر سے نکل نہیں پارہی تھی۔

یامین عبداللہ کلاس کا انوکھا بچہ تھا۔ جسے صحیح معنوں میں ابنارمل چائلڈ کہا جا سکتا تھا۔ والدین کی علیحدگی کے بعد دادی کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے والا یامین ڈھیر سارے کزنز کی ساتھ رہتے ہوئے دو چچیوں کے زیرِ عتاب رہتا تھا۔ اور اس کے حالات نے اسے اس قدر جھگڑالو بنا دیا تھا کہ وہ چلتی ہوا سے بھی پنگا لے لیتا تھا۔ وہ تسمیہ کی کلاس میں نہیں تھا۔ مگر ایک دن اس کی موجودگی میں تھری کلاس کی انچارج زنیرہ کو پرنسپل نے یامین کا بیک گراؤنڈ بتاتے ہوئے کچھ ہدایات دی تھیں اور تسمیہ چونکہ ان کا انگلش کا پریڈ لیتی تھی۔ لہٰذا اس کے متعلق مکمل طور پر آگاہ ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے؟ کچھ پریشان لگ رہی ہو بیٹا؟" صبیحہ صوفے پر بیٹھی چینل سرچنگ کر رہی تھیں۔ جب تسمیہ نے کسی میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے اسے ٹیبل پر پٹخ دیا تو وہ چونک اٹھی تھیں۔

"مما میں یہاں بہت بور ہو گئی ہوں پلیز واپس کراچی چلیں نا۔" وہ منہ بسور کر کہہ رہی تھی۔

"چلے چلیں گے چندا بس ذرا اس بڈھے کو کھسکنے دو نا۔" انہوں نے لاڈ سے اس کا سر سہلایا تھا۔

"کب چلیں گے؟ مجھے عاشی، مشی اور اپنے فرینڈز بہت یاد آتے ہیں۔" اس نے ٹھنک کر کہا تھا۔

"بہت جلد۔" صبیحہ نے یقین سے کہتے ہوئے اسے مختصر جواب دیا تھا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتیں ٹائم پاس کرنے کے لیے کوئی جاب کر لو۔"

"مما گڈ آئیڈیا، حیرت کی بات ہے مجھے پہلے کیوں خیال نہیں آیا۔" وہ یکدم اٹھ بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

ظہور علی بخاری کے سپوت منصور بخاری نے والدین کی مخالفت کے باوجود صبیحہ سے شادی کی تھی جو کہ ان کی کلاس فیلو تھیں۔ صبیحہ منصور ایک لبرل گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ اپنے دل سے اس بات کو کبھی نہ نکال سکیں کہ شوہر کے خاندان میں انہیں من چاہی بہو کا اعزاز نہیں ملا۔ اگرچہ شروع میں انہوں نے اس بات کو دل پر لیا مگر کچھ عرصہ کے بعد یہی بات انہیں اپنے حق میں سود مند نظر آنے لگی کہ منصور ان کے اشاروں پر چلنے والے شوہر تھے۔ اور کسی بھی سسرالی رشتہ کی مداخلت کے بغیر وہ بلا روک ٹوک زندگی گزارتی رہیں یوں انہیں اپنے بہن بھائیوں کے قریب رہنے کا موقع بھی ملا تھا۔

شادی کے پندرہ سال بعد وہ پہلی مرتبہ سسرال آئی تھیں۔ اس کے بعد منصور کا اگرچہ اپنے والدین سے ملنا ملانا رہا مگر انہوں نے ہمیشہ کنارہ کشی قائم رکھی۔ اور اب بائیس سال کے بعد وہ سسرال میں رہائش پذیر ہونے پر آمادہ ہوئیں تو اس کے پیچھے ایک وجہ تھی۔ ظہور علی بخاری علیل تھے اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے بغیر منصور کے ساتھ جائیداد کی صورت میں حق تلفی ہو۔ اگرچہ کلر کہار آکر انہوں نے اپنے لیے متعدد مشاغل ڈھونڈ لیے تھے۔ مگر ان کی اکلوتی بیٹی تسمیہ منصور کو یہاں ایڈجسٹ ہونے میں بہت دشواری پیش آرہی تھی۔ چچا کی دونوں بیٹیوں لاریب اور حنا سے اس کی کوئی خاص نہ بن سکی کہ اس کے

نزدیک وہ اپنے خول میں بند رہنے والی دبو سے لڑکیاں تھیں۔ جن کے مشاغل اور دلچسپیاں ان سے قطعی میل نہ کھاتی تھیں۔ سو اب ماں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے جاب کی تلاش شروع کی اور اگلے ہفتے اسے ایک انگلش میڈیم اسکول میں ٹیچر کی جاب مل گئی۔ اگرچہ یہ کام اس کے مزاج سے قطعی مطابقت نہ رکھتا تھا۔ مگر خیر یہاں بھی برتری دکھانے کے ڈھیروں مواقع موجود تھے۔

☼ ☼ ☼

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ کسی فیشن شو میں کیٹ واک کرنے جا رہی ہیں آپ؟" وہ کافی دیر سے ڈرائیونگ سیٹ پر اس کے انتظار میں براجمان تھا۔ مگر جب وہ بڑے کروفر سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کے مقابل آن بیٹھی تو اس کا حلیہ دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

"آپ کو اس سے مطلب؟" تسمیہ نے جواب دینے کے بجائے اطمینان سے پوچھا۔

"تم ظہور علی بخاری کے خاندان کی عزت ہو تمہیں اس حلیے میں دیکھ کر لوگ ہمارے خاندان کے بارے میں کیا کہیں گے؟" یکدم ہی وہ سارے ادب آداب بالائے طاق رکھ کر اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"واٹ ربش؟ کون سے لوگ، یہ تھرڈ لوگ اور کر ہی کیا سکتے ہیں سوائے۔"

"نکلو.... نکلو میری گاڑی سے۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سعد نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایکسکیوزمی دادا جان نے آپ کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ آپ مجھے پک اینڈ ڈراپ دیں گے۔" اس نے تیکھی نظروں کے ساتھ اسے یاد دلایا تھا۔

"آؤٹ۔" سعد اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور گھوم کر دوسری طرف کا دروازہ کھول کر انتہائی درشت لہجے میں اس سے یوں مخاطب ہوا تھا کہ تسمیہ کو لگا جیسے ابھی اسے بازو سے پکڑ کر نیچے اتار دے گا۔

سلیولیس شارٹ شرٹ اور ٹراؤزر کے ساتھ بغیر دوپٹے کے بنی سنوری تسمیہ غصے سے باہر نکلی اور کھٹ کھٹ کرتی اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"اسٹوپڈ اتنا ٹائم ویسٹ کر دیا کل سے دادا جان سے صاف صاف کہوں گا کہ اس مغلی طرز کے نمونے کا کوئی اور انتظام کریں۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ زن سے گاڑی نکال کر لے گیا۔

☼ ☼ ☼

جلیل کامران اسکول کے پرنسپل اور ایم ڈی تھے۔ وہ تسمیہ کو بطور خاص ایڈمائر کرتے اور وہ بھی اسے اپنا حق سمجھتی تھی کہ فرفر کونونٹ کے لہجے میں انگریزی بولنے والی تسمیہ کے سامنے یہاں کی دبو ٹیچرز کہاں ٹکتی تھیں۔

"آپ سب ٹیچرز اس بات کا خیال رکھا کریں کہ کلاس کے علاوہ اسٹاف روم میں بھی انگریزی زبان میں بات کریں۔ جیسے کہ ہمارے پاس میڈم تسمیہ ہیں۔ آپ لوگ انہیں فالو کرنے کی کوشش کریں۔ ان کا اسٹائل، ان کی ڈریسنگ، ان کی لینگویج، ایسے ٹیچرز ہمارے اسکول کا اسٹینڈرڈ امپروو کرتے ہیں۔" سر جلیل نے اسٹاف میٹنگ میں کہا تو تمام ٹیچرز نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا تھا۔ مگر ان کی اگلی بات پر بہت سے چہروں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ جبکہ چند ٹیچرز نے اسے سرد نظروں سے دیکھا تھا۔ جو ایک ادائے تفاخر سے سر جلیل کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

یوں یہ مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ مگر ظہور بخاری جو اپنے بیٹے کو مستقل طور پر پاکر بہت خوش تھے۔ اور ان کی صحت بھی تیزی سے بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اپنی خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے انہوں نے ایک اور فیصلہ کر لیا ـ اور وہ یہ کہ وہ تسمیہ کو اپنے پوتے یعنی مسعود بخاری کے اکلوتے لخت جگر سے منسوب کرنا چاہتے تھے۔ صبیحہ کے لیے یہ خبر ازحد مسرت کا باعث بنی۔ وہ اپنے سسر کی آدھی دولت کے لیے سراپا انتظار

تھیں۔ مگر اس طرح ان کی تمام دولت کے حق دار تسمیہ اور سعد ٹھہرتے۔ کیونکہ سعد کے علاوہ مسعود کی دو بیٹیاں تھیں اور اس پرائے دھن کو رخصت ہو کر جانا ہی تھا۔ اور پھر سعد جیسا خوبرو اور ہائی ایجوکیٹڈ لڑکا تو ان کے میکے میں بھی کوئی نہ تھا۔ مگر تسمیہ نے یہ سن کر واویلا ہی مچا دیا تھا۔ کہاں سعد علی بخاری جیسا اکھڑ مزاج اور تنگ نظر شخص جس کے قریب سے بھی وہ گزرنا پسند نہ کرتی۔ کجا یہ کہ اسے سعد سے منسوب کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ صبیحہ کو اس کا یہ انکار قطعی پسند نہ آیا تھا۔ مگر جان چھڑانے کو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہو گا۔ یوں تسمیہ کو کسی قدر تسلی تو ہوئی مگر نئے سرے سے سوچ کر اس کا دماغ گھومنے لگتا تھا۔ بے زاری سے وہ پیپرز لے کر وہ آفس میں چلی آئی تھی۔ جہاں سر کامران جلیل نے اسے خوشدلی سے بیٹھنے کو کہا تھا۔

"کافی یا چائے؟" انہوں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

"اٹز نو وش سر۔" وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لائی تھی۔ مگر تھوڑی دیر کی گپ شپ کے بعد چائے پیتے اس کا موڈ خاص خوشگوار ہو گیا تھا۔ سر جلیل باتیں ہی اس قدر دلچسپ کرتے تھے۔ ان کی کسی بات پر اس نے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ جب صبا کسی کام سے آفس میں داخل ہوئی۔ اور تسمیہ کو یوں لگا جیسے صبا نے اسے قدرے ناگواری سے دیکھا تھا۔ پورے اسٹاف میں صبا ہی وہ واحد ٹیچر تھی۔ جس سے کسی حد تک تسمیہ کی بن سکی تھی۔ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بھی صبا نے ہی بڑھایا تھا۔ اور تسمیہ کو اس کی مخلص طبیعت نے خاصا متاثر کیا تھا۔

"سنو کہتے ہیں عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ مرد کی ہر نگاہ خاص کو جانچ لیتی ہے کیا اللہ نے تمہیں اس حس سے محروم رکھا ہے۔" بریک کے دوران دھوپ پر بیٹھ کر جوس پیتے ہوئے صبا نے اس سے سوال کیا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"کیا واقعی تم سر کامران کی بد نظر کو نہیں پہچان سکیں؟" صبا نے سیدھے سادے انداز میں پوچھا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو؟ وہ تمہاری تعریفیں کیوں کرتے ہیں؟" وہ اس کے حیرت بھرے چہرے کو نظر انداز کر کے مزید کہہ رہی تھی۔

"اچھی چیز کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔ ٹاپ اسٹینڈرڈ ادارے سے حاصل کی ہوئی ٹاپ کلاس ڈگریز" میرا بول چال، میری ڈریسنگ، میرا اسٹائل ایوری تھنگ از پرفیکٹ اینڈ گریس فل۔" وہ اترائی تھی۔

"تسمیہ، یہ جو مس زنیرہ ہے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایس کیمسٹری میں ٹاپ کیا تھا اور پی سی ایس ایگزام میں اسے کال لیٹر بھی ملا تھا۔ مگر دوسرے ڈسٹرکٹ میں اپائنٹ منٹ ہونے کی وجہ سے اس کے پیرنٹس نے اسے جوائن نہیں کرنے دیا۔ سر نے کبھی اس کی تعریف کی ہے نہیں نا۔

اور یہ جو تجل ہے۔ اس نے انگلش لٹریچر میں

NUML، یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا ہے اور ہیڈ آفس کی سلیکشن میں اس کا پہلا نمبر تھا اس کی قابلیت پر کوئی بھی شک و شبہ نہیں کر سکتا۔ مگر سر نے اس کی تعریف میں ایک لفظ بھی کہا ہے؟"

"تو میں کیا کروں؟" وہ صبا کی تقریر سے بے زار ہو چلی تھی۔

"سمجھنے کی کوشش کرو؟" صبا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"جلیل کامران جیسا بد خصلت انسان ڈریسنگ اور انداز سے تمہیں اپنا آسان ہدف سمجھتا ہے اور یہ تعریفیں دراصل تمہیں گھیرنے کے لیے ہیں۔ تم میرے لیے چھوٹی بہنوں کی طرح ہو اور میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا بے باک انداز اور بے ہودہ ڈریسنگ کو تبدیل کرو۔"

"شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ! تم جیسی تھرڈ کلاس لڑکیاں جب کسی سے جیلس ہوتی ہیں تو یوں ہی بکواس کرتی ہیں۔" پہلے تو وہ صبا کی بات پر جیسے ساکت ہو گئی تھی۔ پھر جب بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی

صبا اس کے رویے پر خاصی دل برداشتہ ہوئی تھی اور خاموشی سے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

اس روز اسے صبا پر اس قدر غصہ آیا تھا کہ دل چاہ رہا تھا کہ گویا کچھ کر ڈالے۔ اسی دن سے اسکول میں چھٹیاں بھی ہو گئی تھیں۔ لہٰذا ان کا آمنا سامنا بھی نہیں ہوا۔

"لوگ پیدا ہوتے ہی سو گئے' لوگ پیدا ہوتے ہی سو گئے۔" چھٹیوں کی وجہ سے وہ آج کل بہت دیر تک سوئی رہتی تھی۔ اس وقت بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ جب ساری لائٹس آن ہو گئیں اور صبا کی آواز کسی پرومو کی طرح کمرے میں گردش کرنے لگی تھی۔

"ارے تم؟" اس نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔

"آنٹی ذرا دیکھیے تو لوگ نیند کے کس قدر کچے نکلے دنیا میں آتے ہی سو گئے۔" وہ پیچھے مڑ کر صبیحہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ آج اس کی برتھ ڈے ہے' ورنہ کراچی میں تو وہ اپنی سالگرہ بہت دھوم دھڑکے سے منایا کرتی تھی۔ صبا سے اس کی خفگی یک دم ہی ماند پڑ گئی تھی۔

آج پہلی بار اس کے گھر آ کر جس خوب صورت انداز میں اس نے برتھ ڈے وش کی تھی۔ یہ صبا کی اس سے بھرپور محبت کا عکاس تھا۔ پھر گھر آئے مہمان سے وہ بے مروتی کا مظاہرہ نہیں کر سکی تھی۔ وہ اس کے لیے پھولوں کے ساتھ خوب صورت امبرائیڈڈ سوٹ لائی تھی۔ جس کا دوپٹہ ہی کم از کم اڑھائی تین میٹر تھا۔

"ایسا سوٹ تو میں ستر سال کی ہو کر بھی نہیں پہن سکوں گی۔" اس کے جانے کے بعد وہ سوٹ کھول کر دیکھتے ہوئے خود سے مخاطب ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سعد دن ڈھلے کسی کام سے باہر نکلا تھا۔ گھر کے قریبی پارک کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نظر جنگلے سے لٹکتے تین لفنگے سے لڑکوں پر پڑی تھی۔ وہ نہ جانے کس منظر کو اس قدر دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ انہیں گرد و پیش کی خبر ہی نہ تھی۔ اس کی نظراِن دلچسپی کے تعاقب میں گئی تھی اور اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں میں لہرا گیا۔ اس کا سارا خون کنپٹیوں میں جوش مارنے لگا۔ محترمہ تسمیہ صاحبہ بڑے اطمینان سے واک فرما رہی تھیں اور وہ لفنگے اس کی شاندار ڈریسنگ پر تبصرے کرتے ہوئے یقیناً "محظوظ" بھی ہو رہے تھے۔

یک دم وہ گاڑی روک کر اس کے پاس چلا گیا تھا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں گھر میں کوئی ایمرجنسی ہے۔" اس نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے اطمینان سے کہا تھا۔ تسمیہ جلدی سے گاڑی میں آن بیٹھی تھی۔

"کیا پرابلم ہے بتائیں تو سہی مجھے ٹینشن ہو رہی ہے۔" چند منٹ میں اس نے کوئی پانچ دفعہ اس سے

سوال کیا تھا۔

"سب سے بڑی ٹینشن اور سب سے سیریس پرابلم تم ہو۔" گاڑی پورچ ہی میں کھڑی کر کے بازو سے کھینچتے ہوئے وہ اسے اس کے پورشن میں لا کر جیسے پھٹ پڑا تھا۔

"اگر آئندہ تم اس حلیے میں گھر سے باہر گئیں تو اچھا نہیں ہو گا۔"

"آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے یوں بات کرنے والے۔۔۔ اور کیا کر لیں گے آپ؟" وہ ہٹ دھرمی سے گویا ہوئی تھی۔

اگلے لمحے تڑاخ کی آواز کے ساتھ اس کا ہاتھ تسمیہ کا گال دہکا گیا تھا۔

"میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔" غصے سے کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر وہ جیسے ہوش میں آئی تھی اور پھر جو باآواز بلند رونا شروع کیا تو صبیحہ جو چھت پر تھیں بھاگی بھاگی نیچے آئی تھیں۔ پھر تسمیہ سے ساری بات سن کر وہ بھی جوش میں آئی تھیں۔

"آنے دو تمہارے بابا جان کو کرتی ہوں میں ان سے بات اور اس بڈھے سے بھی نواب زادے کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔"

مگر انہیں بات کرنے کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ خبر آ گئی تھی۔ جس نے گھر بھر کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ شہر کے ایک معروف چوک سے گزرتے ہوئے اس کی گاڑی کا ٹرک سے تصادم ہوا تھا۔ جس میں اسے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ تسمیہ کو اس سے اس قدر بیر ہو چکا تھا کہ اسے ذرا بھی افسوس نہ ہوا بلکہ یوں لگا کہ اس کی بددعا ہی لگی ہے۔

☆ ☆ ☆

گھر کے تمام افراد کی روٹین ہی بدل گئی تھی۔ ہسپتال آنا جانا' پورا دن اور پوری رات ڈیوٹیاں بدل کر اس کے پاس رہنا' دادا جان حتیٰ کہ صبیحہ بھی کئی چکر ہسپتال کے لگا آئی تھیں۔ کئی مرتبہ وہ اسے بھی چلنے کے لیے کہہ چکی تھیں مگر ہر بار اس نے انکار کر دیا تھا اور اپنی شب و روز کی پرانی روٹین پر عمل پیرا تھی۔

گیم پیریڈ میں ٹیچرز گروپ کی صورت میں بیٹھ کر کاپیاں چیک کر رہی تھیں۔ جب تھری کلاس کا یامین عبداللہ اپنی ٹیچر زینبہ کو بلانے آیا تھا۔ یامین عبداللہ کی طبیعت میں بہت سے متضاد پہلو تھے۔ مگر اس کی اسپیشل بات یہ تھی کہ جواب دینے میں سینئر' جونیئر' بڑے چھوٹے "کا احترام بالائے طاق رکھ دیتا تھا چونکہ بہت جھگڑالو تھا۔ لہٰذا اکثر اسٹوڈنٹس کے ساتھ ٹیچرز بھی اسے چھیڑ جاتے تھے۔ کیونکہ اس چھیڑ چھاڑ کا جواب وہ بہت دلچسپ دیتا تھا۔ اس وقت وہ نیکر شرٹ میں ملبوس تھا۔ نہ جانے صبا کو کیا سوجھی کہ وہ اسے چھیڑ

بیٹھی تھی۔

"آہا یامین کی توشیم ہو رہی ہے۔" صبا نے اس کی ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حسب توقع گول مٹول یامین عبداللہ تپ کر لال بھبھوکا ہو گیا۔ اس نے جیسے صدمے کی کیفیت میں صبا کو یوں دیکھا جیسے وہ کتنا بڑا الزام لگا رہی ہے اس پر۔

"جو ٹیچرز اتنے کھلے گلے پہنتی ہیں ان کی شیم نہیں ہوتی میری بڑی شیم نظر آ رہی ہے ٹیچر آپ کو۔" اس نے تڑاخ سے صبا کو جواب دیا تھا اسٹاف روم میں موجود ٹیچرز کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں چند ایک نے تسمیہ پر نگاہ بھی ڈالی تھی یقیناً "شیم کا یہ پہلو اس پر فٹ بیٹھتا تھا اور تسمیہ تو یامین کی بات پر جیسے ساکت ہو گئی تھی۔

اب کمرے میں مقید گزشتہ کئی گھنٹوں سے سوچتے ہوئے وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اپنے برہنہ جسم کو آئینے میں دیکھتے ہی اسے اپنے حلیے سے نفرت ہونے لگی تھی۔

"کیا یامین جیسا فرشتہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ نہیں۔" اس کا ذہن اپنے سوال کی نفی کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے اردگرد موجود بہت سے کرداروں کے اصلی اور نقلی چہرے اس پر واضح ہونے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

سعد ہسپتال سے فارغ ہو کر بیڈ ریسٹ پر تھا۔ تسمیہ نے ٹیرس سے اسے پچھلے لان میں تائی کے ساتھ دھوپ میں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ سو وہ پھولوں کا بکے اور کارڈ اٹھائے ان کے پورشن کی طرف بھاگی تھی۔

خوب صورت تحریر سے سجا وہ کارڈ پھولوں کے اوپر رکھ کر وہ واپس تیزی سے مڑی تھی۔ جب سعد کو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

"بھئی کیا تخریب کاری ہو رہی ہے یہاں۔" ہولے ہولے قدم اٹھاتا وہ اس کی طرف بڑھا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس ٹیبل تک لے آیا تھا۔

"یہ نہ ہو کہ آپ نے یہاں بم شم رکھا ہو اور میں اکیلا ہی اوپر چلا جاؤں۔ ویسے آپ نے بتایا نہیں آپ ہیں کون؟ اس سے پہلے تو میں نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں ہے۔" وہ اس وقت صبا کے گفٹ کردہ سوٹ میں ملبوس تھی اور دوپٹہ نما شال کو بھی سر پر اچھی طرح جما رکھا تھا۔ آنکھوں میں ہزاروں رنگ لیے وہ شرارت سے اس کے حلیے پر حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کے ایک شانے کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی تھی اس پر ابھی تک پلستر چڑھا ہوا تھا۔ سو اس نے ایک ہاتھ سے کارڈ کھولنے کے لیے۔ جونہی اس کا ہاتھ چھوڑا وہ باہر کی طرف بھاگی مگر پھر دروازے پر ہی رک گئی تھی۔

چلو کہ جشن بہاراں دیکھیں
چلو کہ پھولوں کے ساتھ کھیلیں
چلو کہ خیام کی رباعی کا
کوئی مصرعہ ہی گنگنائیں
کہ اس زمین پر
بجز محبت
کوئی بھی جذبہ امر نہیں ہے
مگر کسی کو خبر نہیں ہے

سعد کارڈ پڑھ کر مسکرا رہا تھا۔ کسی کام سے اس کے کمرے میں آتے دادا جان نے ان دونوں کو یوں دیکھا تو مطمئن سے مسکرا دیے۔

☆ ☆

ضو باریہ ساحر

مقیدِ خاکداں

اختر اپنی جگہ حیران تھا اور میں اپنی' اور تو اور مہرجی پلٹ کر حیرت و بے یقینی سے پروفیسر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے لیے پروفیسر کا یہ رویہ حیرت اور بے یقینی کا باعث تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ اختر کچھ کہتا میں نے اسے ٹوک دیا۔

"اختر خاموش ہو جاؤ۔" اور اختر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

ہم دوسری جانب پہنچ گئے کنارے پر لگے درخت اور جھاڑیاں بہت گھنی تھیں۔ ہم بڑی مشکلوں سے نالے میں سے نکلے اور جھاڑیوں کی دوسری جانب پہنچے۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر ابھی پوری طرح اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ نالے کے دونوں طرف موجود درختوں پر بے شمار پرندے چہچہانے لگے تھے اس کے باوجود پہاڑوں کی ہیبت ناک خاموشی ایک بوجھل احساس سے دوچار کر رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ سڑک اسی طرف ہوگی۔ آئیں احتیاط کے ساتھ۔" مہرجی نے تیز لہجے میں کہا اور جھکے جھکے انداز میں جنوبی سمت کو چل پڑی۔ ہم بھی فوراً اس کے پیچھے چل پڑے۔ چند قدم چلنے کے بعد مہرجی نے اپنی رائفل جھاڑیوں کے درمیان سے نالے میں سرکا دی اور پروفیسر کے ہاتھ سے رائفل لے لی۔ اور پھر دوڑنے والے انداز میں آگے بڑھنے لگی ہم نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ قدموں کے تلے گھاس بچھی ہوئی تھی۔ کہیں تو ایک سبز چادر کی صورت اور کہیں اچھی خاصی اونچی اونچی۔ نالا ایک نصف دائرے کی صورت آگے بڑھ رہا تھا اور ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جھاڑیاں مزید گھنی ہوتی جا رہی تھیں جگہ جگہ گھاس میں چھوٹے بڑے پتھر بکھرے پڑے تھے دو ایک بار تو میں ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا تھا جب کہ پروفیسر صاحب دو تین سجدے کر چکے تھے۔ اندھیرا ابھی گہرا ہونے لگا تھا اور اندھیرے میں ایسی جگہ آگے بڑھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

بھاگتے بھاگتے اچانک پروفیسر صاحب کو ایک بار پھر ٹھوکر لگی۔ انہوں نے سنبھلنے کی کوشش بھی کی مگر اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے وہ گرے' ان کے منہ سے ایک دردناک کراہ خارج ہوئی اور وہ اپنا دایاں گھٹنا پکڑ کر گھاس پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"پروفیسر صاحب!" میں نے لپک کر ان کو تھاما۔ اختر اور مہرجی رک کر قریب آگئے۔ پروفیسر کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

"پروفیسر کیا زیادہ لگ گئی ہے؟" مہرجی نے کہا۔ "دکھائیں۔"

"نہیں... کوئی بات نہیں۔" پروفیسر نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"دکھائیں تو سہی۔۔۔" میں نے ان کا گھٹنا ننگا کر دیا اچھی خاصی چوٹ آئی تھی گھٹنے سے کھال اتر گئی تھی اور خون رسنے لگا تھا۔

"ارے چھوڑو بس معمولی رگڑ ہے۔" پروفیسر نے پائنچہ درست کیا اور اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

"چلو آگے بڑھو ہمیں جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچنا ہے۔ آگے بڑھو۔" اور ہم سب دوبارہ چل پڑے مگر اب کے ہماری رفتار نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ اندھیرا ابھی پھیل گیا تھا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں تیز رفتاری بڑی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی البتہ ہم ایک منٹ کو بھی کہیں نہیں رکے مسلسل چلتے رہے۔ آخر تین گھنٹے کے صبر آزما سفر کے بعد ہم سڑک تک پہنچ گئے بے اختیار ہمارے منہ سے مسرت انگیز قلقاریاں خارج ہو گئیں۔ سڑک پر پہنچ کر ہمیں یوں لگا تھا جیسے ہم دنیا فتح کر آئے ہیں۔ جیسے ہم نے ہفت اقلیم کی دولت پالی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم وادی اجل سے بچ کر زندگی کی آغوش میں پہنچ آئے ہوں۔

"مہر جی! اب بتاؤ ہمیں آگے کس طرف جانا ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"دائیں رخ۔" مہر جی نے فوراً کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم رام پور پہنچ گئے ہیں۔ اور اب ہم آبادی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔"

"تو پھر بسم اللہ کرو قدم آگے بڑھاؤ۔"

"آئیں۔۔۔" ہم دائیں طرف کو چل پڑے۔

"کیا ہمیں آبادی کے اندر جانا ہے؟" اختر کے لہجے میں اندیشے سرسرا رہے تھے۔

"جانا تو آبادی میں ہی ہے لیکن آبادی کے وسط میں نہیں۔۔۔ آبادی کے شروع میں ایک قدیم حویلی آتی ہے وہاں صرف ایک چھوٹی سی فیملی رہتی ہے۔ میاں، بیوی اور چھوٹے چھوٹے تین بچے۔ حویلی کا ایک حصہ ان کے استعمال میں ہے باقی کی حویلی ویران ہے اور وہی حویلی ہماری منزل ہے۔ ہمارا مرکز۔"

"وہ میاں بیوی۔۔۔ ان کا کیا کردار ہے؟ کیا انہیں ہماری آمد کے متعلق علم تھا؟" اختر نے سوال کیا۔

"ہاں انہیں علم تھا۔۔۔ وہ انکل کے معتقد ہیں اور وہ عورت ہماری ایجنٹ بھی ہے جو ان دنوں راج محل میں اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔"

تقریباً نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک ایک پہاڑ کے گرد گھومتی ہوئی بائیں ہاتھ کو رخ بدلتی تھی ہم اس پہاڑ کے گرد گھوم کر جیسے ہی دوسری طرف پلٹے خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر کسی آبادی کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"دیکھا میرا اندازہ درست نکلا نا۔۔۔ یہ رام پور کی روشنیاں ہیں ہم۔۔۔ ہم رام پور پہنچ چکے ہیں۔" مہر جی نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

"آؤ جلدی آؤ۔" ہماری رفتار تیز ہو گئی۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے روشنیوں کا دائرہ کار وسیع ہوتا جا رہا تھا جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ریاست رام پور اچھی خاصی ریاست ہے۔ کچھ دیر بعد ہم آبادی تک پہنچ چکے تھے کچھ افراد بھی نظر آ رہے تھے۔ "کسی کی نظروں میں آنا مناسب نہیں ہوگا اس لیے ہم دوسرے رخ سے چلتے ہیں۔

میرے پیچھے پیچھے آ جائیں۔" مہر جی نے کہا اور رخ بدل دیا ہم نے بھی کچھ کہنا یا پوچھنا ضروری نہ سمجھا اور اس کے پیچھے ہو لیے۔ مہر جی ہمیں مکانوں کی عقبی سمت لے گئی۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑ تھا اور آگے مکانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ تین مکان چھوڑنے کے بعد مہر جی ایک جگہ رک گئی اس طرف ویسے بھی اندھیرا تھا جو ہمارے حق میں بہتر تھا۔

"یہی حویلی ہے ہمیں دیوار پھاندنا ہو گی۔" مہر جی نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔" مہر جی نے آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا جمپ لیا اور دیوار کا کنارہ تھام لیا دوسرے ہی لمحے وہ دیوار کے اوپر موجود تھی۔

"آ جائیں۔" اس نے ہم سے کہا اور ہم لوگ بھی آگے بڑھ گئے، پہلے اختر اوپر چڑھا پھر میں اور آخر میں ہم نے پروفیسر کے ہاتھ پکڑ کر انہیں اوپر آنے میں مدد دی۔ ایک نظر اطراف کا جائزہ لیا کہ کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا مگر دور دور تک کوئی ذی روح نہیں تھا بس خاموشی اور سناٹا تھا۔ حویلی بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی دور ایک کونے میں کچھ روشنی تھی ایک نیچے والے کمرے میں ایک اوپر والے کمرے میں باقی ساری حویلی مکمل اندھیرے کی لپیٹ میں تھی۔ دیوار سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کنارا سی ویگن کھڑی تھی مگر یہ وہ ویگن نہیں تھی جس میں کہ شلندر وغیرہ آئے تھے۔

ہم چاروں اطمینان سے دوسری جانب کود گئے۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنی منزل تک پہنچ گئے ہیں ورنہ مجھے تو امید نہ تھی کہ ہم زندگی بھی بچا سکیں گے۔" مہر جی نے ایک ایسی سکون کی سانس لی جیسے ساری تھکن اس سانس کے ذریعے خارج کر دی ہو۔

"شکریہ بعد میں ادا کیجیے گا پہلے یہ دیکھیں کہ وہ سامنے کون جناب کھڑے ہیں۔" اختر کی بات پر ہم نے چونک کر سامنے کی طرف دیکھا۔ وہاں واقعی کوئی موجود تھا اور برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ساتھ والے کمرے کی کھڑکی سے آنے والی مدھم روشنی میں بس اس کا ہیولہ سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ذرا ہمارے قدم ٹھٹکے تو وہ بول پڑا۔

"کوئی بات نہیں یہاں تک پہنچ آئے ہو تو آگے بھی آ جاؤ اب دوستوں کے قریب ہو۔" آواز سو فیصدی شلندر کی تھی۔ ہمارے سینوں میں رک جانے والی سانس اطمینان سے خارج ہو گئی۔ مہر جی دوڑ کر شلندر سے لپٹ گئی۔

"آئی ایم پراؤڈ آف یو مائی ڈاٹر۔ مجھے یقین تھا کہ تم ہر طوفان کا رخ پھیر کر یہاں تک آ پہنچو گی۔" ہمارے قریب پہنچتے ہی وہ ہم سے مخاطب ہوا۔

"آپ لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟"

"الحمدللہ ہم بالکل پرفیکٹ ہیں۔ ہاں البتہ اگر مہر جی ہمارے ساتھ نہ ہوتیں تو پھر شاید ہم کبھی بھی یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔" میں نے مسکراتے ہوئے شلندر سے ہاتھ ملایا۔

"آئیں۔۔۔ باقی باتیں اوپر بیٹھ کر کریں گے۔" شلندر اپنی جگہ پلٹ گیا۔ برآمدے کے ایک کونے میں سے ہی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں شلندر ان سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو ساتھ والے کمرے (جس میں لائٹ جل رہی تھی) میں سے ایک ادھیڑ عمر دیہاتی آدمی نکل آیا۔

"صاحب جی! باقی لوگ بھی آ گئے ہیں۔"

"ہاں خیرو! اب کھانا لے آؤ۔۔۔ بھوک بہت شدید ہو گئی ہے۔"

"جی صاحب ابھی لاتا ہوں۔" وہ واپس کمرے میں چلا گیا اور ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے اور جب کمرے میں پہنچے تو ڈاکٹر عقیل اور عارب ہم لوگوں پر نظر پڑتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"شکیل صاحب خیریت تو ہے؟"

"ہاں۔۔۔ہاں بھئی اب سب خیریت ہی ہے۔" شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں بھی مسکرا دیا۔ ڈاکٹر عقیل اور عارب ہمارے دگرگوں حلیوں کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مہرجی کی طرف نظر گئی تو وہ دونوں چونک پڑے۔

"ارے یہ۔۔۔یہ کیا' یہ خون کیسا ہے؟" اس بار شلندر نے بھی چونک کر مہرجی کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں انکل معمولی زخمی ہے۔ گولی چھو کر گزری ہے۔" مہرجی نے سرسری سے انداز میں کہا اور شلندر کے جبڑے بھنچ گئے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ ایک کونے سے بیگ اٹھالایا۔ ہم سب مرداروں کی طرح ڈھیر ہو گئے تھے۔ شلندر زپ کھول کر بیگ میں سے مرہم پٹی کا سامان نکالنے لگا۔

"انکل آپ آرام سے بیٹھیں فکر مندی کی کوئی بات نہیں۔" مہرجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کمال کرتی ہو اتنا خون دکھائی دے رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ فکر کی کوئی بات نہیں!"

"ہاں تو ٹھیک کہہ رہی ہوں نا! آپ سکون سے بیٹھیں یہ مجھے دے دیں۔" مہرجی نے بیگ شلندر کے ہاتھ سے لے لیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ شلندر ہم لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"آپ لوگ اگر فریش ہونا چاہیں تو یہاں اوپر ساتھ ہی باتھ روم ہے۔"

"فی الحال تو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ پیٹ میں چوہے کبڈی کا میچ کھیل رہے ہیں ان کو کچھ ملے گا تو طبیعت خود بخود فریش ہو جائے گی۔" اختر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

"کم از کم کوئی شرٹ' کوئی قمیص ہی پہن لو۔" ڈاکٹر عقیل نے اسے مخاطب کیا۔

"نہ ڈاکٹر صاحب! فاقے کے باعث بہت نقاہت محسوس ہو رہی ہے میں فالتو بوجھ بالکل نہیں سہار سکتا۔"

پھر جب مہر مکمل چینج کر کے باہر آئی تو شلندر اس سے مخاطب ہوا۔

"ہاں اب پوری تفصیل بتاؤ کیا ہوا تھا اور تم لوگ یہاں تک کیسے پہنچے؟ میں نے کچھ آدمی بھیجے تھے جنہوں نے بتایا ہے کہ ایک جگہ تم لوگوں کی گاڑی تباہ حال میں دیکھی گئی ہے مگر باوجود کوشش کے وہ ابھی تک تم لوگوں کا کوئی سراغ نہیں پا سکے تھے۔ کہاں تھے تم لوگ؟"

شلندر کی بات کے جواب میں مہرجی نے شروع سے لے کر آخر تک تمام رام کہانی کہہ سنائی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوئی ہی تھی کہ خیرو کھانے کے برتن اٹھائے آگیا۔ وہ برتن درمیان کی ٹیبل پر رکھنے لگا اور مہرجی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ابھی آئی۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ شلندر ہونٹ کاٹتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں گویا ہوا۔

"میری بیٹی کا خون بہا کر رام پرشاد نے اپنے حق میں برا کیا ہے۔۔۔ اب تک جو کر سکتا تھا وہ کر چکا اب ہماری باری ہے۔ اب ہم وار کریں گے اس کا وار تو ہم سہہ گئے مگر وہ ہمارا وار برداشت نہیں کر پائے گا بہت کاری وار ہو گا۔"

"کیا سوچا ہے آپ نے۔۔۔ اب آگے کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رانی راج محل میں ہے خیرو بتا رہا تھا کہ کبھی وہ چار دن بعد آتی ہے' کبھی چھ دن بعد اور کبھی دس دس دن نہیں آتی۔ اگر وہ آجاتی تو زیادہ بہتر تھا۔۔۔ ہمیں تازہ ترین صورت حال کے متعلق علم ہو جاتا۔ بہر حال۔۔۔ اس کا انتظار بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا کچھ پتا نہیں وہ کب آئے' اس لیے میں نے چال تو چل دی ہے۔ ہمارا "سوار" میدان میں نکل گیا ہے اب دیکھیں نتیجہ کیا نکلتا ہے؟" شلندر نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

مہرجی واپس آئی تو وہ ہلکے آسمانی کلر کے شلوار سوٹ میں تھی اور شلوار قمیص میں اور بھی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی' دوپٹہ اس نے اسکارف کی صورت سر اور چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ آکر بیٹھی تو ہم سب آگے کھسک آئے اور پھر صدیوں کے بھوکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ چاول پکے ہوئے تھے اور ایسے مزے کے تھے کہ میں نے آج تک اتنے لذیذ چاول نہیں کھائے تھے۔۔۔ یا شاید یہ شدید بھوک کا کمال تھا۔۔۔ لیکن جو بھی تھا اس رات میں نے دل کھول کر کھایا تھا۔ خیرو کھانے کے ساتھ ایک ڈرم سائز کا تھرموس بھی رکھ گیا تھا کھانا کھانے کے بعد مہرجی نے برتن سمیٹ کر ایک طرف کر دیے اور تھرموس اٹھا کر چائے کپوں میں انڈیلنے لگی۔

"انکل! میں تو کہتی ہوں کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے آج رات ہی محل میں گھس جاتے ہیں ورنہ جب مہاراج کو معلوم ہو گا کہ اس کے شکاری کتے ہمارا شکار کرنے میں ناکام رہے ہیں تو وہ اور بھی زیادہ محتاط ہو جائے گا اور ہمارے لیے اچھی خاصی سردردی پیدا ہو جائے گی۔" مہرجی نے تھرموس ایک طرف رکھا اور چائے اٹھا کر شلندر کو پکڑا دی۔

"ہونے دو اسے محتاط۔۔۔ میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے اس کی عقل پر پردے ڈالنے کا۔۔۔ محتاط ہو کر بھی وہ نقصان ہی اٹھائے گا۔"

"کیا بندوبست کیا ہے آپ نے؟"

"اس بات کو فی الحال رہنے ہی دو میں سے سے پہلے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

"شلندر صاحب! آپ کا اطمینان دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کوئی بہترین لائحہ عمل ترتیب دے چکے ہیں لیکن اس کے متعلق ہمیں بھی تو کچھ علم ہونا چاہیے کہ آپ نے کیا سوچا ہے' کیا کیا ہے' اور۔۔۔ کیا کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"بات درست ہے شلندر۔" ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

"تم اتنا سسپنس کری ایٹ کر رہے ہو آخر بتا کیوں نہیں دیتے؟"

"بھئی پہلے تو آپ لوگ یہ بتائیں کہ آپ لوگوں کو مجھ پر بھروسہ ہے یا نہیں؟"

"بھروسہ نہ ہوتا تو تم سے مدد کی درخواست ہی نہ

کرتے۔"

"دوسرا تم لوگوں کو ممی چاہیے؟"

"ظاہری سی بات ہے اور یہاں کیا ہم پکنک منانے آئے ہیں۔"

"تو بس پھر خاموشی سے دیکھتے جائیں کہ کیا ہوتا ہے۔ دو دن کے اندر اندر ممی آپ لوگوں کی تحویل میں ہوگی۔"

"مگر جو طریقہ کار آپ نے اختیار کیا ہے اس میں رسک بہت زیادہ ہے؟" پروفیسر نے کہا تو شلندر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ براہ راست شلندر کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

"کیا مطلب پروفیسر؟"

"مطلب صاف ہے۔۔۔ ہم لوگ محل تک پہنچنے سے پہلے ہی اوپر بھی پہنچ سکتے ہیں۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ ہمارے بجائے ہماری لاشیں مہاراج کے چرنوں میں جا ڈالیں۔" پروفیسر نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور شلندر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ حیرت و بے یقینی سے پروفیسر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آ۔۔۔ آپ کو کیا خبر کہ میں نے کیا سوچا ہوا ہے؟"

"شلندر میاں تم نے صرف سوچا ہی نہیں اپنی سوچ پر عمل بھی کر ڈالا ہے۔۔۔ کھیل یہاں بھی جاری ہے اور تمہارا "سوار" تو اب تک منزل پر بھی پہنچ چکا ہوگا۔۔۔ ہے نا؟"

"آپ کو کیسے علم ہوا؟" شلندر متحیرانہ انداز میں بولا تو پروفیسر مسکرا کر رہ گئے۔

"شلندر صاحب! پروفیسر بڑی کمال چیز ہیں ان کی حسیات حیرت انگیز حد تک تیز ہیں اسی باعث انہیں اکثر اوقات ایسے دورے پڑتے ہیں کہ جن کے دوران ان پر الہام ہوتے ہیں۔" عارب نے ہنستے ہوئے کہا۔ شلندر حیران نظروں سے پروفیسر کو دیکھ رہا تھا۔

"پروفیسر کیا آپ کوئی اندیشہ محسوس کر رہے ہیں؟" میں نے سنجیدگی سے پروفیسر کو مخاطب کیا۔

"نہیں۔۔۔ ایسی بات تو نہیں شلندر کا منصوبہ تو اچھا ہے لیکن اس میں اسی فیصد خطرہ ہے۔ ہم لوگ ناقابل تلافی نقصان بھی اٹھا سکتے ہیں۔" پروفیسر کپ سے آخری گھونٹ لے کر کپ واپس رکھتے ہوئے بولے۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پروفیسر! آپ کی بات بھی درست ہے بظاہر میرا یہ طریقہ کار موت کے مترادف ہے مگر میں نے بہت سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے اور میں پوری طرح مطمئن ہوں۔"

"تو بس پھر یہ قصہ ختم کریں آپ مطمئن ہیں تو ہم بھی مطمئن ہیں۔" اختر نے کہا۔

"ویسے اب تک میں سینکڑوں کیس حل کر چکا ہوں مگر یہ کیس میری زندگی کا انوکھا کیس ہوگا کہ ایک صدیوں پرانی لاش کے لیے اتنا کھٹ راگ پھیل رہا ہے۔"

"اوں ہو۔۔۔" پروفیسر تیزی سے بولے۔

"شلندر میاں احتیاط برتو مریانس کو لاش کہہ کر اس کی بے حرمتی نہیں کرو۔" پروفیسر کی بات پر شلندر ایک بار پھر حیران رہ گیا۔

"کیا مطلب پروفیسر! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی پروفیسر۔ بھلا ایک لاش کو لاش نہ کہا جائے تو اور اسے کیا کہیں۔" اختر نے ناگواری سے کہا تو پروفیسر بھڑک اٹھے۔

"تم تو اپنی چونچ بالکل ہی بند رکھو احمق انسان۔۔۔ کم عقل بنیاد پرست۔"

"کیوں؟ اس میں کم عقلی یا بنیاد پرستی کی کیا بات ہوئی کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ ہزاروں سال پہلے مر گئی تھی۔"

"اسے سمجھاؤ۔۔۔ تم لوگ سمجھاؤ اسے! یہ جاہل اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی کسی عذاب میں مبتلا کرا دے گا۔" پروفیسر تلملاتے ہوئے بولے۔

"اختر خاموش ہو جاؤ۔" میں نے اختر سے کہا اور وہ منہ بنا کر رہ گیا۔ مہرجی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ بیٹھے بیٹھے مغز سلگنے لگا ہے اور آنکھوں کے آگے دھند سی پھیلنے لگی ہے۔ اسی وقت مہرجی کی آواز میرے گنبد سر میں گونجی۔

"انکل! میں کچھ نقاہت محسوس کر رہی ہوں سر چکرا رہا ہے میرا۔" اس کے جواب میں بھی کوئی بولا تھا مگر میرا شعور الفاظ اور لہجے کی تمیز کھو بیٹھا تھا سو میں نہ سمجھ سکا کہ وہ بولنے والا کون ہے؟ اس کے بعد میں حواس کھو بیٹھا۔ حواس کی آخری ہچکیوں تک میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ میرے ساتھ یہ ہوا کیا ہے۔

☼ ☼ ☼

ہوش آیا تو میں نے خود کو حوالات نما پنجرے میں پایا۔ اس پنجرے میں میرے ساتھ اختر، عارب اور پروفیسر تھے میری طرح وہ تینوں بھی ہوش میں آ چکے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کہیں شکیل صاحب! مزاج شریف کی۔" عارب نے مسکرا کر کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ پروفیسر اور شلندر۔۔۔"

"ہم ادھر ہیں۔۔۔" میری بات درمیان میں ہی رہ گئی میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ سلاخوں کی دوسری طرف تقریباً" دس فٹ کے فاصلے پر ایک ایسا ہی پنجرہ تھا جس کی سلاخوں کے پیچھے پروفیسر، شلندر، مہرجی اور ڈاکٹر عقیل کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ میں لپک کر سلاخوں تک پہنچ گیا۔ یہاں صرف یہ دو پنجرے ہی نہ تھے بلکہ آمنے سامنے دونوں اطراف دو قطاروں کی صورت کتنے ہی پنجرے تھے اور ان پنجروں کے درمیان ایک دس فٹ کی راہداری سی تھی۔ ہمارے علاوہ بھی چند پنجروں میں کچھ لوگ بند تھے جو زندہ انسان کم اور ڈھانچے زیادہ لگ رہے تھے۔

"شلندر صاحب! یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

"قید خانہ۔" شلندر مسکرا دیا۔

"مہاراج رام پرشاد کا قید خانہ۔"

"اوہ۔۔۔ یعنی۔۔۔" میں مزید کچھ بھی نہ کہہ پایا۔

"یہاں کا کھانا ہم ہضم نہیں کر پائے۔ یہ دوسرا موقع ہے۔" عارب نے کہا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

"خیرو کی خیر ہو۔ دعائیں کیجیے اس کے لیے۔" میں نے رخ بدل کر شلندر کو مخاطب کیا۔

"کیا یہ قید خانہ راج محل میں ہی ہے؟"

"ہاں! اس وقت ہم راج محل کی عمارت کے نیچے ہیں۔۔۔ ہمارے اور ممی والے تابوت کے درمیان صرف اس قید خانے کی دیوار حائل ہے۔"

"ہاں اور اس تک پہنچنا ہمیں کبھی نصیب نہیں ہوگا۔" عقیل نے گہری سانس لی۔

"بہت جلد عقیل بن عاص۔۔۔ تم دیکھتے جاؤ ہم بہت جلد نا صرف اس تابوت تک پہنچ جائیں گے بلکہ تابوت یہاں سے نکال لے جائیں گے۔"

"سپنے دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ویسے تو اب یہاں سے زندہ نکلنے سے رہے۔"

"اگر مہاراج کو ہماری موت مقصود ہوتی تو ہمیں یہاں لانے کا کشٹ نہ کیا جاتا بلکہ وہیں بے ہوشی کے عالم میں ایک ایک گولی ہمارے لیے کافی ثابت ہوتی۔" شلندر نے پر یقین انداز میں کہا۔

"اب کسی بھی خوش فہمی کو مت پالنا۔"

"میں اگر خوش فہمیوں کے جھولے جھولنے والوں میں سے ہوتا تو اب تک جس قسم کے پنگوں میں الجھتا رہا ہوں کب کا سورگ باسی ہو چکا ہوتا۔"

"ان لوگوں کی عقل میں بات نہیں آئے گی شلندر میاں بہرحال پہلے قدم کی کامیابی پر میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔" پروفیسر نے کہا تو شلندر تیزی سے بولا۔

"پروفیسر صاحب! ابھی نہ میں کچھ کہوں گا اور نہ ہی آپ اس بارے میں کچھ بولیں اور مناسب بھی یہی رہے گا کہ اس موضوع پر فی الحال ہم خاموش ہی رہیں۔"

"ہاں تمہاری یہ دور اندیشی بھی بہتر ہے۔" پروفیسر نے سنجیدگی سے کہا پتا نہیں کیا کھچڑی پکا رہے تھے۔ ہم دشمن کی قید میں تھے اس کے رحم و کرم پر آ گئے تھے اور وہ کامیابی اور مبارک بادوں کی باتیں کر رہے تھے۔ میں

نے وقت دیکھنا چاہا تو چونک پڑا گھڑی غائب تھی۔۔۔ جیبیں بھی خالی تھیں کم بختوں نے ایک کاغذ کا ٹکڑا تک نہیں چھوڑا تھا۔

شلندر وغیرہ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شلندر اور عقیل بدستور آپس میں الجھے ہوئے تھے عقیل کہہ رہا تھا۔

"شلندر! مجھے سمجھاؤ تو سہی کہ تم اتنے دعوے سے کیسے اور کیوں کہہ رہے ہو کہ مہاراج ہمیں زندہ چھوڑ دے گا۔"

"پاگل ہوگئے ہو۔۔۔! یہ میں نے کب کہا کہ وہ ہمیں زندہ چھوڑ دے گا۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ فی الوقت وہ ہمیں ہلاک نہیں کرے گا یعنی ابھی ہماری زندگیاں محفوظ ہیں۔"

"یعنی دوسرے لفظوں میں تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی وہ ہمیں بطور مہمان رکھے گا۔"

"مہمان نہیں دشمن۔ اور وہ بھی دشمن خاص! پہلے وہ ہمیں طرح طرح کی اذیتیں دے گا' ہمیں تکلیفیں پہنچائے گا ہم پر سائنٹیفک قسم کا تشدد کرائے گا تاکہ اس کی حیوانی فطرت کی تسکین ہوسکے اور جب اذیتیں سہہ سہہ کر ہم دم توڑ دیں گے تب وہ ہماری کھالوں میں بھس بھروا کر' ہماری کھالیں اور ہمارے استخوانی ڈھانچے۔ عجائب خانے میں اس سونے کے مجسمے کے ساتھ رکھوا دے گا اور ہمارے ڈھانچوں کی گردنوں میں ایک تختی لٹکا دی جائے گی جس پر ہماری کوششوں اور ہمارے انجام کے حالات درج ہوں گے۔" شلندر نے بڑے مزے سے آخر تک کی قیاس آرائی کردی اور عقیل اسے یوں گھورنے لگا جیسے کچا ہی کھا جائے گا۔

"منحوس آدمی شکل اچھی نہیں تو کم از کم بات تو اچھی کرلو' کیسی بے ہودہ اور فضول قیاس آرائی کر رہے ہو۔"

"میری جان عقیل بن عاص۔۔۔! یہ کوئی قیاس آرائی نہیں حقیقت ہے میں تمہیں مہاراج کی سوچ سے آگاہ کر رہا ہوں کہ ہمارے متعلق وہ کیا دچار رکھتا ہے۔"

"تم کیا کوئی نجومی ہو جو دوسروں کی سوچوں کو سمجھ رہے ہو؟"

"بات نجومی کی نہیں ہے میرے دوست "کامن سینس" بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مہاراج جس ذہنیت' جس نفسیات کا آدمی ہے ایسا شخص اس کے علاوہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"بس رہنے دو۔۔۔ لگتا ہے کہ آج شرلاک ہومز تمہارے سر پر زیادہ ہی سوار ہے۔"

بائیں طرف کونے کی جانب سے کچھ آہٹوں کی آواز بلند ہوئی تو شلندر نے سبھی کو خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔ یقیناً" کوئی آیا تھا۔ میں' اختر اور عارب سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی ایک آدمی نہیں بلکہ اچھے خاصے افراد آرہے ہیں۔

قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ قریب آرہی تھی اور پھر آنے والے حوالات کے سامنے آرکے۔ دس خونخوار قسم کے آدمی تھے جن کے ہاتھوں میں دونالی بندوقیں نظر آرہی تھیں اور ان سے آگے جو شخصیت تھی وہ سو فیصدی بھیم سنگھ تھا۔

بھیم سنگھ! جو محل کے اندرونی امور کا انچارج تھا۔ شکل سے ہی بڑا خطرناک و درندہ صفت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چند لمحے وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں گھورتا رہا پھر پلٹ کر شلندر اور دوسرے لوگوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"ماں کے دینو! بڑے بے فکر ہوکر بیٹھے ہو کیا باپو کے دیواہ میں آئے ہو؟" اس کی آواز بھی اس کے چہرے کی طرح خشک اور کرخت تھی۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ مہرجی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ماتا ہری! یہ تم نے اپنا چہرہ بگاڑنے کا کشٹ کیوں کیا ہے۔۔۔! جب یہاں پلٹ کر آہی رہی تھیں تو یہ ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈال دینا تھی۔ ہم اس طرح تمہاری صورت بگاڑتے کہ کوئی مائی کا لعل کبھی پہچان نہیں پاتا جبکہ اب تو۔۔۔ اس حلیے میں تم کو کوئی اندھا بھی

پہچان لیوے گا۔" وہ چند لمحے کو خاموش ہوا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ویسے میرا خیال ہے کہ مہاراج تمہارے ساتھ خصوصی رعایت برتیں گے۔" لہجہ بڑا معنی خیز تھا۔

"بھیم سنگھ! مہاراج نے تمہیں یہاں بھیج دیا ہے کیا خود مہاراج کو ہمت نہیں ہوئی ہمارا سامنا کرنے کی؟" مہرجی نے بڑے پروقار انداز میں کہا۔

"دھیرج سے۔۔۔ ذرا دھیرج سے کام لو ماتا ہری! مہاراج سے بھی سامنا ہوجائے گا اور ہمت شبد کے معنی تو تم لوگوں کو میں سمجھاؤں گا۔"

"اس شبد کے معنی تو ابھی تم خود نہیں سمجھ سکے بھیم سنگھ ہمیں کیا سمجھاؤ گے؟"

"چنتا نہیں کرو سب سے پہلے میں تمہیں ہی اپنی ہمت دکھاؤں گا۔"

"اور کیا دکھاؤ گے بھیم سنگھ! ہم نہتے بے بس اور سلاخوں کے پیچھے قید ہیں اس کے باوجود تم دس دس مسلح افراد کے گھیرے میں ہمارے سامنے آئے ہو۔۔۔ ہم دیکھ رہے ہیں تمہارا حوصلہ' واقعی بڑے بہادر اور باہمت جوان ہو۔" مہرجی کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ بھیم سنگھ تلملا کر رہ گیا۔

"بکواس نہیں کر' کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ابھی تجھے باہر نکال لوں۔"

مہرجی نے ایک نظر شلندر کی طرف دیکھا پتا نہیں آنکھیں کیا بولیں کہ وہ خاموش ہورہی۔

"تم میں شلندر کون ہے؟" اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔" جواب مہرجی نے ہی دیا تھا۔

"بھونکتی ہے تو۔۔۔ ہمیں سب خبر ہے۔۔۔ اتنے نادان نہیں ہیں ہم۔۔۔ خیرو نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شلندر بھی تم لوگوں کے ساتھ ہے۔"

"خیرو کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"اچھی بات ہے۔" بھیم سنگھ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر وہ رخ بدل کر اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"روشن ان کے سامان میں جو بیگ تھا اس میں "کلینزنگ لوشن" کی ایک بوتل بھی ہے وہ لے آؤ اور ان کے چہرے دھلانے کا پربندھ کرو۔" روشن سرہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔

"ابھی پتا چل جائے گا کہ شلندر کہاں ہے؟" اس نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد روشن واپس آگیا ایک بوتل اور ایک تولیہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔

"چلو پہلے یہ والا تالا کھولو۔" وہ ہماری جانب متوجہ ہوگیا۔ ایک شخص چابیوں کا گچھا لے کر آگے آگیا جب کہ باقی سب اپنی اپنی جگہ پر الرٹ ہوگئے۔

"اگر کوئی ذرا بھی پھرتی دکھانے کی کوشش کرے تو بلا جھجک گولی چلا دینا۔" اس نے سفاک لہجے میں اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا پھر وہ ہم لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"تم لوگوں کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ آرام و سکون سے اپنے "تھوبڑے" صاف کروا لو بصورت دیگر اپنی زندگیوں کے نقصان کے ذمہ دار تم لوگ خود ہوگے۔"

ایک گینڈے نما انسان نے دروازہ کھولا اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ روشن نے اپنی بندوق اسے تھمائی اور خود اندر آگیا۔ اس گینڈے نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اپنے ساتھیوں کی طرح ہم پر بندوق تان کر کھڑا ہوگیا۔

اب ان کا ایک ساتھی حوالات کے اندر تھا اور نو آدمی ہم پر بندوقیں سیدھی کیے کھڑے تھے جبکہ بھیم سنگھ ایک طرف دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے کھڑا تھا۔ ہوٹل والے تہ خانے میں ان کے سات آدمی مہرجی کے ہاتھوں مارے گئے تھے شاید اسی وجہ سے اس بار وہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہورہے تھے۔ روشن نے سب سے پہلے مجھے ہی منتخب کیا۔ وہ میرے چہرے پر لوشن مل رہا تھا اور میں آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ دیر بعد اس نے تولیہ سنبھالا اور اچھی طرح رگڑ رگڑ کر میرا چہرہ صاف کرنے لگا کچھ ہی دیر بعد وہ ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

"ہوں... تو یہ آپ ہیں ڈاکٹر شکیل ظفر۔" بھیم سنگھ نے گہری چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورا۔ پھر وہ روشن سے مخاطب ہوا۔

"تو کھڑا کیا کر رہا ہے چل دوسرے کا چہرہ صاف کر۔" اور روشن جلدی سے اختر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس کا چہرہ رگڑنے کے بعد وہ عارب کی جانب متوجہ ہوگیا لوشن ملنے کے بعد جب وہ تولیے سے عارب کا چہرہ رگڑنے لگا تو عارب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا۔

"الو کے پٹھے میرا چہرہ ہے کوئی پتھر نہیں ذرا ہولے۔" باہر کھڑے مسلح افراد اس کی اس حرکت پر چونک پڑے تھے۔ بھیم سنگھ کی آنکھیں بھی ایک ذرا کشادہ ہوگئی تھیں۔ مگر عارب کی بات سن کر ان کے تاثرات اعتدال پر آگئے۔

"واہ میرے لٹھیے کے تھان تو تو بڑا نازک مزاج لگتا ہے۔" بھیم سنگھ استہزائیہ انداز میں بولا... روشن تولیہ لیے دوبارہ آگے بڑھا تو عارب نے اس کی کلائی تھام لی۔ اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غرایا۔

"روشن میاں ذرا آہستہ ورنہ تمہاری کلائی توڑ ڈالوں گا۔"

"اوپاٹے خان! زیادہ نواب صاحب بننے کی کوشش نہیں کرو ورنہ بھیجے میں سوراخ ہوجائے گا۔" بھیم سنگھ نے کہا۔

"بھیم سنگھ! یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے تم بیچ میں مت بولو اگر گولیاں چلانے کا زیادہ شوق ہے تو بندوق پکڑو اور چلادو مجھ پر، زیادہ ڈرانے دھمکانے کی ضرورت نہیں۔" عارب نے لاپرواہی سے کہا اور روشن کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ بڑی احتیاط سے عارب کا چہرہ صاف کرنے لگا اور کچھ ہی دیر بعد عارب کی اصل صورت دکھائی دینے لگی۔

"اوہ...!" بھیم سنگھ چونکا۔

"نیورو سرجن ڈاکٹر عارب علی تیمور! ہمیں بتایا گیا تھا کہ تم بڑے اکھڑ قسم کے آدمی ہو... اچھی بات ہے... بہت اچھی بات ہے۔"

اس گینڈے نے دروازہ کھولا اور روشن تولیہ، بوتل سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔ فوراً" ہی دروازہ بند کرکے تالا لگا دیا گیا۔ پھر وہ سب دوسری حوالات کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مسلح افراد نے بندوقوں کا رخ اس حوالات کی طرف کردیا اور روشن حوالات کے اندر چلا گیا۔ اس نے سب سے پہلے تولیہ پروفیسر کے چہرے پر رکھا۔ پھر مہرجی پھر ڈاکٹر عقیل اور آخر میں شلندر کی باری آئی۔ اپنا کام نبٹا کر وہ جلدی سے باہر نکل آیا اور حوالات کے دروازے پر دوبارہ تالا ڈال دیا گیا۔ بھیم سنگھ کی نظریں شلندر پر جمی ہوئی تھیں۔

"باقی سب کا ریکارڈ تو ہمارے پاس محفوظ ہے میرے لیے صرف تم ہی انجان ہو اور یقیناً" تم ہی شلندر ہو... سراغ رساں شلندر رائے ہریجہ۔" بھیم سنگھ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"فرض کرو اگر میں ہی شلندر ہوں تو پھر کیا' کیا جائے؟" شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بھیم سنگھ منہ سے کچھ نہیں بولا سر ہلاتا ہوا واپسی کے لیے پلٹ گیا مسلح افراد بھی اس کے پیچھے چل دیے قدموں کی چاپ لحہ بہ لحہ دور ہوتی گئی اور کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا۔

وہ چلے گئے مگر ہمارے لیے وسوسے اور اندیشے چھوڑ گئے۔ ایک اضطراب تھا جو لہو کی گردش میں گھولنے لگا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ آنے والے لمحات اپنے جلو میں کیا لے کر آنے والے تھے... ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا۔ اگر کوئی پوری طرح مطمئن تھا... یا مطمئن اور بے فکر دکھائی دے رہا تھا تو وہ شلندر ہی تھا۔

وقت دھیرے دھیرے... ثانیہ بہ ثانیہ گزرتا رہا اور ممکنہ خطرات کے اندیشے ہمیں ہلکان کرتے رہے۔ کئی گھنٹے یونہی گزر گئے ہم لوگوں کے درمیان کوئی خاص یا اہم گفتگو نہیں ہوئی۔ ایک اندازہ تھا کہ موجودہ رات کے بعد دن کے ساتھ ساتھ رات بھی خاصی گزر گئی ہے۔ مگر لگتا تھا جیسے وہ ہم لوگوں کو بھول ہی گئے ہوں کوئی بھی نہ آیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی... حلق میں صحرائی کانٹے سے چبھتے معلوم ہوتے تھے اور بھوک کی

شدت سے جیسے کلیجہ خون میں گھلنے لگا تھا جسم کے جوڑ جیسے ان پچیس تیس گھنٹوں میں ہی جواب دے گئے تھے۔ کبھی ہم اس چھوٹی سی حوالات میں ٹہلنے لگتے کبھی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور کبھی لیٹ کر کمر سیدھی کرنے لگتے۔ عجیب بے بسی میں وقت گزر رہا تھا۔

کسی کہنے والے نے درست کہا ہے کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے ہم سب کا اس قید میں اس محاورے پر کامل یقین ہوگیا۔ کچھ دیر کے لیے سوجانے کا مشورہ شلندر نے ہی دیا تھا جسے ہم سب نے قبول کرلیا۔ کیونکہ نیند آبھی رہی تھی اور ہم سب خود کو اعصابی طور پر مضمحل بھی محسوس کررہے تھے سو فرش پر ہی لمبے لمبے لیٹ گئے اب یہ معلوم نہیں کہ وہ نقاہت کی غنودگی تھی یا کہ حقیقی نیند۔ بہرحال کچھ دیر کی کسمساہٹ کے بعد ہم لوگ گردوپیش اور اپنے آپ تک سے بے خبر ہوگئے۔ سوتے وقت ذہن میں صرف یہی سوچ چکرا رہی تھی کہ ہمیں مغلظات کے گیت سنا کر نیند سے بے دار کیا جائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا باری باری ہم سب از خود ہی بے دار ہوگئے تھے جس وقت میری آنکھ کھلی۔ میری حوالات میں اختر اور دوسری طرف پروفیسر اور مہرجی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ عارب، عقیل اور شلندر ابھی سو رہے تھے۔

اختر ٹھوڑی دائیں ہتھیلی پر ٹکائے فریفتہ نظروں سے مہرجی کو تک رہا تھا اور وہ غصے سے تلملا رہی تھی۔ لیکن شاید شلندر اور عقیل کی نیند کے خیال سے خاموش بیٹھی تھی ورنہ لگتا یہی تھا کہ وہ اختر کو بڑی کھری کھری سنانا چاہتی ہے۔ البتہ پروفیسر مراقبے کی سی کیفیت میں تھے۔

اختر کی مستقل نگاہوں کی آنچ سے تنگ آکر مہرجی قدرے رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس کے اس طرح رخ پھیر لینے پر اختر قدرے مضطرب سا ہوگیا۔ چند ایک بار اس نے بے چینی سے پہلو بدلا پھر منہ سے شی شی کی آوازیں نکالنے لگا۔ مہرجی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا اور اشاروں کی مدد سے کہنے لگا کہ رخ میری طرف کرلو۔ مہر نے پاؤں سے سینڈل اتاری اور اختر کو دکھاتے ہوئے اشارے سے مخاطب ہوئی کہ "اب اگر تم خاموش نہیں ہوئے تو میں یہ تمہارے منہ پر کھینچ ماروں گی۔" وہ دوبارہ رخ پھیر کر بیٹھ گئی اور اختر اٹھ کر سلاخوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"شی... شی... ہش۔" مہرجی اس کی شش کاروں پر بھوکی بلی کی طرح اس کی جانب پلٹی بس ایک جھلک ہی دکھائی دی تھی اس کے دائیں ہاتھ میں سینڈل تھا وہ ہاتھ بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور اختر تڑپ کر ایک طرف ہوگیا۔ ورنہ اضطراری انداز میں بھی مہرجی کا نشانہ بڑا باکمال تھا۔ سینڈل بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح سلاخوں کے درمیان سے گزر کر اندر آیا، اختر تو ایک طرف ہٹ گیا تھا سینڈل کسی بم کی طرح سوتے ہوئے عارب کی پیشانی پر آپڑا۔ ایک تو سینڈل ہارڈ سول کا تھا دوسرا دونوں دروازوں کی سلاخوں سے ٹکرائے بغیر سیدھا عارب کی پیشانی پر آکر لگا تھا اور تیسرا یہ کہ وہی بے چارہ بے خبر گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ سو اس افتادِ ناگہانی پر وہ بری طرح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شاید وہ خواب بھی کوئی ڈراؤنا دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق سے ایسی بھیانک دھاڑ بلند ہوئی کہ میں دہل کر رہ گیا۔ دوسری طرف پروفیسر بھی بوکھلا گئے۔ مہرجی گڑبڑا گئی اور عقیل... اور شلندر بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"کک... کک کون ہے؟"

"کک... کیا ہوگیا...؟" ان بے چاروں کی حالت خراب تھی عارب اپنی جگہ ایک ہاتھ سے پیشانی اور دوسرے سے سینڈل پکڑے حیران پریشان بیٹھا تھا اور میرے دل میں قہقہے مچل رہے تھے۔ ڈاکٹر عقیل کے بے ربط جملے کے جواب میں اختر مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

"عارب بھائی کے ہاں ہوا ہے۔"

"کیا... کیا ہوا ہے؟" ڈاکٹر عقیل ابھی سنبھل نہیں پائے تھے۔

"مہرجی کا سینڈل۔" شلندر اور عقیل استفہامیہ انداز میں مہرجی کی طرف دیکھنے لگے اور عارب غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بدتمیزی ہے... کیا... کیا بے ہودگی ہے یہ؟" وہ غصے سے دھاڑا۔ اس کی کشادہ پیشانی پہ ایک چھوٹا سا گومڑ نمودار ہو گیا تھا۔

"یہ کوئی طریقہ ہے۔"

"مہر! کیا حرکت ہے یہ؟" شلندر نے گہری سنجیدگی سے مہرجی کو مخاطب کیا۔

"وہ... وہ انکل میں نے اختر کو جوتا مارا تھا مگر... عارب صاحب کے لگ گیا۔" مہرجی خاصی خجل دکھائی دے رہی تھی۔

"تا تو آپ کیا یہاں اپنی موسی کے گھر تشریف فرما ہیں جو "پیٹھو گرم" کی مشقیں کر رہی ہیں۔"

"سوری عارب صاحب!" وہ براہ راست عارب سے مخاطب ہوئی۔

"سوری عارب صاحب! میرے ماتھے پر پکوڑا بنا کر رکھ دیا ہے اور یہ سوری کہہ کر بری الذمہ ہو گئیں۔" عارب نے مینڈک کی طرح منہ پھلاتے ہوئے کہا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

"مہر! تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ ہم کس صورت حال کا شکار ہیں اور کہاں پڑے ہیں؟" شلندر نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

"انکل مجھے صرف اندازہ نہیں پورا علم اور پورا پورا ادراک ہے کہ صورت حال کتنی سنگین ہے۔"

"تبھی اس بچپنے کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"انکل! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"تو کیا تم پر کوئی بدروح مسلط ہو گئی تھی؟"

"مجھے... مجھے اختر نے اس حد تک زچ کر دیا تھا کہ میں نے اس پر جوتا کھینچ مارا۔"

"میں کئی بار تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ تمہاری سب سے بڑی کمزوری یہی ہے۔ اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھو۔" شلندر، مہرجی کو سمجھا رہا تھا۔ عارب اختر پر برس پڑا۔

"تم ساری زندگی بچے کے بچے رہ جانا کبھی نہ سدھرنا۔"

"عارب بھائی! میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"کیا کر دیا ہے؟ یعنی تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ تمہیں کچھ علم ہی نہیں۔" عارب ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔ اس نے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا یہ تمہیں دکھائی نہیں دے رہا کہ یہ کیا ہے؟"

"پیشانی ہے۔"

"یہ... یہ پیشانی کے اوپر کیا ہے؟" عارب نے پیشانی پر ابھر آنے والے گومڑ پر انگلی رکھی۔

"یہ... یہ چھوٹی پیشانی ہے۔" اختر کے جواب پر بے اختیارانہ سبھی مسکرا دیے مگر عارب کے تاثرات دیکھ کر فوراً ہی مسکراہٹوں کو دبا لیا گیا۔

"بکومت!" عارب بھڑک اٹھا۔

"یہ ٹین ایجرز والی چھچھوری حرکتیں چھوڑ دو ایسی حرکتوں سے کوئی لڑکی متاثر نہیں ہوتی۔"

"مگر عارب بھائی میں کسی لڑکی کو متاثر کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا۔" اختر کے چہرے پر گہری معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔

"تو یہ سینڈل بلاوجہ ہی یہاں تک آ گیا تھا۔"

"میں نے تو مہرجی سے صرف اتنا کہا تھا کہ میری طرف دیکھتی رہیں کیونکہ بھوک پیاس کی اذیت سے میرا دم نکل رہا تھا۔"

"تو وہ کیا وہاں بیٹھی چرغہ اڑا رہی تھی جس کی تمہیں اس نے دعوت نہیں دی تھی۔" اس بار عارب کے بولنے سے پہلے میں بول پڑا۔

"نہیں وہ... بات دراصل یہ تھی وجب مہرجی کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے تو مجھے اور کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ اس لیے میں نے مہرجی سے کہا تھا کہ آپ رخ میری طرف کیے بیٹھی رہیں تاکہ میں بھوک پیاس کے احساس سے بچا رہا ہوں مگر... انہوں نے خفا ہو کر سینڈل کھینچ مارا۔" ڈاکٹر عقیل دوسری طرف سے بولے۔

"تم بھوکے تھے اسی لیے تو مہر نے سینڈل تمہیں مارا ہے کہ فی الحال سینڈل کھا کر گزارا کرو۔"

"تو اس پر بھی کب تک گزارا کرے گا۔ انجام آخر کار فاقہ زدہ لاش ہی ہوگی جیتے جی اب یہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔" عارب نے کہا۔

"اور اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔" شلندر نے کہا۔

"آپ نہیں اس کے ذمہ دار یا تو شکیل صاحب ہوں گے یا پھر وہ منحوس تابوت جس کے چکر میں ہم لوگ یہاں تک آ پہنچے ہیں۔" اختر نے کہا۔

"او ملعون! خبیث بدبخت انسان کیوں خود پر عرصہ حیات تنگ کر رہا ہے تو۔ کیوں کربناک موت کو آوازیں دیتا ہے۔ اپنی زبان کو لگام ڈال۔" پروفیسر پر فرط غضب کے لرزہ طاری ہو گیا۔ اختر نے بڑی ناگواری سے پروفیسر کی طرف دیکھا وہ پروفیسر کی ایسی بے سروپا باتوں سے بڑی خار کھاتا تھا۔ اگر وہ جواب میں مزید کچھ کہتا تو ماحول میں بہت زیادہ کشیدگی پیدا ہو جاتی یہی سوچ کر میں نے اسے درگزر کر جانے کا اشارہ کیا اور وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

پروفیسر بیٹھے بیٹھے کپکپا رہے تھے۔ شلندر اور مہرجی متحیرانہ انداز میں پروفیسر کو دیکھ رہے تھے۔

"پروفیسر ضبط سے کام لیں اتنا اگزسٹ ہونے والی کون سی بات ہے۔" شلندر نے کہا۔

"شلندر میاں انہیں حقیقت کا علم ہی نہیں نہ ہی یہ حقیقت پر یقین کرنے کو تیار ہیں۔ اندازہ نہیں کہ اس تابوت میں کون ہے... عہد فراعنہ کا ایک زندہ وجود... مریافس!"

"حوصلہ پروفیسر! حوصلہ۔" شلندر کے تاثرات بڑے عجیب تھے شاید اسے پروفیسر کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ بڑی مشکلوں سے پروفیسر کی حالت اعتدال پر آئی۔ کچھ دیر کی گہری خاموشی کے بعد شلندر پروفیسر سے مخاطب ہوا۔

"پروفیسر! یہ صورت حال میرے منصوبے سے متصادم ہے میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کوئی اور قدم اٹھانا چاہیے... آپ کی کیا رائے ہے؟"

"جو قدم بھی اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھانا۔"

"میرا خیال ہے اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" شلندر رخ بدل کر مہرجی سے مخاطب ہوا تو مہرجی سے پہلے عارب بول پڑا۔

"کیوں کیا انڈر گراؤنڈ سرنگ کھود کر نکلنے کا ارادہ ہے؟"

"بالکل نہیں! جس طرح ہم لوگ یہاں آئے ہیں ویسے ہی یہاں سے نکل بھی جائیں گے۔"

"باتوں سے آپ بہت بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔" عارب کا لہجہ طنزیہ تھا۔ شلندر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"مائی ڈیئر عارب! اگر میں تم لوگوں کو ان سلاخوں کے پیچھے لے کر آ سکتا ہوں تو یہاں سے باہر بھی نکال سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب...؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" ہم سب کی سوالیہ نظروں کا مرکز شلندر ہی تھا۔

"مطلب یہ کہ یہاں ہمیں ان لوگوں نے قید نہیں کیا بلکہ ہم خود قید ہوئے ہیں اور ایسا میں نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا ہے ورنہ یہ لوگ ہم پر کبھی بھی قابو نہیں پا سکتے تھے...۔" شلندر چند لمحے کے توقف کے بعد گویا ہوا۔

"دراصل بات یہ تھی کہ چوری چھپے محل میں داخل ہو کر اور بغیر کسی کی نظروں میں آئے مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سو میں نے ایک منصوبہ بنایا... مہاراج ہم سے بڑی حد تک خائف ہے اسی وجہ سے وہ ہماری موت کے درپے تھا۔ اس کی طرف سے بھیجے گئے موت کے ہرکارے رام پور تک آنے والے واحد راستے میں گھات لگائے بیٹھے تھے اور کچھ لوگ ہماری کوٹھی کی نگرانی پر مامور تھے ہم وہاں سے نکلے تو ہم سے پہلے ہمارے اس طرف آنے کی خبر ان لوگوں تک پہنچ گئی جس کی وجہ سے ان لوگوں نے شکیل صاحب، پروفیسر

اختر اور مہر کو راستے میں ہی دھر لینے کی کوشش کی مگر یہ لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم لوگ ان سے بچ کر حویلی تک پہنچنے میں اس لیے کامیاب ہو گئے تھے کہ ہم نے شہر سے نکلنے سے پہلے ہی گاڑی بدل لی تھی۔ رانی جو کہ اب بھی راج محل میں ہی ہے اس نے مجھے خبر دی تھی کہ مہاراج ویسے تو ہمیں زندہ قابو کرنا چاہتا ہے مگر اس طرح کی ایک کوشش اسے پہلے ہی بہت مہنگی پڑ چکی تھی۔ اس لیے وہ دوبارہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا سو اس نے ہماری موت کا پروانہ جاری کر دیا۔۔۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم بے بس ہو جائیں تو مہاراج ہمیں موت کے گھاٹ اتارنا بھی گوارا نہیں کرے گا بلکہ زندہ پکڑ کر اپنے سامنے اذیتیں دے دے کر مارے گا۔ اس لیے میں نے مہاراج کے ساتھ ایک ڈرامہ کھیلا۔ خیرو کو کہہ کر میں نے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی اور خیرو کو راج محل مہاراج کے پاس بھیج دیا کہ جا کر مہاراج کو بتا دے کہ کھیر تیار ہے ہاتھ صاف کر لو حالانکہ اس میں رسک بھی بہت تھا مگر مجھے وشواس تھا کہ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلے گا اور وہی بات ہوئی مہاراج کے کتے ہمیں از خود محل کے اندر اس قید خانے تک لے آئے۔۔۔!"

میرا خیال تھا کہ مہاراج جب یہاں آئے گا تو ہم اس کو بندی بنا لیں گے اور تابوت لے اڑیں گے مگر یہاں صورت حال میری توقع کے خلاف نکلی میں سمجھ رہا ہوں یہ لوگ ہمیں بھوکا پیاسا رکھ کر جسمانی و اعصابی طور پر اس حد تک ناکارہ کر دیں گے کہ ہم میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہ رہے تب مہاراج ہمارے سامنے آئے گا اور ایسی صورت میں ہم زندہ نہ بچ سکیں گے۔ لہٰذا اس سے پہلے ہی ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہو گی۔" شلندر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر تک خاموشی پھیلی رہی پھر ڈاکٹر عقیل کی آواز خاموشی میں رخنہ انداز ہوئی۔

"شلندر تمہارا منصوبہ تو بڑا جاندار تھا لیکن اگر ذرا بھی کہیں کوئی کمی بیشی ہو جاتی تو اس وقت ہم سارے عالم بالا میں بیٹھے ہوتے۔"

"میرے ہوتے ہوئے ایسا ممکن نہ تھا۔" شلندر مسکرایا۔

"تم بھی تو ہمارے ساتھ ہی مردوں کی طرح یہاں تک آئے ہو اگر وہ لوگ ہمیں ہلاک کرنا چاہتے تو ہمارے ساتھ ساتھ تم بھی ٹائیں ٹائیں فش ہو گئے ہوتے۔"

"میں یہاں تک تم لوگوں کے ساتھ آیا ضرور ہوں مگر مردوں کی طرح نہیں بلکہ اپنے ہوش و حواس کے ساتھ آیا ہوں۔"

"کیا مطلب! تم نے بھی تو چائے پی تھی۔"

"ہاں چائے ضرور پی تھی مگر شاید اس دوران میں سے کسی نے نوٹ کیا ہو کہ چائے پینے سے پہلے میں نے کپ میں ایک ٹیبلٹ ڈالی تھی۔۔۔ وہ بے ہوشی کی دوا کا اثر زائل کرنے کے لیے تھی۔"

"بڑے خبیث ہو۔ یقیناً" تم شرلاک ہومز کے ریکارڈ توڑو گے۔ بہرحال یہ بتاؤ کہ اب کیا پروگرام ہے۔ کیا یہاں سے نکلا جا سکتا ہے۔"

"یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا؟" ہم سب پوری طرح شلندر کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"مہاراج کے عجائب خانے کو جانے والا راستہ مہاراج کی خواب گاہ سے جاتا ہے یہ تو تم لوگوں کو علم ہے۔"

"ہاں بالکل۔"

"وہ آپ نے بتایا تھا۔"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"مہاراج کی خواب گاہ میں ایک اور خفیہ راستہ بھی ہے جو محل سے باہر ایک ایسی کوٹھی میں جا کر نکلتا ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ہے ہم لوگ عجائب خانے سے تابوت نکال کر مہاراج کی خوابگاہ سے ہی اس دوسرے راستے کے ذریعے محل سے باہر نکل جائیں گے۔"

"یہ تو سارا مسئلہ حل ہو گیا سارے رستے ہی

سیدھے ہو گئے۔" میں نے مسرت سے کہا۔

"شکیل صاحب! پہلے ان کی مکمل بات تو سن لیں مسئلہ تو ابھی انہوں نے بیان کیا ہی نہیں۔" عارب نے مجھے ٹوکا۔

"ہاں یہ بات بھی ہے۔"

"مسئلہ ہے مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچنے کا۔۔۔! یہ علم نہیں کہ یہ قید خانہ محل کے کون سے حصے میں ہے اور اس کا راستہ کہاں جا کر نکلتا ہے میرا خیال ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچنا کافی خطرناک ثابت ہو گا۔"

"کوئی بات نہیں رب وارث ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" میں نے اچھے خاصے سنگین مسئلے کو نظر انداز کر دیا۔ میرے لیے یہ احساس ہی بڑا خوش کن تھا کہ میں مریاقس تک پہنچنے والا ہوں۔ صدیوں پہلے کی اس شہزادی تک۔ جو ہزاروں سال سے اذیتوں میں مبتلا ہے جو کئی سو سال سے میری منتظر ہے۔ جس کی تمام تکلیفوں، مصیبتوں کا حل میری ذات میں پوشیدہ ہے۔ ایک فرعون زادی، سرزمین مصر کی بیٹی جو میری مدد کی طلب گار ہے۔ میں اس مریاقس تک پہنچنے والا تھا۔ رگوں میں دوڑتا ہوا خون اس احساس کے ساتھ ہی جیسے دھڑکنوں کی تال پر رگوں کے اندر جھومنے لگا تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے یہاں سے نکلا جائے۔" شلندر نے سب کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"اگر ایسا ممکن ہے تو انتظار کس بات کا ہے؟" اختر نے کہا۔

"سوچ لیں باہر نکل کر ہم میں سے کوئی بھی یا سبھی گولی کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔" شلندر بڑے خوبصورت طریقے سے ہمیں ذہنی طور پر ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔

"یہاں فاقوں سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے بے بسی و بے کسی کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے باہر نکل کر گولی کا شکار ہو جائیں۔" عارب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے تیار ہو جائیں۔" شلندر نے کہا اور رخ بدل کر مہرجی سے مخاطب ہوا۔

"تالا کھولنا ہے۔" مہرجی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا اور "ہیئر پن" اتار کر شلندر کو تھما دی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سلاخوں والے دروازے کے قریب آ گیا ایک ذرا اس نے کسی قسم کی آہٹ محسوس کرنے کی کوشش کی پھر سلاخوں سے ہاتھ نکال کر تالا پکڑ لیا اور پن کی ہول میں داخل کر دی۔ ہم سب کی نظریں شلندر پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تو وہ پن والے ہاتھ کو حرکت دیتا رہا پھر اچانک ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔ ہم سب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ شلندر نے تالا ہٹایا اور آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ شلندر نے باہر نکل کر پہلے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی پھر ہمارے دروازے تک آ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ بھی حوالات سے باہر تھے۔

"شلندر جب تم چھوٹے تھے تو کہیں تم چوریاں تو نہیں کرتے تھے؟" ڈاکٹر عقیل نے حیرت سے کہا۔

"میں نوٹ کر رہا ہوں عقیل بن عاص۔۔۔ کہ تم بڑی لچر قسم کی باتیں کرنے لگے ہو۔"

"تو یہاں فصیح و بلیغ گفتگو سے کیا حاصل ہو گا۔۔۔ خیر مٹی ڈالو آگے بولو کیا کریں؟"

"آ جاؤ۔" شلندر بائیں طرف کو چل پڑا۔ پچیس تیس قدم کے فاصلے پر نظر آنے والی دیوار تک دونوں طرف سلاخوں والی کوٹھریاں سی بنی ہوئی تھیں چند ایک میں کچھ زندہ کم مردہ قسم کے لوگ بے سدھ پڑے تھے ہم دبے پاؤں آگے بڑھتے رہے۔ آخری حوالات کی اوٹ میں بائیں ہاتھ کے ایک کونے میں چھ تنگ زینے تھے جن کے اختتام پر ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

شلندر نے ہمیں احتیاط کا اشارہ کیا اور سہج سہج قدم اٹھاتا زینوں کی جانب بڑھ گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تھے البتہ مہرجی تیزی سے میرے عقب سے نکل کر شلندر کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ آخری زینے پر پہنچ کر شلندر نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود

دروازے کی جھری سے اندر جھانکنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ سیدھا ہوا اور مہرجی کو اشارے سے بتانے لگا کہ بظاہر تو اندر ایک آدمی ہے مگر زیادہ بھی ہوسکتے ہیں اور میں اندر جارہا ہوں میرے جانے کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے۔ ہم اک تیز سنسنی کا شکار تھے۔

شلندر نے ایک گہری سانس کھینچی اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتا ہوا برق رفتاری سے اندر داخل ہوگیا۔ مہرجی اچھل کر کھلے ہوئے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اندر سے دوبار عجیب غریب آوازیں بلند ہوئیں پھر کسی کے کراہنے کی آواز ابھری اور ساتھ ہی کراہنے والا دروازے سے آٹکرایا۔ مہرجی پہلی ہی اس کی منتظر تھی اس نے بھوکی بجلی کی طرح جھپٹ کر اس آدمی کی گردن گرفت میں لی اور اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ ایک چیخ کی آواز آئی اور بندہ اچھلتا ہوا فرش پر آرہا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

عقل سے ماورا تھی مہرجی کی یہ تکنیک۔ معلوم نہیں کیا جادو تھا اس کے ہاتھوں میں کہ اچھے خاصے گرانڈیل انسان کی گردن کو صرف چھوتی تھی اور اس کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔

"آجائیں۔" اس نے مطمئن انداز میں ہم سے کہا اور ہم زینے طے کرتے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔ ایک اچھا خاصا کمرہ تھا جس کی دو دیواروں کے ساتھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں تیسری دیوار کے ساتھ ایک آرام دہ صوفہ رکھا تھا دو ایک الماریاں، دیواروں کے ساتھ کچھ زنجیریں ہک اور نہ جانے کیا کیا تھا وہاں۔ یقیناً" یہ عقوبت خانہ تھا جہاں مہاراج اپنے سامنے انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرواتا ہوگا۔ چوتھی دیوار کے ساتھ سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ اور سیڑھیوں کے اختتام پر ایک ٹھوس لکڑی کا دروازہ تھا شلندر ایک طرف پڑی بندوق اٹھا رہا تھا۔ وہ بندوق اٹھا کر اس نے اختر کو تھمادی۔

"خیال رہے محل کے اندر اگر گولی چلنے کی آواز گونج اٹھی تو پھر ہمارا یہاں سے بچ نکلنا تقریباً" ناممکن ہوجائے گا۔" اختر کو تھماتے ہوئے وہ بولا اور پلٹ کر ایک آہنی الماری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ لاک تھی۔ شلندر نے کالر میں لگائی ہوئی ہیئر پن نکالی اور الماری کا لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر کی کوشش میں لاک کھل گیا۔ شلندر کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اتر آئی۔ اس نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور الماری کے دونوں پٹ کھول دیے۔ پوری الماری مختلف النوع اوزاروں اور ہتھیاروں سے بھری ہوئی تھی، ہتھکڑیاں، نائیلون کی رسیوں کے گچھے، پلاس، قینچی، ہنٹر، خنجر، جانے کیا کیا تھا۔ یقیناً" یہ سب قیدیوں کو ایذا پہنچانے کا سامان تھا۔

شلندر چند لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے ایک ہتھکڑی اٹھائی اور عقیل کی جانب اچھال دی جو اس نے فضا میں ہی کیچ کرلی۔

"سنبھال لو کام آئے گی۔" پھر اس نے الماری میں نظر آنے والے تینوں خنجر نکال لیے۔ ایک خنجر اس نے مہرجی کو تھمادیا، دوسرا خود سنبھال لیا اور تیسرا خنجر ہماری طرف کرکے سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ وہ تیسرا خنجر عارب نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اب اس دروازے سے ہم تہہ خانے سے نکل کر محل میں پہنچ جائیں گے۔" شلندر نے سیڑھیوں کے آخر میں نظر آنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"کچھ اندازہ نہیں کہ یہ تہہ خانہ محل کے کس حصے میں واقع ہے اور اس دروازے سے نکلنے کے بعد ہم محل کے کون سے حصے میں نکلیں گے۔ یہ بھی اندازہ نہیں کہ باہر رات کا سمے ہے یا دن کا، لیکن ایک بات طے ہے کہ اگر ہم لوگ کسی بھی طرح مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچ گئے تو یوں سمجھو کہ سیونٹی پرسنٹ خطرے سے محفوظ ہوجائیں گے۔ لہٰذا ذہن میں رہے کہ ہماری پہلی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر خواب گاہ تک پہنچ جائیں لیکن اگر اس دوران ـــ"

"نہیں! ہم لوگوں کو پہلے خواب گاہ تک نہیں پہنچنا۔" اختر نے شلندر کی بات کاٹ دی۔

"پہلے ہمیں راج محل کے کچن یا لنگر خانے کا رخ کرنا چاہیے بھوک نے جسم کی ساری توانائی چوس لی ہے مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا۔"

"تو ٹھیک ہے تم یہاں لیٹ کر آرام کرو ہم لوگ مہاراج کی خواب گاہ کی طرف جارہے ہیں۔" عارب نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پھر شلندر سے مخاطب ہوا۔

"آپ آگے کہیں۔"

"میں کہہ رہا تھا کہ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جائیں لیکن اگر کہیں کسی سے سامنا ہوجائے تو ہماری پوری کوشش ہوگی کہ کسی قسم کے کھٹ راگ کے بغیر خاموشی سے اسے ٹھکانے لگادیں۔"

"ٹھیک ہے۔ بہت صحیح ہے۔" عارب نے پوری طرح شلندر کی بات کی تائید کی۔

"مزید کچھ اس کے علاوہ ـــ" ڈاکٹر عقیل نے پوچھا۔

"نہیں بس۔"

"تو پھر آگے لگیں۔" عارب نے کہا اور شلندر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا مہرجی اس کے ساتھ ساتھ تھی اس کے پیچھے عارب اور آخر میں ڈاکٹر عقیل، اختر، پروفیسر اور میں۔ ہم دبے پاؤں زینے طے کرتے ہوئے دروازے تک پہنچے۔ شلندر نے دروازے پر دباؤ ڈال کر چیک کیا وہ بند تھا۔ نہ کوئی لاک نہ ہینڈل، نہ چٹخنی کنڈی بس سپاٹ لکڑی کی دیوار تھی۔

"الیکٹرانک سسٹم۔" شلندر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور دروازے پر ہاتھ رگڑنے لگا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد شلندر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظریں دائیں ہاتھ دیوار پر نظر آنے والے اس درز نما خلا پر جمی ہوئی تھیں جو دروازے کے بالکل ساتھ سے شروع ہوتا تھا۔ خلا کی چوڑائی دو انچ اور لمبائی دروازے جتنی تھی۔ چند لمحے اس خلا کو گھورنے کے بعد شلندر اپنے پیروں میں موجود اس اسٹیل لائن کی جانب متوجہ ہوگیا جو غالباً" دروازے کی موومنٹ کے لیے تھی۔

"کیا کوئی مسئلہ ہے؟" ڈاکٹر عقیل کے لہجے میں تشویش تھی۔

"دروازہ الیکٹرانک سسٹم کے زیر تحت کھلتا ہے مگر نہ کسی ہک کا کوئی نشان ہے اور نہ ہی کوئی بٹن وغیرہ دکھائی دے رہا ہے۔" شلندر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟" شلندر کوئی جواب دینے کی بجائے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دروازے کی لکڑی سے ایک باریک تار نکل کر دائیں طرف خلا میں گم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ شلندر نے تار پکڑ کر کھینچنا چاہا مگر شاید تار کی لمبائی اتنی ہی تھی۔ اس نے نہایت احتیاط سے تار پکڑا۔ اور خنجر کی نوک اس پر یوں پھیرنے لگا جیسے تار کو گدگدی کررہا ہو۔ چند لمحوں بعد وہ مزید جھک گیا اور باریک بینی سے تار کو دیکھتے ہوئے اپنا کام کرتا رہا کچھ دیر بعد وہ رک گیا اور خنجر کی دھار تار پر رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ غالباً" خنجر ننگی تاروں سے چھو گیا تھا۔ کیوں کہ شلندر کو واضح جھٹکا لگا تھا۔ خنجر کا دستہ بھی دھاتی تھا۔ تار سے چند چنگاریاں پھوٹیں خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ خود جھٹکے سے گڑبڑا گیا مگر اس ہلکے سے جھٹکے سے مسئلہ حل ہوگیا دروازہ بے آواز انداز میں ایک ذرا ہماری جانب سرکا اور پھر دائیں طرف دیوار میں نظر آنے والے خلا میں سرکتا چلا گیا۔ باہر جانے کا راستہ کھل گیا تھا۔

کھلے دروازے کی دوسری جانب ویلوٹ کا سبز رنگ کا پردہ جھول رہا تھا۔ شلندر نے اپنا خنجر اٹھایا اور جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے ہلکا سا پردہ ہٹا کر دوسری جانب دیکھا۔ پھر پلٹ کر سرگوشی کے انداز میں مہرجی سے مخاطب ہوا۔

"کیلا بھیم سنگھ ہے بالکل سامنے بیٹھا شراب پی رہا ہے اور اس کا رخ بھی ہماری جانب ہے۔ــــ آواز نہیں ہونی چاہیے۔" خنجر اس نے مہرجی کے ہاتھ سے لے لیا اور مہرجی سر ہلاتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھ گئی

شلندر ایک طرف ہوگیا اور وہ پردے کی اوٹ سے دوسری جانب جھانکنے لگی۔ کچھ دیر بعد اچانک اس نے پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہوگئی۔ ہمارے دل دھک سے رہ گئے۔ اگر بھیم سنگھ چیخ پڑا تو ابھی بیسیوں مسلح افراد یہاں پہنچ جائیں گے اور ہم اوپر..... پردہ ہٹا اور مہوجی کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔

"آجائیں۔" اس نے مطمئن انداز میں کہا اور ہم حیران پریشان اندر داخل ہوگئے۔ اتنی جلدی کیا ہوسکتا تھا؟ محض چند سیکنڈ ہی تو گزرے تھے۔

ہم اندر داخل ہوئے تو ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بالکل سامنے سینٹر ٹیبل پر شراب کے لوازمات دکھائی دے رہے تھے اور ٹیبل کے ساتھ ہی بھیم سنگھ عجیب بے تکے انداز میں پڑا تھا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا..... یقیناً" اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

"عارب اس کو تہہ خانے میں پھینک دو۔" شلندر نے عارب کو مخاطب کیا۔

"مہر! دروازہ۔" شلندر نے کھلے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کیا تو مہوجی نے لپک کر دروازہ بند کر دیا۔ ایک طرف کھڑکی بھی تھی جو ڈاکٹر عقیل نے بند کر کے آگے پردے کھینچ دیئے۔ عارب نے بھیم سنگھ کے نیم مردہ وجود کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا میں نے پردہ ہٹایا اور اس نے اسے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر لڑھکا دیا۔ شلندر نے آگے بڑھ کر جانے کیا کیا کہ کھلا ہوا دروازہ بے آواز دوبارہ بند ہوگیا اس کے بعد اس نے نیچے بیٹھ کر دروازے کی نیچے والی جھری میں خنجر کا پھل ڈالا کچھ ٹٹولا پھر ایک جھٹکے سے خنجر کھینچ لیا اور مطمئن انداز میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"اب یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔"

"ہم لوگ اب کدھر جائیں گے۔"

"ہمیں بائیں باغ کا رخ کرنا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کھڑکی بائیں باغ میں ہی کھلتی ہے۔" میں نے فوراً" کہا۔

"اور لگتا ہے کہ قسمت کی دیوی بھی مہربان ہے کیونکہ باہر اندھیرا ہے۔ یقینی بات ہے کہ رات کا وقت ہے۔" شلندر نے دیواروں پر نظر دوڑائی۔ بائیں ہاتھ دیوار پر کلاک دکھائی دے رہا تھا جس کی سوئیاں ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔

"یعنی رات کے ڈھائی بج رہے ہیں۔ اور ہمارے پاس ڈھائی گھنٹے ہی ہیں اس کے بعد اجالا پھیل جائے گا ہمیں ڈھائی گھنٹے کے اندر اندر تابوت لے کر یہاں سے نکلنا ہوگا ورنہ خاصی مشکل ہوجائے گی۔ ابھی تو مہاراج رام پرشاد بھی اپنی خواب گاہ میں ہی ہوگا! ہمارا کام مزید آسان ہوجائے گا۔ اس نے مجھے انسانی سروں کا تحفہ بھیجا تھا۔" شلندر کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔

"ہم جتنی جلدی کریں گے ہمیں اتنی آسانی رہے گی اس رات کے اندھیرے میں جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو صبح کی روشنی کے ساتھ حالات خطرناک ہوجائیں گے۔" پروفیسر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر بھگوان کا نام لے کر آجاؤ۔" شلندر کھڑکی کی طرف بڑھا۔

"ہم تو اللہ کا نام لیں گے۔" اختر بے ساختہ بول پڑا۔

"اوہ یس..... آئی ایم سوری۔" شلندر مسکرایا۔ پھر مہوجی سے مخاطب ہوا۔

"لائٹ آف کردو۔" مہوجی نے فوراً" آگے بڑھ کر دو چار بٹن پش کیے تو کمرے میں گاڑھا اندھیرا ابھر آیا۔ اندھیرے میں ہلکے پردے کی سرسراہٹ ابھری پھر کھڑکی کھلنے کی ہلکی سی آواز..... کھڑکی کھلتے ہی چاند کی زرد کرنیں تاریکی کو زخما گئیں۔ کھڑکی کے پٹوں میں تو شیشے لگے ہوئے تھے البتہ فریم قدیم طرز کا تھا نہ جالی اور نہ ہی سلاخیں یقینی بات تھی کہ محل کی تمام کھڑکیاں اسی طرز کی رہی ہوں گی اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہی تھا۔ مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہوتی۔

❁

(آخری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

(۴) کرن ہمارے ہاں باقاعدگی سے آتا ہے اور جب فرصت ملتی ہے میں اس کا مطالعہ ضرور کرتی ہوں کسی ایک مصنفہ کا نام تھوڑا مشکل ہے لیکن روشی بخاری کا نام ضرور لوں گی ان کی تحریریں جاندار ہوتی ہیں اور قاری کو ایک نئی سوچ دے کر جاتی ہیں۔ "روداد قفس" اچھا سلسلہ ہے اور "آرزو عیب نہیں" نے بہت متاثر کیا۔ آخر میں کرن کی پوری ٹیم اور قارئین کا شکریہ ادا کروں گی اور دعا کرتی ہوں کہ یہ سفر کامیابی سے طے ہوتا رہے۔ (آمین)

اعتبار ساجد...... شاعر

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں میرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں مجھے کوئی شام ادھار دو

آپ کے سوالات دلچسپ ہیں۔ اشعار میں جواب دے رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف۔

(۱) زندگی کا ایک اور سال گزر جانے کے بعد احساسات؟

جواب۔ مجھے تو ہر بار یہی احساس ہوتا ہے

ساجد کوئی کلی نہ کھلی شاخ علم پر
یہ سال بھی عذاب جہالت میں کٹ گیا

(۲) شیکسپیئر...... دنیا ایک اسٹیج ہے۔ میرا کردار......

جواب۔ خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا "اہم" کردار ادا کیا ہے۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں۔

ساجد نجانے کون سا کردار تھا مگر
تمثیل شب میں ایک اداکار ہم بھی تھے

(۳) غلطی؟

ہر کام ابتدائی مراحل سے شروع کیا۔ مثلاً محبتیں۔

ہم کو بھی تو زندگی میں بڑے دیر سے ملے
کوئی بھی چیز وقت ضرورت نہیں ملی

☼ ☼ ☼

تو کیا ترک سفر اس خوف سے ہم نے کیا ساجد
یہیں سے لوٹ جائیں ہم کہ آگے پل شکستہ ہے؟

○ پچھتاوا؟

میں شرمندہ بہت ہوں رفتگاں سے جانے کیوں ساجد
بدل دیتا ہوں رستہ روز قبرستان سے پہلے

○ ازالہ؟

چلو مرنے سے پہلے زندگی آسان کر جائیں
کسی کے کام آئیں اپنی آنکھیں دان کر جائیں

☼ ☼ ☼

زیست کے آخری پیغام سے پہلے پہلے
قرض نمٹاتے چلیں شام سے پہلے پہلے

عمر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ کے ہمراہ چلیں
کسی تہمت کسی دشنام سے پہلے پہلے

رت جگے جتنے ہیں باقی سو ادا کرتے رہیں
آخری نیند کے آرام سے پہلے پہلے

(۴) کرن کے حوالے سے......

میں کس کا نام لوں، کس کو عظیم ٹھہراؤں
کرن کے سارے لکھاری عزیز ہیں مجھ کو

☼ ☼ ☼

یہ اور بات کہ دو چار نام ایسے ہیں
جنہیں بھلانا بھی چاہوں تو میں بھلا نہ سکوں

سیما غزل (رائٹر، شاعرہ)

شام ڈھلے جب سارے پنچھی گھر کو جانے لگتے ہیں
سامنے والے پیڑ پہ بیٹھی چڑیا رونے لگتی ہے

(۱) شدت سے احساس ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے کام ہیں جو نہیں کر سکی۔ بہت سے لوگ تھے جن کو کھو دیا بہت سی نیکیاں تھیں جنہیں سمیٹ سکتی تھی مگر سمیٹ نہیں پائی کاش یہ گزرا سال لوٹ آئے کہ میں دنیا والوں سے محبت کر سکوں جنہیں کھو دیا ان کی خدمت کر سکوں اور اپنی کی ہوئی غلطیوں کو درست کر سکوں۔

(۲) میں دنیا کے اس اسٹیج پر ابھی تک کوئی ایسا اہم کام نہیں کر سکی جو میرے اپنے ضمیر کو مطمئن کر کے مجھے اپنی ذات میں اس کائنات کی ساری پوزیشنوں سمیٹ لینی چاہیے یہ میرا سب سے اہم رول ہوگا اور میں ان شاء اللہ یہ رول ادا کروں گی۔

(۳) بہت سی غلطیاں اور بہت سے پچھتاوے ہیں کیونکہ ہر آنے والا لمحہ ہمیں جہاں نیا شعور دیتا ہے وہاں ہماری بے وقوفیوں کا ادراک بھی دے جاتا ہے۔ جو پچھتاوا بن کے ہمارے ساتھ رہتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ پچھتاوے ہی ہمیں سدھارتے ہیں۔ میں اپنی ساری گزری غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتی ہو۔

(۴) مجھے اکثر لکھنے والوں نے متاثر کیا ہے دل مطمئن ہوتا ہے کہ لکھنے والوں کے پاس ابھی بہت کچھ ہے اور وہ اس سفر میں بہت کچھ حاصل بھی کر رہے ہیں۔

کرن رباب نقوی (شاعرہ)

میری آنکھوں میں اب بھی چبھتا ہے
تو نے جو خواب توڑ ڈالا تھا

(۱) ملے جلے سے احساسات ہوتے ہیں، صرف ذاتی زندگی کی بات نہیں اجتماعی طور پر بھی دیکھا جائے تو پورے سال کے دوران رونما ہونے والے واقعات فلم کی طرح نظروں کے سامنے چلتے ہی رہتے ہیں اگر اچھی یادیں چہرے پہ مسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں تو اداس لمحے مغموم بھی کر دیا کرتے ہیں انسان کبھی بے خیالی میں مسکرا دیتا ہے تو کبھی پلکیں بھیگ بھی جاتی ہیں بہر حال یہ تو زندگی کا حصہ ہے دکھ سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ اندر کا موسم باہر کے موسم پر ہمیشہ حاوی رہتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کسی بھی چیز کو بے وجہ نہیں بنایا انسان کو بنانے کی بنیادی وجہ انسانیت کی تکمیل ہی تھی بقول اقبال۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ اطاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

تو اپنی طرف سے کوشش کرتی ہوں کہ حقوق العباد میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہو، رہے حقوق اللہ تو ذات پاک پر بہت یقین بہت مان ہے۔ وہ بہت غفور الرحیم ہے جانے انجانے میں ہو جانے والی غلطیاں معاف فرمائے گا ان شاء اللہ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں نے یہ کردار آسانی سے نباہ لیا تو اس دنیا میں اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا۔

(۳) انسان خطا کا پتلا ہے نہ چاہنے پر بھی اس سے بہت

سی غلطیاں سرزد ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ اپنی طرف سے تو پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو کیونکہ اس سے بڑا گناہ اور کچھ نہیں ہو سکتا پھر بھی اگر مجھے لگے کہ میں نے کسی کا دل دکھا دیا تو معافی مانگنے میں کبھی شرم محسوس نہیں کرتی۔

(۴) ویسے تو بہت کم وقت ملتا ہے کہ فرصت کے لمحات میسر آئیں سو جب میں بہت زیادہ تھک جاتی ہوں اور توانائی تھکن اتارنے کے لیے مطالعہ کا ہی سہارا لیتی ہوں پھر مطالعہ میرے اعصاب کو پرسکون کر دیتا ہے۔ سال گزشتہ کرن میں ایک دو تحریریں پڑھی ہیں۔ بعض کہانیاں بہت اچھی تھیں 'دل کو چھو لینے والی حقیقت سے بہت قریب تر ہیں۔

ارشد ملک (شاعر)

اب زندگی کے شلف میں ڈھونڈا کریں گے لوگ
ارزاں ہوئے ہم اتنے کہ نایاب ہو گئے

(۱) دیکھیں جی میں تو زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرتا ہوں یہ محسوس نہیں کرتا کہ زندگی کا ایک اور سال کم ہو گیا یہ جو اتار چڑھاؤ آتے ہیں جیسے کہ بچپن جوانی اور پھر بڑھاپا۔ تقریباً" چالیس سال کا ہو گیا ہوں یوٹرن لگا ہوا ہے لیکن میں خود کو اس حساب سے ایڈجسٹ کر لیتا ہوں مجھے اتنی پرابلم نہیں ہوتی۔

(۲) جب میں نے ہوش سنبھالا اور شاعری کی دنیا میں آیا تو دیکھا قاری اور کتاب میں ایک گیپ آگیا بہت سی چیزیں جیسے نظمیں یا غزلیں لوگوں کو پسند تو ہوتی ہیں لیکن ان کو یہ نہیں پتا ہوتا کہ یہ ہیں کس کی تو اس حوالے سے میں نے کام کیا۔ اپنی شاعری تو کی ہی ہے دوسرے لوگوں کے بھی بہت سے انتخاب شائع کیے تاکہ لوگوں میں شعور پیدا ہو کہ کون سی چیز کس شاعر کی تخلیق ہے۔ تو یہ کردار نبھانے کی بس اپنی سی کوشش کی ہے۔

(۳) زندگی کا جو راستہ ہے یہ بالکل سیدھا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کاش وہ دائرے کی شکل میں ہوتا اور ہم گھومتے ہوئے واپس جا کر اپنی کی ہوئی غلطیوں کو سدھار سکتے 'غلطیاں تو بے شمار ہیں جو ہم نے کی ہیں جب میں پبلشر تھا تو بہت سی ایسی کتابیں چھاپیں جو شائع نہیں کرنا چاہیے تھیں اس پر کبھی کبھی مجھے ندامت اور پچھتاوے کا احساس ہوتا ہے۔

(۴) کرن ایک معتبر اور معیاری پرچہ ہے رائٹر کے حوالے سے میں نازیہ کنول نازی کا نام لینا چاہوں گا ان کا سارا سفر میرے سامنے ہے اس وقت سے جب انہوں نے ناول لکھنا شروع کیا یا شاعری کا آغاز کیا۔ تو جب کوئی ترقی کرتا ہے 'نام بناتا تو مجھے خوشی ہوتی ہے ان کے علاوہ عمیرہ احمد اور نمرہ احمد وہی جو کرن میں لکھتی رہی ہیں اور انہوں نے بطور رائٹر اپنا نام پیدا کیا۔ نمرہ بھی بطور رائٹر پسند ہیں۔ عام روٹین سے ہٹ کر جو لکھنے والی ہیں میں انہیں پسند کرتا ہوں بلکہ یہ کہوں تو مزید بہتر ہو گا کہ میرے لیے رائٹر سے زیادہ اس کی تحریریں اہمیت رکھتی ہیں۔

قارئین

فرزانہ علی احمد۔۔۔ کراچی

(۱) ایک اور سال تمام ہوا 'وقت اسی طرح رواں دواں رہتا ہے روز و شب یوں ہی ماہ و سال میں ڈھلتے صدیوں میں تبدیل ہوتے کرنوں کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ لیکن گزرے دنوں کا شمار اور آنے والے دنوں کا حساب مقصد حیات نہیں 'نہ ہی زیست کے اس سفر میں یہ دیکھیں کہ آپ نے کیا کھویا یہ دیکھیں کہ آپ کے پاس کیا ہے کیونکہ جو پل گزر گئے انہیں گزرنا ہی تھا۔

(۲) شیکسپیئر نے کہا تھا دنیا ایک اسٹیج ہے بالکل صحیح کہا۔ میں نے اب تک بہت سے کردار ادا کیے ہیں بہت سارے رشتے نبا ہے ہیں بس ایک کردار ادا نہ کر سکی وہ ماں کا رشتہ ہے جو دنیا میں سب سے خوب صورت کردار ہے۔

(۳) میری سب سے بڑی غلطی یا پچھتاوا یہ ہے کہ میں ہر بات سب کو بتا دیتی ہوں اور پھر افسوس کرتی ہوں میں نے کیوں بتائی۔

(۴) کرن کی ہر تحریر جو کسی بھی مصنفہ کی ہو بہت اچھی ہوتی ہے کیونکہ ان تحریروں سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ ہماری زندگی میں کہیں نہ کہیں نظر آتی ہے اور اس سے ہم سبق بھی حاصل کرتے ہیں۔ ہمیشہ کرن نے ہمیں اچھی اور معیاری کہانیاں شائع کی ہیں جس سے ہمیں زندگی سنوارنے کے مواقع ملتے ہیں۔

باقی کرن کے تمام اسٹاف اور مصنفین کا شکریہ ادا کروں گی خاص طور پر ریحانہ علی احمد کا اور ارم آفتاب کا جن کی محنت 'محبت اور لگن سے کرن ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔

خدائے بزرگ و برتر آپ کے ادارے پر اپنا سایہ رحمت ہمیشہ رکھے آمین۔

اسماء اقبال عمران۔۔۔ لاہور

(۱) پہلا سوال کا جواب تو کچھ یوں ہے کہ زندگی کا ایک اور سال گزر جانے پر یہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک سال اور اختتام پذیر ہوا اور وہ بھی بنا کوئی خوشی دیے۔ میں سوچتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور چالیس دن میں سے انتالیس دن تکلیف اور درد کی ہوا چلائی اور ایک دن خوشی و آرام کی تو یہ بات آج کل کے زمانے میں بالکل درست ہے خوشی بہت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی اور غم ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے اور کوئی نیا احساس 'نئی بات 'نیا منظر نہ گھر میں نہ شہر میں نہ ملک میں نظر آتا ہے بلکہ صرف یہ احساس باقی رہ جاتا ہے کہ زندگی کا ایک اور سال کچھ کیے بغیر ہی گزر گیا۔

(۲) شیکسپیئر نے بالکل ٹھیک کہا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور میں نے حسب توفیق جو اللہ تعالیٰ نے مجھے ذمہ داریاں سونپی ہیں انہیں احسن طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے آپ کو سنوارنے کی ادنیٰ سی کوشش ہے ظاہری نہیں باطنی طور پر نیک اور صالح بننے کی کوشش کی ہے۔

اپنے جذبات و احساسات کو تحریر کی صورت دینے کی سعی کی ہے جس میں تھوڑی سی کامیابی بھی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مجھے دنیا میں ایک اچھا کردار نبھانے کی ہمت عطا فرمائے آمین۔

(۳) غلطی تو میں اپنی یہی مانوں گی کہ اس دنیا میں جس کے ساتھ اچھا کرو وہ برا ہی کرتا ہے۔ آپ کی نیک نیتی کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ جس کے ساتھ اچھائی کی وہ "اچھائی" کی قدر بھی نہ کر سکا۔ تو اس سال کسی کے ساتھ برا تو بالکل نہیں کروں گی مگر اچھا کرنے کی کوشش بھی نہیں کروں گی اور اپنے کام سے کام رکھوں گی۔ اپنے دکھ درد کو اپنا سمجھوں گی کسی دوسرے کے نہیں اور اس امید پر زندہ رہوں گی کہ برائی کے ڈر سے اچھائی کو نہ چھوڑ دینا۔ کبھی تو کوئی سمجھے گا ان شاء اللہ۔

شمائلہ تاج۔۔۔ خانپور

کرن کا سروے ہو اور میں شرکت نہ کروں 'یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سو اپنے جوابات کے ساتھ حاضر ہوں۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
زندگی یونہی تمام ہوتی ہے

(۱) زندگی کا ایک اور سال بیت گیا۔ وقت تو گویا پر لگا کر اڑ رہا ہے 'جانے کیسا دور آگیا ہے۔ کسی کو کسی کی پرواہی

نہیں۔ ایک افراتفری اور نفسا نفسی کا دور ہے کہ فرصت کے چند پل بھی غنیمت لگتے ہیں۔ اور اس افراتفری میں عمر عزیز کا ایک اور سال بیت گیا۔ جیسے جیسے زندگی کے سال گزرتے جا رہے ہیں۔ ایک افسوس سی کیفیت رگ و پے میں سرائیت کرتی جا رہی ہے اور خاص طور پر میں جب ضعیف العمر لوگوں کو دیکھتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ ہم بھی ایک دن اس عمر کو پہنچ جائیں گے تو ایک بے چارگی اور بے بسی کا احساس مجھے اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔

(۲) زندگی میں ہر کوئی اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ شیکسپیئر نے کہا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور آپ نے پوچھا کہ ہم نے کون سا اہم کردار ادا کیا۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ اس سوال کا کیا جواب دوں۔ اس دنیا میں ہر فرد اپنا کردار بخوبی ادا کر رہا ہے۔ اگر ہم فیشر زندگی گزاریں' کسی کو اپنی ذات سے کوئی تکلیف نہ دیں' اپنا اخلاق اچھا کرلیں' ہر ایک کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھیں "تو یقیناً" ہم اس اسٹیج پر بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں (یہ میرے بالکل ذاتی خیالات ہیں' کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے) اور میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ میری ذات کسی کے لیے دکھ کا باعث نہ بنے۔

(۳) اللہ پاک کا لاکھ کرم ہے کہ مجھ سے ایسی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس پر مجھے نادم ہونا پڑے۔ چھوٹی چھوٹی غلطیاں تو ہر انسان کرتا ہے۔ میں نے بھی بے شمار کی ہیں مگر ایسی بڑی غلطی نہیں ہوئی جس پر میں نادم ہوں۔

(۴) 2011ء کا سال بہت مصروف گزرا مگر میں نے "کرن" کا کوئی شمارہ بھی مس نہیں کیا۔ مجھے بہت سی تحاریر نے متاثر کیا مگر ایک تحریر جو میں نے پہلی قسط سے بہت توجہ سے پڑھی وہ ہے نایاب جیلانی کی "اور ہے پیا" اس کی پہلی قسط سے لے کر اب تک میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ جب بھی اس کی کوئی قسط اینڈ ہوتی ہے میرا دل چاہتا ہے کہ بس جلدی سے دوسری آجائے اور میں ساری اقساط ایک ساتھ پڑھ لوں اور اس کہانی نے کیوں متاثر کیا یہ پتا نہیں۔

نمرہ۔۔۔ راولپنڈی

سب سے پہلے کرن کی سالگرہ سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ پاک کرن کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے (آمین) تمام مصنفین کو بھی بہت بہت مبارک باد جن کی محنت کی بدولت اتنا اچھا رسالہ ہمارے ہاتھوں میں آتا ہے اب آتے ہیں سوالات کی جانب۔

(۱) ایک اور سال گزر جانے پر کیا احساسات ہونے چاہئیں ... سب سے پہلے تو اداسی چھا جاتی ہے اور وہ تمام باتیں یاد آتی ہیں جو گزرے ہوئے سال میں کی ہوتی ہیں ایک تو سال کا اینڈ بھی سردیوں میں ہوتا ہے اور سردیوں کی شامیں انتہائی اداس ہوتی ہیں سال کی آخری شام اور بھی زیادہ اداس گزرتی ہے۔ یہ ہی احساس ہوتا ہے ایک اور سال گزر گیا اور پتا بھی نہ چلا' وقت کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ وقت آگے جا رہا ہے اور ہم وقت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

ابھی پچھلے سال ہی تو میری آپی کی شادی ہوئی تھی اور ایسا لگتا ہے کل کی بات ہے۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ کچھ کام ادھورے رہ گئے سب سے بڑھ کر تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم گناہ گاروں کی زندگی کا ایک اور سال گزر گیا ایک اور سال کم ہو گیا نہ جانے زندگی کتنی رہ گئی ہے؟ کیا پتا آنے والا سال ہماری زندگی کا آخری سال ہو اور یوں ہی خالی ہاتھ سر پر گناہوں کا بوجھ اٹھائے اس دنیا سے چلے جائیں۔ نماز بھی کبھی ڈھنگ سے نہیں پڑھی۔ یہ تو ہمارا حال ہے اگر سال کے آخر میں ہم یہ بھی سوچ لیں تو بڑی بات ہو گی۔

(۲) میں گھر میں سب بہن بھائیوں سے چھوٹی ہوں اور ابھی تک سب مجھے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں اور مجھے ایسا ہی فیل ہوتا ہے کہ میں ابھی بھی چھوٹی سی بچی ہوں اس لیے میرے خیال میں دنیا کے اسٹیج پر میں نے ابھی تک کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا لیکن میری دعا ہے کہ میں امی 'پاپا کے لیے اچھی بیٹی' اپنے بہن بھائیوں کے لیے اچھی بہن کا کردار ادا کروں اور اپنی آنے والی بھابھیوں کے لیے ایک بہن کا کردار ادا کروں نہ کہ ایک نند کا..... جس طرح میں نے اپنے بہنوئی کو کبھی فیل نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی بہن نہیں ہوں اسی طرح ان شاء اللہ میری پوری کوشش ہو گی کہ میں اپنی بھابھیوں کو بھی یہ فیل نہ ہونے دوں کہ میں ان کی بہن نہیں ہوں۔

دنیا کے اسٹیج پر کردار ادا کرنے کی بات ہے تو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک اچھے مسلمان ہونے کا کردار ادا کرنا ہے صرف نام کے مسلمان نہ ہوں صحیح والے مسلمان بن کر رہیں اور دنیا کے اسٹیج پر اچھے مسلمان کا کردار ادا کروں اور دنیا میں کچھ ایسا کر کے جاؤں کہ لوگ میرے مرنے کے بعد مجھے اچھے لفظوں میں یاد رکھیں ایک

اور بات میں کبھی کبھی کافی بدتمیز ہو جاتی ہوں۔ کافی بدتمیزی کر جاتی ہوں اس عادت کو ختم کر کے ایک اچھی انسان بھی بننا چاہتی ہوں۔

(۳) غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ کچھ غلطیاں ہم بھول کر کر بیٹھتے ہیں اور کچھ غلطیاں جانتے بوجھتے کرتے ہیں۔ ہوئی ہیں ایسی غلطیاں جو نہیں ہونی چاہیے تھیں۔ غلطی کر کے اس کو تسلیم کر لینا بھی بہت بڑی بات ہوتی ہے اسی لیے جو ہو گیا سو ہو گیا گزرا ہوا وقت اچھا ہوتا ہے چاہے اچھا ہو یا برا اسی لیے برا وقت بھول جانا چاہیے کیونکہ غلطی انسان سے برے وقت میں ہی ہوتی ہے۔ میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوں لیکن ان کا ازالہ بھی کر چکی ہوں۔

(۴) کہانیاں تو ساری اچھی ہوتی ہیں لیکن جس کہانی نے مجھے متاثر کیا وہ گزشتہ سال جولائی کے شمارے میں نبیلہ عزیز کی ایک کہانی "بے داغ" تھی اس کہانی میں لڑکی کی ہمت کی داد دوں گی کہ کس طرح وہ اپنی عزت بچا کے بھاگی اور ایک لڑکے کے ساتھ فلیٹ میں اکیلی رہی اور پھر جس طرح اس سے شادی کے بعد سب کچھ فیس کرنا پڑا یہ سب کافی مشکل کام ہے لیکن میرے خیال میں لڑکیوں کو اسی طرح بہادر ہونا چاہیے۔

عنبر وسیم۔۔۔ گوجرانوالہ

(۱) وقت کا کام گزرنا ہے اور یہ اپنی مدت پوری کر کے گزرتا جاتا ہے اور زیست کے صفحات میں اپنے واقعات اور نقش و نگار چھوڑ جاتا ہے۔ سال گزرنے کا تو پتا ہی نہیں چلتا ابھی یکم جنوری ہے تو پلک جھپکتے میں 31 دسمبر..... چونکہ مجھے دسمبر مہینہ اچھا لگتا ہے۔ اس لیے اس میں' میں بہت اداس ہو جاتی ہوں کہ اب یہ بچھڑنے والا ہے۔ دسمبر آتے ہی اپنی قیمتی یادیں' اپنے بیچلر لائف' کالج کے ایڈونچرز اور نہ جانے کیا کیا رلاتا ہے اور دسمبر پھر گزر جاتا ہے۔ سال جیسا بھی گزرا ہو۔ خداوند کریم سے دعا کرتی ہوں کہ آئندہ سال اس سے بھی اچھا گزرے۔ ویسے ہم مسلمانوں کا نیا سال یکم محرم الحرام سے شروع ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں رہنا ہے تو یہ رسم بھی جنوری کو بھی نبھانی پڑتی ہے۔

(۲) شیکسپیئر نے واقعی ٹھیک کہا ہے کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم انسان اس میں اپنے کردار نبھا کر چلے جاتے ہیں۔ میں برملا کہتی ہوں کہ میں نے ایک عورت ہونے کا صحیح حق ادا کیا ہے۔ بیٹی ہے تو عزت و حیا کا پیکر' ماں' باپ کی رضا میں راضی رہنے والی بیوی بنی تو شوہر کے حقوق و فرائض میں ہلکان ہوتی نظر آئی اور جب ماں بنی تو اپنی کل کائنات اپنے دونوں بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لینے والی دنیا کے ہر سرد و گرم اور لو دیتے تھپیڑوں سے بچا لینے والی۔

ان کی بلائیں' دعائیں اپنے سر لینے والی۔ اپنی جان تک تیاگ دینے والی۔ حقیقی ماں۔ سچ ان میں جو ماں والا کردار ہے وہ بہت ہی خوب صورت ہے۔ میں جو کتابوں کی دیوانی مشہور تھی۔ رسائل کا کیڑا تھی۔ اب بچوں میں اتنی محو ہو گئی ہوں کہ اکثر سر میں کنگھی کرنا ہی یاد نہیں رہتا۔ بستر پر سونے سے پہلے یاد آتا ہے تو سر پر ہاتھ پھیر کر رہ جاتی ہوں کرن و خواتین' جو ایک دن میں ختم کر لیتی تھی۔ اب پندرہ بیس دن لگتے ہیں کہ خطوں کی آخری تاریخ گزر جاتی ہیں۔

(۳) انسان خطا کا پتلا ہے۔ اور کون سا انسان ایسا ہے جو کہے کہ میں نے کبھی غلطی نہیں کی۔ غلطیاں میں نے بھی کی اور ان پر نادم بھی ہوتی ہوں اور اپنی اصلاح وقتاً "فوقتاً" کرتی رہتی ہوں۔ ہاں اگلا بندہ احساس دلائے تو غلطی برا نہیں مانتی۔ مگر ایک پچھتاوا ایسا ہے جو لگتا ہے ساری زندگی ساتھ رہے گا۔ بے رحم وقت اور [illegible] نے مجھ سے میرے پیارے ساتھی چھڑوا دیے۔ جن میں [illegible] اور کتاب بھی سرفہرست ہیں میں اس [illegible] کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتی۔ کہ [illegible] دے دیا ہے اور ریڈنگ نہ کرنے سے میرا نقصان ہوا ہے۔ وہ مائنڈ جو ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ رہا کرتا تھا' اب لگتا ہے [illegible] ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر خوشی یہ ہے کہ میں قیمتی اثاثہ لیے ہوئے ہوں جو دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی۔ عبداللہ اور حریم فاطمہ کی شکل میں۔

(۴) سعدیہ راجپوت گو کہ پرانا نام نہیں لیکن انداز تحریر اتنا پختہ کہ ناقابل بیان۔ ان کی تخلیق کردہ "عشق آتش" کئی ایک نے اسے کاپی کہا۔ کسی نے اس کے انداز بیان کو نشانہ بنایا تو کسی نے منظر نگاری کو۔ مگر میں اسے ایک دم پرفیکٹ کہوں گی۔ وجدان اور ملیحہ کی کہانی دل چھو لینے والی تھی۔ ان کا دکھ مجھے اپنا دکھ لگا اور نور الہدیٰ وفا و عظمت کا پیکر۔ ان جیسا مرد دنیا میں ناپید ہے وجدان کے اینڈ نے تو اتنا رلایا کہ بس۔

"عشق آتش" کو بلاشبہ گزشتہ سال کی بہترین تحریر کہوں گی۔ نایاب جیلانی' شگفتہ بھٹی' نبیلہ عزیز' روشنی بخاری نے بھی اچھا لکھا۔ آخر میں کرن کی سالگرہ کے

موقع پر دعا ہے کہ خداوند کریم اسے یونہی قائم و سلامت رکھے اور ہم اس سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں۔ گو کہ خواتین و شعاع میں میں تبصرے نہیں کرپاتی مگر مطالعہ میں ان کا بھی کرتی ہوں۔ خط نہ لکھنے کی مجبوری بیان کرچکی ہوں تاہم میری دعائیں تینوں کے نام ہیں۔

آپ بھی مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں اور خصوصاً" یہ دعا کریں کہ اللہ مجھے صبر و حوصلہ استقامت کے ساتھ عطا کرے۔ (آمین)

انیقہ انا..... چکوال

(۱) سال گزرنے پر احساسات..... اگر دسمبر سے جنوری تک آنے کی بات ہے تو..... دوستوں کے سال گزرنے کے حوالے سے ڈھیروں ڈھیر پیغامات وصول کر کر کے مت ماری جاتی ہے۔ تو ایسی صورت حال میں دل کہتا ہے اچھا ہی ہوا کہ سال ختم ہوا۔

پھر دوسری طرف اگر کسی خاص دن کا انتظار ہو تو۔ دل اداس ہو جاتا ہے۔ وہ کیا بھلا سا شعر ہے نا!

وصل آرزو کا دن اور اتنا مختصر

جیسے عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دن ہمیشہ مجھے اس دن کا بہت انتظار رہتا ہے۔ پر اب کی بار جب اس مبارک دن کا سورج اپنی رونقیں اور رحمتیں سمیٹ کر رخصت ہوا تو دل بھر آیا کہ بس اتنا سا دن جانے اگلے سال میں رہوں یا نہ رہوں۔

نہ جی بھر کے دیکھا نہ بات کی

(۲) شیکسپیئر صاحب تو کہہ کر دار فانی سے کوچ فرما گئے ہم ابھی تک ان کے سوالوں میں الجھے ہیں بات ہے کرداروں کی تو جناب شادی سے پہلے تک کے تمام کردار میں نبھا چکی ۔ اوہ بلکہ نبھا رہی ہوں۔ بیٹی "بہن" دوست "پھپھو اور خالہ۔ وغیرہ وغیرہ اب کیسے نبھائے پتا نہیں (مجھ سے وابستہ لوگ جانتے ہیں) بات ہے اہم کردار کی۔ نہ میں اچھی بیٹی نہ بہن اور نہ دوست..... ہاں خالہ ہونے کے ناتے مجھے اپنی تینوں بہنوں کے بچے ازحد عزیز ہیں۔ (بھتیجے ملک سے باہر ہیں "ہیں تو وہ بھی پیارے) جب ام ہانی جب کوئی چیز پا کر یا کئی دن بعد مجھ سے مل کر بے ساختہ کھلکھلا کر ہنستی ہے تو لگتا ہے زندگی یہی ہے اور جی چاہتا ہے اس پر واری جاؤں میں (اتنی عزیز ہے وہ مجھے)

(۳) آپ کے سوال نے کئی یادیں تازہ کردیں ٹھہریے! تھوڑا پیچھے جاتی ہوں۔ میں نے ایک جملہ کہیں سنا تھا (میرے نزدیک وہ جملہ تاریخ ساز ہے) جملہ تھا "ہر گناہ ایک حادثہ ہے" "اسی جملے سے میں اس سوال کا جواب دیتی ہوں۔

"ہر گناہ ایک پچھتاوا ہے" "اور کہا جاتا ہے کہ بلا اجازت شرعی گناہ کا اظہار کرنا بھی گناہ ہے۔ لہٰذا کیا بتاؤں کہ کس کس غلطی کا ازالہ کروں..... سچ کہوں تو میں اپنی ہر ہر غلطی کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔ اب خود بتائیے کیا کیا لکھوں؟ اپنا حال تو یہ ہے کہ.....

اے نفس یہ کیا ظلم ہے

جب دیکھو نیا جرم ہے

(۴) سال گزشتہ میں بہت سی تحاریر نے دل و ذہن کو منور کیا۔ مگر "آتش عشق" نے تو روح کو جھنجھوڑ دیا۔ سعدیہ راجپوت کے قلم سے نکلا لفظ لفظ..... کہانی کے عنوان سے لے کر اختتام تک سعدیہ نے ہر کردار کو بخوبی نبھایا تھا۔ خدا ان کے قلم میں مزید ترقی دے۔ آمین

سیماب علی.....ڈیرہ اسماعیل خان

محمود ریاض (مرحوم) کی سندر چھاؤں میں بابر فیصل (مرحوم) بھیا نے ایک چھوٹا سا پودا کرن ڈائجسٹ کے نام سے کراچی کی سرزمین پر لگایا تھا۔ جو پھلتے پھولتے آج ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ اللہ پاک محمود ریاض "ابن انشا" محمود خاور "ذوالقرنین" محمود بابر "میرے والدین اور سب مسلمانوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (امین) زندگی خوشی غم "خزاں بہار کا خلاصہ ہے۔ تو اس خوشی کے موقع پر ادارہ کرن ڈائجسٹ کو مسلسل کامیابی سے ہمکنار چونتیس سال (۳۴) مکمل کرنے پر ڈھیر ساری مبارکباد قبول ہو۔

تو جس راستے پر رہے گامزن

وہی تیری منزل کا ہو راستہ

اب آتے ہیں سروے کے جوابات کی طرف۔

(۱) زندگی ایک نعمت ہے۔ ایک امانت ہے۔ ایک کیف و سرور کا نام ہے۔ پھر ایک آزمائش بھی ہے۔ روز محشر اللہ تعالیٰ سب انسانوں سے یہ سوال بھی فرمائے گا کہ میں نے تم کو یہ زندگی دی تھی۔ اس کو کس طرح بسر کی تھی؟ تب مقصد حیات کا علم ہو گا.....

آدھا جیون بیتا آہیں بھرنے میں

آدھی عمر توازن قائم کرنے میں

جب زندگی کا ایک سال چپکے سے گزرتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ سوائے دوسروں کے احساسات سے کھیل کر اپنا دامن خوشیوں سے بھرنے کے! افراط و تفریط کی دوڑ میں صرف بے حسی، نفسانفسی کا عالم ہے۔ ہر سو انسانیت کی تذلیل سرعام ہے۔ قتل و غارت، لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ اندھا راج ہے۔ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" زندگی کا مقصد صرف جھوٹ، فریب، سازش ہی رہ گئی ہے۔ جبھی تو امن و سلامت نام کو نہیں ہے۔

سازشوں کے دور میں امن کی دعا کرو
امن کھو گیا کہاں اس کا کچھ پتا کرو
الفتیں کہاں گئیں نفرتوں کا زور ہے
پیار کے حصول کی شہر میں صدا کرو

آزادی کا جو خواب دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر الٹ ہو چکی ہے۔ بے حیائی، کرپشن ہمارے آس پاس ہے۔ بلکہ ہماری ضرورت بن چکی ہے۔ جبھی تو ہمیں اپنی غلطی، اپنی کمزوری اپنی نا اہلی بالکل ٹھیک لگتی ہے اور یہ احساس ابلیس کی فریبی میں شامل ہے۔ کہ ابن آدم گمراہی کی جانب گامزن رہے۔ کبھی بھی اپنی بھول پر شرمندہ ہو کر توبہ نہ کرے۔ بلکہ خود کو اچھا سمجھے اور دوسروں کو حقیر جان کر امن و سلامتی کا پرچم خود اپنے ہی ہاتھوں سے گرانے کی کوشش میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

کاغذی سے پھول ہیں جن میں رنگ و بو نہیں
پھر سے رنگ و بو ملے ایسی کچھ دعا کرو
خود ہی شاخ کاٹ دی جس پہ آشیانہ تھا
مت کسی بھی غیر سے اس کا اب گلہ کرو

(۲) فانی دنیا واقعی ایک پلیٹ فارم ہے۔ اس دنیا میں ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں۔ آخرت میں اس کی سزا و جزا کا علم ہو گا کہ کیا کھویا کیا پایا؟ لیکن نیکی اور بدی کے اثرات اس دنیا میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ جو انسان اپنی لاعلمی کے باعث جان بوجھ کر اگنور کرتا ہے۔

فقط درد دل زندگی کا ہے مقصد
مگر بھول بیٹھا ہے اس کو انسان

ناچیز نے کوئی ایسا کارنامہ تو انجام نہیں دیا ہے۔ جو قابل ذکر ہو۔ لیکن کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ معارف القرآن (تفسیر) جو کہ آٹھ جلد پر مشتمل ہے۔ اس کا مطالعہ کیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر کا مطالعہ جاری ہے۔ کرن، شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اپنے پیارے بھانجے عبدالباسط کو قرآن پاک پڑھایا ہے۔ "شہاب نامہ" سے دو وظائف کو اپنی زندگی میں شامل کیا ہے (چھوٹا منہ بڑی بات) منافقت کی بجائے سچائی کو اپنی زندگی میں شامل کیا تو سب دوست دور ہوتے چلے گئے۔

فیصلہ سچا کرو اے منصفو.....
ایک منصف اور ہے تم سے بڑا

(۳) "صبر اور شکر" یہ ایک ایسی طاقت ہے جو ہر انسان کو عظیم بنا دیتی ہے۔ پھر رب العزت خالق دو جہاں کو بے حد پسند ہے اور اسلام کی خوب صورت تعلیم بھی یہی ہے۔ ایک پبلک اسکول میں بحیثیت ٹیچر میں نے اڑھائی سال جاب کی ہے۔ محنت و لگن سے اپنا مقام بنانے میں کافی ٹائم گزارا تھا۔ سب کچھ بہتر تھا۔ لیکن وائس پرنسپل جو کہ میری رشتہ دار ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اسکول میں جاب کروں اس کی وجہ کچھ خاندانی مخالفت تھی۔ وائس پرنسپل کا سلوک سب کے ساتھ اچھا تھا سوائے میرے! اس کی مسلسل زیادتیوں پر ایک دن اسے جواب دے دیا۔ بس پھر اس نے پرنسپل صاحبہ کو میری شکایت کر دی۔ جس کی بنا پر پرنسپل صاحبہ نے غصے میں آکر مجھے ٹرمینیٹ کر دیا۔ ساتھ ہی ایک ماہ کی تنخواہ بھی ضبط کر لی۔ میرے لیے یہ بات دکھ کا باعث ہے لیکن پرنسپل وائس پرنسپل صاحبہ کو اپنا فیصلہ آج بھی درست لگتا ہے اور مجھے آج بھی دکھ ہے کہ کاش صبر و تحمل سے وائس پرنسپل کے زیادتیوں کو برداشت کیا ہوتا تو سب لوگ پرنسپل کی حمایت نہ کرتے اور میری اڑھائی سال کی سروس پل میں ختم نہ ہوتی.....؟

بخش دے یارب مرے قلب و ذہن کو روشنی
میری سوچوں کو خدایا دے شعور و آگہی

(۴) ہمیشہ کی طرح گزشتہ سال بھی کرن ڈائجسٹ کی سب رائٹرز نے خواب لکھا۔ لیکن فوزیہ یاسمین، نبیلہ عزیز، نایاب جیلانی، قرۃ العین چنا، نفیسہ سعید نے متاثر کیا ہے۔

مجھ سے ملیے

سعدیہ عزیز آفریدی

ادارہ

1 "تاریخ پیدائش / اسٹار؟"
○ "تین جنوری / کیپری کورن۔"
2 "اللہ سے تعلق؟"
○ "بے حد پر محبت اور بیسٹ فرینڈ جیسا۔"
3 "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"
○ "فرصت کے لمحات؟ جانے یہ کس زمانے کی باتیں تھیں، اب تو کچھ نہ بھی کر رہی ہوں تب بھی بہت ساری باتوں کا بوجھ ہوتا ہے کندھوں پر۔"
4 "کون سی چیز خوش گوار تاثر قائم کرتی ہے؟"
○ "کسی کا بہت محبت سے یاد رکھنا۔"
5 "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"
○ "کوئی بھی چیز چند لمحوں سے زیادہ موڈ خراب نہیں کرتی سو کبھی اس پر نہیں سوچا۔"
6 "مشکل ترین لمحہ؟"
○ "جب ڈیڈی کو اپنی آنکھوں کے سامنے آخری سانس لیتے دیکھا، پھر اس کے بعد کے سارے لمحے اتنے مشکل نہیں لگے زندگی نے آگے بڑھ کر خود موم سے پتھر اور پتھر سے آہستہ آہستہ پارس کر دیا۔"
7 "بہترین تعریف جو وصول کی؟"
○ "جب کسی بہت خاص نے کہا کھانا اچھا بنا ہے، جب امین نے کہا" آپ دنیا کی سب سے اچھی موم ہیں جب احمر بھائی نے کہا آپ کے لکھے ہوئے لفظ میرے لیے زندگی کا انسپریشن ہیں۔"
8 "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
○ "لمبی تان کر سونا۔"
9 "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
○ "جب معین بھائی کے ہاتھ کی Vainz گرینڈر سے کٹ گئی ان کے ہاسپٹل میں جانے اور آپریشن کے بعد تک کا ہر لمحہ خوفناک تھا اب بھی یاد آجائے تو دل کانپ جاتا ہے۔"
10 "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
○ "محبت اور صرف محبت، وہ لفظی ہو یا صرف احساسات کی، بے حد باکمال کر دیتی ہے زندگی کو، اور زندگی کو زندگی دینے کا ہنر، ہر کسی کو نہیں آتا۔"
11 "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"
○ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز۔"
12 "پسندیدہ ساتھی؟"
○ "ایک بے حد پر محبت انسان جس کی وجہ سے زندگی واقعی زندگی لگنے لگی ہے۔"
13 "پسندیدہ ہستی؟"
○ "حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم۔"
14 "پسندیدہ پروفیشن؟"
○ "لفظوں کی بنت سے ڈھارس اور حوصلے کی چادر بننا اور محبت کے بیج دلوں میں اچھال کر محبت کے شجر سایہ دار بننے کی امید میں جینا۔"
15 "بہترین کاوش؟"
○ "ہر وہ تحریر جسے پڑھ کر کسی دل شکستہ نے امید کی

دیوار کو تھام کر سانس بحال کی اور اپنا سفر نئے سرے سے شروع کرنے کا خود عہد کیا۔"

16 "پسندیدہ ملکیت؟"
○ "میری ماں، میری سوچ۔"

17 "زندگی کی خواہش؟"
○ "ایک بہت بڑی سولو ایگزیبیشن اور کسی کی بہت ساری پذیرائی۔"

18 "پریشان کن لمحہ؟"
○ "ہر پریشانی کے لمحے میں کسی بہت اپنے کے قریب ہونے کا احساس اس لمحے کی پریشانی کو زائل کر دیتا ہے، سو کوئی نہیں۔"

19 "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"
○ "خاموش ہو کر اکیلی بیٹھ جاتی ہوں۔"

20 "کوئی ایسا فرد، جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
○ "اپنی ماں کے بعد، سرکاروں کے سامنے۔"

21 "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
○ "جب خود نمائی میں سے شخصیت ڈھونڈ نکالنا مشکل محسوس ہو۔"

22 "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
○ "جب دل کاسہ گدائی ہو اور لوگ اس میں اپنی مصروفیت، الجھنیں اور دکھ ڈالنے کے لیے بھی وقت نہ نکال پائیں اور بے ضرر سی محبت کو موم بن کر مٹھی میں بھینچ کر رکھیں۔"

23 "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
○ "بے پناہ محبت کا احساس، ایک ماں کا بے پناہ تکلیفوں میں بھی اپنی اولاد کے لیے اپنی زندگی سیکری فائز کر دینا اور صلے کی تمنا نہ کرنا۔"

24 "زندگی کا یادگار دن؟"
○ "جب محبت کو میں نے مجسم اپنے سامنے دھیمے سے ہنستے اور باتیں کرتے سنا۔"

25 "موسیقی میرے نزدیک؟"
○ "خالی اور خاموش لمحوں میں رنگ اور ردھم پیدا کرنے کا آسان ذریعہ۔"

26 "پسندیدہ گانا؟"
○ "جب کوئی بات بگڑ جائے جب کوئی مشکل پڑ جائے۔"

27 "پسندیدہ فقرہ؟"
○ "ہر وہ فقرہ جو زندگی میں وقت کے اضافی ہونے کو منہا کر کے زندگی میں زندگی بڑھا دے۔"

28 "پسندیدہ کردار؟"
○ "ہر وہ کردار جو اپنے اندر کی توڑ پھوڑ کو چھپا کر کچھ شکستہ دلوں کی نئے سرے سے آبیاری کرے، امید بوئے، خواب آنکھوں میں بھر کر زندگی کو خوشی کی دعا دے۔"

29 "سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
○ "میری ماں اور میری محبت۔"

30 "اچھا اور خوب صورت موسم؟"
○ "کوئی خاص نہیں۔"

31 "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
○ "پہلا قدم کرن نے چلنا سکھایا اور پہلی کاوش ایک دم سے سب کچھ الگ اور نیا لگا تھا، احساس ہوا کہ لفظ جب بولنا سیکھتے ہیں تو زندگی کیسے نئی معنی اوڑھ لیتی ہے انسان تنہائی سے یکدم بہت سارے دوستوں کے جھرمٹ میں آجاتا ہے۔"

32 "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"
○ "ڈیڈی کے جانے کے بعد، آنے والی رات اس دن احساس ہوا باپ کے چلے جانے پر کیا کیا حق ہیں جو اچانک زندگی چھین لیتی ہے۔"

34 "پسندیدہ مزاح؟"
○ "مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء۔"

35 "حسد محسوس کرتی ہوں؟"
○ "حسد نہیں رشک آتا ہے ان لوگوں پر جنہیں محبت نے دل سے چھوا اور صندل کر ڈالا۔"

36 "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
○ "خوشبو! خاموشی کی طرح ایک بھرپور احساس کا نام ہے سو پسند ہے۔"

37 "پسندیدہ خوشبو؟"
○ "Skyblue coolwater"۔

38 "آخری کتاب جو میں نے پڑھی ہو؟"
○ "ابھی پڑھی نہیں "خدا اور محبت" شروع کر رکھی ہے۔"

39 "پسندیدہ جگہ؟"
○ "شہریاراں رحیم یار خان۔"

40 "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟"
○ "زندگی نے کبھی موقع دیا تو سوچیں گے۔"

41 "میری قوت ارادی؟"
○ "معاشرے میں بچ جانے والی ایمانداری جتنی۔"

42 "گھر کا پسندیدہ کمرا؟"
○ "ہم سب بہنوں کا مشترکہ کمرا۔"

43 "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"
○ "شلوار قمیص۔"

44 "پسندیدہ رنگ؟"
○ "Black Red"۔

45 "پسندیدہ مصنف؟"
○ "بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، مظہر الاسلام، امرتا پریتم۔"

46 "پسندیدہ شاعر؟"
○ "فیض احمد فیض، امجد اسلام امجد۔"

47 "ویران سنسان جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کروں گی؟"
○ "وہ جزیرہ محبت ہوا تو Exit نہ بھی ہو تو محبت اور تنہائی کے ساتھ خوب گزرتی ہے میری۔"

48 "خود اپنی بری عادت؟"
○ "جذباتی ہوں، جلد اعتبار کر لیتی ہوں۔"

49 "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"
○ "کوئی خاص نہیں۔"

50 "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟"
○ "شاعرہ ہوتی۔"

51 "ایک لفظ جو مجھے واضح کر دے؟"
○ "محبت۔"

52 "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"
○ "کائنات کے بہت سے رنگوں میں سے ایک رنگ، کبھی زندگی سجا دینے والا، کبھی زندگی کا تلخ گھونٹ۔"

53 "محبت کے بارے میں خیال؟"
○ "زندگی میں جینے اور زندہ ہونے کے فرق کو واضح کرنے کا لطیف احساس۔"

54 "پسندیدہ رشتہ؟"
○ "میرے جیون ساتھی جو جہاں بھی ہیں میرے لیے زندگی کا حوصلہ اور محبت کی انسپریشن ہیں۔"

55 "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"
○ "محبت پلاننگ تھوڑی ہے کہ سوچو کرو اور حاصل ضرب بتاؤ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔"

56 "پسندیدہ لو اسٹوری؟"
○ "ہر وہ اسٹوری جس میں محبت خالی ہاتھ ہو کر بھی کسی کا دامن بھر جائے۔"

57 "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"
○ "پاکیزہ، باغبان۔"

58 "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"
○ "ہاں زندگی کا سکوت، خوشی، غم، الجھن سب بتاتے ہیں۔"

59 "شاعری کے بارے میں خیال؟"
○ "زندگی کو ارتقا دیتی ہے، رویوں کو سنوارتی ہے، دلوں کو نرم کرتی ہے۔"

60 "بہترین کامیابی؟"
○ "جب فینز کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی تحریروں سے محبت سے محبت کرنا سیکھی۔"

61 "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟"
○ "اللہ کو یاد کر کے۔"

62 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
○ "ہر وہ ایجاد جو سسکتی زندگی کو ایک نئی زندگی کی امید دلائے۔"

☆ ☆

سالگرہ نمبر

شعاع عمیر

شفقت والا

اس (اللہ) نے جانور پیدا کیے، جن میں تمہارے لیے (گرم) پوشاک بھی اور خوراک بھی، اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی اور ان کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے، جبکہ صبح تم انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور شام کے وقت انہیں واپس (گھر) لاتے ہو، وہ تمہارے بوجھ بھی اٹھا کر ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جاں فشاں (اور مشقت) کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا شفقت والا ہے۔ بڑا رحمت والا ہے۔

(سورۃ النحل... آیت 7 تا 5)

امبر آصف... کراچی

عظمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جتنے انبیائے کرام کو دنیا میں بھیجا وہ تمام کے تمام اونچی صفات کے حامل تھے۔ جبکہ محبوب رب کائنات، خاتم النبین، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صفات میں سب سے اعلا اور کامل تھے۔ تمام انبیائے کرام اپنی اپنی قوم کے لیے ہادی تھے۔ جبکہ نبی اکرم شفیع اعظم، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہادی عالم ہیں۔

اگر حضرت آدم علیہ السلام کی تکریم کی خاطر انہیں فرشتوں سے سجدہ کروایا گیا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ خود اللہ رب العزت اور اس کے فرشتے ہمہ وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود سلام بھیجتے ہیں۔

اگر حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یہ شان ہے کہ انہوں نے "صنم خانے" کے بتوں کو توڑا تو نور راہ ہدیٰ احمد مجتبیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ سے 360 بتوں کا صفایا فرمایا۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلق کے بیاں کے موقع پر انہیں نرم دل اور بردبار فرمایا تو سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کو قرآن کریم میں "خلق عظیم" سے تعبیر فرمایا۔ (سبحان اللہ)

افشاں... لاہور

زندگی کے دو رخ

یعقوب کندی سے کسی نے کہا۔

"اگر خدا زندگی میں خوش ہی رکھتا تو کتنا مزا رہتا ہے اور زندگی کتنی حسین ہوتی۔" کندی نے جواب دیا۔

"تمہاری بات مہمل ہے۔" پھر سوال کیا۔

"کیا تم نے دنیا میں کوئی ایسی چیز دیکھی ہے، جو ایک رخی ہو اور اس کا دوسرا رخ نہ ہو۔" اس نے شخص نے جواب دیا۔

"نہیں... یہ ناممکن ہے۔" کندی نے کہا۔

"پھر تم ناممکن چیز کی خواہش کیوں کر رہے ہو۔ خوشی زندگی کا ایک رخ ہے اور غم دوسرا، اور زندگی کی

تکمیل ان دونوں رخوں سے ہوتی ہے۔"

فوزیہ ثمریٹ... گجرات

چند باتیں شاید آپ کے لیے

☆ جب آپ کو اپنی شخصیت کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے تو سمجھ جائیے کہ آپ خود پسندی کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

☆ بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جنہیں برتتے ہوئے پل صراط پر سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔

☆ جو لوگ کچھ پانا چاہتے ہیں وہ کوشش کرتے ہیں اور جو کوشش نہیں کرتے وہ پانا ہی نہیں چاہتے۔

☆ جن کو سجدوں میں رونے کی عادت ہو وہ کبھی قسمت پر نہیں روتے۔

☆ جھگڑا نہ کرنا کمزوری نہیں بلکہ زندگی کا اعلا ترین اصول ہے۔

☆ دن کی روشنی میں رزق کی تلاش کرو اور رات کی تاریکی میں اسے تلاش کرو جو تمہیں رزق دیتا ہے۔

☆ ہم کسی کو اپنی مرضی سے چاہ تو سکتے ہیں، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے وہ بھی ہمیں چاہے۔

گڑیا شاہ... کہروڑپکا

بڑوں لوگوں کی بڑی باتیں

☆ انسانیت نور کا دریا ہے، جو ازل کی وادیوں سے نکل کر ابد کی راہوں میں بہتا ہے۔

(خلیل جبران)

☆ دوسروں کے چراغ سے روشنی ڈھونڈنے والے ہمیشہ اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

(عبدالقادر جیلانی)

☆ جو شخص ارادے کا پکا ہو وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔

(گوئٹے)

☆ محبت طویل قربتوں کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ وحی کی طرح کسی لمحے میں ہمارے دلوں میں اترتی ہے۔

(جبران)

☆ دعا مانگتے رہو کیونکہ ممکن اور ناممکن تو ہماری سوچ میں ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆ جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی بخشتے ہیں، اسی طرح اچھے الفاظ مایوس دلوں کو روشنی بخشتے ہیں۔

☆ انسان کا لباس اور سوسائٹی اس کے اخلاق و کردار کا پہلا سرٹیفکیٹ ہے۔

راحیلہ۔ کراچی

ماہر نفسیات

ایک بڑے ہوٹل میں ماہر نفسیات کا کنونشن منعقد ہو رہا تھا، کنونشن کے دوران ایک روز دو ماہرین نفسیات راہ داری میں ایک دوسرے کے پاس سے گزرے، دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک نے مسکرا کر دوسرے کو کہا۔ "ہیلو۔" دوسرے نے کوئی جواب نہ دیا اور کافی آگے جا کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر سر کھجاتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔

"آخر اس "ہیلو" کہنے کا مقصد کیا تھا؟" دو گھنٹے وہ وہیں کھڑا اس سوال پر غور کرتا رہا۔ تب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ دوسرے نفسیات دان کے "ہیلو" کہنے کا مقصد "ہیلو" ہی تھا۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑپکا

نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول "در دل" کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر مارچ کے شمارے میں شامل اشاعت نہیں ہے۔ قارئین "در دل" کی انیسویں قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

اولاد کی تربیت

شیخ سعدیؒ سے پوچھا گیا۔
"اولاد کی تربیت کیسے کرنی چاہیے؟" تو آپؒ نے فرمایا۔
"جب بچے کی عمر دس سال سے زائد ہو جائے تو اسے نامحرموں اور اریوں غیروں میں نہ بیٹھنے دو' اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا نام باقی رہے تو اولاد کو اچھے اخلاق کی تربیت دو' اگر تمہیں بچے سے محبت ہے تو اس سے بے جا لاڈ پیار نہ کرو' بچے کو استاد کا ادب سکھاؤ' اسے استاد کی سختی سہنے کی عادت ڈالو۔ بچے کی تمام ضرورتیں خود پوری کرو' اسے عمدہ طریقے سے رکھو' تاکہ وہ دوسروں کی طرف نہ دیکھے' بچوں پہ کڑی نگرانی رکھو' تاکہ وہ بروں کی صحبت میں نہ بیٹھیں۔ بچوں کو ہنر سکھاؤ' تاکہ کسی بھی برے وقت میں کام آ سکے۔"

نمرہ' اقراء۔ کراچی

اب بھی

اب عمر' نہ موسم' نہ وہ رستے کہ وہ پلٹے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی
ہمراہ ترے پھول کھلاتی تھی جو دل میں
اب شام وہی درد سے خالی نہیں جاتی

قرۃ العین۔۔۔ لاہور

دکھ

مجھے اداس دیکھ کر
اس نے کہا
میرے ہوتے ہوئے
تمہیں کوئی دکھ نہیں
دے سکتا
پھر ایسا ہی ہوا
کہ بعد میں جتنے بھی
دکھ ملے سب
اس نے دیے

نوشین اقبال نوشی۔۔ گاؤں بدر مرجان

روشنی

حضرت ابراہیم نے موسیٰ بن میران کو ان کے انتقال کے بعد دیکھا۔ اور ان سے اللہ تعالیٰ کے سلوک کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔
"جب سے مرا ہوں امراء کی ضیافتوں کا حساب دے رہا ہوں۔ اور ایک سوئی کے بدلے قید میں ہوں۔ جو میں نے مستعار لی تھی۔ اور واپس نہیں کی تھی۔"
پھر آپ سے دریافت کیا کہ۔
"کون سی قبروں میں زیادہ روشنی ہے۔" آپ نے فرمایا۔
"دنیا میں مصیبت زدگان کی قبروں میں انتہائی روشنی ہے۔"

فوزیہ ثمر بٹ۔۔ گجرات

وشواس

بنا چپ چاپ ہے
ٹوٹا آواز سے ہے
کوئی اکا دھاگہ
سینت کے رکھا ہوا
پرانا آئینہ
یا
کسی کا وشواس

صبا سلیم۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

جواہر ریزے

اگر رزق عقل اور دشواری سے ملتا تو جانور اور بے وقوف بھوکے مر جاتے' انسان کی تمام پریشانیوں کی وجہ مقدر سے زیادہ اور وقت سے پہلے چاہنا اور قناعت پسندی کی کمی ہے۔ دنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت سے' لیکن لوگ محنت دنیا کے لیے اور آخرت کو نصیب پر چھوڑ دیتے ہیں۔

شہلا۔۔۔ گجرات

تیری یادوں کے کنول، تیری جدائی کے گلاب

سدرہ وزیر' کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی نظم

سالگرہ

برتھ ڈے کیک پہ جلتی ہوئی شمعوں کے بجھا دینے سے
کب بجھیں گے یہ شب و روز تمہ و سال کے انگار جنہیں
چھو نہ سکا
وقت کا سیل رواں جس کے خم و پیچ میں گم
ہم اور تم
ہم اور تم سے ہزاروں لاکھوں
گم سم
آج کی رات
میں نے ہر سال اسی طور سے کاٹی ہے کہ جیسے کوئی
قید خانے میں کرے عہد اسیری کا حساب
کرچیاں ہوتے ہوئے خواب چنے اور سئے
دشت احساس میں آہٹ کے سراب
کون، کب، کون سی منزل پہ ملا
کس طرح بچھڑا، کہاں پر بچھڑا
دوست کس طرح ہوئے دشمن جاں
غیر کس طرح ہوئے سانس کی خوشبو جیسے
کس کو فرصت ہے کرے، ان کا حساب
اور اگر ہو بھی تو اس کام میں رکھا کیا ہے
آخر کار وہی سیل رواں ہو گا جواب
وقت کا سیل رواں
جس کے اس پار کہیں رکھی ہے
گمشدہ عمر کے لمحوں کی کتاب
اور اس پار فقط خواب ہی خواب
جو بھی رت آئے کھلا کرتے ہیں

شاہین محمد شوقین' کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی نظم

سالگرہ

یہی وہ دن تھا
جب آج سے چار برس پہلے
اسی روش پر بنفشی بیلوں کے نرم سائے میں ہم ملے تھے
وہ لمحہ جب ہمارے جسموں کو اپنے ہونے کا
حیرت آمیز، حیرت افزا، نشاط اثبات مل چکا تھا
ہماری روحوں نے اپنا اپنا سنہری جنم لیا تھا
وہ ایک لمحہ!
ہماری روحوں کو اپنے دست جمال سے چھو رہا ہے
اب تک
نظر کو شاداب کر رہا ہے
بدن کو مہتاب کر رہا ہے
ہم اس کے مقروض ہو چکے ہیں
سو اب آؤ اس عظیم لمحے کے نام کو دعا کریں ہم
اٹھائیں ہاتھ
اور محبتوں کی تمام تر شدتوں سے چاہیں
کہ جب بھی چھبیس جون کا آفتاب نکلے
تو ہم اسے ایک ساتھ دیکھیں

سیماب علی' کی ڈائری میں تحریر
یونس نوزی کی نظم

برتھ ڈے،

سوچتا ہوں ... !
اُسے برتھ ڈے پر
کیا پیش کروں ؟
وفا کا گیت سُنا کر
اپنی چاہت کا برملا
اقرار کروں
اک لمبی عمر کی دُعا دوں
زندگی کا ایک سال
کم ہونے کا بھرپور احساس دلاؤں۔

مہوش فاروقی، کی ڈائری میں تحریر

ارشد ملک کی نظم

آخری ای میل،

خواب پوش آنکھوں میں
آنسوؤں کا بھر جانا
حسرتوں کے ساحل پر
تتلیوں کا مر جانا
حبس کی ہواؤں میں
خوشبوؤں کا ڈر جانا
دل کے گرم صحرا میں
حشر ہی بپا ہونا
درد لادوا ہونا
کیا بہت ضروری ہے
اب ترا جدا ہونا

ثمرہ بٹ، کی ڈائری میں تحریر

منیر نیازی کی نظم

جاگنے کی دُھند میں کوئی خواب گم ہو گیا ہے
اب یہ خواب کبھی پھر دکھائی دے گا
دکھائی دے گا یا نہیں
جاگنے کی دُھند میں کوئی چہرا گم ہو گیا ہے
اب یہ چہرا پھر کبھی دکھائی دے گا
دکھائی دے گا یا نہیں
جاگنے کی دُھند میں کوئی جسم گم ہو گیا ہے
اب یہ جسم پھر کبھی دکھائی دے گا
دکھائی دے گا یا نہیں

تسنیم چوہدری، کی ڈائری میں تحریر

نوشی گیلانی کی غزل

جانے کیسے سنبھال کر رکھے
سب ارادے سنبھال کر رکھے

کچھ نئے زنگ ہیں محبت کے
کچھ پرانے سنبھال کر رکھے

موسم عشق تیری بارش میں
خط جو بھیگے سنبھال کر رکھے

جن کی خوشبو اُداس کرتی تھی
وہ بھی گجرے سنبھال کر رکھے

تجھ سے ملنے کے اور بچھڑنے کے
سارے خدشے سنبھال کر رکھے

جب ہوا کا مزاج برہم تھا
ہم نے پتے سنبھال کر رکھے

آرزو کے حسین پنجرے میں
کچھ پرندے سنبھال کر رکھے

ہم نے دل کی کتاب میں تیرے
سارے وعدے سنبھال کر رکھے

تیرے دُکھ کے تمام ہی موسم
اے زمانے سنبھال کر رکھے

میرے خوابوں کو راکھ کر ڈالا
اور اپنے سنبھال کر رکھے

آصفہ ——— کراچی
خزاں کی رُت ہے جنم دن ہے دُھواں اور پھول
ہوا بکھیر گئی موم بتیاں اور پھول !
وہ لوگ آج خود اک داستاں کا حصہ ہیں
جنہیں عزیز تھے قصے، کہانیاں اور پھول

سدرہ وزیر ——— خوشاب (پپیل)
نیا ہمسفر کے کب تلک کوئی مسافتوں میں لگا رہے
جہاں کوئی کسی سے جُدا نہ ہو مجھے اس راہ کی تلاش ہے
مجھے دیکھ کر جو اک نظر میرے سارے درد سمجھ سکے
جو اس قدر ہو چارہ گر مجھے اس نگاہ کی تلاش ہے

انعم ——— کراچی
اس موم سی لڑکی کے حوصلے تھے بہت
جبھی تو دُکھ عمر بھر اسے ملے تھے بہت
وہ اک برف سی لڑکی جو مجھ میں رہتی ہے
اس برف سی لڑکی سے مجھے گلے تھے بہت

نوشین اقبال نوشی ——— گاؤں بدو مرجان
وہ اس انداز کی مجھ سے محبت چاہتا ہے
کہ میرے ہر خواب پر اپنی حکومت چاہتا ہے
کہتا ہے کہ اس کی ضرورت بن چکا ہوں میں
گویا وہ مجھے حسب ضرورت چاہتا ہے

اقراء ——— سیالکوٹ
برستی بارشوں سے بس مجھے اتنی نسبت ہے
کہ اس طرح کا ایک موسم میرے اندر بھی رہتا ہے

امبر ——— کوئٹہ
مجھے تھا زعم مگر میں بکھر گیا محسنؔ
وہ ریزہ ریزہ تھا مگر اپنے اختیار میں تھا

رانی ——— کراچی
مجھے کیا خبر کہ وہ عشق تھا، وہ نماز تھی کہ سلام تھا
میرا اشک اشک تھا مقتدی، ترا حرف حرف امام تھا

انجم فاطمہ ——— لاہور
پیپر کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد ہم نے بچتے دیکھا کم
ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انسان
بہت خوشی سے بھی آنکھیں ہو جاتی ہیں نم

صدف عبداللہ ——— لاہور
وہ مجھ کو چاہتے لگے بے حد اور اس کے بعد
اس بات کی جہاں میں شہرت کمال ہو
پھر کیوں اس کو جیت کے لیے جائے کوئی اور
جب ہم کو ہار جانے کی عجلت کمال ہو

ام رومان ——— عبدالحکیم
ابھی زندگی کو جواب دینا ہے اس کے پہلے سوال کا
میں یہ دیکھتا ہوں کہ جنوری بھی گزر گیا نئے سال کا
تو یقین کر، تو یقین کر کہ وہ رائیگاں ہے وہ رائیگاں
میری زندگی سے نکل گیا ہے جو لمحہ تیرے خیال کا

دلیجہ مان جٹ ——— عبدالحکیم
اُداس شاموں میں تیز کافی کی تلخیوں میں
وہ کچھ زیادہ ہی یاد آتا ہے سردیوں میں
مجھے اجازت نہیں ہے اس کو پکارنے کی
جو گونجتا ہے لہو میں سینے کی دھڑکنوں میں

سورٹھ ساند ——— روحل والی گاؤں
بہتے ہوئے اشکوں کی روانی میں مرے ہیں
کچھ خواب میرے عین جوانی میں مرے ہیں
ہم کو قبروں میں نہیں کتابوں میں اتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں

حمنہ سوہنی ——— عبدالحکیم
سلجھ جاتی ہے اک اُلجھن تو مشکل اور بڑھتی ہے
کسی صورت محبت کی پریشانی نہیں جاتی

امامہ جٹ ________ عبدالحکیم

بات دل کی ہے اس لیے چلو رہنے دو
تم سے دل کھول کے محبت کی ہے

صبا ________ کراچی

ہم نہ کہتے تھے وقت ظالم ہے
دیکھ لو خواب ہو گئے تم بھی

کرن ________ لاہور

زندہ رہنا ہے تو حالت سے ڈرنا کیسا
جنگ لازم ہو تو لشکر نہیں دیکھا جاتا

مہک سہیل ________ ملتان

فراق بھی نہ ملا اور وصال بھی نہ رہا
بچھڑ کے تم سے، تمہارا خیال بھی نہ رہا
سمیٹ لیں تیرے دور سے کرچیاں دل کی
کچھ اس طرح سے کہ شیشے میں بال بھی نہ رہا

انجم ________ کوئٹہ

تمہارے سرد رویے نے برف کر ڈالا
لہو میں اب وہ انوکھا ابال بھی نہ رہا

عائشہ، تحریم ________ گوجرہ

ہزاروں عنوان گفتگو تھے مگر رہ گئے یہ سوچ کر ہم
یہ بات اُسے ناگوار ہوگی یہ لفظ اُسے ناپسند ہو

ریحانہ ________ لاہور

نگاہ عشق کا عجب ہی مشغلہ دیکھا
اُسے ہی دیکھنا چاہا، جسے بے پناہ دیکھا

ادم ________ کراچی

کوئی نعم البدل عطا کر
دل تو پروردگار ٹوٹ گیا

اقصیٰ رضوان ________ سندھ

مجھ کو بھی شوق تھا نئے چہروں کی دید کا
رستہ بدل کے چلنے کی عادت اسے بھی تھی
وہ مجھ سے بڑھ کے ضبط کا عادی تھا جی گیا
ورنہ ہر ایک سانس قیامت اسے بھی تھی

نواب زادی سولنگی ________ مورو سندھ

وہ مجھے بھولنے کی فکر میں ہے
یہ میری فتح ہے شکست نہیں

جاسمہ مریم نوید ________ کراچی

میری چاہتوں پہ شکوے
تیرے رابطوں میں وقفے
ہاں یہی نشانیاں ہیں
کہ تم دور ہو رہے ہو

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات

یہ عشق تھا فقط عشق جس کا مسئلہ تھا
اس امتحان میں سجدے نہ استخارے تھے
خدا کرے تیری عمر میں گنے جائیں
وہ دن جو ہم نے تیرے ہجر میں گزارے تھے

مشعال جنید ________ کراچی

اس کو آتا ہے قید رکھنے کا فن
ساری پابندیاں اُٹھا کے بھی

تانی چوہدری ________ آکسفورڈ یو کے

غم دے کے کہہ گئے وہ
احسان یاد رکھنا
میری جان لے کے بولے
میری جان یاد رکھنا

سونیا ربانی ________ قاضیاں محلہ بالا

اپنے جہاں میں دیکھ تیرے بعد کچھ نہ تھا
ہم نے لگا دی آج تیرے نام زندگی
جس کے بنا ہر سانس مجھے ڈوبتی لگے
جا کر اُسے بھی ڈھونڈ کسی شام زندگی

عابدہ نثار ________ کراچی

تمہارے بعد کیا رکھنا انا سے واسطہ کوئی
تم اپنے ساتھ میرا عمر بھر کا مان لے جانا
تمہیں ایسے تو خالی ہاتھ رخصت کر نہیں سکتے
پرانی دوستی ہے اس کی کچھ پہچان لے جانا

ریحانہ امجد بخاری

عہد و پیماں

نئی نویلی دلہن نے شادی کے چند روز بعد اپنے شوہر سے اٹھلا کر پوچھا۔

"سنو جی! کیا واقعی تم مجھ سے بے حد محبت کرتے ہو اور تا عمر اسی طرح مجھ کو چاہتے رہو گے، تمہاری محبت میں کبھی بھی کمی نہیں آئے گی؟"

"بے شک سویٹ ہارٹ۔" شوہر نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ مگر پھر اپنا سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر لڑکی مجھ سے اس قسم کے سوالات کیوں کرتی ہے۔"

ثریا شاہ۔۔۔ کہروڑ پکا

وجہ تاخیر

ایک بڑے بزنس مین کے انتقال کے کئی دن بعد جب اس کے دفتری سامان کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ایک خط بھی تھا۔ جو پوسٹ ہونے سے رہ گیا تھا۔

اس کی مستعد اور فرض شناس سیکریٹری نے خط پوسٹ کر دیا، لیکن خط کے آخر میں تاخیر کی وجہ سے بیان کرنا بھی بہتر سمجھا۔ اس نے خط میں باس کے دستخط سے پہلے یہ لائن ٹائپ کی۔

"یہ خط ارسال کرنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ خط لکھنے کے بعد میرا انتقال ہو گیا تھا۔"

لنچ بکس

ایک جگہ ایک ہندو، ایک سکھ اور ایک دہریہ مزدوری کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنے لنچ بکس کھولے تو ہندو بولا۔

"اگر کل پھر میرے لنچ بکس میں میری بیوی نے آلو مٹر رکھے تو میں خودکشی کرلوں گا۔" دہریہ بولا۔

"اگر کل میرے لنچ بکس میں میری بیوی نے دال رکھی تو میں خودکشی کرلوں گا۔" سردار جی کہنے لگے۔

"اگر کل میرے لنچ بکس سے انڈے نکلے تو میں خودکشی کرلوں گا۔"

اگلے روز تینوں نے اپنے لنچ بکس کھولے تو پھر وہی سب کچھ تھا، تینوں نے سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔

آخری رسومات کے وقت ہندو کی بیوی بولی۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ انہیں آلو مٹر سے اتنی نفرت ہے تو میں آلو مٹر نہ پکاتی۔" دہریے کی بیوی نے کہا۔

"اگر مجھے پتا ہوتا انہیں دال ناپسند ہے، تو میں کبھی بھی دال نہ پکاتی۔" سردار کی بیوی بولی۔

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا کیونکہ وہ تو اپنا لنچ خود بنایا کرتے تھے۔"

سیدہ نسبت گیلانی۔۔۔ کہروڑ پکا

ہری مرچیں

☆ "ڈاکٹر صاحب۔۔۔ ڈاکٹر صاحب! میرے بال دھڑا دھڑ گر رہے ہیں، مجھے آپ ان کے لیے کچھ دے سکتے ہیں۔"

"جی ہاں۔۔۔ یہ شاپنگ بیگ لے لیجیے۔"

☆ "پانی سے اسٹک بنانا، سیاستدان کا سچ بولنا اور پیسوں کا چوکور ہونا ممکن ہے، لیکن عورت ذات کا خاموش رہنا ناممکن ہے۔"

☆ ٹیکسی جب آگے جاتی ہوئی کار سے ٹکرائی تو ڈرائیور چیخا۔

"لوگ اندھے ہوگئے ہیں' نہ کوئی اصول' نہ انڈیکیٹر' ایک دم بریک لگا دیے۔" دوسری طرف سے کار ڈرائیور کا جواب آیا۔
"کیا گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے پر بھی انڈیکیٹر دینا پڑے گا۔"

فوزیہ ثمر بٹ... گجرات

مشکل سوال

"اس فارم میں ایک ایسا سوال پوچھا گیا ہے جس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" ایک صاحب نے باہر جانے کے سلسلے میں کاغذات کی خانہ پری کرتے ہوئے سر اٹھا کر اپنے دوست سے کہا۔

"کیا سوال ہے؟" دوست نے پوچھا۔
"لکھا ہے آپ کی والدہ شادی سے پہلے کیا کرتی تھیں؟
مسئلہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے تو وہ میری والدہ ہی نہیں تھیں۔"

رابعہ۔لاہور

کفایت شکاری

"ہم ہر تیسرے سال کسی نہ کسی تفریحی مقام پر چھٹیاں گزارتے ہیں۔"
"باقی دو سالوں میں تم لوگ کیا کرتے ہو۔"
"ایک سال تو ہم پچھلی چھٹیوں کی باتیں کرتے ہوئے گزارتے ہیں۔ دوسرے سال میں ہم آنے والی چھٹیوں کے بارے میں منصوبے بناتے رہتے ہیں۔"
ثمر و بٹ... گجرات

گنجائش

سائنسی ترقی سے بہت دور دراز کے لوگ بھی استفادہ کرنے لگے ہیں۔ ایک آدم خور نے ڈیپ فریزر خرید لیا۔ اس کا پڑوسی آدم خور اسے مبارک باد دینے آیا۔ مبارک باد دینے کے بعد اس نے پوچھا۔
"کتنی گنجائش کا ہے یہ ڈیپ فریزر؟" پہلے آدم خور نے سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچ کر کہا۔
"مجھے ٹھیک سے تو معلوم نہیں' بہرحال شہر سے جو دو آدمی اسے یہاں پہنچانے آئے تھے' وہ اس کے اندر ہی ہیں۔"

انجم بٹ... گوجرانوالہ

کمی

دو جج مرنے کے بعد الگ الگ جگہوں پر پہنچے' ایک دن جنت میں پہنچنے والے جج کی ملاقات دوزخ میں جانے والے جج سے ہوئی۔ دونوں اپنی اپنی مصروفیات کا حال سنانے لگے' دوزخی جج بولا۔
"بہت اچھی گزر رہی ہے' صبح گیارہ بجے تک سارا کام پورا ہو جاتا ہے' ہر شخص کے مقدمے کا فیصلہ ایک دن میں ہو جاتا ہے۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ ہم لوگوں کو کام نہیں کرنا پڑتا۔ تمہارے یہاں کیا حال ہے؟"
جنتی جج نے جواب دیا۔
"برا! صبح کے آٹھ بجے عدالت کا کام شروع ہو جاتا ہے' تو ختم ہوتے ہوتے رات کے گیارہ بج جاتے ہیں۔ ایک ایک مقدمے کا فیصلہ ہونے میں دس بیس سال لگ جاتے ہیں۔" دوزخی جج نے پوچھا۔
"عجیب بات ہے تمہیں اتنا کام کیوں کرنا پڑتا ہے؟" جنتی جج نے جواب دیا۔
"کیونکہ ہمارے یہاں ججوں کی بہت کمی ہے۔"
عرشی... لاہور

صرف تم ہی نے نہیں

جارج نے اپنے دوست کو اسپتال میں مرہم پٹی کراتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے کہا۔
"ارے یار سیمسن کیا ہوا تمہیں؟ آج صبح ہی تو میں نے تمہیں ایک ریستوران میں سنہرے بالوں والی لڑکی کے ساتھ کافی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔" سیمسن نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔
"تم نے ہی نہیں میری ساس نے بھی دیکھا تھا۔"

حرا عظیم... راولپنڈی

صاحبِ علم

ایک صاحب فلم کی کہانی لکھ کر ڈائریکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈائریکٹر نے کہانی کا عنوان دیکھتے ہی مسودہ واپس کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں جناب! یہ کہانی پبلک میں بالکل بھی نہیں چل سکتی۔"
"مگر آپ نے تو اسے پڑھا ہی نہیں' پڑھے بغیر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔" نئے مصنف نے حیرت سے کہا۔
"ارے جناب! اس کا عنوان ہی چلنے والا نہیں ہے۔" ڈائریکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"آپ نے اس کا عنوان رکھا ہے "دیدۂ بینا" اب مجھے اور آپ کو تو معلوم ہے کہ اس کا مطلب ہے "بینا کی آنکھ" لیکن بھلا اس جاہل پبلک کو کیا پتا۔"
شبانہ محمد شفیع... کراچی

قابلیت

موروثی بیماریوں کی تعریف کرتے ہوئے میڈیکل کے ایک طالب علم نے اپنے امتحانی پرچے میں لکھا۔
"ورثے میں ملنے والی بیماریوں کو موروثی کہا جاتا ہے۔ مثلاً" آپ کے دادا کے ہاں اگر اولاد نہیں ہوئی تو زیادہ امکان یہی ہے کہ آپ کے والد کے ہاں بھی اولاد نہیں ہوگی اور ممکن ہے کہ آپ کے ہاں بھی نہ ہو۔"
سحر... لاہور

کتبہ

انگریز شاعر جان ڈرائیڈن کی بیوی بہت چڑچڑی اور بد مزاج تھی۔ جب وہ مری تو ڈرائیڈن نے اس کی قبر پر کتبہ لکھوایا جس پر لکھا تھا۔
یہاں میری بیوی لیٹی ہوئی ہے۔
اسے یہیں لیٹا رہنے دو۔
اب یہ آرام سے ہے۔
اور میں بھی آرام سے ہوں۔
رانی... کراچی

پُرلطف

"محبوب کے انتظار میں زیادہ لطف ہے یا اس سے ملاقات میں؟" لڑکے نے اپنی فلسفی محبوبہ سے پوچھا۔
جواب ملا۔
"محبوب کے انتظار میں زیادہ لطف ہے۔"
"اچھا تو تم ساری زندگی یہ لطف حاصل کرتی رہو۔ میں نے کل زائرہ سے شادی کرلی ہے۔" لڑکے نے کہا۔
زاہدہ نور... حجرہ شاہ مقیم

اطمینان

ایک قبائلی شہر سے ملازمت کر کے [illegible] جارہا تھا کہ اس کی ملاقات ایک صاحب [illegible] انہوں نے قبائلی سے پوچھا۔
"[illegible] کیسے؟"
"[illegible]"
"[illegible]"
"[illegible] رائفل خریدوں گا۔"
"لیکن وہ تو بہت [illegible] ہے۔ اتنے پیسوں میں نہیں آئے گی۔"
"کوئی بات نہیں' باقی رقم بیوی کو بیچ کر حاصل کرلوں گا۔"
"بہت افسوس کی بات ہے بیوی فروخت کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔"
"بس مجھے رائفل خرید لینے دیں' جوں ہی رائفل مل گئی اپنی بیوی واپس لے لوں گا۔" قبائلی نے اطمینان سے جواب دیا۔
(ڈاکٹر یونس بٹ کی "عکس بر عکس" سے اقتباس)
کرن عدنان... کراچی

☼ ☼

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

فرائیڈ بیف سلائس وِد رائس

اجزا :

گائے کا گوشت (لمبائی میں کاٹ لیں)	آدھا کلو
نمک	حسبِ ذائقہ
سیاہ مرچیں (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
رائس (ابال لیں)	سرونگ کے لیے
تیل	حسبِ ضرورت

لہسن' ادرک کو گوشت کے ٹکڑوں میں ڈال کر ابال لیں۔ ٹھنڈا کر کے ایک طرف رکھیں ایک پیالے میں انڈا' کارن فلور' نمک اور کٹی ہوئی سیاہ مرچیں مکس کر لیں گوشت کے ٹکڑے بھی انڈے کے مکسچر میں مکس کریں اور تیل گرم کر کے ڈیپ فرائی کریں اچھی طرح فرائی ہو جائے تو رائس کے ساتھ سرو کریں۔

خوشبودار دیگی پلاؤ

اجزا :

یخنی کے لیے :

مرغی کا گوشت	750 گرام
بادیان کے پھول	تین عدد
سونف	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
الائچی	تین عدد
لہسن' ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
پانی	تین کپ
لونگ	چار عدد
سیاہ مرچیں	آٹھ عدد
دار چینی	ایک انچ کا ٹکڑا
تیزپات	ایک عدد

پلاؤ کے لیے :

چاول (باسمتی)	آدھا کلو (بھگو دیں)
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	دو عدد
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
بادیان کے پھول	تین عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
جائفل' جاوتری	چوتھائی چائے کا چمچہ
دہی (پھینٹ لیں)	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ

یخنی کے لیے گوشت' بادیان کے پھول' سونف' ثابت دھنیا' نمک' الائچی' ادرک' لہسن پیسٹ' لونگ' سیاہ مرچیں' دار چینی' تیزپات اور پانی ڈال کر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو چولہا بند کر دیں اور گوشت کو چھان لیں۔ یخنی الگ رکھیں اور گوشت کو الگ۔ ایک دیگچی میں تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز براؤن کر کے نکال لیں باقی تیل میں گرم مسالا' زیرہ' جائفل' جاوتری' بادیان' گوشت' دہی اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔

جب اچھی طرح فرائی ہو جائے تو یخنی ڈالیں۔ ابال آنے پر بھیگے چاول ڈال کر پکائیں۔ یخنی خشک ہو جائے تو دم پر رکھیں (اگر چاہیں تو زرد رنگ کیوڑے میں مکس کر کے ڈالیں) سرونگ ڈش میں نکال کر براؤن پیاز چھڑک کر رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

مٹر گوشت

گائے کا گوشت	آدھا کلو
چاول (بھگو دیں)	آدھا کلو
نمک	حسبِ ذائقہ
لہسن ادرک پیسٹ	تین چائے کے چمچے
مٹر کے دانے	ایک کپ
ہری الائچی	تین عدد
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	ایک عدد
ثابت گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	چوتھائی کپ
یخنی	تین کپ

گوشت میں پانی' ثابت گرم مسالا' نمک' دو چائے کے چمچے لہسن' ادرک پیسٹ ڈال کر گوشت گلا لیں۔ گوشت میں اتنا پانی ڈالیں کہ تین کپ یخنی نکل آئے گوشت گل جائے تو گوشت الگ کر لیں۔ یخنی چھان لیں۔ گرم تیل میں پیاز اور ہری الائچی فرائی کریں۔ پیاز سنہری ہو جائے تو زیرہ' باقی لہسن' ادرک پیسٹ' گوشت اور مٹر ڈال کر فرائی کریں۔ یخنی' پلاؤ چاول اور نمک ڈال کر پکائیں جب یخنی خشک ہو جائے تو چاول کو پانچ منٹ دم پر رکھیں۔ رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

زعفرانی ہانڈی پلاؤ

اجزا :

مرغی	آدھا کلو
چاول	دو کپ
لہسن' ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
سونف (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لونگ	چھ عدد
پیاز	دو عدد (سلائس کاٹ لیں)
زعفران	ایک چٹکی
تیل	آدھا کپ
خشک میوہ	حسبِ ضرورت
جائفل' جاوتری	حسبِ ضرورت

چاول صاف کر کے آدھا گھنٹے کے لیے بھگو دیں ایک مٹی کی ہانڈی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری براؤن کر لیں پیاز کی آدھی مقدار نکال لیں اور ہانڈی میں گوشت' لہسن' ادرک' پیسٹ' گرم مسالا پاؤڈر' سونف' نمک اور لونگ ڈال کر بھونیں۔ دو گلاس پانی ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔

گوشت گلنے کے بعد چاول ڈال لیں پانی خشک ہونے کے بعد دم پر رکھ دیں۔ زعفران کو تھوڑے سے پانی میں بھگو دیں۔ سب سے آخر میں جائفل' جاوتری' زعفران' تلی ہوئی پیاز اور خشک میوہ جات ڈالیں مزے دار پلاؤ تیار ہے۔ رائتے کے ساتھ نوش فرمائیں۔

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

شاہینہ رباب ۔۔۔ جھنگ

س ذوالقرنین جی! آخر یہ تمام لڑکیاں آپ کے اور آپ کی شرٹ کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں؟
ج انہیں ہماری کفایت شعاری سے چڑ ہے اس لیے شرٹ کے پیچھے پڑ گئی ہیں البتہ میرے پیچھے پڑنے والی اطلاع غلط ہے۔

مانو ۔۔۔ جہلم

س اگر آپ کو بلب پھونکوں سے بجھانا پڑے تو آپ کیا کریں گے؟
ج بس اتنی سی بات بی بی ذرا تکلیف کرو اور سوئچ آف کرو تب سمجھ میں آجائے گا کہ ہم کیا کریں گے۔
س اگر آپ کو اپنی سالگرہ پر کیک کاٹنے کے بجائے تربوز کاٹنا پڑے تو؟
ج تربوز کاٹنے کے لیے آپ کو بلوالیں گے جہلم سے۔

شفق شہزاد ۔۔۔ کراچی

س کیوں ذوالقرنین صاحب آپ کے بھی منہ کو لگ گئی؟
ج بھئی کیا لگ گئی منہ کو؟ بس وہ کرتی رہتی ہو اپنا کنفیوز۔

شفق سلطان ۔۔۔ منچن آباد

س چنگیا کے نیئوا جلدی سے بتاؤ عید کیسی گزری؟
ج بھلا ہو تمہارا، تمہاری دعاؤں سے اچھی گزری اپنی عید، تم اپنی سناؤ۔

تمکین زیدی ۔۔۔ کراچی

س اب تک آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں اپنے آپ کو اس محفل، صنف نازک میں؟
ج خوش باش، ٹھیک ٹھاک البتہ اس محفل، صنف نازک میں آپ لوگوں کو کھٹک رہا ہوں۔

ممتاز کنول ۔۔۔ کراچی

س جلدی سے بتائیے اپنی آخری خواہش کہ ہمیں بے پناہ غصہ آگیا ہے اور ہم جوڈو کراٹے سیکھ رہے ہیں؟
ج آپ سے پہلے بھی کسی نے پوچھی تھی ہماری آخری خواہش۔ تعجب ہے اس کے بعد بھی آپ پوچھ رہی ہیں۔
س کیا ہمارے خطوں میں بہت غذائیت ہوتی ہے جو آپ انہیں ہضم کر جاتے ہیں؟

ج بی بی! آج کل غذائیت تو خالص گھی میں بھی نہیں ہوتی۔

مسرت جبیں قادری ۔۔۔ جلال پور

س عورت زندگی میں سب سے زیادہ کس چیز کی تمنا کرتی ہے؟
ج بے پناہ کماؤ شوہر کی۔
س عورتوں سے اگر غلطی ہو جائے تو وہ سجدے میں گر جاتی ہیں کیا مرد بھی ایسا کرتے ہیں؟
ج تو آپ کا کیا خیال ہے مردوں کا خدا دوسرا ہے، جو انہیں غلطی کی سزا نہیں دے گا۔

افشاں سہیل اکرام ۔۔۔ سندھ

س لڑکیوں نے بال کٹوا لیے۔ لڑکوں نے بڑھا لیے کچھ عرصہ بعد میرا خیال ہے لڑکیاں، لڑکوں کے گھر بارات لے کر جائیں گی۔ نین جی آپ کا کیا خیال ہے؟
ج پھر تو وارے کے نیارے ہوں گے لڑکوں کے کہ لڑکیاں خود چل کر گھر آیا کریں گی اور کسی ظالم سماج کا خوف نہ ہوگا۔

نسرین سکندر ۔۔۔ لطیف آباد

س خوب صورت مرد بد صورت عورت سے شادی کیوں نہیں کرتا؟
ج اس کی مرضی، بھئی مرد کی ویلیو زیادہ ہے ہر جگہ کھپ جاتا ہے۔ اپنی باری پر وہ انتخاب ذرا زوردار کرتا ہے۔

توحید صدیقی ۔۔۔ کراچی

س انسان اپنی ناکامی کی وجہ اپنی تقدیر کو کیوں ٹھہراتا ہے؟
ج بھئی! بزدل انسان ہمیں قطعی پسند نہیں۔
س نین جی! خواہشات کی انتہا کہاں ہوتی ہے؟
ج کوئی انتہا نہیں، نہ ہی پابندی، جتنی چاہے خواہشات کرو۔

رضیہ نادر ۔۔۔ جلال پور جٹاں

س عورتوں کو ناقص العقل کیوں کہا جاتا ہے؟
ج کیا آپ نے اپنے نام کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر لکھنا چھوڑ دیا ہے۔

راحیلہ عتیق ۔۔۔ روہڑی

س لڑکی کے سر سے دوپٹہ کیوں اتر جاتا ہے؟
ج اچھا تو آج کل لڑکیاں گلے میں جو رسی ڈالے پھرتی ہیں وہ سر سے اتر جاتی ہے اور آپ اسے دوپٹہ کہتی ہیں؟

خالدہ کوثر ۔۔۔ لاہور

س بچے سے جوان، جوان سے بوڑھا اور بوڑھے سے؟
ج کچھ کہتے ہیں پھر بچہ، کچھ کہتے ہیں کہ اللہ میاں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے۔

شاہدہ انجم ۔۔۔ نامعلوم

س بزم میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اور آپ مجھے خوش آمدید نہیں کہیں گے؟
ج آیئے! آیئے تشریف لایئے۔ کہیے کیسے آنا ہوا۔

ناظمہ انوار ۔۔۔ فیصل آباد

س آپ خود کو شہزادہ گلفام سمجھتے ہیں کیا؟
ج نا نا نا، گلفام کا شہزادہ سمجھتا ہوں۔

عابدہ صفدر لودھی ۔۔۔ گوجرانوالہ

س بڑھتی ہوئی مہنگائی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟
ج جو آپ نے سوچا۔

مسرت کھر ۔۔۔ کاغان

س برے کی برائی دیکھنی چاہیے یا اچھائی؟
ج اچھائی تلاش کرنی پڑے گی اور ایسا کرنے کے لیے ہمارے پاس فرصت نہیں۔

ربیعہ کنول رانا...... انٹر کالج کوٹ مومن

خلوت نشینی کی ایسی عادت نہ ہوتی تو کب کے اس بزم میں شرکت کی سعادت حاصل کر چکے ہوتے۔ ہماری بزدلی کے بے شمار سبب بھی تھے اور اندیشوں کا احوال بھی کچھ کم نہ تھا۔ مگر دل پر سنگ گراں رکھ کے، سراسیمگی اور اضمحلال کی کیفیت سے نکل کے قفل لب توڑنے کا فیصلہ بالآخر کر ہی لیا اور ہماری ہمت، جرات اور قلم تھامنے کی کوشش کا سارا تعلق کرن میں لگنے والے نایاب جیلانی کے ناول "اور رے پیا" سے ہے۔

اس ناول کو ہم کرن کا بناؤ سنگار اور آرائش جمال کہتے ہیں۔ اس کی ساحری کا تعلق ماہیر عالم کے گھر سے جو ہے۔ اول قسط سے لے کر اب تک میٹھے، تلخ، شیریں اور زہریلے لفظوں کی جادوگری کے ساتھ ساتھ ماہیر کی ماں کے عشوے ناز و انداز کی عادت سی ہو چلی ہے۔ جہاں حریم کی ثابت قدمی کبھی ناشاد نہیں ہونے دیتی وہیں عفیفا کی زندگی کی افسردگیاں مضطرب کر دیتی ہیں...... ناول یقیناً" اختتام کی طرف گامزن ہے۔ تاہم اول قسط میں جو زوباریہ کا ذکر ہوا تھا یقین واثق ہے کہ زوباریہ کی زندگی کے اسرار بھی عنقریب کھل ہی جائیں گے۔ زرجان کی خاموشی کے ساتھ گفتگو میٹھے میٹھے درد اور کسک کو جگا دیتی ہے اور دل بے اختیار دعا کرتا ہے زرجان کی محبت کو وصل کی سحر نصیب ہو۔ یہ قسط انکشافات کا مجموعہ تھی۔ ہر ہر سطر دل کو چھوتی چلی گئی۔

ہم دانا، عقلمند اور تجربہ کار تو نہیں تاہم قیافہ شناس تو غضب کے ہیں اور یہ سانس روکتی دھڑکنیں بتلاتی ہیں کہ ماہیر عالم کے گھر سے ہمارا ساتھ چھوٹنے ہی والا ہے۔ حریم اور ماہیر کی جدائی اگرچہ دل کو گوارا نہیں مگر زرجان کی خاموش محبت کے سامنے ہم تو ہار ہی چکے ہیں۔ غیب عالم کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اول روز سے جو دل کو کھٹکا سا تھا وہ بالآخر حقیقت کا روپ دھار گیا اور ہم موہی کے بارے میں اس انکشاف پر ہل کر رہ گئے۔

اب ضوباریہ ساحر کے ناول پر بات نہ کریں تو یہ نری زیادتی ہوگی۔ جہاں ضوباریہ ساحر کے لفظوں نے ہم پر اپنی ساحری قائم کرنے کی کوشش برقرار رکھی وہیں ہمیں کچھ کچھ جگہوں پر محسوس ہوا گویا ہم مصر کا سفرنامہ پڑھ رہے ہیں۔ جاسوسی ناول کا کوئی حصہ۔ حقیقت سے بہت دور سا معلوم ہوا۔ اوپر سے مریاقس کی روح والا معاملہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ اب یہ نہ ہو آخری قسط پر پتا چلے ڈاکٹر صاحب بھیانک طویل خواب دیکھ رہے تھے۔ بہرحال آخری قسط تک تبصرہ محفوظ ہے۔

"دردل" کو کیا کہیں...... جہاں سے چلے تھے وہیں پہ کھڑے ہیں...... علیزے کی نازک اندامیاں ذرا نہیں بھاتیں۔ بندہ کچھ تو میچور ہو۔ "بے بے" کی عمر میں ابھی تک "بے بی" بنی ہوئی ہیں۔

دل آور کا کردار مضبوط ہے اور زری کی شاعری بھی کچھ ہضم نہیں ہوتی۔ مدحیہ کو تو اللہ ہی سمجھائے۔ کیسے شرارے پھوٹتے ہیں اس کے لبوں سے۔ بہرحال منصور حسین بھی ایک "معمہ" سا لگتا ہے۔ زہرہ آنٹی تو سو فیصد دل آور کی ماں، زہرہ بتول ہوں گی اور یہ علیزے بے بی پہ حملے بھی دل آور کرواتا ہوگا۔ (ہماری قیافہ شناسی غضب کی جو ہے)

فوزیہ یاسمین بالکل ناک کی سیدھ میں ٹھیک ٹھیک جا رہی ہیں۔ خرم ہمارا فیورٹ ہے اور کمل کے تو کیا ہی کہنے۔

ویسے پورے ناول میں ہمیں اور ہماری چھوٹی بہن اقرا ریاض کو زوبیہ پسند ہے۔ ہم کرن کے لیے ایک تجویز دینا چاہتے ہیں۔ اگر برا نہ لگے تو صاف صاف کہہ دیں۔ کرن میں کچھ کمی سی ہے اور اس کمی کو دور کیوں نہیں کیا جاتا۔

آپ جو بھی سلسلہ وار ناولٹ یا مکمل ناول لگاتے ہیں ان کی پچھلی قسطوں کا خلاصہ لازمی دیا کریں جو نئے لوگ جوائن کرتے ہیں ان کے لیے بہت آسان ہوگی اور ہماری اس خواہش کو ضرور پورا کیجیے گا اور دوسری بات یہ کہ شعاع اور خواتین کی طرح خطوط کے جوابات بھی دیا کریں عین نوازش ہوگی۔ جاتے جاتے کرن کے لیے دعاؤں کا تحفہ۔ جیتے رہیں لکھاری اور زندہ رہیں قاری۔

نمرہ...... راولپنڈی

سب سے پہلے تو کرن کی سالگرہ کے موقع پر سب کو مبارک باد۔ اللہ پاک کرن کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے اور ہمیشہ ہمارے لیے روشنی کی کرن ثابت ہو۔ پہلے تو میری آپی کرن پڑھا کرتی تھیں انہیں دیکھ دیکھ کر میرا بھی شوق بڑھ گیا میں "تقریباً" چار سال سے کرن کی مستقل قاری ہوں مگر کبھی کسی بھی سلسلے میں انٹری مارنے کا موقع نہیں ملا لیکن اب میں نے سوچ لیا کہ لازمی انٹری مارنی ہے کیونکہ یہ تو اپنا کرن ہے اس لحاظ سے پہلی دفعہ کرن میں شرکت کر رہی ہوں۔

خط لکھنے کے مقصد تو بہت ہیں لیکن سب سے پہلے میں کرن کی قارئین کو معذرت کے ساتھ ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ نئی رائٹرز کی حوصلہ افزائی کیا کریں پلیز تنقید برائے تنقید کا نشانہ نہ بنایا کریں کیونکہ جو نیا رائٹر ہوتا ہے وہ بالکل اس بچے کی مانند ہوتا ہے، جس نے ابھی ابھی چلنا سیکھا ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس کے قدم لڑکھڑا بھی جاتے ہیں اسی طرح رائٹر نے بھی ابھی ابھی قلم پکڑا ہوتا ہے اسی لیے ہو سکتا ہے ان کا قلم بھی کہیں لڑکھڑا جائے اس لیے حوصلہ افزائی ضروری ہے اور کرن نے اپنا حق ادا کیا ہے نئی رائٹر کو اپنے شمارے میں جگہ دے کر۔

اب آتے ہیں تبصرے کی طرف ٹائٹل گرل اچھی لگی حمد و نعت بھی اچھی تھیں "دو کا پہاڑا" میں ابرار شد کا انٹرویو ہی پڑھا ہے۔ "روداد قفس" پڑھنے کے بعد دنیا کی سفاکی پر حد درجہ غصہ آیا لوگ غربت کی وجہ سے مر رہے ہیں غریب لوگ خودکشی کرنے پر مجبور ہیں اور کچھ لوگ تو ایک ساتھ دو گناہ کر بیٹھتے ہیں قتل بھی اور خودکشی بھی۔

عبیرہ گل کا ناولٹ بھی اچھا تھا یہ مرد ایسے کیوں ہوتے ہیں ایک عورت کا بدلہ ساری عورتوں سے کیوں لیتے ہیں۔ سب ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔

افسانے ابھی چار پانچ ہی پڑھے ہیں اپنی اپنی جگہ سب اچھے تھے۔ "یادوں کے دریچے سے" مجھے ڈاکٹر سعدیہ زمان اور اسماء پروین کا انتخاب پسند آیا خط کے ساتھ سالگرہ نمبر کے لیے سروے بھی بھیج رہی ہوں اگر پسند آیا تو پلیز ضرور شامل کیجیے گا۔

میں نے دو تین افسانے اور ناولٹ لکھے ہیں اگر کرن میں تھوڑی سے جگہ مل جائے تو خوشی ہوگی اور پلیز میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا اور شامل بھی کیجیے گا۔ اب اجازت دیجیے اللہ حافظ۔

جواب پیاری نمرہ! آپ کے افسانے ہمیں مل گئے ہیں۔ آپ کرن کے آفس فون کر کے اپنے افسانوں کے بارے میں معلوم کر سکتی ہیں۔ آپ کی پسندیدگی مصنفین تک ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

فوزیہ ثمروٹ، ہانیہ عمران...... گجرات

فروری کا کرن تیرہ تاریخ کو مل گیا تھا۔ اکیس فروری کو میری پیاری بہنا شازیہ میرر ئیس کی سالگرہ ہوتی ہے اسے وش کر دیں۔

فروری کا شمارہ افسانہ نمبر تھا۔ فہرست میں دس افسانے موجود تھے ہمیشہ کی طرح حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم شریف کو پڑھا۔ "مجھ سے ملیے" صائمہ اکرم چوہدری کافی حساس طبیعت کی مالک ہیں۔ ان کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔

قارئین کی عدالت میں ڈرامہ "مات" کے ہیرو عدنان صدیقی کو ضرور شامل کریں اور دو کے پہاڑے میں حنا دل پذیر کو بھی ضرور شامل کریں۔

اس بار مستقل سلسلے سے کرن کو شروع کیا۔ "کرن کرن خوشبو، مسکراتی کرنیں" اس بار شاندار رہے۔ رباب آفاق کی حسرت پہ حیرت ہوئی۔ ایک انسان خود کو کتے سے بھی کم تر سمجھ رہا ہے۔ خیر وہ انسان تو نہ تھا وہ تو ایک عدد شوہر تھا۔

"یادوں کے دریچے سے" ارم اور اسماء پروین کی ڈائری پسند آئی۔

"نامے میرے نام" میں سب ہی کے کرن کے بارے میں تبصرہ اچھے تھے خود کا خط پڑھ کر کبھی کبھی حیرانی ہوتی ہے کہ یہ میں نے لکھا ہے کاش کہ میرے قلم میں بھی اتنی وسعت آجائے کہ میں تحریروں کا صحیح حق ادا کر سکوں۔

رسالہ کی ہارٹ فیورٹ اسٹوری "اور رے پیا" پہ کچھ بات ہو جائے۔ کہانی تو مکمل کوئی نیا موڑ لینے والی ہے۔

عفیفا بے چاری پہ یہ کیا ظلم ہو گیا اور پھر سہیل کی عفیفا کو طلاق کے بعد روپوشی کیا سہیل زندگی کے کسی موڑ پہ عفیفا کی زندگی میں انٹر ہونے والا ہے۔ ویسے اچھا ہوا جو عفیفا کی جان چھوٹ گئی پر جو ہوا ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ انجانے میں ہی سہی اس کی ماں اس کے دکھ میں مر گئی نایاب جی اگر آپ عفیفا کو زرجان یا پھر شاہنواز کی زندگی میں شامل کرنا چاہتی ہیں۔ تو پلیز زوباریہ یعنی ہنی کو کسی بھی طریقے سے ماہیر عالم کی زندگی میں شامل مت کیجیے گا' حریم کے ساتھ اس۔۔ قسم کی زیادتی ہم سے ہضم نہ ہو سکے گی۔ اور موبی کے کردار کو کلوز کریں۔ ایویں ہی سسپنس پیدا کرتا رہتا ہے۔ ہنی اور شیری کا کیا قصہ ہے۔ کیا شیری سہیل ہی تو نہیں۔

عفیفا' زرجان کے ساتھ کام کر رہی ہے کیا زرجان عفیفا کا سہارا بنے گا سارے کردار ہی بیچارے محبت کا بوجھ لیے پھر رہے ہیں۔ عفیفا تو خود ماہیر عالم کی محبت کی ترسی ہوئی ہے وہ محبت کے گھائل زرجان کو کیا دے سکے گی۔

ماہیر عالم ہے ویسے قسمت کا دھنی۔ بیک وقت تین تین لڑکیوں نے محبت کی ہے پر کردار کا مضبوط مرد ہے۔ اس نے صرف اپنی محبت کو چنا ہے۔

دوسرا مستقل ناول "مقید خاک" اس ماہ کہانی کچھ فاسٹ رہی۔ اختر اور صمترا کی نوک جھوک اچھی رہی۔ کیا مہر اختر کی محبت کو قبول کر لے گی اور میرے خیال میں اب مرباقس کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ کہانی میں اسی بات کی دلچسپی ہے پر۔۔ زیادہ الجھاؤ بھی سارا مزا کرکرا کر دیتا ہے۔

"روداد قفس" بہت تلخ تحریر تھی۔ یہی کچھ تو ہو رہا ہے مہنگائی کے ہاتھوں پہلے چوری ڈاکے پڑتے ہیں۔ اب لوگ خود کشیاں کرنے پہ مجبور ہو گئے۔ بھوک پیٹ کی ہو یا ہوس کی دونوں ذلیل کرواتی ہے۔ معاشرے کے بے ضمیر انسانوں نے عورت کو کھلونا سمجھ لیا ہے بے بس اور مجبور عورت کی مجبوری کو کیش کرتے ہیں۔

"بڑی بھابھی" بھی اچھی تحریر تھی۔ مائرہ کی چالاکیوں پہ حیرانی ہوئی لوگ کیسے ۔۔ حاسدانہ فطرت سے دوسروں کی زندگیوں پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

سب سے اچھا افسانہ سمیرا حمید کا "گرہ" لگا۔ یہ رامین کتنی بے وقوف لڑکی تھی۔ کیا کبھی محبت بھی اس طرح ملتی ہے۔ اس نے "مجاذب" کے ساتھ وہ۔۔ کیا جو ایک شریف عورت کو زیب ہی نہیں دیتا۔ خود کو اس کی نظروں میں گرا کر اسے کون سا محبت مل گئی۔

"محبت خوش گماں ہے" منتہیٰ ایک تو نام بہت پسند آیا۔ دوسرا کہانی بھی۔ منتہیٰ کی تصوراتی دنیا اچھی لگی۔ ہم لڑکیوں کے پاس یہی تو اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔ جو کوئی چھین نہیں سکتا۔ جس میں کھو کر تھوڑی دیر کے لیے زندگی کے جھمیلے سے نجات ملتی ہے۔ حالانکہ ایسا ہوتا نہیں پر کیا کیا جائے دل ناداں کو کون سمجھائے۔

ام ثمامہ ایک تو آپ کا نام بہت پیارا اور مقدس ہے دوسرا آپ کی تحریر بہت سبق آموز ہوتی ہیں۔ ہر تحریر میں کوئی نہ کوئی مثبت سبق ہوتا ہے۔

معید رضا کی محبت میں ثابت قدمی بہت اچھی لگی اور میرب کا اپنی خاندان کی عزت کی خاطر محبت کی قربانی دی۔ میرب اور معید رضا کا ملن اچھا لگا۔ جو لوگوں کو خدا کی رضا پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ خدا ان کو کبھی مایوس اور خالی ہاتھ نہیں رکھتا۔ دونوں نے صبر سے اپنی محبت کو نبھایا اور پایا بھی۔

"اجنبی مہربان" اچھی تحریر تھی۔ جہیز کے خلاف مہم تو ہر کوئی چلا رہا ہے۔ مگر یہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ مشہود جیسے نوجوان ہیں جو جہیز جیسی لعنت کو دور کر سکتے ہیں۔

اس ماہ کا رسالہ شاندار تھا۔ اب اجازت دیں آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

شمائلہ تاج ۔۔۔ خان پور

فروری کا کرن ملا۔ ٹائٹل سو سو تھا۔ سب سے پہلے صائمہ اکرم چوہدری سے ملاقات کی۔ ان کا انٹرویو بہت اچھا تھا۔ بہت کم انٹرویو پڑھ کر مزا آتا ہے اور صائمہ اکرم کا پڑھ کر بہت مزا آیا۔ اس کے بعد نایاب جیلانی کی "اور ے پیا" پڑھی۔ اس قسط میں کہانی کافی تیزی سے آگے بڑھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کہانی کو اب ختم ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ طوالت اکثر بور کر دیتی ہے۔ مگر کہانی بہت اچھی ہے۔ پڑھنے بیٹھو تو دل ہی نہیں کرتا کہ ختم ہو۔ زرجان پر بہت ترس آتا ہے۔

افسانوں میں "اجنبی مہربان" بہت اچھا لگا۔ نہ جانے یہ لڑکے والے اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔ افسانہ پڑھ کر ایسے لوگوں پر بہت غصہ آیا جو صرف جہیز کی لالچ میں لڑکی والوں کی بے عزتی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ عابد

علی" سے ملاقات ٹھیک رہی۔ "نام ے میرے نام" اچھے تھے۔

شاہین محمد شوقین ۔۔۔ میرپور خاص

ویسے تو میں خاموش قاری ہوں کرن پڑھتے ہوئے کافی وقت گزر گیا ہے کرن پڑھتے ہی چاند کی نرم و نازک چاندنی کا تصور ذہن میں آتا ہے۔

ابتدا ہمیشہ حمد و نعت سے کی جو ہمیشہ دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

مارچ ہمیشہ سے ہی میرے لیے دوگنی خوشی لے کر آتا ہے کیونکہ مارچ میں میری بھی سالگرہ آتی ہے تو ہوئی نہ دوگنی خوشی 'مدیرہ آپی گیارہ مارچ کو میری سالگرہ ہے سو ہمیں مبارک باد ہی دے دیجیے گا۔

آپ سے ایک درخواست ہے شہزاد رائے کا انٹرویو شائع کریں اور آواز کی دنیا میں FM-98 کے آرجے مجتبیٰ خیام کا انٹرویو لیں۔

خط لکھنے کی اصل وجہ سالگرہ نمبر میں شرکت ہے۔ نبیلہ جی سے میں یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ اپنے ناول "در دل" میں زری اور دل آور شاہ کو جلد سے جلد ملا دیں کیونکہ سب سے زیادہ اور سب سے فیورٹ کردار ۔۔۔ زری' آذر' دل آور شاہ اور علیزے ہیں۔

ابھی پورا شمارہ نہیں پڑھا ہے اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

خط طویل ہونے کی معذرت چاہتی ہوں مگر محبت ہمیشہ بے حساب ہوتی ہے ان شاء اللہ اگلے ماہ اس خط کی اشاعت کے بعد حاضری دوں گی اپنی دعاؤں میں ہمیشہ میرا بھی حصہ رکھیے گا مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے تب تک کے لیے اللہ حافظ اس دعا کے ساتھ اللہ کرن کو ہمیشہ ترقی عطا کرے آمین۔

انیقہ انا ۔۔۔۔ چکوال

آج ایک طویل مدت کے بعد لکھنے کو قلم اٹھایا تو نوک زبان پر بے ساختہ شعر آگیا۔

اک مدت کے بعد میرے گھر کی خامشی ٹوٹی
آخر اک روز میں نے کلام خود سے کیا

بہر کیف آج سوچا کہ قبل اس کے کہ انیقہ آپ کے اذہان سے محو ہو جائے' چل کر حاضری دیتے ہیں۔

"اور ے پیا" کھول کر پڑھا تو سوچا یقیناً" آٹھ ماہ ہو گئے میں نے کچھ نہیں لکھا یہ ذہن بھی کم بخت کسی پل ٹکتا نہیں تو لکھتی کیسے؟ اب بات "اور ے پیا" کی ہوئی ہے تو تبصرہ بھی اسی سے شروع کرتی ہوں۔ یوں بھی خط لکھنے کی بنیادی وجہ بھی اسی پر تبصرہ کرنا ہے۔

پہلی بات تو اس ناول کی حد درجہ طوالت ہے۔ آٹھ ماہ میں سوائے فیفا کی طلاق اور حانی کی منگنی کے کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔۔۔ چند انکشافات ضرور ہوئے۔ غیب عالم کا مخنث ہونا کہا جاتا ہے صحبت بڑا اثر رکھتی ہے۔ اس ضمن میں کئی احادیث بھی ہیں۔ اب حانی کی منگنی پر شور و ہنگامے نے غیب کی اصلیت واضح تو کر دی مگر جو شخص بچپن سے معمول کی زندگی گزارتے لوگوں میں رہا' ناچ گانے سے اس کا دور تک واسطہ نہیں تھا۔ وہ بھلا کیونکر رقص کر سکتا ہے؟ وہ بھی مخصوص انداز میں۔

اس پورے ناول میں ایک غیب عالم کا کردار متاثر کرتا تھا پر۔۔۔ "اس کی باتیں تو اب بھی کمال کی ہیں۔ مجھے کیوں لگتا ہے کہ فیفا اور ماہیر کی شادی ہو گی ہنی ہی زوباریہ ہے اور حریم بالآخر زرجان کی' یہ تمام مفروضات مابدولت نے موبی کی باتوں سے قائم کیے ہیں۔ ورنہ خدا کرے ہماری مصنفہ ماہیر اور حریم کو الگ نہ کریں۔

اس ماہ کا شمارہ افسانہ نمبر تھا ایک سے بڑھ کر ایک افسانہ خصوصاً "گرہ" مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ مصنفہ اگر مزید چاہتی تو اس افسانے کو بڑھا کر ایک خوب صورت ناول تشکیل دے سکتی تھیں۔

"دست کوزہ گر" ۔۔ ناول نمل اور خرم کے جھگڑوں تک منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسری جانب الیان اور ابرار صاحب کے معاملات خاصے گرم نظر آ رہے ہیں اور نہ ہی زوبیہ والا معاملہ کچھ سلجھتا نظر آ رہا ہے۔ اب یہ میری کم نگاہی ہے یا شاید اتنے ماہ کی غیر حاضری کہ کچھ نہ کچھ کمی سی لگ رہی ہے۔ "در دل" کا بھی یہی کچھ حال ہے کہ مجھے ناول آگے بڑھتا نظر نہیں آ رہا۔ شاید اگلی بار تبصرہ کروں تو کچھ بہتری نظر آ جائے۔

انٹرویوز' میں سلسلہ "قارئین کی عدالت" میں بہت جی چاہتا ہے کہ کچھ سوال پوچھوں مگر مجھے یقین ہے کہ میرے سوالات سنسر کر دیے جائیں گے۔ لہٰذا جانے دیں۔

مستقل سلسلوں میں کئی عرصے سے میرا نام نہیں جگمگایا۔ تبصرہ مکمل ہو چکا ہے۔ امید ہے آپ جگہ دیں گی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

ام رومان۔۔۔۔ عبدالحکیم

کرن منترہ کو ملا' ٹائٹل بے حد پسند آیا' دلہن بہت پیاری لگ رہی تھی۔ حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد مستقل سلسلوں کی طرف دوڑ لگائی۔ نبیلہ عزیز کا "دردِل" بہت اچھا جا رہا ہے۔ نبیلہ آپی کیپ اٹ اپ! آپ کا مستقل ساتھ کرن میں بہت بھلا لگتا ہے' ضوباریہ ساحر کی "مقید خاک" بلاشبہ ایک بہترین اور دلچسپ تحریر ہے' بہت ہی مزا آ رہا ہے پڑھنے میں اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اب آتے ہیں نایاب جی کے "اور رے پیا" کی طرف' نایاب جی بہت اچھا جا رہا ہے ناول' منیب کے بارے میں پڑھ کر بے حد دکھ ہوا' آپی جی پلیز جلد سے جلد پیارا سا اینڈ کیجیے گا ناول کا "مجھ سے ملیے" میں صائمہ اکرم چوہدری سے ملاقات خوب رہی' اس کے ساتھ ہی مجھے اجازت دیں کرن اسٹاف اور قارئین کو کرن کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ کرن کو کرن کی طرح جگمگاتا رکھے (آمین)

الفت زہرہ ہراج۔۔۔۔ خانیوال

اس مرتبہ کرن بارہ کو ملا کرن ٹائٹل ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا حمد و نعت کے بعد "کرن اور فضا" سے ملاقات کی جو بہت اچھی رہی اس کے بعد ضوباریہ ساحر کے ناول "مقید خاک" کی طرف متوجہ ہوئے پہلی اور دوسری قسط زبردست تھی کیا یہ ناول حقیقت میں ایسا ہے کیا یہ کردار سچے ہیں؟ تقریباً تمام افسانے ہی بہترین تھے۔

نایاب جیلانی کا ناول "اور رے پیا" بھی ٹھیک جا رہا ہے نایاب جیلانی صاحبہ اس ناول میں پلیز ماہیر عالم کو کچھ نہیں ہونا چاہیے اور زرجان کی جوڑی ہنسی سے بنا دیں اور آخر میں کرن کے لیے ڈھیروں چاہتیں اور دعائیں۔

سائرہ پروا کرن۔۔۔۔ کوٹ چٹھہ

کافی عرصے کے بعد "کرن" کی اس محفل میں جلوہ گر ہو رہی ہوں۔ ٹائٹل گرل کا ڈریس اچھا لگا۔

سب سے پہلے ذکر کروں گی "اور رے پیا" کا اس ناول کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے' نایاب آپی' تھینک یو سوچ۔

حریم اور زرجان کی خاموشی' ماہیر اور حریم کی رومینٹک باتیں' شاہنواز اور حریم کی انٹرسٹنگ گفتگو سب لاجواب ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ مستقبل قریب حریم کے لیے نہایت برا ثابت ہو گا۔ ماہیر عالم' حریم کو چھوڑ دے گا اور زرجان عباس ہی حریم کو اپنائے گا۔

"دردِل" میں زہرہ' آئی تھنک عائشہ آفندی کی بیٹی ہیں۔ اس بار عدیل کا ذکر نہیں تھا۔ نبیلہ آپی کیا واقعی آذر' علیزے سے محبت کرتا ہے یہ تو صحیح نہیں ہے پھر منصور حسین کا کیا بنے گا؟

"دستِ کوزہ گر" نے تو بہت سسپنس پھیلایا ہوا ہے خرم زونیہ سے اس کا نمبر لینے میں کامیاب ہو جائے گا اور خرم نے شخص نمل کو نیچا دکھانے کے لیے اس سے منگنی کی ہے مگر وہ شادی تو زونیہ سے ہی کرے گا۔ عالیان کا کردار میرا فیورٹ ہے۔

اب اس ناول کا ذکر کروں گی۔ جس نے ہمارے ذہنوں میں خوف بٹھایا ہوا ہے مگر پھر بھی میں یہ ناول ضرور پڑھتی ہوں۔ کیونکہ اس کو پڑھے بغیر مجھے نیند نہیں آتی' جی ہاں میں "مقید خاک" کا ذکر کر رہی ہوں۔

افسانوں میں جس کو انعام ملنا چاہیے۔ وہ ہے "اجنبی مہمان" "مشہود جیسے اچھے لوگ آج کل ناپید ہو چکے ہیں۔

"گرہ" بھی بہت ونڈر فل افسانہ تھا۔ اس میں جاذب کا فیصلہ بہت اچھا لگا۔ رامین سے شادی نہ کر کے اس نے بہت عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔

سورٹھ ساند۔۔۔۔ روحل وائی گاؤں

فروری کا افسانہ نمبر کچھ خاص پسند نہ آیا مکمل ناول میں نایاب جیلانی خوامخواہ طوالت دے رہی ہیں ناول میں کچھ بھی نہیں ہے افسانے بس سو سو تھے اور قسط وار ناول ہمیشہ کی طرح بہت بیسٹ رہے باقی سلسلے سارے اچھے تھے۔ خاص طور پر "کرن کرن خوشبو" باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔ اب اجازت دیں آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔